هندوستان میں
فرقہ پرستی اور اس کا جواب

اصغر علی انجینئر

ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

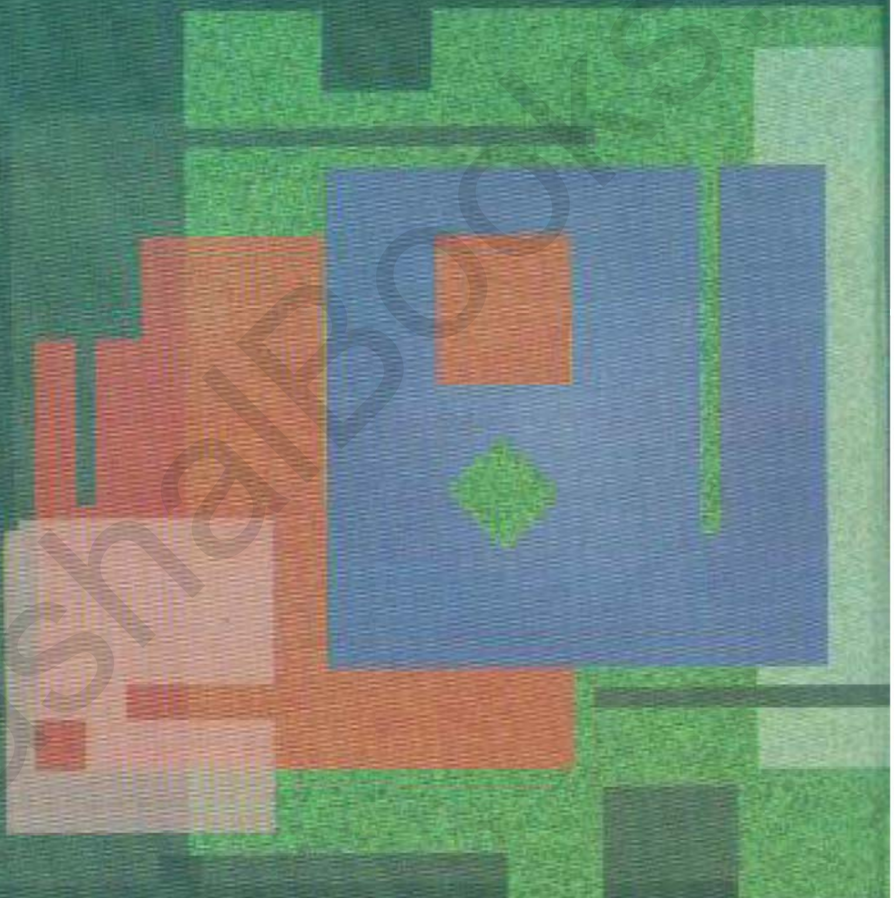

مشعل

MashalBooks.org

ہندوستان میں
فرقہ پرستی اور اس کا جواب

اصغر علی انجینئر

ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

مشعل بکس
آر۔بی۔5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

MashalBooks.org

ہندوستان میں

فرقہ فرستی اور اس کا جواب

اصغر علی انجینئر

ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

کاپی رائٹ اردو (c)2004 مشعل بکس
کاپی رائٹ (c)اصغر علی انجینئر

ناشر : مشعل بکس
آر۔بی۔۵، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان
فون وفیکس 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

ترتیب

دیباچہ شفقت تنویر مرزا 6

حرف آغاز 9

ترقی پذیر ممالک میں جمہوریت اوراس کے مسائل 19

فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تشدد 1998ء/ فرقہ وارانہ تشدد 1999ء/ فرقہ وارانہ فسادات 200/ بال ٹھاکرے کی گرفتاری/ سری کرشنا کمیشن رپورٹ/ کانپور کے فسادات/ بمبئی کے فسادات میں ملوث پولیس افسروں کے لیے سزا

مالیگاؤں کے فسادات/ بابری مسجد کے انہدام کے بعد فرقہ وارانہ صورت حال/ بابری مسجد کے بعد فرقہ وارانہ تشدد۔

فرقہ وارانہ فسادات/ بی جے پی کا فرقہ وارانہ فسادات سے پاک ہندوستان/ گجرات...... حلقہ تاریک/ گجرات کی خونریزی میں پولیس کا کردار/ فرقہ وارانہ تشدد اور سول سوسائٹی کا کردار۔

مشترکہ ثقافت، سیکولرازم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی 116

سیکولرازم کی تذلیل/ بین المذہبی اور بین الثقافتی مکالمہ/ مذاہب اور ثقافتوں کی باہمی تفہیم/ بین المذاہب مکالمے کیلئے قاعدے/ اکیسوی صدی، مذہب اور امن/ قومی، ریاست، مذہب اور شناخت/ کانگرس سیکولرازم اور اقلیتیں۔

MashalBooks.org

اسلام اور سیکولرازم/ قومی پرستی، فرقہ پرستی اور بیسوی صدی/ واجپائی کا بیان اور قرون وسطیٰ کی تاریخ/ کثیرالوجودیت اور فرقہ واریت/ گجرات میں سب کچھ نہیں کھو گیا/ گجرات کا قتل عام اور سیکولرازم پر اثرات'

بی جے پی/ سنگھ پریوار اور اقلیتیں 182

ہندوستان/ اقلیتیں اور اکیسویں صدی/ بی جے پی اور گجرات میں اس کی جڑیں/ بی جے پی اور اس کے 20 سال/ بی جے پی اور مسلمان/ آر ایس ایس: اقلیتی نقطۂ نظر سے/ ہندوتوا/ نیشنلزم اور تشدد/ بی جے پی کی شکست......فرقہ واریت کی شکست/ اقلیتیں۔ آر ایس ایس کے رحم وکرم پر نہیں!

ہندوستانی مسلمان 230

ہندوستانی مسلمان اور تعلیم/ مسلمان اور تعلیم/ سماجی اصلاحات اور سیاسی دشواریاں/ الگ مسلم پارٹی کی ضرورت نہیں/ شناخت اور بقا کا مسئلہ/ فرقہ وارانہ تشدد/ بابری مسجد کے بعد/ مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ اور اس کا کردار/ پچاس برس آزاد ہندوستان میں ......ایک جائزہ مسلمانوں کے متعلق افسانہ سازی اور گجرات کا کشت وخون۔

مسلم خواتین اور شرعی قوانین 286

مسلم خواتین کا نان نفقہ: کچھ نئے فیصلے/ ایران میں خواتین اور شرعی قانون/ عورتوں کے حقوق اور مذہبی قانون کا بورڈ'

مسلم خواتین اور بنگلہ دیش میں دُوررس تبدیلیاں/ کیا جبراً پردہ کرایا جاسکتا ہے؟۔

کشمیر 309

کشمیر میں تشدد اور جمہوری حقوق/ کشمیر...... کیا خودمختاری مسئلے کا حل ہے؟/ کشمیر کا انتخاب......امن۔

پاک وہند تعلقات 324

نصابی کتابوں میں ہندوستان کے خلاف نفرت/ جنوبی ایشیا میں مسئلہ قوم سازی/ قوم

MashalBooks.org

سازی کے مسئلے/ پاکستان...... جمہوری حکومت/ سیاست اور پائیداری/ پاک و ہند تعلقات میں بڑھتی تلخی/ کیا جنوبی ایشیا میں کنفیڈریشن ممکن ہے؟

عالم اسلام 353

ایران...... جدید اور قدیم کے درمیان/ انڈونیشیا میں سیاست اور مذہب/ انڈونیشیا...... مصیبت میں ہے/ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ اور مسائل/ دہشت گردی کا ٹکراؤ؟/ عالم اسلام کو نئے راستے کی ضرورت ہے

MashalBooks.org

دیباچہ

اصغر علی انجینئر، ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے لئے لڑنے والوں میں صف اول میں شامل ہیں۔ بہت ہی معروف سکالر اور دانشور ہیں۔ بوہرا خاندان سے تعلق ہے 1940ء میں پیدا ہوئے۔ تفسیر فقہ اور حدیث کی مکمل تعلیم حاصل کی۔ دین سے ہٹ کر دنیوی تعلیم انجینئرنگ میں گریجوایشن کی۔ دینی علوم کے حصول کیلئے بہت سی زبانیں سیکھیں۔ ان میں اردو، عربی، فارسی، ہندی بھی شامل ہیں۔ انگریزی ویسے ہی تعلیم کا لازمی حصہ تھی۔ گجراتی ان کی مادری زبان ہے جبکہ مراٹھی بھی جانتے ہیں۔ اس وقت تک چالیس کے قریب کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اسلام کے بارے میں ان کے تحقیقی کام پر انڈونیشیا میں بھی پی ایچ ڈی کی سطح پر کام کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی اندرونی زبانوں کے علاوہ بعض غیر ملکی زبانوں میں بھی ان کے کئی کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔

اصغر علی انجینئر نے جس دن آنکھ کھولی تھی اس کے گیارہ روز بعد لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی گویا ابتدائی عمر میں ہی ہندو مسلم تنازع کو محسوس کرنا پڑا پھر 1947 کی تقسیم، قیام پاکستان، قتل و غارت گری، کچھ خواب ٹوٹے، کچھ بکھرے۔ آزاد ہندوستان، جو اصغر کا وطن ہے کشمیر کے مسئلے میں الجھا، ہندو اکثریت نے مسلمان اقلیت کو ہندوستان کا کم اور پاکستان کا زیادہ وفادار جانا، ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت بھی مسلمان اور ہندوستان کی تاریخ بھی ایک ہزار سال تک مشترکہ اور متنازعہ۔ ہندوستان کے لئے آزادی کی جنگ لڑنے والے مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد نے بقول اصغر صاحب بہترین آئین بنایا جس کی بنیاد جمہوریت اور سیکولرازم کے اصولوں پر ہے اور جس

کی نظر میں ہندوستان کا ہر شعبہ بلا امتیاز مذہب و رنگ اور نسل' علاقہ ایک سے حقوق کا مالک ہے تاہم اس میں ایک دفعہ 370 کشمیر سے متعلق رکھی گئی۔ اسی سے پھوٹا تنازع۔ یہ تنازع ان دونوں ملکوں کی معیشت کو بھی برباد کرتا جاتا ہے۔ 47ء سے پہلے اور بعد کے فرقہ وارانہ زخم بار بار ہرے ہوتے رہتے ہیں اور اصغر علی انجینئر کا اس کتاب میں یہی مسئلہ ہے کہ جو زخم 1947ء میں برصغیر میں لگے۔ 1948 میں مشرق وسطیٰ میں فلسطین کی صورت میں جو جراحت ہوئی اور نائن الیون یعنی 11 ستمبر میں نیویارک کے ٹریڈ ٹاور پر حملے سے لے کر افغانستان پر کارپٹ بمباری تک یہ سارے زخم اصغر علی انجینئر نے اس کتاب میں شمار کئے ہیں۔ اصغر علی انجینئر کا سادہ الفاظ میں نظریہ ہے کہ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا' زیادہ معاشی اور سیاسی اسباب پر تنازع کھڑا کیا جاتا ہے اس کو اپنے اپنے مذہب کا نقاب پہنا دیا جاتا ہے۔ ان کی نظر میں اس نوعیت کے تنازعوں کا حل صرف جمہوریت اور سیکولرازم میں پوشیدہ ہے۔ وہ ہندوستان میں سابق ہندو مہاسبھا سے لے کر موجودہ حکمران پارٹی بھارتیہ جنتا پارٹی تک سبھی کو جمہوریت خصوصاً سیکولرازم کی ناکامی کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ انہیں ہندو مہاسبھا (بحوالہ لالہ جپت رائے) دو قومی نظریہ کی خالق نظر آتی ہے جبکہ مسلمانوں نے یہ راہ خاصی دیر کے بعد اختیار کی اور اصغر صاحب کی نظر میں مسلمانوں کا مقصد بنا۔ یوپی اور بہار کے مسلمانوں کا بالائی طبقہ دو قومی نظریہ اور تحریک پاکستان کے حق میں تھا کیونکہ اس کی نگاہ پاکستان کی سرسبز چراگاہوں پر تھی غریب مسلمانوں کو اس میں کوئی زیادہ کشش نظر نہیں آتی تھی۔

انجینئر صاحب اپنے تجزیے میں دیوبندی علماء کو مذہبی لحاظ سے قدامت پسند' برطانوی راج کے حوالے سے حریت پسند اور سیاسی اور قومی لحاظ سے متوازن سمجھتے ہیں۔ اصغر علی صاحب سے بہت سے اختلافات ہو سکتے ہیں مگر ان کے اس خیال سے انکار نہیں کہ اسلام کی قرون اولیٰ کی تعبیر اور تفسیر کی جگہ اجتہاد کی ضرورت ہے۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے بارے میں سوچتے ہیں ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا معروضی جائزہ لیتے ہیں اور آج کی عالمی کثریت کے حوالے سے نئے سانچے بنانے پر زور دیتے ہیں۔

اصغر علی انجینئر کی یہ کتاب زیادہ تر ہندوستانی مسلمانوں کے 47ء سے بعد کے لہورنگ واقعات کے اسباب و علل اور تجزیہ تک محدود ہے۔ اسی حوالے سے پاکستان کے

معاملات بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اصغر صاحب سے یہاں بیک وقت اختلاف اور اتفاق ہوتا ہے تاہم ان کا نقطۂ نظر ایک ایسے دردمند ہندوستانی مسلمان کا ہے جسے ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کا قومی اعزاز دیا گیا ہے۔ تقریباً اسی مقصد کے لئے ان کی ساری زندگی وقف ہوگئی اس کتاب کا مطالعہ انہی سطور کی روشنی میں کیا جائے تو حاصل مطالعہ کشمیر سمیت برصغیر کے مسلمانوں کے لئے بڑا چشم کشا ہوگا۔

شفقت تنویر مرزا

MashalBooks.org

حرفِ آغاز

فرقہ واریت کا مسئلہ ہمارے ملک کیلئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ ہمارے سیاست دان اسے مزید سنگین بناتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارا معاشرہ تو سیکولر ہے اور توقع یہ تھی کہ جمہوریت کے استحکام کے ساتھ ساتھ سیکولرازم کو تقویت ملے گی مگر ہمارے سامنے جو منظر ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ جمہوریت کی لہریں گہری تو ہوتی گئیں مگر نتیجہ یہ نکلا کہ فرقہ وارانہ اور ذات پات کی علامتیں اور شناخت زیادہ ابھرنے لگی۔

سیاستدانوں (معدودے چند قابل احترام مثالوں کو چھوڑ کر) نے ان شناختوں پر زیادہ سے زیادہ زور دینا شروع کیا اور ذات پات اور مذہب کی بنیاد پر ووٹ حاصل کرنے کیلئے زیادہ انتشار پھیلا دیا۔

ہم نے ایسا آئین بنایا جو دنیا کے بہترین آئینوں میں شمار ہوتا ہے جس میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ قانون کی نظر میں ذات، رنگ اور عقیدے سے قطع نظر ہر شہری برابر ہے اور یہ برابری ایسے معاشرے میں ہے۔ جس میں سو رنگ ہیں۔ ہم نے مذہبی یا لسانی اقلیتوں کو بھی ان کے حقوق کی پوری ضمانت دی ہے۔ آئین میں اقلیتی مذاہب اور ثقافتوں کے تحفظ اور فروغ کیلئے جامع دفعات رکھی گئی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے آئین کے آرٹیکل 25 سے 30 تک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ آئین سیکولر تھا۔ اس میں دی گئی ضمانتوں کے باوجود ہمیں فرقہ واریت اور ذات پات کی تفریق کے بڑے بڑے مسائل درپیش ہیں۔ اکثریت اور اقلیت کے درمیان کشمکش سنگین ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری کثیرالوجود ثقافت کو ہر لمحہ خطرہ لاحق ہے۔ یہ ثقافت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا نظام تعلیم ناقدانہ اور عقلی غور و فکر کے بجائے تعصبات کو فروغ دے رہا

ہے۔ ہم نے اس نظام کے ذریعے اقدار کے فروغ کیلئے کچھ نہیں کیا۔ اعلیٰ اقدار سے لیس تنقیدی نظر سے سوچ بچار کرنے والوں کی جگہ ہم نے کثیر تعداد میں پڑھے لکھے متعصب پیدا کر دیئے ہیں اور آج صورت یہ ہے کہ ان پڑھ لوگوں کے مقابلے میں پڑھے لکھے لوگ ذات پات اور مذہب کی بنا پر زیادہ متعصب ہو گئے ہیں۔

ہم اپنے معاشی مسائل حل کرنے میں بھی ناکام ہو گئے ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں میں بیروزگاری روز افزوں ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہی لوگ فرقہ واریت اور مذہبی منافرت پھیلانے کا بہت بڑا وسیلہ بن گئے ہیں۔ سیاستدان ان معاملات کو سلجھانے کے بجائے ووٹ کی خاطر فرقہ وارانہ جذبات (شناخت) کو ہوا دیتے ہیں۔ ہمارے مثالی کردار مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ وہ ذہنوں سے محو ہو گئے ہیں۔ انکے بعد جو قیادت ابھری ہے نہ اس میں کوئی معجزہ نمائی ہے نہ وہ عزت ووقار کی حامل ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے لوگ صرف اقتدار کے بھوکے ہیں۔ ان کے سامنے ملک اور عوام کی فلاح کا کوئی مقصد نہیں یہ ایک تلخ حقیقت ہے اور ہمیں اسی کا سامنا ہے۔ یہ رہنما اپنے اپنے مفاد کے وفادار ہیں۔ چنانچہ اقتدار کی دوڑ میں صرف ہمارے اختلافات اور تعصبات کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔

نہرو گاندھی اور آزاد کے بعد قومی سطح پر کوئی بھی سربلند قائد پیدا نہیں ہوا۔ ہماری آبادی بہت زیادہ ہے اس حساب سے ہمارے مسائل بھی بڑے کٹھن ہیں۔ ہم نے ذات اور عقیدہ سے بالاتر ہو کر مساوات اور عدل وانصاف کی خاطر نظریاتی طور پر سیکولرازم اور سوشلزم کو اختیار کیا تھا۔ سوشلزم کو ترک کر دیا اور سیکولرازم آہستہ آہستہ کمزور ہوتا گیا۔

بی جے پی (بھارتیہ جنتا پارٹی) نے نہ صرف شوشلزم کو مسترد کیا سیکولرازم کو بھی رد کر دیا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس نے اس تصور پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے اور اسے ہندوستانی ثقافت میں درآمد شدہ مغربی تصور قرار دے کر رد کر دیا۔ پھر نہرو طرز کے سیکولرازم کو بھی نام نہاد سیکولرازم قرار دیا۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ ہندو ووٹروں کو اپنی طرف راغب کر سکیں۔ ہمارے آئین کی تمام اقدار کو دریا برد کر دیا اور کانگرس پر الزام لگایا کہ اس نے اقلیتوں کو خوش کرنے کیلئے مسلمانوں کو شرعی قوانین پر عمل کی اجازت دیدی ہے۔ آئین کے بنیادی اصولوں میں یک رنگ سول ضابطہ جو دراصل سیکولر اور انسانی نوعیت اعلیٰ قدم تھا اسے ہندوتوا کا ایجنڈا بنا دیا کیسی ستم ظریفی ہے اس طرح یک رنگ سول ضابطہ وضع کرنے کا مقصد فوت ہو گیا۔

MashalBooks.org

کانگریس کی بعد کی نسل کی قیادت بھی برائے نام سیکولر رہ گئی۔ سیکولرازم ان کیلئے اب مقصد بالذات نہیں رہا صرف اقلیتوں کے ووٹ حاصل کرنے کیلئے جھوٹے وعدے کرنے کے کام آیا۔ اندرا گاندھی نے شروع میں انہی سیکولر اور سوشلسٹ پالیسیوں کے باعث معاشرے کے کمزور طبقوں میں عزت اور مقبولیت حاصل کی مگر اقتدار چھوٹا تو انہوں نے بھی موقع پرستی شروع کر دی۔ آٹھویں دہائی کے شروع میں تو انہوں نے کمال مہارت سے بالائی طبقے اور ذات کے ہندوؤں کو خوش کرنے کیلئے ہندوتوا کی حامی ان طاقتوں کی حمایت شروع کر دی جن کی نمائندگی وشوا ہندو پریشد کرتی ہے۔

اس طرح بلاشبہ ملک میں سیکولر طاقتوں کو نقصان پہنچا۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد راجیو گاندھی آئے انہوں نے بھی خوب موقع پرستی دکھائی، ان منصوبوں کے باعث سکھوں پر تباہی آئی اور مسز اندرا گاندھی کے قتل کے جواب میں 1986ء میں سینکڑوں سکھوں کا قتل عام کیا گیا۔

مسلم قیادت نے بھی کوئی کم موقع پرستی نہیں دکھائی۔ جب سپریم کورٹ نے شاہ بانو نامی ایک مسلم مطلقہ عورت کے نان نفقہ کے حق میں فیصلہ دیا تو مسلمانوں کی طرف سے اس فیصلے کو نہ صرف غیر اسلامی قرار دے کر اس کیخلاف وسیع پیمانے پر احتجاجی تحریک چلائی گئی بلکہ اسے اسلامی شریعت پر حملہ بھی قرار دیا گیا۔ اس تحریک کی وجہ سے بھی ملک میں سیکولر اقدار کو بڑا نقصان پہنچا۔

بی جے پی کو ہندو ووٹ نہ ملنے پر انتہائی مایوسی ہوئی۔ 1984ء کے انتخاب میں اسے صرف دو نشستیں مل تھیں۔ تو اس نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ مذہبی تنازعات کھڑے کر کے اکثریت کی حمایت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس نے سیکولرازم کو بھی رگیدا۔ اس نے مسلم قیادت کی طرف سے سپریم کورٹ کے فیصلے کیخلاف پیدا کی گئی نفرت سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بدقسمتی سے مسلم قیادت کے دباؤ میں راجیو گاندھی بھی آ گئے اور انہوں نے مطلقہ مسلم خواتین کے نان نفقہ کے لئے قانون (مسلم ویمنز ایکٹ) بنا دیا۔ یہ انتہائی نامناسب اقدام تھا جس سے ہندوستانی سیکولرازم کو دھچکا لگا۔ چنانچہ درمیانے درجے کے ہندوؤں نے بی جے پی کو ہندو مفادات کا علمبردار سمجھ کر اس سے وابستہ ہونا شروع کر دیا۔

یوں آٹھویں دہائی میں ہماری سیاست سخت فرقہ واریت کا شکار ہو گئی۔ کانگریسی قیادت کمزور ہو گئی اور بی جے پی کے حملوں کی تاب نہ لا سکی۔ اس کے ساتھ بی جے پی نے ایودھیا

میں رام مندر کا مسئلہ اٹھا کر اپنے لئے کافی گنجائش پیدا کر لی۔ درمیانے طبقے کے ہندو تاریخ کی نصابی کتابوں کے حوالے سے پہلے ہی مسلمانوں کیخلاف تعصبات کا شکار ہو چکے تھے۔ ان کتابوں میں تاریخ اور سیاسی سیاق و سباق سے ہٹ کر اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مسلمان حکمرانوں نے ہندو مندروں کو تباہ کیا تھا۔

بی جے پی نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے مسئلے کو ہوا دے کر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا درمیانے طبقے کے ہندوؤں نے زوردار طریقے سے اس مسئلے پر بی جے پی کا ساتھ دیا اور یوں بی جے پی ہندو مفادات کی علمبردار بن کر ابھری۔ انہوں نے اس افسانے کو بلا چوں و چراں مان لیا کہ بابر نے ایودھیا میں واقعی رام مندر گرا کر اس پر مسجد تعمیر کر دی تھی۔ اس طرح ملک میں سیکولرازم کا حلقہ اثر بہت ہی محدود کر دیا گیا۔ اور فرقہ پرست طاقتوں کو کھلی چھٹی دے دی۔ اسی طریق کار کی بنا پر اقلیتوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا اور فرقہ وارانہ فسادات سارے ملک میں پھیل گئے۔ اسی کی دہائی میں آسام سے کنیا کماری تک پورے ہندوستان میں بے شمار فسادات ہوئے۔

پنڈت نہرو کے بعد کی نسل نے سنجیدگی کے ساتھ سیکولر قوم پرستی کے فروغ پر توجہ نہیں دی۔ اس کے برعکس مختلف برسر اقتدار آنے والے گروہوں اور دھڑوں نے موقع پرستی کی پالیسیوں سے سیکولرازم کو مزید دبا کر رکھ دیا۔ نہرو کے بعد جنون یہ رہ گیا تھا کہ ذات پات اور فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دے کر کسی نہ کسی طرح اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔ متعصبانہ جذبے کے تحت ذات پات اور فرقہ واریت کو فروغ دیا گیا۔ اگر ایک پارٹی کسی ایک ذات یا عقیدے کے لوگوں کے مفادات کی علمبردار بنی تو دوسری پارٹی دوسری ذات اور فرقے کا مسئلہ لے کر کھڑی ہو گئی۔

کانگریس نے اتنے طویل عرصے میں مسلمانوں کے مفاد کیلئے کوئی ٹھوس کام نہیں کیا تھا۔ لیکن بی جے پی نے اس پر الزام لگایا کہ وہ مثبت سیکولرازم کی روح کو مجروح کر کے مسلمانوں کی چاپلوسی کرتی رہی ہے۔ بی جے پی خود اس مثبت سیکولرازم کی دعویدار بن گئی۔ یہ الزام تراشی محض اس لئے کی جا رہی تھی تا کہ ہندوؤں میں کانگریس اور مسلمانوں کے خلاف جذبات کو ابھارا جائے۔ بی جے پی نے جنتا پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ بھی مہاتما گاندھی کی سمادھی پر غیر فرقہ وارانہ معاشرے کے قیام کی قسم اٹھائی تھی مگر ہندو ووٹ حاصل کرنے کیلئے اس نے اس

قسم کی دھجیاں اڑا دیں۔

سیکولرازم کے قیام اور فروغ کی قسم اٹھانے کے بعد بی جے پی نے زیادہ زور شور سے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اس نے ہندویت کے فروغ پر زیادہ زور دیا اور وشوا ہندو پریشد کو اپنے خاندان میں شامل کر لیا۔ پریشد ہندویت کیلئے زیادہ زور شور اور مذہبی جذبے کے ساتھ سرگرم ہو گئی۔ اس کی پہلی تحریک تامل ناڈو کے ضلع مینا کشی پرانم میں کچھ دلت لوگوں کے قبول اسلام سے شروع ہوئی۔ ان دلت لوگوں نے اونچی جاتی کے ہندوؤں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اسلام قبول کیا تھا۔ یہ مکروہ مہم چلائی گئی کہ عرب ممالک تیل سے کمائی دولت ہندوؤں کو مسلمان بنانے کیلئے بھیج رہے ہیں۔

اندرا گاندھی کو مسلمان ووٹروں سے جو نقصان ہوا تھا اس کو پورا کرنے کیلئے انہوں نے بھی پریشد کی تحریک کو یوں استعمال کیا کہ ہندو ووٹروں کو رام کر سکیں۔ اس زمانے سے پریشد بھی سنگھ پریوار کی زبردست ساتھی بن گئی اور اب تک چلی آ رہی ہے۔ اس کی عسکریت اور شدت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ جب بی جے پی نے نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ بنایا تو ہندوتوا کے بارے میں اس کا رویہ کچھ نرم پڑ گیا مگر اس نے بڑی کامیابی سے پریشد کو اس مقصد کیلئے استعمال کیا۔ اس نے ایک اور متنازعہ نظریہ بھی اٹھا دیا کہ صرف ایک ہندو ہی سیکولر ہو سکتا ہے۔

نظریئے کی بنیاد اس بات پر تھی کہ عرب مذاہب ایک خدا، ایک رسول ایک کتاب پر مبنی ہیں اس لئے وہ اصلاً تنگ نظر فرقہ پرست ہیں اور دوسرے مذاہب کیخلاف۔ جبکہ ہندوازم میں کئی خدا، کئی اوتار اور کئی کتابیں ہیں یعنی یہ زیادہ کشادہ اور سیکولر ہے۔ نتیجہ یہ نکالا گیا کہ صرف ہندو ہی سچے سیکولر ہیں، مسلمان اور عیسائی کبھی سیکولر ہو ہی نہیں سکتے۔ جو بے خبر مگر پڑھے لکھے ہندوؤں میں یہ ان گھڑ دلیل مقبول ہوئی۔ اس بودی اور بے ڈھنگ منطق میں یہ حقیقت بھلا دی گئی کہ اول تو سیکولرازم مذہبی نہیں سیاسی فلسفہ ہے۔ اور ہندوستان میں بہت سے قدامت پسند علما نے بھی اس کو قبول کر لیا ہے۔ ان علما نے پرزور طریقے سے دوقومی نظریئے کی نفی کی اور ثابت قدمی سے متحدہ یا مخلوط سیکولر قوم پرستی کا ساتھ دیا اور کہا کہ تحریک پاکستان کی قیادت جناح صاحب جیسے مغربی تعلیم یافتہ مغربی رنگ میں رنگے آزاد خیال شخص نے کی۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ متوسط طبقے نے پاکستان کی لڑائی لڑی نہ کہ مسلم عوام اور قدامت پسند مسلمانوں نے۔

گویا سیکولرازم کوئی مذہبی نوعیت کا مسئلہ نہیں بلکہ اسے قبول کرنا یا رد کرنا سیاسی سوال ہے

MashalBooks.org

کہا جاتا ہے کہ ہندو مذہب بڑا کشادہ اور آزاد ہے لیکن اسی مذہب نے تنگ نظری اور عسکریت سے لیس ہندتوا وادی پیدا کئے ہیں۔ جو سیکولرازم کو مکمل طور پر رد کرتے ہیں اور اپنی دانست میں اسے ایک مغربی نظریہ قرار دے کر بھارت کی ثقافت کے لئے عجوبہ گردانتے ہیں پھر یہی لوگ دوسری ہی سانس میں یہ دعوے کیوں کرتے ہیں کہ صرف ہندو ہی سیکولر ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کا اصرار سراسر غلط اور بے معنی ہے مگر بدقسمتی سے بہت سے لوگوں نے اس کو آنکھ بند کر کے قبول کرلیا ہے۔

گجرات میں جو فسادات ہوئے سنگھ پریوار کی فرقہ وارانہ عسکریت کا نتیجہ ہے۔ اسی نوعیت کے مسلسل جارحانہ پراپیگنڈے نے بہت سے ہندوؤں کے ذہنوں کو بھی مسموم کر دیا ہے اور مسلمان اور عیسائی اقلیتوں کے بارے میں شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ ان کے بارے میں خیال ہے کہ وہ موروثی طور پر لڑائی بھڑائی میں یقین رکھتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے وفادار ہیں۔ ان کی طرف سے اگر چھوٹا سا تشدد بھی ہو تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ساری برادری اس تشدد کی حامی ہے۔ چنانچہ 27 فروری 2002ء کو سابرمتی ایکسپریس کی بوگی پر گودھرا میں جو حملہ ہوا اس کو مسلمانوں کی عسکریت اور دہشت پسندی کا ثبوت سمجھ لیا گیا حالانکہ یہ تھوڑے سے گھانچی مسلمانوں کا فعل تھا جن کے چھابڑی فروشوں کو ایودھیا سے واپس آنے والے وشوا ہندو پریشد کے کارسیوکوں نے گودھرا کے ریلوے سٹیشن پر مارا پیٹا تھا۔

بعد میں اس وقت یہ سارا معاملہ مشکوک ہو گیا جب آتش زنی کے ماہرین نے رائے دی کہ بوگی کے اندر سے آتش زنی کی گئی باہر سے نہیں۔ اس میں ساٹھ لٹر پٹرول یا آگ پکڑنے والا کوئی سیال مادہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کارنامہ کس نے کیا؟ یہ معاملہ ابھی ایک پراسرار بھید ہے اور تحقیق طلب۔ تاہم اگلے روز 28 فروری کو سنگھ پریوار نے گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی شروع کردی، سنگھ کو سرکاری مشینری کی حمایت بھی ملتی رہی اور سیاسی طبقے کے ساز باز بھی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہزار کے قریب لوگ قتل کئے گئے یا جلا دیئے گئے۔ مگر بہت سی تحقیقاتی رپورٹوں کے مطابق دو ہزار افراد قتل کئے گئے اور ہزاروں عورتوں کی سرعام عصمت دری کی گئی۔

کنسرنڈ سٹیزنز ٹریبونل رپورٹ نے انسانیت کے خلاف جرم کے عنوان سے جو رپورٹ حال ہی میں چھاپی ہے اس کے ذریعے تصدیق کی گئی ہے کہ اس خون خرابے میں گجرات کی

سرکاری مشینری اور سیاسی لوگ ملوث تھے۔ اس رپورٹ کے ذریعے گجرات میں قتل و غارت گری کے دل دہلا دینے والے واقعات منظر عام پر لائے گئے ہیں۔ یوں ظاہر ہوا کہ سیاسی لوگوں نے ہندوستان میں قومی وحدت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو تباہ کیا ہے۔ ہمارا کثیر النوع قسم کا کلچر بالکل تباہ کر دیا گیا۔ اس طبقے پر ووٹ حاصل کرنے کا جنون طاری ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں معاشرہ قبل تاریخ سے کثیر النوع رہا ہے۔ یہاں انگریز کے آنے کے بعد انیسویں صدی سے پہلے کبھی مذہبی یا ذات پات کی بنیاد پر ایسی کشمکش نہیں دیکھی گئی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ کشمکش جدید عہد کی پیداوار ہے اور اس کا سرچشمہ جدید تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ہے جو نوکریوں اور سیاسی اقتدار کے حصول میں سرگرداں ہے۔

اسلامی عسکریت بھی جدید عہد کا ہی مظہر ہے اور یہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ متوسط طبقے کا مسئلہ ہے یہ طبقہ تھا۔ جس نے 1990ء میں (کشمیر میں) میں ہتھیار اٹھا لئے۔ یوں تعلیم تو بہت پھیلائی گئی مگر اسی نسبت سے روزگار فراہم نہ کیا گیا۔ چنانچہ ریاست مرکزی حکومت اور نظام کے خلاف غصہ نکالنے کیلئے تعلیم یافتہ بیرزگار نوجوانوں نے تشدد کی راہ اپنالی۔ ان کے نزدیک تشدد کے سوا اور کوئی متبادل نہیں رہا تھا۔ انہیں گمراہ کیا گیا کہ جمہوریت ناکام ہو گئی ہے صرف طاقت کے استعمال ہی سے کوئی حل نکلے گا۔

پنجاب میں خالصتان کی تحریک بھی پڑھے لکھے مگر بیروزگار جوانوں نے چلائی تھی انہیں امریکہ اور کینیڈا میں سکھوں کی تنظیموں (NIR) کی حمایت حاصل ہوئی۔ اس عسکریت کو نظریاتی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔ اس قسم کی مسلح تحریک کے نظریاتی محرکات بھی ہوتے ہیں مگر پنجاب اور کشمیر دونوں جگہ اس تشدد پسندی کے باعث بے گناہ لوگوں کا بہت نقصان ہوا۔ ہزاروں لوگ مسلح کارکنوں اور پولیس اور پیرا ملٹری فورس کے تصادم میں مارے گئے۔ برسوں کی مسلح کارگزاری کے باوجود منزل ایک انچ بھی انکے قریب نہیں آئی۔ جب مسلح کارکنوں نے کشمیر میں بندوق اٹھالی تو کشمیر آزادی، آزادی اور خودمختاری کے نعروں سے گونجنے لگا اور کشمیری لوگوں نے سمجھ لیا کہ آزادی بس گلی کی نکڑ پر آ گئی ہے۔ اب تک ساٹھ ہزار سے زائد جان گنوا بیٹھے ہیں مگر آزادی دور دور تک نظر نہیں آتی۔ آخرکار کشمیر کے لوگوں کو احساس ہوا کہ تشدد اور قتل و غارت آزادی نہیں موت اور تباہی لے کر آتے ہیں چنانچہ انہوں نے امن کو پکارنا شروع کر دیا۔

یہ اہم بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اگر مسلح جدوجہد ایک اعلیٰ مقصد (ظلم وستم، استحصال کے خلاف غیر ملکی حکومت سے آزادی یا خود مختاری کی جدوجہد ہی کیوں نہ ہو) کیلئے ہی ہو تو کچھ عرصہ بعد اس میں وحشت آ جاتی ہے اور بعض مسلح کارکن معصوم لوگوں کو بے دھڑک قتل کرنے لگتے ہیں۔ شروع میں بندوق پر نظریئے کا قابو ہوتا ہے مگر جلد ہی بندوق نظریئے پر غلبہ پانے لگتی ہے۔ ہاتھ میں بندوق ہو تو پھر نظریہ زیادہ دیر تک انسان کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ کشمیریوں نے عورتوں کی شرم و حیا، جائیداد اور جانوں کی بری قیمت ادا کرنے کے بعد اس حقیقت کا وقوف حاصل کیا۔ سینکڑوں عورتوں کی عصمت دری کی گئی ان میں سے بعض پر بارڈر سکیورٹی فورس اور فوج کے جوانوں نے گینگ ریپ کیا۔

پھر ان مسلح لوگوں پر کنٹرول بھی غیر ملکی عناصر کے پاس چلا گیا اور کشمیری جنگجو افراد کی حیثیت بھی کم تر بنا دی گئی۔ عام کشمیری نے تو امن کیلئے دعائیں مانگنا شروع کر دی۔ 1977ء کے انتخابات کو چھوڑ کر کشمیر میں باقی جس قدر انتخابات ہوئے ان میں نیشنل کانفرنس کی خاطر دھاندلی کی گئی۔ چونکہ نیشنل کانفرنس کیلئے انتخابات میں ہمیشہ اتنی زیادہ دھاندلی ہوتی رہی اس لئے لوگوں نے (الیکشن کے بجائے) مسلح جدوجہد کی حمایت شروع کر دی۔ تاہم جب انہیں باور کرایا گیا کہ انتخابات دیانتدارانہ ہوں گے تو انہوں نے عسکریت پسندوں کی دھمکیوں کے باوجود 2002ء کے انتخابات میں مفتی محمد سعید اور کانگریس کے اتحاد کو ووٹ دیا۔ مفتی سعید نے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے درد کا درمان کریں گے۔ چنانچہ لوگوں نے برسر اقتدار آنے والے اس اتحاد سے بہت توقعات وابستہ کر لیں جنہیں ادا کرنا آسان نہیں تاہم امید تو ہے۔ دراصل کشمیری لوگوں کی نظر میں یہی بہت بڑی بات ہے کہ نیشنل کانفرنس کو شکست تو ہوئی۔

بہر طور دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ اتحاد اپنے وعدہ پر قائم رہتے ہوئے لوگوں کی بھلائی کا کام کر سکے گا؟ یہ سوال بڑا پیچیدہ ہے اور اسکا جواب بھی کوئی آسان نہیں مرکز میں برسر اقتدار این ڈی اے شاید کشمیر کی حکومت سے زیادہ تعاون نہ کرے مگر مرکز کے تعاون کے بغیر مسئلہ حل بھی نہیں ہو سکتا۔۔

انتخابات کے بعد دہشت پسندوں کے حملوں میں زیادہ شدت آ گئی ہے تاکہ یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ بنا دیا جائے کہ ہندوستانی سیاسی ڈھانچے کے اندر اسے حل ہی نہ کیا جا سکے۔ ان دہشت گردوں کو پاکستان کی بڑی حمایت حاصل ہے اور پاکستان کشمیر پر اپنے دعوے سے دستبردار

MashalBooks.org

نہیں ہونا چاہئے گا۔اس صورتحال میں کسی فوری حل کی امید نہیں لگائی جاسکتی ایک سہ فریقی کوشش سے کچھ نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے مگر ہندوستان اس کیلئے تیار نہیں اس لئے کشمیر میں یہ تشدد آسانی سے ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔

آج ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مذہب ایک بہت ہی متنازعہ مسئلہ بن گیا ہے۔ چنانچہ ضروری ہوگیا ہے کہ مختلف نوعیت کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کیلئے بین المذہبی مکالمہ جاری ہو۔ مذہب کے بارے میں ایک کھلا رویہ اختیار کرنے کی بڑی ضرورت ہے مگر کہنا آسان ہے کرنا مشکل۔ بڑی طاقتور مذہبی تنظیمیں اور ادارے ہیں جن پر مخصوص مفادات والوں کا کنٹرول ہے اور انہیں فروغ تو صرف اس طرح ملتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے بارے میں مخاصمانہ رویہ اختیار کیا جائے یا قدامت پسندی کو اتنا مضبوط کیا جائے کہ پیروکاروں کو پوری گرفت میں رکھ سکے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں مذہب کا اثر کم ہو رہا تھا مگر پھر یہ دوبارہ سامنے آ گیا ہے اور بڑے زوردار طریقے سے آیا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہبی اقلیتوں یا برادریوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہوتی ہے۔ چنانچہ راستہ یہی رہ جاتا ہے کہ یہ مذہبی گروہ بین الاقوامی سطح پر اپنا مسئلہ اٹھائے۔ ایران میں شاہ ایران نے مخصوص امریکی مفادات کے تحت ظلم وستم کا بازار گرم کررکھا تھا چنانچہ ایرانی لوگ شاہ کا تختہ الٹنے اور امریکی بالادستی ختم کرنے کیلئے آیت اللہ خمینی کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح وہاں انقلاب آیا مگر اس سے اسلامی شیعہ قدامت پسندی کو تقویت ملی۔ پھر کچھ سالوں بعد آزادروی کی خاطر اصلاحات کی لہر اٹھی اور نسبتاً فراخ نظر والے عالم خاتمی ایران کے صدر منتخب کر لئے گئے لیکن ابھی کٹڑ پن کو کمزور کرنے اور آزاد اصلاحات کیلئے ایران کو لمبا سفر کرنا ہے۔

11 ستمبر کو نیویارک کے ٹریڈ سنٹروں پر حملہ کو اسلامی دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے مگر اس کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ مشرق وسطیٰ میں امریکی کارروائیوں کیخلاف متشدد ردعمل تھا۔ اس سے پہلے امریکہ شاہ ایران اور اسرائیل کے ذریعے مشرق وسطیٰ کی سیاست پر کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب وہی کام سعودی عرب اور کویت کے حکمرانوں کے ذریعے کررہا ہے اور اگر دہشت پسندی میں سعودی عربوں کی اکثریت ہے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ سعودی حکمران مکمل طور پر امریکی مفادات کے تابع ہیں تا کہ برسرِ اقتدار بھی رہیں اور اپنے عوام کو دبائے بھی رکھیں۔ اس ملک میں کوئی جمہوری آزادی نہیں اس لئے

جمہوری احتجاج کا بھی کوئی راستہ نہیں سعودی نوجوان اس صورتحال کا ذمہ دار امریکہ کو قرار دیتے ہیں۔

اسرائیلیوں نے اگر فلسطینیوں کے حقوق کو پامال کر رکھا ہے تو اسکا ذمہ دار بھی امریکہ ہے جو اسرائیل کی مکمل اور غیر مشروط حمایت کرتا ہے جب تک امریکہ اپنے مفادات کیلئے اسرائیل کی حمایت کرتا رہے گا اس وقت تک اس قسم کے تشددانہ حملوں کا خطرہ کم نہیں ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مذہب تشدد کا ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ صورتحال امریکہ کی پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ تشدد کو محض بڑے بڑے تشدد مخالف اتحاد بنانے سے نہیں روکا جا سکتا صرف منصفانہ پالیسیاں اختیار کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔ یہ پہلو بھی دلچسپ ہے کہ جو دہشت گرد متذکرہ حملوں میں ملوث تھے وہ مدرسوں کے تعلیم یافتہ نہیں تھے جدید ٹیکنالوجی کے علم سے آراستہ تھے۔ یہ تصویر اپنی وضاحت آپ ہے۔ اس بات کا ان کو بھی خیال رکھنا چاہیئے جو اسلام پر دہشت پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔

اس کتاب میں شامل یہ مضامین وقتاً فوقتاً سیکولرازم، فرقہ واریت، اقلیتی حقوق، کشمیر میں عسکریت، دہشت گردی اور اسی قسم کے موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ مصنف کی نظر میں یہی حقیقت ہے کہ اصل کشمکش (ٹکراؤ سے نسبتاً کم شدید) مذاہب میں نہیں ہے بلکہ مختلف قسم کے مفادات خصوصاً سیاسی اور معاشی مفادات میں ہے۔ مذہب اور مذہبی حوالوں میں بڑی جذباتی اپیل ہوتی ہے لوگوں کو بڑی جلدی بھڑکایا اور آمادہ کار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مخصوص مفادات والے لوگ یہ مذہبی راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس سے طاقت کے استعمال کا جواز بھی نکل آتا ہے اور انہی وجوہ کی بنا پر مذہب کو اتنی اہمیت حاصل ہے۔

مسئلہ کا واحد حل دنیا میں ایسے منصفانہ نظام کا قیام ہے جس میں نہ کوئی مذہب دوسرے مذہب کے نہ کوئی قوم دوسری قوم کا نہ کوئی طبقہ یا ذات کسی دوسرے طبقے یا ذات کا استحصال کر سکے۔ آج ہمہ گیریت اس دنیا پر محیط ہے جس میں وسیع بربادی کے ہتھیار بنالئے گئے ہیں اور یہ ہتھیار بھی مغرب خصوصاً امریکہ نے ہی بنائے ہیں چنانچہ دہشت گردی بھی ہمہ گیر ہوگئی ہے اس طرح امریکہ کو وہی کچھ کاٹنا پڑ رہا ہے جو وہ بو رہا ہے۔ تاہم ہمارا ایمان ہے کہ انتہائی ناانصافیوں کا جواب تشدد نہیں ہے غیر تشددانہ جمہوری طریقے ہی واحد مؤثر جواب ہیں۔ یہ مضامین امن اور عدم تشدد کا پیغام عام کرنے کیلئے لکھے گئے ہیں۔

MashalBooks.org

ترقی پذیر ممالک میں جمہوریت اور اس کے مسائل

آج جو کچھ ہمارے ملک میں ہو رہا ہے اس کی وجہ سے جمہوری طریق حکمرانی کے بارے میں بہت سے سوال اٹھائے جا رہے ہیں۔مخلوط یا اتحادی سیاست کی وجہ سے ملک میں سیاسی عدم استحکام پیدا ہو رہا ہے اور بے شمار چھوٹی بڑی پارٹیوں میں اتحاد محض اور محض اپنے مخصوص مفادات کے تحت ہو رہا ہے۔اسی وجہ سے اکثر لوگ محسوس کرتے ہیں کہ سیاستدان اصلاً بدکردار یا بے کردار ہو گئے ہیں اور محض اپنے مفادات کے پیش نظر وہ ملک یا ملک کے مفاد کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے تاہم ایک جمہوری معاشرے میں سیاستدانوں کی کچھ اپنی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں ہم جمہوریت اور اس کے مسائل کے بارے میں خصوصاً علاقائی اور اقلیتی حوالے سے کچھ روشنی ڈالنا چاہیں گے۔

بلاشبہ جمہوریت بہترین طرز حکومت ہے خصوصاً جدید زمانوں میں جہاں کہیں آمریت یا شہنشاہیت ہے وہاں کے لوگ جمہوری طرز حکومت کی تمنا لئے ہوئے ہیں۔مثالی بات تو یہ ہے جمہوری طرز حکومت میں اصل اقتدار عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور کوئی بھی حکومت عوام کی مرضی کے خلاف نہیں چل سکتی مگر یہ طرز حکومت بھی بڑے پیچدار مسائل پیدا کرتا ہے۔اور مقتدر طبقوں کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ تکڑم کر حالات کو اپنے حق میں کر لیں۔

جمہوریت کی کامیابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ لوگ بہت باخبر ہوں اور اس کی بنا پر ان کی اپنی رائے بنی ہو۔اور پھر مثالی صورت میں تو ملک نہ صرف سو فی صد خواندہ ہو بلکہ ملک کو درپیش تمام مسائل سے پوری طرح باخبر بھی ہو۔لیکن ہوتا ایسا نہیں صرف ہندوستان ہی نہیں امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں بھی لوگ اپنے مسائل سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اور مخصوص

مفادات والے ذرائع ابلاغ کو سازشی انداز سے استعمال کر کے اپنی مرضی کی رائے بنا لیتے ہیں چنانچہ میڈیا یا ذرائع ابلاغ بہت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں عموماً ذرائع ابلاغ پر طاقتور مفادات کا کنٹرول ہوتا ہے (چند ایک استثنائی صورتیں بھی ہیں) اس لئے جمہوری ملک میں عوام کی رائے کے بارے میں اس کا کردار کوئی زیادہ صحتمند نہیں ہوتا۔ علاقائی اخبارات تو شاہ بانو کیس ہو یا پھر جنم بھومی کا معاملہ یا فرقہ وارانہ فسادات سب علی الاعلان متعصبانہ رویہ رکھ کر صورتحال کو اور سنگین بنا دیتے ہیں بعض فسادات تو اس لئے ہوئے کہ ان اخبارات میں بالا راہ جھوٹی خبریں چھوڑ دی گئیں ایسا نہ ہوتا تو یہ فسادات بھی نہ ہوتے۔

آج جو کولیشن یا مخلوط حکومت مرکز میں برسر اقتدار ہے اسکے حوالے سے ہندوستان جیسے ملک میں جمہوریت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں نسلی، مذہبی، لسانی اور ثقافتی تنوع یا فرق بہت ہے۔ حیرت ناک حد تک اس نوع بنوع معاشرے کی نمائندگی کوئی ایک جماعت نہیں کر سکتی آزادی کے کچھ عرصہ بعد تک کانگرس نے مرکز میں بھی اور صوبوں میں بھی بیک وقت حکومت کی ادارہ اس نے کانگرس نے ایک تو آزادی کی جدوجہد میں بڑا نام پایا۔ یہ دیو قامت تنظیم بنی پھر اس کی قیادت مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم راہنما نے کی۔ آزادی کی جدوجہد میں مخصوص وجوہات کی بنا پر علاقائی جماعتیں بنی بھی کم اور ابھری بھی نہیں تھیں۔ ہم اس عرصہ پر ان وجوہات کا تجزیہ نہیں کریں گے تاہم کانگرس بھی اپنی اتنی بڑی حیثیت کا فائدہ محدود مدت تک ہی لے سکی۔

1967ء میں کانگرس کو یوپی کے انتخابات میں شکست ہوئی اور متعدد پارٹیوں کے اتحاد سمیو کتا ودھائک دل کہ حکومت بن گئی۔ دراصل ہندوستان میں مخلوط یا اتحادی حکومتوں کی تشکیل کا آغاز یہیں سے ہوا۔ دوسرے کانگرس کے خلاف عوام کی رائے کا یہ پہلا اظہار تھا جو وقت کیساتھ ساتھ مضبوط اور مؤثر ہوتا گیا۔ چھٹی دہائی کے آخر تک ہندوستان کی سیاسی سرزمین میں جمہوریت خاص جڑیں پکڑ چکی تھی اور علاقائی امنگیں اور مطالبے بھی جاندار ہو گئے تھے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب تامل ناڈو جیسے صوبوں میں بھی کانگرس کی حکومت تھی مگر اس زمانے میں (1967ء میں) اناڈرائے کی قیادت میں تامل پارٹی اقتدار میں آ گئی۔

اسی طرح آٹھویں دہائی کے شروع میں کانگرس ہائی کمان نے آندھرا پردیش کے وزیر اعظم کو ایک دم برطرف کر دیا تو آندھرا پردیش کی علاقائی انا سخت مجروح ہوئی۔ این ٹی راما

راؤ نے تلگو دیسم پارٹی بنائی۔ جس نے زوردار طریقے سے انتخاب لڑا۔ ساتویں دہائی کے آخر میں بنگلہ دیش سے آسام میں آنے والوں کے باعث مسئلہ پیدا ہوگیا۔ آسام سٹوڈنٹس یونین نے احتجاجی تحریک شروع کردی جو بڑی کامیاب ہوئی۔ یونین سیاسی پارٹی (اے بی پی) کی شکل اختیار کرگئی اور اس نے آخرکار اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

یو پی اور بہار میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوئیں تو ذات پات کی بنیاد پر سیاست شروع ہوگئی۔ ذاتیں اپنے حقوق کے بارے میں باخبر ہوئیں تو اپنے جمہوری حقوق مانگنے لگیں۔ ان کے رہنماؤں نے اقتدار اور روزگار میں زیادہ حصے کا مطالبہ شروع کردیا۔ کانشی رام ان دنوں دلت افراد کے ٹریننگ کیمپ لگایا کرتے تھے مگر اس کام سے مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی پارٹی کھڑی کرلی۔ آج اس پارٹی کا نام بہوجن سماج وادی پارٹی (بی ایس پی) ہے پس ماندہ ذات کے لوگوں نے بھی روزگار اور اقتدار میں زیادہ حصہ کا مطالبہ زیادہ زور سے شروع کیا۔ ان کیلئے وی پی سنگھ مسیح موعود بن گئے جنہوں نے اگست 1990ء میں منڈل کمیشن رپورٹ پر عملدرآمد شروع کردیا جس کے بعد یو پی میں سماج وادی پارٹی بنی اور بہار میں راشٹریہ جنتا دل جو نمائندگی کرتی تھی ایک طرف ہندوؤں کی پسماندہ ذاتوں مثلاً یادیو وغیرہ کی اور دوسری طرف اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کی۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ہندوستانی معاشرے میں جو حیران کن تنوع ہے اس حساب سے پارٹیوں کی تعداد بھی حیران کن ہوگئی۔ ایک پختہ قسم کی جمہوریت میں صحیح سماجی صورتحال اس کے سیاسی ڈھانچے میں پوری طرح منعکس ہوتی ہے یہ مخلوط سیاست یا اتحادوں کی سیاست جیسا کہ وی پی سنگھ اور دوسرے لیڈروں نے کہا ہے کہ آ گئی اور رہے گی۔ ہندوستان جیسے ملک سے جہاں جمہوریت کو پچاس برس ہوگئے ہیں۔ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ یہاں امریکہ یا برطانیہ کی طرح صرف دو پارٹیاں ہوں گی۔

مگر ہماری بدنصیبیوں میں ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ علاقائی جماعتوں کے اندر بھی شخصی تصادم یا انا کے تصادم کے باعث ان ے کئی ٹکڑے ہوگئے ہیں۔ تامل پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی اور تامل ناڈو میں کانگرس بھی دو ٹکڑے ہوگئی۔ اسی طرح جنتا دل پسماندہ ہندوؤں کے مفادات کی نمائندگی کرتا تھا مگر ذات پات کی بنا پر کئی گروپوں میں بٹ گیا۔ یہ تقسیم در تقسیم ہماری سیاست کا اصل روگ ہے، تقسیم در تقسیم پارٹیوں کے باعث ان میں ہندوستانی معاشرتی

صورتحال کی جھلک نظر نہیں آتی اور یہ منقسم پارٹیاں صحیح معاشرتی صورتحال کی عکاسی کرنے کے بجائے ہماری سیاسی صحت کیلئے ضرر رساں ہیں اور اس پس منظر میں مرکز کے موجودہ بحران کو دیکھنا چاہئے۔

سیاسی جماعتوں کے ذریعے ان عوام کی امنگوں کو سامنے لایا جانا چاہئے جن کی وہ نمائندگی کرتی ہیں۔ یہی تو جمہوریت کے وجود کی اصل دلیل ہیں۔ مگر سیاسی پارٹیوں کے اندر تفرقہ لیڈروں کے اپنے اپنے مفادات کی بنا پر پڑتا ہے جسے روکا جانا چاہئے۔ اب سمتا پارٹی اور بی جے پی میں بھی ذاتی شکایات کی بنا پر دراڑ پڑنے والی ہے۔ اس قسم کی تقسیم سے ایک طرف ووٹر اور دوسری طرف ملک کے مفادات مجروح ہوتے ہیں۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ صحیح جمہوریت میں ایک طرف ووٹروں کا مفاد اور دوسری طرف ملکی استحکام میں ایک توازن قائم رکھا جاتا ہے۔ بی جے پی قسم کی پارٹی ہندوؤں کے مفادات کی بات کرتی ہے۔ جبکہ یہ نمائندگی اونچی ذات کے ہندوؤں کی کرتی ہے اور وہ بھی سارے ملک کے بالائی ہندو طبقے کی نہیں بلکہ ہندی والے علاقے کے ہندوؤں کی۔ اونچی ذات کے تمام ہندوؤں کی سیاسی نگاہ بی جے پی اور ایسی پارٹیوں کی سوچ سے بہت مختلف ہے۔ اس لئے تعجب کی بات نہیں کہ بی جے پی جنوب میں زیادہ راہ نہیں پاسکی۔ علاقائی عوامل ذات پات کے سوال پر غالب آ جاتے ہیں۔ تاہم جنوبی ہند میں بھی ذات پات کا مسئلہ خاصا گرم ہے اور اب وہاں خصوصاً تامل ناڈو میں ذات برادری کی بنیاد پر پارٹیاں وجود میں آ گئی ہیں چنانچہ اب وہاں علاقائی عوامل اور ذات پات کے عوامل میں میں تصادم ہے جس کی وجہ سے سیاسی پارٹیوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں اپنے بعض حصے مذہبی اقلیتوں سے وابستہ کر دیتی ہیں مگر اس عمل میں سب سے زیادہ نقصان مذہبی اقلیتوں کا ہی ہوتا ہے۔ کانگرس سیکولر جماعت ہے مگر اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی اقلیتوں مثلاً مسلمانوں اور عیسائیوں کے مفادات کی پاسداری کی ہے مگر کانگرسی قیادت نے ان اقلیتوں کیلئے کوئی سا بھی ٹھوس کام نہیں کیا۔ مثلاً آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی کبھی بھی وہ نمائندگی نہیں ہوئی جس کے وہ حق دار ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی 14 / 13 فیصد ہے۔ آخری مردم شماری کے مطابق 12.12 فیصد مگر کبھی لوک سبھا میں

مسلمانوں کی نمائندگی سات آٹھ فیصد سے آگے نہیں بڑھی بلکہ اکثر لوک سبھاؤں میں اسکی نمائندگی تین فیصد سے زیادہ نہیں ہوئی۔ دراصل جب کانگرس نے پارلیمینٹ میں 33 فیصد نمائندگی دینے سے انکار کیا (جبکہ مسلمانوں کی آبادی 27 فیصد تھی) تو مسٹر جناح نے آخرکار پاکستان کا مطالبہ کر دیا۔ تاہم آزادی کے بعد کے ہندوستان میں مسلمانوں کو افسوس ناک حصہ تک کم نمائندگی ملی۔ لگتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ سیاسی پارٹیاں خود ہی الیکشن میں اقلیتوں کے امیدوار زیادہ تعداد میں نامزد کریں۔

اگر شیڈول کاسٹ اور شیڈول قبائل کو آئینی تحفظ نہ ہوتا تو ان کی نمائندگی اور بھی افسوس ناک حد تک کم ہوتی۔ ہندوؤں کی پسماندہ اقوام یا ذاتوں کو بھی اسمبلیوں میں اس وقت زیادہ نمائندگی حاصل ہوئی جب ان کے مفادات کو لے کر نئی سیاسی جماعتیں اٹھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اونچی ذات یا بالائی طبقہ کے مفادات کی نگہبانی کرنے والی سیاسی پارٹیوں کے مقابلے میں معاشرے کے کمزور حصوں اور نچلی ذات کے لوگوں کی نمائندگی کرنے والی سیاسی پارٹیوں میں زیادہ اختلاف پیدا ہوا۔ مثلاً کانگرس اور بی جے پی میں اتنی تقسیم نہیں ہوئی جتنی جنتا دل میں ہوئی ہے جو دراصل معاشرے کے کمزور حصوں کے اتحاد کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔

اوپر کی ذاتوں اور اوپر کے طبقے کے مفادات بڑے نپے تلے، مستحکم اور کم جذباتی ہیں جبکہ نچلے طبقے مع مذہبی اقلیتوں کے بڑے جذباتی ہوتے ہیں اور ان کے مفادات بھی کم مستحکم اور کمزور ہوتے ہیں وہ اس قسم کا ہاتھ دکھا جاتے ہیں۔

ان باتوں سے ظاہر ہوا کہ ایک یا دو بڑی پارٹیوں کی حکومت کے بجائے ایک مخلوط حکومت یا اتحاد کی حکومت معاشرے کے مختلف حصوں اور طبقوں کے مفادات کی نمائندگی کرتی ہے اگر بڑی سیاسی جماعتیں حکومتیں بنائیں گی تو وہ ملک کے بالائی طبقے کی زیادہ نمائندگی کریں گی لیکن اگر لوگ مختلف طبقوں، علاقوں، زبانوں، ثقافتی اور مذہبی گروپوں سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر ایک مخلوط حکومت ہی ملک کی بہتر نمائندہ ہو سکے گی۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھی جانی چاہئے کہ ایک جماعت سے زیادہ فائدہ بالائی طبقہ کو ہوتا ہے اور نیچے کے طبقے گھاٹے میں رہتے ہیں۔ جبکہ مخلوط حکومت میں کانگرس اور بی جے پی جیسی بڑی پارٹیاں ان چھوٹی پارٹیوں کی دست نگر رہتی ہیں جو معاشرے کے کمزور لوگوں کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہیں۔ اگرچہ ایک اچھی حکومت کیلئے استحکام بہت ضروری ہے۔ استحکام اور معاشرے کے غریب طبقوں کے مفادات

میں ایک توازن قائم ہونا چاہئے اور یہ توازن یقیناً اس وقت قائم ہوسکتا ہے جب مخلوط حکومت موقع پرستی کے بجائے معاشرے کے مختلف حصوں کے مفادات اور خواہشات کو پورا کرنے کے ارادے پر کاربند ہو۔ ایسی حکومتیں مستحکم بھی ہوں گی اور مذہبی اقلیتوں سمیت معاشرے کے کمزور حصوں کیلئے انصاف کی ضمانت بھی فراہم کریں گی۔

(15 مئی۔1999ء)

فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تشدد۔1998ء

1998ء کا سال بڑے مذہبی فسادات سے تو پاک رہا مگر ایسا پاک بھی نہیں۔ بی جے پی نے نعرہ دیا تھا ''بھارت......فسادات سے آزاد'' یہ ابھی ایک خواب ہے اور بی جے پی کے حکومت کے قیام کے باوجود محض ایک خواب۔1998ء میں چند ایک مذہبی فسادات ہوئے۔ بی جے پی متعدد اتحادیوں مثلاً آر کے ہیگڑے اور جارج فرنینڈس نے دعویٰ کیا ہے کہ جب بی جے پی حکمران ہوتی ہے تو کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوتے تاہم حقیقت تو یہ ہے کہ جب بی جے پی اقتدار سے باہر ہوتی ہے تو ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے اسے فرقہ وارانہ تشدد کیلئے تحریک کرنے کی ضروری ہوتی ہے۔ مگر جب اقدار میں ہو تو پھر اسے ایسے اشتعال دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور پھر یہ اقلیتوں کو یہ باور کرانے کی کوشش بھی کرتی ہے کہ وہ اسکے عہد حکومت میں حفظ وامان میں ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے سچ یہ بھی نہیں ہے اور سچ یہ ہے کہ بی جے پی کے عہد اقتدار میں مرکز میں بھی اور ملک کے مختلف حصوں میں بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔

1998ء کا پہلا فساد یوپی میں ہوا جہاں بی جے پی ہی اقتدار میں تھی۔ یہ فسادات بلند شہر سے 40 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گنجان آباد قصبے دولت پور میں ہوئے۔ 4 جنوری 1998ء کو دو افرد ہلاک ہوئے۔ ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان۔ بلند شہر کے حکام کے مطابق دونوں گروپوں میں تصادم اس وقت شروع ہوا جب گاؤں کے مکھیا عبدالغفور نے ایک ہندو ست ویر کی طرف سے ایک کچی تنگ گلی بنانے پر اعتراض کیا۔ ستو یرا اور اسکے ساتھیوں نے تعمیر کا کام روکنے سے انکار کر دیا غفور کے بیٹوں نے ست ویر کے خاندان کے افراد پر حملہ کر دیا اس کے بعد دونوں طرف سے سنگ باری اور فائرنگ شروع ہوگئی جس میں دو آدمی زخمی ہوئے جو بعد میں زخموں کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہوگئے۔ چار شدید زخمی ہوئے۔

MashalBooks.org

دوسرا فساد یو پی کے شہر کان پور میں 10 جنوری کو ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو گروپ بھڑ گئے۔ پولیس نے کنٹرول کرنے کی کوشش کی تو ایک گروپ نے پولیس پر گولیاں چلا دیں۔ فائرنگ سے ایس پی اشوک کمار کا باڈی گارڈ ہلاک ہو گیا۔ فسادات کا آغاز امام مسجد سے ہوا جس کے پیروکاروں نے مطالبہ کیا کہ امام صاحب سے زیادتی کرنے والوں کو گرفتار کیا جائے۔ اس پر فساد شروع ہو گیا۔ کشیدگی بڑھ گئی۔ پولیس قابو پانے کیلئے پہنچی اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کسی سماج دشمن نے روشنی کی رو منقطع کر دی لوگوں نے سوچا کہ یہ پولیس کا کام ہے اور پھر پولیس پر حملہ کر دیا گیا۔ پولیس کو ہوائی فائر کرنا پڑا۔ پولیس کے مطابق فسادات لوک سبھا کی ایک نشست کے الیکشن کی وجہ سے ہوا۔ کان پور کے مسلمانوں نے الزام لگایا کہ بی جے پی اور ان کی دوسری تنظیمیں مسلمانوں کو ڈرا رہی ہیں۔ مسلمانوں نے یہ شکوہ بھی کیا کہ پولیس الٹا مسلمانوں کو پکڑ رہی ہے۔ مولانا کلب جواد نے بھی ان لوگوں پر تنقید کی جنہوں نے امام مسجد کو زدوکوب کیا تھا اور کہا کہ گیان سنگھ کی حکومت بھی فرقہ وارانہ ہے اور فرقہ واروں کی حمایت بھی کر رہی ہے۔

اس سے اگلا فساد اجمیر شہر میں ہوا جہاں صوفی بزرگ حضرت معین الدین چشتی مدفون ہیں۔ فروری 1998ء کے دوسرے ہفتے کی بات ہے۔ فساد حضرت چشتی کی درگاہ کے بالکل سامنے ہوا جس میں 25 افراد زخمی ہوئے۔ درگاہ کے بالکل باہر اکثریتی فرقے کی دکانیں ہیں۔ یہیں پر اقلیتی فرقے کے رہائشی مکان ہیں بعض شر پسندوں نے ان دکانوں اور مکانوں کو آگ لگا دی۔ فسادات کی وجوہ تو واضح نہ ہو سکیں لیکن لگتا ہے کہ کچھ دکانداروں اور گاہکوں کے درمیان تکرار سے جھگڑا شروع ہوا۔ صورتحال اس قدر خراب ہو گئی کہ چند دن کیلئے شہر کے اس نصف حصے میں کرفیو لگانا پڑا۔ فساد کے دوران ایس پی سمیت بیس سے زیادہ پولیس والے زخمی ہوئے۔ درگاہ کے خدام نے وزیر اعظم اندر کمار گجرال کو ایک یادداشت پیش کی جس میں کہا گیا کہ پولیس جوتوں سمیت درگاہ میں داخل ہوئی عبادت میں مصروف لوگوں پر لاٹھی چارج کیا اور ہوائی فائرنگ کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ فرقہ وارانہ جذبات کو باہر کے چند ہندو دکانداروں نے ہوا دی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پولیس نے ہجوم کو منتشر کرنے کیلئے جو فائرنگ کی اس میں 56 افراد زخمی ہوئے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ چشتی کی درگاہ والے اس شہر میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ صوفیوں کا تو مسلک ہی صلح کل کا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجمیر

جیسے شہر میں اس طرح سے فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلائی جاتی ہے کہ صوبے میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

14 فروری 1998ء کو کوئمبٹور میں بم دھماکے ہوئے جن میں 60 افراد مارے گئے۔ کہا گیا کہ دھماکے الامہ اور الجہاد نامی تنظیموں نے کئے جسے پاکستان کی آئی ایس آئی نے ایسا کرنے کیلئے اکسایا ہے۔ دھماکے کا اصل نشانہ مفروضہ طور پر ایل کے ایڈوانی تھے۔ جنہیں اسی روز کوئمبٹور میں ایک انتخابی جلسہ کو خطاب کرنا تھا لیکن ان کی فلائٹ کو دیر ہوگئی اور ٹائم بم اپنے وقت پر چل گئے۔ کہا گیا کہ نومبر 1997ء میں اس شہر میں ہندو مسلم فسادات میں بہت سے مسلمان مارے گئے تھے اور ان فسادات میں ہندوؤں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا چنانچہ اس کا انتقام لینے کیلئے اب دھماکے کئے گئے ہیں۔ بی جے پی نے ان دھماکوں سے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ ہمدردیاں سمیٹیں اور آنے والے لوک سبھا کے انتخاب میں بھی اسے فائدہ ہوا۔ پولیس نے الامہ کے صدر باشا اور جہاد کمیٹی کے صدر افضل خان سمیت پانچ سو افراد کو گرفتار کرلیا۔

دھماکوں کے بعد فرقہ وارانہ جنون بڑھ گیا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسٹ) کے پولٹ بیورو ممبر اماناتھ نے مطالبہ کیا کہ حکومت بی جے پی اور اے آئی اے ڈی ایم کے ان ہندوؤں کے خلاف سخت کارروائی کرے جو دھماکوں کے بعد فرقہ وارانہ نفرت پھیلاتے پھرتے ہیں۔ دھماکوں کے بعد جو لوٹ مار ہوئی وہ سماج دشمن عناصر نے نہیں کی۔ اگر چہ یہ بات ناقابل یقین ہے مگر یہ کام بھی بی جے پی اور اے آئی اے ڈی ایم کے حمایتوں کی کارستانی ہے۔ اماناتھ نے اخباری بیان میں مزید کہا ''اقلیت سے انتقام لینے کی خاطر بی جے پی اور اے آئی اے ڈی ایم کے منظم گروپوں نے وسیع پیانے پر دکانوں کو توڑا، لوٹا اور آگ لگادی پھر اپنی مخالف سیاسی جماعتوں ڈی ایم کے اور سی پی آئی ایم کے دفتر میں توڑ پھوڑ کی اور ان پارٹیوں کے علاوہ ٹی آئی سی کے حامیوں کے گھروں پر بھی حملے کئے۔

اسی زمانے میں 12 فروری 1998ء کو یوپی کے شہر فیروز آباد میں فساد ہوا۔ سرکاری اطلاعات کے مطابق امام باڑہ محلّہ میں فساد ہوا۔ 10 افراد زخمی ہوئے اور تھانہ کے دو علاقوں میں کرفیو لگا دیا گیا۔ دونوں فریق جب ایک دوسرے سے الجھے تو پھر سنگ باری بھی ہوئی اور فائرنگ بھی۔ ان میں بہت لوگ زخمی ہوئے۔ آغاز یوں ہوا کہ ایک چوڑی فروش اور اسکے گاہک میں جھگڑا ہوگیا دونوں کا تعلق الگ الگ مذہب سے تھا۔ پھر لوگ مشتعل ہوگئے اور

انہوں نے گھروں اور دکانوں کو آگ لگانا شروع کردی۔ فائرنگ سے زخمی ہونے والے تین افراد کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔

اس سے ذرا بڑا واقعہ 9 مئی 1998 ءکو مراد آباد یوپی میں ہوا۔ مراد آباد کو فرقہ وارانہ فساد کے حوالے سے بڑا احساس شہر شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں 1980ء میں بہت ہی بڑا ہندو مسلم فساد ہوا تھا جبکہ مسز اندرا گاندھی جنتا حکومت کی ناکامی کے بعد دوبارہ اقتدار میں آئی تھیں۔ دراصل آٹھویں دہائی میں مراد آباد کے فسادات پورے برس کے شدید مذہبی فسادات کا پیش خیمہ تھے۔ اس دہائی میں پورے ہندوستان میں وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔

1980ء میں مراد آباد کے بہت بڑے فساد کے بعد کچھ عرصہ خاصی خاموشی رہی اکادکا واقعات ضرر ہوئے لیکن 9 مئی 1998ء کو یہاں پھر المناک فساد ہوا گو 1980ء والے سے زیادہ بڑا نہ تھا۔ مبینہ طور پر بی جے پی کے حامیوں نے تعزیہ کے جلوس پر حملہ کیا۔ کشیدگی ایک دم اتنی بڑھ گئی کہ ضلعی انتظامیہ کو حالات قابو میں لانے کیلئے عام پولیس کے علاوہ آر اے ایف (ریپڈ ایکشن فورس) کو بھی بلانا پڑا اور شہر میں غیر معینہ مدت کیلئے کرفیو لگانا پڑا۔ فسادات میں تین افراد ہلاک ہوئے جس کی نعشیں شہر کے مختلف حصوں سے ملیں اور پچاس افراد زخمی ہوئے کہا جاتا ہے کہ فساد اس وقت شروع ہوا جب تعزیہ کے جلوس پر پتھر پھینکے گئے اور ایسڈ کی بوتل بھی دراصل فرقہ وارانہ کشیدگی اس قدر تھی کہ تعزیہ کا جلوس دسویں محرم کو نہیں نکالنے دیا گیا ور اس کی اجازت ایک روز بعد یعنی گیارہویں محرم 9 مئی کو دی گئی۔

پولیس کے مطابق شہر کے مختصر حصوں سے اسی افراد کو گرفتار کیا گیا۔ تعزیہ پر حملہ کے فوراً بعد متعدد دکانوں اور گھروں کو لوٹا گیا۔ بعض کو آگ لگادی گئی۔ کم از کم چھ رکشا جلا دیئے گئے اور بارہ دکانیں لوٹ لی گئیں۔ پولیس نے یہ بھی کہا کہ شرپسندوں نے دیسی پستولوں سے چھتوں پر سے پولیس پر گولیاں بھی چلائیں۔ امام بخاری سمیت بہت سے ایسے سیاسی لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا یا نظر بند کردیا گیا جو فسادہ زدہ مراد آباد میں آنا چاہتے تھے۔ سماج وادی پارٹی کے رہنما رام سرن داس نے الزام لگایا کہ حکام اصلی جانی نقصان کو چھپا رہے ہیں چار نہیں بہت سے لوگ مارے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کم از کم آٹھ افراد لاپتہ ہیں۔ پولیس نے انکا ذکر نہیں کیا۔ مختلف پارٹیوں کے نمائندوں کے ایک وفد نے وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی سے ملاقات میں کہا کہ چار نہیں بہت لوگ مارے گئے ہیں اور اقلیت کی دکانوں اور مکانوں

کو نذر آتش کیا گیا اور لوٹا گیا ہے۔ اس وفد نے متاثرین کی مدد کیلئے ایک پیکیج کا بھی مطالبہ کیا اور کہا کہ یہ 1984ء والے پیکیج جیسا ہونا چاہئے۔ سماج وادی پارٹی کے رہنما اور سابق وزیر دفاع ملایم سنگھ نے الزام لگایا کہ سنبھل اور مراد آباد کے انتخابی حلقوں میں اقلیتوں نے بھی بی جے پی کے مقابلے میں سماج وادی پارٹی امیدواروں کو کامیاب کرایا تھا اس شکست کا انتقام لینے کے لئے بی جے پی نے ڈرامہ رچایا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پولیس نے مرکز کے دباؤ کے تحت ساری کارروائی یکطرفہ طور پر کر کے اقلیتوں کو سزا دی ہے۔ اس ساری صورتحال سے ظاہر ہوا کہ مذہبی بنیادوں کے بجائے اس فرقہ وارانہ فساد کے محرکات اصلاً سیاسی تھے۔

حیدرآباد شہر بھی مذہبی اعتبار سے بڑا احساس شہر ہے۔ یہاں جون میں جنگی جنون طاری ہوا۔ جون 1998ء کو پرانے شہر میں اسوقت بھونچال آ گیا جب چار مینار کے قریب مسجد سے جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد مسلمانوں کا ہجوم باہر آیا اور دکانوں پر حملہ کر دیا۔ فساد اگلے دن بھی جاری رہا اور پھر تیرہ پولیس سٹیشنوں میں کرفیو لگا دیا گیا۔ فسادات میں چار اموات ہوئیں۔ سولہ افراد زخمی ہوئے۔ پولیس کی فائرنگ سے دو افراد ہلاک ہوئے اور سولہ زخمی ہوئے۔ ایک پولیس انسپکٹر کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا اور بلوائیوں نے ایک عورت کو چھری مار کر ہلاک کر دیا۔ کئی افراد چاقو چھری لگنے یا سنگ باری میں زخمی ہوئے۔ صورتحال اتنی سنگین ہوگئی کہ فوج کو بھی تیار رہنے کا حکم دیدیا گیا اور مرکزی وزارت داخلہ سے کہا گیا کہ وہ پیرا ملٹری فورس بھیجے۔

حیدرآباد میں جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب مسلمانوں میں ایک ایسا پمفلٹ تقسیم کیا گیا جس میں ان کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا گیا تھا۔ یہ لوگ اس قدر جذباتی اور جنونی ہو گئے کہ انہوں نے علاقے میں دکانوں پر حملہ کر دیا۔ پولیس کو ایسی شدید صورتحال میں ہوا میں فائرنگ کرنا پڑی۔ شام تک صورتحال پرسکون ہوگئی مگر دوبارہ معاملہ اس وقت خراب ہوا جب اگلی صبح دس بجے فضل پورہ کی مسجد پر ایک ہجوم نے حملہ کر دیا اس کے جواب میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ایک مندر کو آگ لگا دی۔ اس ہجوم نے کم وبیش پندرہ مکان نذر آتش کئے اور فائر بریگیڈ کو آگ بجھانے کیلئے راستہ نہیں دیا۔ پھر ہجوم دوسرے علاقوں میں گیا۔ گھر جلائے، سکوٹر، کاریں، جیپیں، سائیکل اور دکانیں جلائیں۔ ان ہجوموں نے پولیس اور بے گناہ لوگوں کو نشانہ بنایا۔ ایک پولیس انسپکٹر قادر کو تین بجے کے قریب ہری باؤلی میں چھرا گھونپ دیا گیا۔ پولیس سب انسپکٹر کا سرکاری ریوالور چھین کر اسی سے اس کو گولی ماردی۔ پردھیوارا میں ایک پینتیس سالہ

عورت کو چاقو مار کر قتل کر دیا گیا اور مختلف واقعات میں تقریباً بیس افراد چاقو زنی سے زخمی ہوئے۔ پانچ سو افراد پر مشتمل ہجوم نے بھوانگر پولیس سٹیشن پر حملہ کر کے اسے بالکل تباہ کر دیا اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ایک ایسا پمفلٹ تقسیم کیا گیا تھا جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔

کسی کو خبر نہیں کہ پمفلٹ کس نے تقسیم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ ایک گاڑی میں آئے اور پمفلٹ ادھر ادھر پھینک کر چلے گئے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ کسی نے خاص مفادات کیلئے یہ فسادات کروائے تھے۔ اس پمفلٹ کے بارے میں بھی متعدد بیانات دیئے گئے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس طرح تیلگو دیشم کے وزیر اعلیٰ کو مسلمانوں کی حمایت سے محروم کرنا مقصود تھا جنہوں نے مرکز میں بی جے پی کے اتحاد کی حمایت کی تھی۔ دوسروں کا کہنا تھا کہ مجلس کی قیادت نے اپنی اہمیت بحال کرنے کی خاطر یہ اشتعال انگیزی کی پھر بعض کی نظر میں بی جے پی کی کارستانی تھی جس نے ہندوؤں کو اپنا مزید حامی بنائے اور اپنی بنیاد مضبوط کرنے کیلئے یہ پمفلٹ تقسیم کرایا۔ حقیقت جو کچھ بھی ہو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس اشتعال انگیز اور جذبات کو مجروح کرنیوالے پملفٹ کے پیچھے کون سے ہاتھ تھے۔ بعد میں حیدرآباد کے سابق میئر ایم بالی پوچیا پر پمفلٹ کی تقسیم کا الزام لگایا گیا اس نے خود کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا اسے گرفتار کر لیا گیا اس کے ساتھ مزید چار افراد ونود کمار، کے نرسیمہ، رپی راجن اور جے کرمولو اسی سلسلے میں گرفتار ہوئے۔

جولائی 1998ء میں صوبہ گجرات کے شہر باردولی اور سنجیلی اور دوسری طرف راجکوٹ میں فسادات ہوئے۔ ضلع باردولی میں چند مسلمان لڑکوں نے قبائلی لڑکیوں سے شادی کر لی تھی اس لئے وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل نے مسلمانوں کو ہراساں کرنا شروع کر دیا اور اس قدر کہ انہوں نے وہ دیہات بھی چھوڑ دیئے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ قبائلی ہندو نہیں ہیں مگر پریشد اور بجرنگ دل والوں نے ان کی حمایت حاصل کرنے کیلئے انہیں ہندو کہنا شروع کر دیا۔ وہاں کے مناظر کے عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ بی جے پی کا امیدوار قبائلی علاقے میں ہار گیا تھا اور اب پریشد اور بجرنگ کے سرگرم رکن اس علاقے میں الیکشن جیتنے کیلئے یہ کارروائی کر رہے تھے۔ انہوں نے ان قبائلی دیہات میں دھرم سبھا کا جلسہ کیا اور پھر جلسہ کے بعد مسلمانوں کی دکانوں اور مکانوں کو لوٹا اور نذر آتش کیا۔ جب کبھی پولیس نے

مداخلت کرنا چاہی تو وشوا ہندو پریشد نے کہا اس معاملے میں مت آ ؤ ورنہ راج بی جے پی کا ہے۔ تبادلہ کر دیا جائے گا۔ اور تو اور گجرات کی پولیس کے ڈائریکٹر جنرل نے بھی ان واقعات کا اعتراف کیا اور ان کی مذمت کی جس پر صوبے کے وزیراعلیٰ نے ان کی بھی کھچائی کر دی۔

وہاں مسلمان لڑکیوں کی ہندو لڑکوں سے بھی شادیاں ہوئی تھیں مگر اس معاملہ پر بجرنگ دل اور پریشد دونوں خاموش رہیں۔ کانگرس کے کارکنوں نے ایسی شادیوں کی فہرست مرتب کی مگر جب ایک مسلم لڑکے نے ایک قبائلی لڑکی سے شادی کی تو بھگوے بریگیڈ نے جذبات کو اس حد تک مشتعل کیا کہ صرف ایک تیلی پھینکنے سے سارا قصبہ مذہبی جنون میں ڈوب جاتا۔ ایک خبر کے مطابق بے عمل پولیس والوں نے پریوار کو بڑھاوا دیا اور جب ہندو تنظیموں نے اس قسم کی شادیوں کیخلاف جلوس نکالا تو جلوس میں ننگی تلواریں اور ترشول کی کھلی نمائش کی گئی اور خود ہندوؤں نے یہ بات تسلیم کی۔ وشوا ہندو پریشد ضلع باردولی کی صدر کے یونٹ کا لا بین پٹیل نے کہا ''کٹڑ مسلمانوں نے ہندو لڑکیوں کو پھانسنے کیلئے سازش کر رکھی ہے۔ آر ایس ایس کے جنرل سیکرٹری امبوئی بھڑ وج اور ہرشد شاہ نے کہا کہ یہ اسلام پھیلانے کی سازش ہے۔ مسلمان لڑکوں کو مدرسوں میں تربیت دی جاتی ہے کہ کس طرح ہندو لڑکیوں کا دل موہتے ہیں۔'' اس نے یہ دعویٰ بھی کیا ''اگرچہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے مگر اجمیر میں ایک ٹرسٹ ہے جو بیاہتا ہندو عورت کو مسلمان بنانے پر ایک لاکھ روپے اور غیر شادی شدہ لڑکی کو مسلمان بنانے پر پچاس ہزار روپیہ دیتا ہے۔'' یہ ہے بے خبری اور غلط پراپیگنڈے کی مہم جو فرقہ وارانہ تشدد کا سبب بنتی ہے۔

اسی زمانے میں صوبہ گجرات میں عیسائی بھی زیر عتاب آ گئے۔ ضلع راج کوٹ میں متعدد واقعات ہوئے۔ سنگھ پریوار والوں نے بائبل کے کوئی دو سو نسخے یہ کہہ کر جلا دیئے کہ یہ نسخے ہندو طلباء کو عیسائی بنانے کیلئے تقسیم کئے جا رہے تھے۔ ایک چرچ پر حملہ کیا گیا۔ قبر سے ایک عیسائی کی لاش نکال کر باہر پھینک دی گئی کہ قبرستان والی زمین ہندوؤں کی ملکیت ہے۔ جب وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی تو انہوں نے کہا کہ چھوڑیں یہ بہت ہی معمولی باتیں ہیں۔ تبصرے کی ضرورت نہیں۔

صوبہ گجرات کے ضلع ڈاہوڑ میں سنجیلی قصبے میں 18 اگست 1998ء کو جنم اشٹمی کے موقع

MashalBooks.org

پر پھر بڑا فساد ہوا۔ پولیس نے فسادیوں پر گولی چلائی۔ دو آدمی زخمی ہوئے۔ قصبے پر کرفیو لگا دیا۔ وزیر داخلہ ہرن پانڈیا نے کہا کہ تالاب میں مچھلیاں پکڑنے پر دو فریقوں کے درمیان جھگڑا ہوا یہ بہت معمولی واقعہ ہے۔ پچھلے مہینے تک اس تالاب میں مچھلیاں پکڑنے کا سرکاری طور پر تسلیم شدہ حق ایک مسلمان نوجوان الطاف کے پاس تھا مگر ٹھیکے کی مدت گزرنے پر اسکی تجدید نہیں کی گئی۔ وزیر نے یہ نہیں بتایا کہ ٹھیکے کی تجدید کیوں نہیں کی گئی۔ اور کہا اس سلسلے میں وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل کا دباؤ تھا۔ بعض قبائلی اس تالاب سے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ الطاف نے اعتراض کیا تو دونوں نے ایک دوسرے پر سنگ باری کی۔ جنم اشٹمی کے جلوس پر بھی پتھراؤ ہوا اور فساد شروع ہو گیا۔ پانڈے نے یہ بھی کہا کہ سنجیلی کے اس واقعہ کا قبائلیوں کی ایک شادی شدہ اور ایک کنواری لڑکی کے سنجیلی کے مسلمان لڑکوں کیساتھ اغوا ہونے والے ایک ماہ پہلے مدھیت کپور گاؤں کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر 12 ستمبر کو مہاراشٹرا کے قریب ناسک میں فساد ہوا جس میں ایک نوعمر لڑکا مارا گیا۔ خبروں کے مطابق ہفتہ کے روز تحصیل ستانہ میں بھگدڑ مچی اور ایک چودہ سالہ لڑکی اس میں ماری گئی۔ قصبے میں گنیش میلہ سے فرقہ وارانہ آگ سلگ رہی تھی بس ایک شعلے کی ضرورت تھی۔ ایک جیپ کو پارک کرنے کے معمولی واقعہ پر شدید فساد پھوٹ پڑا۔ ایک ہجوم نے مسلمانوں کی دکانیں اور ریڑھیاں جلا دیں۔ نازیہ مطیع اللہ خان فسادیوں سے بچنے کی کوشش میں تھی کہ ہجوم کی بھگدڑ میں دب کر مر گئی۔ مسلمان مسجد کے پاس جمع ہونے شروع ہو گئے اور بچی کی لاش کو اس وقت تک دفن کرنے سے انکار کر دیا جب تک فسادی گرفتار نہیں کئے جاتے۔ تاہم پولیس اور سیاستدانوں نے احتجاج کرنے والوں سے اپیل کی کہ وہ معاملہ کو اور سنگین نہ بنائیں اس اپیل کے بعد نازیہ کی لاش کو دفن کر دیا گیا۔ بابو شیخ منصوری کے کہنے کے مطابق بعض سماج دشمن عناصر اور فسادیوں کا تعلق سیاسی جماعتوں (شیو سینا اور بی جے پی) سے تھا۔ انہوں نے ایک اقلیت کو ہراساں کرنا شروع کیا پھر ان پر حملہ کیا۔ تحقیقات کرنے والوں کو بتایا گیا کہ 11 ستمبر کو میونسپلٹی کے صدر وجے وگھ کی قیادت میں ایک جلوس نکالا گیا۔ وجے کا تعلق شیو سینا سے ہے۔ جلوس والے مسلمانوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے پھر وہ ایک مسلمان محلے میں آن کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کے گھروں پر پتھر پھینکے ایک مسلمان کے ہوٹل کو لوٹا اور تباہ کیا گیا۔

اگرچہ لالو پرشاد یادو کے برسر اقتدار آنے کے بعد کئی سال تک بہار میں کوئی بڑا فرقہ

Mashalbooks.org

وارانہ فساد نہیں ہوا۔ مگر یہ بھی نہیں کہ کوئی واقعہ نہیں ہوا اور نہ ہی کشیدگی رہی ہو۔ اکتوبر میں دو شہروں نالندہ اور مونگیر میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔

2 اکتوبر کو ضلعی مقامات نالندہ اور مونگیر میں شدید قسم کی مذہبی کشیدگی پیدا ہوئی کیونکہ ہندو مسلم دو فساد ہوئے جن میں تین افراد ہلاک اور 39 زخمی ہوئے تھے۔ (یہاں 1981ء میں بڑا فساد ہوا تھا۔) بہار شریف کے تھانے کے ایک گاؤں کٹڑا میں بھی درگا دیوی کا جلوس نکالا گیا۔ جلوس میں مسلمانوں کیخلاف نعرے لگائے گئے اور مسلمانوں نے بھی مخالف نعرے لگائے۔ پھر فساد شروع ہو گیا۔ ایک شخص فائرنگ میں مارا گیا۔ ایک پولیس کانسٹیبل سمیت دو زخمی ہوئے۔ چشم دید گواہوں کے مطابق دونوں فریقوں نے گولیوں کے کئی راؤنڈ چلائے اور ایک دوسرے پر بم بھی پھینکے۔ صورتحال پر قابو پانے کیلئے ریپڈ ایکشن فورس کی ایک اور سی آر پی ایف کی دو کمپنیوں کو صورتحال پر قابو پانے کیلئے بلا لیا گیا۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ دونوں طرف کے سماج دشمنوں نے مارو اور بھاگ جاؤ طریقہ اختیار کیا جس کی وجہ سے قصبہ میں کئی روز تک کشیدگی جاری رہی۔ مختلف سیاسی جماعتوں نے اس واقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ بی جے پی کے لیڈر اور بہار میں حزب اختلاف کے رہنما سوشیل موڈی نے شہر کا دورہ کیا۔ وہ زخمی ہونے والے یادو لڑکے کے گھر افسوس کرنے گیا مگر ان مسلمان لڑکوں کے گھروں میں نہیں گیا جو فساد میں مارے گئے تھے۔ دوسری طرف رام ولاس پاسوان مسلمان لڑکوں کے گھر میں گیا اور یادو کے گھر نہیں گیا۔ اجے یادو مسلمان شرپسندوں کی گولی سے ہلاک ہوا تھا۔ جبکہ اس کے پندرہ منٹ بعد ہندوؤں نے ایک مسلمان چنو کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اسی روز شہر کے ایک اور محلے میں ہندو شرپسندوں نے ایک مسلمان اکرام کا سر اڑا دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمان اور یادو دونوں ہی لالو پرشاد کے حامی ہیں اور وہی آپس میں لڑ پڑے۔ مگر بتایا گیا ہے کہ بہار شریف کے یادو بڑے مضبوط ہیں اور ہمیشہ سے بی جے پی کے حامی۔ ایک سماج دشمن مسلمان پپو خان مسلمانوں کو اشتعال دلاتا تھا وہ آر جے ڈی (راشٹریا جنتا دل) کا مقامی صدر ہے۔ مونگیر میں درگا دیوی کا جلوس جب ایک مسلم محلے میں سے گزرنے لگا تو پولیس نے روک دیا فساد ہو گیا جس میں خشت باری سے 27 افراد زخمی ہوئے ان میں تین پولیس والے بھی تھے۔

ان فرقہ وارانہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اکثر چھوٹے چھوٹے تھے اور بس

اچانک ہوگئے۔اس سال بھی بابری مسجد کی تخریب کے بعد کئی سالوں کی طرح کوئی ایسا بڑا فساد نہیں ہوا جس میں بہت زیادہ لوگ مرے ہوں اور بہت سی جائیداد تباہ ہوئی ہو۔ان واقعات میں بھی مرنیوالوں کی تعداد چھ سات سے اوپر نہیں گئی تو ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابری مسجد کے گرائے جانے کے بعد فرقہ وارانہ نوعیت کے فسادات اور ان کی شدت کم ہوگئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فرقہ پرست جماعتیں اور گروپ مذہبی جذبات کو قائم رکھنا چاہتے ہیں مگر وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ تصادم کرانے میں انہیں کوئی زیادہ سیاسی فائدہ نظر نہیں آتا۔لیکن اس کے باوجود جن واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے بارے میں متفکر ہونے کی ضرورت ہے۔فرقہ وارانہ جذبات کو قائم رکھا جا رہا ہے اور جہاں بھی ان پارٹیوں کو احساس ہوا کہ بڑے فرقہ وارانہ فساد سے انہیں سیاسی فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ یہ فساد کروادیں گی۔یہ بھی سچ ہے کہ مرکز اور بعض صوبوں میں بی جے پی کی حکومت کے باعث وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے رکن اقلیتوں کو ہراساں کرنے کیلئے شیر ہوگئے ہیں۔اس عرصہ میں عیسائیوں پر گیروے کپڑے والوں نے بڑی منصوبہ بندی سے حملے کئے۔خاص طور پر گجرات میں جہاں بی جے پی کی حکومت ہے وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل کا رویہ ایسا ہے جیسے وہاں بے لگام ہندو راج آ گیا ہے۔یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد گجرات کے جو مسلمان کانگرس سے دور ہوگئے تھے وہ اس الیکشن میں کانگرس کے قریب آ گئے ہیں۔اگر گجرات میں ہونے والے فرقہ وارانہ واقعات جاری رہے تو مسلمان اور عیسائی زیادہ بڑی تعداد میں کانگرس کے قریب آئیں گے اور یوں کانگرس کو یوپی اور بہار میں بھی جہاں وہ نیم مردہ ہوگئی تھی ایک نئی زندگی مل جائے۔

(15 جنوری 1999ء)

فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تشدد 1999ء

فرقہ وارانہ تشدد کے حوالے سے 1999ء کا سال بھی 1998ء جیسا تھا۔بابری مسجد کے انہدام کے بعد اس سال بھی کوئی ایسا بڑا فساد نہیں ہوا جس میں بہت سا جانی اور مالی نقصان ہوا ہو۔دونوں برسوں میں بڑے فرقہ وارانہ دنگے نہیں ہوئے۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سال فسادات ہوئے ہی نہیں ہاں 1980ء کی دہائی میں بہار شریف میرٹھ یا بھاگل پور جیسے بڑے واقعے نہیں ہوئے۔تاہم وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل جیسی تنظیمیں مصروف کار رہیں

MashalBooks.org

اس لئے فسادات بھی ہوتے رہے۔1998ء کے آخر میں کرناٹک میں سورت کال میں فرقہ وارانہ فساد میں بارہ سے زیادہ افراد مارے گئے تھے۔صوبہ گجرات کے علاقہ ڈنگز میں عیسائی قبیلوں کیخلاف فساد ہوا اوران کے چرچوں پر حملے کیئے گئے بعض چرچ گرادیئے گئے۔ٹائمز آف انڈیا کے مطابق کرسمس سے لے کر اگلے پندرھواڑے میں ڈنگز اور گجرات کے دوسرے علاقوں میں مسیحی عبادت گاہوں پر حملے ہوئے۔اس کے باوجود سرکاری حکام یہی کہتے رہے کہ یہ بات غلط ہے کہ گرجوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔چھوٹے چھوٹے گھروں کو عبادت گاہیں بنایا گیا تھا بس ان پر حملہ ہوا ہے۔

سورت کال میں فساد جنوری 1999ء تک جاری رہے۔یہ شہر کرناٹک کے ضلع منگلور میں ہے اور بی جے پی کا گڑھ ہے 8 دسمبر 1998ء کو لڑکی کو چھیڑنے سے جھگڑا شروع ہوا لڑکا مسلمان اور لڑکی ہندو۔مسلمان لڑکے کو ہندوؤں نے مارا پیٹا ان میں سے تین پکڑے بھی گئے۔ ہندو جاگرن ویدک نامی تنظیم نے تھانے کا گھیراؤ کرلیا اور ملزموں کو چھوڑنے کا مطالبہ کیا۔ پھر دسمبر کے آخری ہفتے میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے جس میں مسلمانوں کا نقصان ہوا۔یہ فساد جنوری 1999ء تک جاری رہے۔کرناٹک کے وزیراعلیٰ جے ایچ پٹیل نے فسادات کی تحقیقات کا حکم دے دیا اور ہائی کورٹ جج کو اس کام پر متعین کیا مگر تحقیقاتی رپورٹ ابھی تک تیار نہیں کی گئی اور تحقیقات ابھی جاری ہے۔

صوبہ گجرات میں فسادات 1999ء میں بھی جاری رہے۔احمد آباد سے آنے والی خبروں کے مطابق ضلع ڈنگز کے گاؤں لمن چریا میں نامعلوم شرپسندوں نے چرچ پر حملہ کیا اور پھر اسے نذر آتش کرنے کی کوشش کی۔وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے بڑی دھوم دھام سے ضلع ڈنگز کا دورہ کیا تھا مگر ان کے دورے کے بعد مذہبی فساد کا یہ دوسرا واقعہ ہو گیا کہنے کی ضرورت نہیں ڈنگز کے حالات کی بنا پر واجپائی نے دورہ کرنا ضروری سمجھا۔مگر اس موقع پر انہوں نے اخبار والوں کے سامنے ایک متنازعہ بیان بھی دے دیا کہ تبدیلی مذہب کے مسئلے پر قومی مباحثہ ہونا چاہئے۔ اس قسم کے مباحثہ کی آئین میں دی گئی آزادی کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے یہ کہا ہے۔ آئین میں شامل بنیادی حقوق میں مذہب کیلئے تبلیغ اور تبدیلی مذہب کی مکمل آزادی ہے۔بعد میں واجپائی نے مؤقف بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ میرا مطلب تبدیلی مذہب پر قومی

مباحثہ یا مناظرہ نہیں بلکہ صرف مکالمہ تھا۔ظاہر ہے کہ یہ خیال آرائی بعد میں کی گئی۔

صوبہ گجرات مذہبی اعتبار سے ملک کے انتہائی حساس علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔1992ء اور1993ء میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد سورت میں خوفناک فسادات ہوئے تھے۔کہا جاتا ہے کہ جنوری1999ء میں اترائن ڈے کے موقع پر شہر میں بڑی کشیدگی تھی اور صورتحال کوکنٹرول کرنے کیلئے بڑی تعداد میں پولیس والوں کی ڈیوٹی لگائی گئی۔13 جنوری کوکیتھولک بشپ آف انڈیا نے گجرات میں مسیحیوں پرحملوں کے بارے میں سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے صدر مملکت وزیراعظم لوک سبھا کے سپیکر اور وزیرداخلہ کوایک یادداشت بھیجی تھی۔دوسری باتوں کے علاوہ یادداشت میں یہ بھی کہا گیا کہ ہم140 کیتھولک بشپ آف چرچز آف انڈیا ملک میں خصوصاً گجرات میں ایک منصوبے کے تحت عیسائیوں کے خلاف ہونے والے تشدد کے واقعات پرسخت پریشان ہیں۔

22، 23 جنوری کو اڑیسہ کے ضلع کونجھر کے گاؤں منوہرپور میں المناک واقعہ ہوا آسٹریلوی نژاد عیسائی مبلغ گراہم سٹینز کواس کے دو بچوں سمیت زندہ جلا دیا گیا۔اس بہیمانہ واردات میں پریشد کے سرگرم کارکن دارا سنگھ کا ہاتھ تھا۔اس واقعہ سے ساری قوم دہل گئی مگر پریشد اور بجرنگ دل نے کہا کہ انکا اس واردات س کوئی تعلق نہیں منوہر پور کی پنچایت میں بجرنگ دل کے بارے میں ساری اطلاعات ہیں۔اس طرح 1999ء ہندوتوا والوں نے عیسائیوں پر باقاعدہ منصوبے کے تحت حملے کیے۔ہندوتوا والے ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے اور اپنی بقا کیلئے فرقہ وارانہ تنازعات کوزندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ان کا پہلا نشانہ تو مسلمان تھےمگر بابری مسجد کے گرائے جانے کے بعد مسلمانوں کیخلاف جواشتعال پھیلایا جاتا رہا اسے ہندوؤں میں اب کم قبول کیا جاتا ہے۔چنانچہ وشوا ہندو پریشد، بجرنگ دل اور راشٹریہ سیوک سنگھ نے بڑے سلیقے کیساتھ ایک ایسا دوہرا ہدف منتخب کرلیا ہے جوجذباتی طور پر بڑا پرکشش ہے اس طرح انہوں نے عیسائی مشنریوں کونشانہ بنالیا۔

دہلی میں بھی بعض علاقے مذہبی لحاظ سے بڑے حساس ہیں ان میں ایک سیلم پور ہے بابری مسجد کے گرنے کے بعد یہاں پر بڑا خوفناک فساد ہوا تھا جس میں کئی جانیں ضائع ہوئی تھیں۔19 جنوری کواردو سکول اور ہندی سکول کے طالبعلموں میں کرکٹ گراؤنڈ میں گری لکڑی پر قبضہ کے باعث پھر جھگڑا شروع ہوا پہلے گرما گرمی ہوئی پھر مار پیٹ جس میں ایک

MashalBooks.org

شخص کو بہت مارا گیا۔ بس دونوں فرقوں کے آپس میں بھڑ جانے کیلئے یہی کافی تھا۔ لوگ گلیوں میں سے نکلے اور مخالفوں پر بوتلوں اور پتھروں کی بارش کر دی۔ جب پولیس آئی تو اسے فسادیوں کو منتشر کرنے کیلئے 21 بار فائر کرنا پڑا۔ فائرنگ کی وجہ سے صورتحال پر کچھ کنٹرول ہو گیا گو زیادہ موثر نہیں۔ بدقسمتی سے اس علاقے میں جھگڑے نچلی ذات کے ہندوؤں (والمیکیوں) اور مسلمانوں میں ہوتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض حساس علاقوں میں دونوں مذہبوں کے ماننے والوں میں تعلقات کتنے نازک ہیں۔ بعض اوقات بچوں کے درمیان تکرار مذہبی فساد میں بدل جاتی ہے اور پولیس کی مدد طلب کرنا پڑتی ہے۔

صوبہ گجرات کے ضلع سریندر کے گاؤں کوتھاری میں مسلح ہندوؤں نے ایک درگاہ پر حملہ کر دیا اور اسے ملیا میٹ کر دیا۔ دوسرا واقعہ موڈگڑھ میں ہوا۔ روزنامہ دی ہندو کے نامہ نگار کے مطابق ضلع ڈنگز میں مسیحوں پر حملوں کے مسئلے پر ابھی انتظامیہ قابو نہیں پانے پائی تھی کہ بجرنگ دل کے سرگرم کارکنوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ سنگھ پریوار نے کہا کہ بجرنگ دل کا مون گڑھ کے اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دن پہلے کولتی گاؤں دیارا میں اندرا کانگریس نے اقلیتوں سے اظہار اتحاد کیلئے ایک جلوس نکالا تھا۔ بہر طور یہ بات قابل تحسین ہے کہ انتظامیہ اور کوتھاری گاؤں کے ہندوؤں نے مل کر درگاہ کو دوبارہ تعمیر کر دیا جسے بجرنگ دل کے کارکنوں نے گرا دیا تھا۔

29 مارچ کو مہاویر جینتی اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر احمد آباد میں دو آدمی مارے گئے۔ جھگڑا قربانی کے جانور پر ہوا۔ رات کو ایک شخص کو چاقو مار کر قتل کر دیا گیا جو بجرنگ دل کے مطابق ان کا کارکن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس گاڑی کے ساتھ تھا جس میں قربانی کے لئے جانور لائے جا رہے تھے۔ یہ دوسرا نوجوان پالدی کے علاقہ میں مارا گیا۔ اندرون شہر میں ہندو علاقوں میں کشیدگی پھیل گئی۔

جیسا کہ بتایا گیا گجرات مذہبی فسادات کے اعتبار سے انتہائی حساس صوبہ ہے جولائی میں جب کارگل میں لڑائی ہو رہی تھی احمد باد میں پھر فساد پھوٹ پڑے۔ وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل فرقہ وارانہ بحران کو بڑھانے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتی ہیں۔ کرکٹ کے میچوں پر لازماً فرقہ وارانہ تباہی ہوتی ہے اور خاص طور پر جب میچ پاکستان اور بھارت کے درمیان ہو وہ خواہ

MashalBooks.org

ہندوستان میں یا ہندوستان سے باہر کھیلا جا رہا ہو۔ احمد آباد میں فساد اس وقت شروع ہوا جب ہندوستان اور آسٹریلیا کے ہاتھوں پاکستان کے شکست کھانے کی خوشی منائی جا رہی تھی۔ تقریب کا اہتمام ایک مسلمان علاقے میں کیا گیا تھا۔ جیسے یہ میچ وہاں مسلمانوں نے ہارا ہو۔ لوگوں نے بتایا کہ منتظمین نے بچوں کو پٹاخے دے کر کہا کہ مسلمانوں کے علاقوں میں جا کر اپنی جیت کی خوشی میں زوردار دھماکے کرو۔ لوگوں کو تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی کرکٹ ٹیم نے پاکستا کی کرکٹ ٹیم پر نہیں بلکہ مسلمانوں پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ کرکٹ میچ کی اس کشیدگی کے بعد کارگل کا معاملہ آ گیا۔ پاکستان کیخلاف متعدد احتجاجی مظاہرے ہوئے اور نواز شریف کے پتلے جلائے گئے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں میں بھارت سے وفاداری کا اظہار کرنے کیلئے مقابلہ پڑ گیا۔ مگر ہندوؤں نے جو نعرے لگائے وہ بڑے اشتعال انگیز تھے۔ مسلمانوں کیخلاف کارگل میں مارے جانے والے ایک جوان کی یاد میں گاندھی نگر میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں ایل کے ایڈوانی نے بھی تقریر کی اس جلسے میں مسلمانوں کے خلاف بڑی نعرہ بازی کی گئی۔

ایک اور واقعہ ہوا جس سے دونوں فریقوں میں مزید تلخی آئی۔ 14 جولائی کو بھگوان جگن ناتھ کی رتھ یاترا کا جلوس نکلا جب یہ جلوس مسلمانوں آبادیوں کے قریب پہنچا تو مسلمانوں کیخلاف نعرے لگائے گئے۔ مکھن چور، میاں چور، (مسلمان چور ہیں) اور مسلمانو! جاؤ پاکستان، جلوس کے ساتھ ساتھ پمفلٹ بھی تقسیم کئے گئے جن میں درج تھا کہ مسلمان ہندو لڑکیوں کو پھانس لیتے ہیں۔ تاہم خبروں کے مطابق مسلمانوں خصوصاً مسلمان عورتوں نے رتھ یاترا کے صحیح سلامت بغیر ہنگامے کے گزر جانے میں خاصہ بڑا کردار ادا کیا۔ مسلمان عورتوں نے فرقہ وارانہ امن و آشتی کیلئے دعا بھی مانگی بعض مسلمان 13 جولائی کو جگن ناتھ کے مندر بھی گئے اور مندر کی مرمت وغیرہ کیلئے اکاون ہزار روپے کا چیک بھی دیا۔ مگر اس کے باوجود 20۔ جولائی کو فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور اس کا آغاز یوں ہوا کہ ایک ذہنی توازن سے محروم لڑکے کو چھیڑا گیا۔ پھر جو فساد ہوا تو شہر کے بہت سے علاقوں میں پھیل گیا۔ گروہ کے گروہ سڑکوں پر آئے دکانیں لوٹیں، جائیدادیں نذر آتش کیں اور لوگوں کو چاقو چھریاں ماریں ان میں سے ایک شخص اسی روز مر گیا۔ دریا پور کالو پور اور سرس پور کے علاقے بہت متاثر ہوئے۔ جالم پور کے علاقے سے تقریباً تین سو مسلم گھرانوں کو جان بچانے کیلئے نقل مکانی کرنا پڑی۔ انہوں نے

MashalBooks.org

دوسرے محلوں میں پناہ ڈھونڈی۔

28 اپریل کو لکھنؤ میں شیعہ سنی فسادات ہوئے۔ان میں دوافراد مارے گئے۔ ہندوستان میں لکھنؤ واحد مثال ہے جہاں ایک عرصہ سے شیعہ سنی فسادات ہوتے چلے آئے ہیں۔شیعہ جلوس نکالنے پر اصرار کرتے ہیں اوراسی دوران پہلے تین خلفاء پر تبرا بھیجتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ دسویں محرم (27 اپریل) کو جو آدمی مارے گئے وہ سیاسی لوگ تھے اور سیاسی رقابت میں مارے گئے۔اسی روز ترنمول کانگرس نے بھی تعزیہ کا جلوس نکالا جس پر تعزیہ کا جلوس نکالنے والوں نے حملہ کردیا۔ترنمول کانگرس والوں نے جوابی حملہ کیا اس جنگ میں تیر کمان،تلواریں استعمال ہوئیں۔جو مارے گئے ان کے نام حبیب خان اور مرشد علی تھے۔

30 اپریل کو ضلع رائے بریلی میں قصبہ پہاڑ گنج میں فساد ہوا، جھگڑا ایک مذہبی جگہ (پلاٹ) پر تھا۔فساد میں ایک چھوٹی بچی سمیت دوافراد ہلاک اور 20 زخمی ہوئے۔خشت باری۔آتش زنی اور فائرنگ سے کچھ لوگ تعزیہ کے جلوس کے بھی زخمی ہوئے۔محرم کی طرح کچھ اور میلے مثلاً ہولی، گنیش چتورتھی وغیرہ بھی ایسے ہیں کہ ان پر اکثر فرقہ وارانہ فسادات ہوجاتے ہیں۔

اخبار قومی زبان کے مطابق 27 اپریل کو یوپی کے ضلع رام پور میں شاہ آباد کے مقام پر تعزیہ کے جلوس کے موقع پر فساد ہوگیا۔اکاون دکانوں کو لوٹ کر آگ لگادی گئی تین افراد شدید زخمی ہوئے۔ان میں سے ایک اسلم سنجے گاندھی میڈیکل کالج لکھنؤ میں جاکر جاں بحق ہوگیا۔ انڈین یونین مسلم لیگ کے صوبائی صدر سید شکیل میاں نے کہا کہ یہ ہندو مسلم فساد نہیں تھا شہر کے غنڈوں لٹیروں نے پولیس کی مدد سے لوٹ مار کی اوران غنڈوں کے حملہ آور ہونے کے بارے میں پولیس کو پیشگی خبر بھی تھی یہی وجہ تھی کہ جب یہ لوگ لوٹ مار کررہے تھے تو پولیس خاموشی سے بت بن کر سب کچھ دیکھتی رہی۔شکیل میاں نے کہا کہ انہیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے بتایا کہ اس وسیع لوٹ مار کے دوران ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دمساز بنے رہے اور ایک دوسرے کے نقصان پر ہمدردی بھی کی۔

31 مئی کے روزنامہ دی ہندو کے مطابق صوبہ تامل ناڈو کے تین شہروں چنائی، تیروچی اور کوئمبٹور میں پولیس کی عمارتوں کے قریب بم رکھے گئے چنائی کے علاقہ ریپبلکن کے طلباء کے ہاسٹل میں بم پھٹا۔ جہاں جہاں بم رکھے گئے وہاں وہاں سے مسلمانوں کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ بھی ملے۔بموں کا بروقت پتہ چل جانے کے باعث انہیں ناکارہ بنادیا گیا۔دی

MashalBooks.org

ہندو کے مطابق پمفلٹ الامہ کی طرف سے شائع کیا گیا تھا جس میں جیلوں میں قید بنیاد پرست مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک اور پولیس کے رویئے کی مذمت کی گئی تھی۔ تاہم وزیراعلیٰ کرونا ندھی نے پمفلٹ میں لگائے گئے الزامات کو غلط قرار دیا اور متنبہ کیا کہ انتہا پسندوں سے نمٹنے کی ضرورت پیش آئی تو نیشنل سکیورٹی ایکٹ بھی لاگو کیا جائیگا۔ بموں کے باعث تامل ناڈو میں حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے اور احتیاطی نظر بندی کے تحت 230 افراد کو نظر بند کر دیا گیا۔ ان میں تمیز گا مسلم منیترا کازگام (ٹی ایم ایم اے) کے رکن بھی شامل تھے۔ زیادہ سخت حفاظتی اقدامات کوئمبٹور میں کئے گئے جہاں ٹی ایم ایم کے ضلعی صدر سمیت 104 افراد کو نظر بند کیا گیا۔ یو این آئی (خبر رساں ایجنسی) کے مطابق جون کے تیسرے ہفتے میں مدورائی میں فرقہ وارانہ کشیدگی پھیل گئی اور پھر ایک مذہبی گروہ والوں نے دوسرے مذہب سے متعلق لوگوں پر حملہ کر دیا اور پندرہ گھر لوٹ لئے۔ 34 افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا ان میں سے 16 کو گرفتار کیا گیا۔ یہ 6 جون کو جلائی جانے والی دکانوں کے جواب میں کارروائی کی گئی تھی۔ بہت سے لوگ خوف کے باعث شہر چھوڑ گئے۔ پولیس نے حفاظت کیلئے چوکیاں بنائیں۔ 26 اپریل کو مہاراشٹر ضلع بلڈانہ کے گاؤں مکھن وارا میں بھی اسی قسم کا واقعہ ہوا۔ شوجینتی کا جلوس جب جامع مسجد کے سامنے پہنچا تو جلوس والوں نے جامع مسجد پر پٹاخے پھینکے تو فساد شروع ہو گیا مسلمانوں کی دکانیں، ہوٹل، پان کے کھوکھے جلا دیئے گئے انہیں پانچ لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ عید گاہ کے بعض حصوں کو بھی نقصان پہنچا۔

27 اپریل کو محرم کی دسویں تھی۔ مراد آباد کے گاؤں پھول پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوئے۔ دو افراد ہلاک ہوئے اور 21 شدید زخمی ہوئے۔ بہت سے لوگ خوف کے مارے گاؤں چھوڑ گئے اور قریبی جنگلوں میں جا کر پناہ لی۔ مسلمانوں کے بیس سے زیادہ گھروں کو گرا دیا گیا۔ پولیس نے اقلیت کے جان و مال کے تحفظ کیلئے کوئی خاص موثر اقدامات نہیں کئے۔ بعض مقامی مسلمان راہنماؤں نے الزام لگایا کہ جن لوگوں کا نام ایف آئی آر میں درج کرایا گیا تھا پولیس نے ان میں سے نصف کو بھی گرفتار نہیں کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ فسادیوں نے جس مسجد کو گرا دیا تھا پولیس نے اسکی دوبارہ تعمیر کیلئے بھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔

یکم جولائی کو مدھیہ پردیش میں ہردا کے مقام پر فسادیوں نے پولیس سے مقابلہ شروع کر دیا جس میں پولیس کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مارا گیا اور کئی پولیس والے زخمی ہوئے۔ قصبے پر کرفیو

لگادیا گیا جو چند دن جاری رہا۔نوے کے قریب افراد کو گرفتار کیا گیا۔صوبہ گجرات کے ضلع سبر کنتھا میں اردا کے شہر میں 15 جولائی کو رتھ یاترا کے جلوس کے موقع پر فساد ہوگیا۔تیس دکانیں اور 63 سائیکل رکشا جلا دیئے گئے۔فساد تب شروع ہوا جب جلوس ایک مذہبی عبادت کے قریب سے گزر رہا تھا کہ نعرے اور جوابی نعرے شروع ہو گئے۔بعد میں بہت سی دکانیں لوٹی گئیں کوئی سات لاکھ روپے کے سامان کو آگ لگا دی گئی۔اردا میں فائر بریگیڈ کی سہولت نہیں اس لئے احمد آباد اور ہمت نگر سے فائر بریگیڈ کو بلوایا گیا اس ضمن میں پولیس نے 111 افراد کو گرفتار کیا۔

احمد آباد کے علاقوں دریا پور اور استودیا میں 21 جولائی کو پھر فرقہ وارانہ ہنگامہ ہوا ایک شخص ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔چھ پولیس والوں سمیت اٹھارہ افراد چاقو زنی اور خشت باری کیوجہ سے زخمی ہوئے۔گجرات کے وزیر داخلہ ہرن پانڈیا کے بقول پولیس نے صورتحال پر قابو پانے کیلئے آنسو گیس کے 423 شیل اور گولیوں کے 60 راؤنڈ فائر کئے۔ایس آر پی کی بیس کمپنیاں ریپڈ ایکشن فورس کی چار کمپنیاں تعینات کرنا پڑیں۔فرقہ وارانہ کشیدگی کے باعث متعدد لوگوں کو گھر اور شہر چھوڑنا پڑا مگر صورتحال مزید خراب ہوگئی۔27 جولائی کو تین اور آدمی مر گئے۔پولیس سپرنٹنڈنٹ پی سی پانڈے کو پولیس کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا اختیار دینا پڑا۔گھی کانتا جورائے میں دو نامعلوم افراد نے ایک شخص کو آگ لگا دی۔وشوا ہندو پریشد اور بی جے پی کی حکومت میں اختلاف اس وقت سامنے آیا جب بی جے پی کے صوبائی صدر کی قیادت میں ایک وفد نے وزیر اعلیٰ کیشو بھائی پٹیل کو متنبہ کیا کہ وہ پاکستان کے حامی عناصر کی طرف داری کر رہے ہیں اور ہندوؤں کو عدم تحفظ کا احساس ہونے لگا ہے۔دوسری طرف کانگرس کی صدر نے الزام لگایا کہ چونکہ بی جے پی کارگل اور لاہور بس کے ذریعے خیر سگالی کا جذبہ نہیں کما سکی اس لئے اب اس نے فرقہ وارانہ فسادات کروانے شروع کر دیئے ہیں۔اڑیسہ میں فسادیوں نے ایک بار پھر عیسائیوں کو نشانہ بنایا۔پادری ارول داس رومن کیتھولک چرچ کے ایک پادری کا والد تھا اڑیسہ کے ضلع کونجھار سے آنند پور پہنچا تو اسے قتل کر دیا گیا۔وہ گاؤں سندھودیہ میں رہتا تھا۔گاؤں میں 2 ستمبر کو رات دو بجے کے قریب اس بات پر جشن منایا جا رہا تھا کہ بہت سے لوگوں نے عیسائیت قبول کر لی ہے۔مقامی چرچ نے اس اجتماع کا اہتمام کیا تھا۔اس میں فادر داوس نے شرکت کی تھی اور اس تقریب پر اسے مارا گیا۔گاؤں کے

MashalBooks.org

غیر عیسائی باشندوں نے عیسائیوں کی اس تقریب کی مخالفت کی تھی غالباً اسی وجہ سے مذہبی تشدد ہوا۔ گاؤں میں بیس عیسائی خاندان تھے۔ سٹینز کا قاتل دارا سنگھ تھا۔ داس کے قتل میں بھی وہی ملوث ہے۔ قتل کے روز جنم اشٹمی کا بھی میلہ تھا۔ سٹینز کو سرسوتی پوجا کے موقع پر ہلاک کیا گیا تھا۔ 26 اگست کو رکھشا بندھن کے موقع پر ایک مسلمان تاجر عبدالرحمٰن کو قتل کیا گیا تھا۔ اگرچہ پولیس حکام نے سٹینز کے قتل میں دارا سنگھ کے ملوث ہونے کی تصدیق نہیں کی مگر موقع کے بعض گواہوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے جائے واردات پر دارا سنگھ کو دیکھا تھا تاہم آج تک اسے گرفتار نہیں کیا گیا۔

25 ستمبر گنیش چتورتھی کے جلوس پر حیدر آباد میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ چل پڑا۔ جلوس چار مینار کے علاقے سے گزر رہا تھا کہ مسلمان نوجوانوں نے اس پر پتھراؤ شروع کر دیا جس میں ایڈیشنل کمشنر پولیس سمیت 25 پولیس والے زخمی ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ مجلس اتحاد المسلمین (ایم آئی ایم) نے اپنے سیاسی مقصد کیلئے یہ فساد کرایا۔ پولیس اور ریپڈ ایکشن نے ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش میں لاٹھی چارج کیا جس میں ایم آئی ایم کا اویسی اور اس کے کچھ ساتھی زخمی ہوئے۔ جیسے جیسے پرانے شہر میں کشیدگی بڑھتی گئی لوگ اپنی گلیوں میں جمع ہو کر باہر سڑک پر پتھراؤ کرنے لگے جس پر پولیس نے آنسو گیس پھینکی اور ہوا میں فائرنگ کی۔ اس فساد میں پولیس کی ایک گاڑی اور کئی سکوٹروں کو نقصان پہنچا۔ جھگڑا تب شروع ہوا جب چار مینار کے علاقہ میں مکہ مسجد کے قریب گنیش کا جلوس جمعہ کی نماز کے دوران پہنچا۔

صوبہ گجرات میں سورت بھی مذہبی اعتبار سے بڑا احساس شہر ہے۔ 24 ستمبر کو گنپتی کے جلوس سے فساد شروع ہوا۔ پولیس نے جب گولی چلائی تو سات افراد ہلاک ہو گئے۔ جھگڑا جلوس کے راستے پر تھا۔ پولیس کو فساد کا خدشہ تھا اس لئے اس نے جلوس کو مدینہ مسجد کے راستے سے گزرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہندو بھپر گئے اور ان پر قابو پانے کیلئے پولیس کو فائرنگ کرنا پڑی اور پولیس کی فائرنگ سے پہلے پولیس پر پتھراؤ کیا گیا جس سے چودہ پولیس والے زخمی ہوئے۔ میلہ منانے والوں نے گنیشوت سادا کے علاقہ کے صدر راؤ ہندرا پاٹل کا گھر بھی جلا دیا۔ اس علاقے کا ایک اور کونسلر بھی زخمی ہوا۔ پولیس نے ہجوم پر فائرنگ کرنے سے پہلے ہوائی فائر کیا۔ اسوقت بے قابو ہجوم نے سنجے نگر میں گاڑیوں اور جھگیوں کو نذر آتش کر دیا تھا۔ اس موقع پر سات افراد ہلاک اور چونتیس گولیوں سے زخمی ہوئے ان میں سے پانچ کی حالت

MashalBooks.org

نازک تھی۔

اکتوبر نومبر 1999ء میں صوبہ یو پی کے ضلع گونڈا میں شدید قسم کا ہندو مسلم فساد ہوا۔ 27 اکتوبر کو ٹالیا نامی گاؤں میں ایک مسلم خاتون کو اس کے دو بچوں سمیت زندہ جلا دیا گیا۔ اس واقعہ کے باعث لوگ اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ پی اے سی کو بھی کچھ بتانے کو تیار نہ تھے۔ اقلیت کے بہت سے لوگ تو گاؤں ہی چھوڑ گئے تھے کہا جاتا ہے کہ بورنگ کے سامان کی چوری ہوئی تو ایک شخص سبحان علی نے پولیس کو مجرموں کے نام بتا دیئے تو یہ ہندو مسلم فساد کی ابتدا تھی۔ سبحان علی کی بیوی اور پانچ بچے دو سالی کے بچوں کو آگ لگا دی گئی۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ 8 نومبر کو گاؤں کے مسلمانوں کے 18 گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ جن لوگوں نے آگ لگائی وہ اس وقت تک وہاں موجود رہے جب تک سب کچھ جل کر بھسم نہیں ہو گیا۔ جن مسلمانوں کے گھر جلے ان میں سے اکثر مزدور تھے۔ چھوٹے چھوٹے دیہات میں ہونے والے ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہندو مسلم فساد کی زد میں دیہات بھی آ گئے ہیں اور فساد صرف شہروں اور قصبوں کا ہی معاملہ نہیں رہے۔

7 اور 10 نومبر 1999ء میں مہاراشٹر کے دو علاقے نند پار اور راوراس آگ کی زد میں آئے اور یہ واقعہ کانگرس اور نیشنل کانگرس میں پارٹی کے صوبے میں اقتدار میں آنے کے بعد ہوا۔ یہ دونوں علاقے ضلع جل گاؤں میں ہیں اس ضلع سے اسمبلی کی بارہ نشستیں ہیں جن میں سے پانچ شوسینا کی اور پانچ بی جے پی کی ہیں ایک اندرا کانگرس اور ایک این سی پی کی ہے۔ جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب دو مسلمان لڑکے ایک ہندو لڑکے سے ٹکرا گئے۔ راہگیروں نے ان دونوں کو مارا اسی اثنا میں کچھ اور مسلمان لڑکے آ گئے اور انہوں نے ہندوؤں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ 11 نومبر کو دوسرا واقعہ ہوا۔ مسلمان لڑکے نے ایک ہندو لڑکے کے اوپر سگریٹ کا کٹ پھینک دیا۔ فساد شروع ہو گیا۔ ہار ڈیڑھ ہزار کے قریب مسلمانوں کا ہجوم آیا اور انہوں نے پتھراؤ شروع کر دیا۔ پولیس کو پہلے لاٹھی چارج کرنا پڑا بعد میں گولی چلانی پڑی ایک شخص زخمی ہو گیا۔ پولیس نے 130 افراد کو گرفتار کر لیا ان میں سے 124 مسلمان تھے۔ پولیس کے کہنے کے مطابق ہندوؤں نے کوئی زیادہ کارروائی یا فساد نہیں کیا تھا مگر فساد مندرجہ ذیل علاقوں تک پھیل گیا۔ امام وڑا، بھوٹی وڈا، پہیر پورہ، سمبھاجی نگر، ہراچا، گن پتی اور رسالپورہ جو چھ گھر تباہ کئے گئے ان میں چار مسلمانوں کے اور دو ہندوؤں کے تھے۔ ایک لاکھ تیس ہزار کی مالیت کا نقصان

ہوا پولس کا کہنا ہے کہ رسالپورہ میں عموماً مسلمانوں میں ناخواندگی اور غربت بڑی ہے اس لئے یہ بڑا احساس علاقہ ہے۔ بی جے پی کے رکن اسمبلی ایکناتھ کھادسے کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے ایک مندر کا گنبد گرادیا تھا لیکن پولیس اس سے بالکل انکاری ہے۔ بہت سی این جی اوز کے نمائندوں پر مشتمل تحقیقاتی ٹیم نے اندازہ لگایا کہ ایک عرصہ سے مذہبی منافرت کو باقاعدہ ہوا دی جارہی تھی 4 نومبر کو پٹاخے اور آتش بازی کے سامان میں جو کاغذ استعمال کیا گیا اس پر قرآنی آیات لکھی تھیں۔ پولیس نے وہ پٹاخے ضبط کر لئے۔ 8 نومبر کو چوہڑہ کے قصبہ میں بھی اسی قسم کے کاغذ میں لپٹے پٹاخے پائے گئے۔ مسلمانوں نے حکام کو متنبہ کردیا مگر جب کوئی کارروائی نہیں کی گئی تو مسلمانوں نے ایسے پٹاخے فروخت کرنے والی دکانوں کو لوٹ لیا۔ اس سے پہلے ستمبر کے مہینے میں کھیل کے میدان کے بارے میں جھگڑا ہوا تھا جس میں بھاری پتھراؤ ہوا تھا۔ ایک جنازے پر بھی پتھراؤ کیا گیا۔ چنانچہ نچلے طبقے کے مسلمانوں کی بستیوں میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ یہاں کی مسلم خواتین نے وہ مظالم بھی بتائے جو پولیس نے یہاں پر کئے تھے۔ تحقیقاتی ٹیم کو بھی لگا کہ پولیس نے بھی لوٹ مار میں حصہ لیا۔ مسلمانوں نے کہا کہ ایک لاکھ تینتیس ہزار کے مقابلے میں نقصان بہت بڑی مالیت کا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا کہنا تھا کہ چونکہ انہوں نے کانگرس کو ووٹ دیا تھا اس لئے ان پر زیادتی کی گئی۔ یہ بھی بتایا گیا کہ بعض مساجد میں لاؤڈ سپیکر پر مسلمان لیڈروں نے اشتعال انگیز تقریریں کیں چنانچہ نائب وزیر اعلیٰ اور داخلہ کے وزیر بھوج بال نے اعلان کیا کہ آئندہ سے مسجد میں لاؤڈ سپیکر لگانے کی پیشگی اجازت لینا ہوگی اور اگر ان کا غلط استعمال ہوا تو اجازت نامہ منسوخ کردیا جائے گا۔

بابری مسجد کے انہدام کے ساتویں سال پر مسلمانوں اور سماج وادی پارٹی نے 6 ستمبر کو ایک جلوس اورنگ آباد میں نکالا جس پر پولیس نے وحشیانہ طریقے سے لاٹھی چارج کیا جس سے متعدد صحافی بھی زخمی ہوگئے۔ بعد میں ایک شخص ہسپتال میں جا کر مر گیا جس پر پولیس کمشنر نے لاٹھی چارج کا حکم دیا تھا۔ اسے چھٹی پر بھیج دیا گیا اور حکومت نے ان فسادات کی عدالتی تحقیقات کا حکم دیدیا اورنگ آباد کے فسادات کا سیاسی حلقوں پر برا اثر ہوا۔ 6 ستمبر کے پچھلے پہر مسلمانوں کو بابری مسجد کے حوالے سے جلوس نکالنا تھا مگر اس سے پہلے شیوسینا کو بھی مہا آرتی کا جلوس نکالنے کی اجازت پولیس نے دی تھی۔ شیوسینا نے سارے علاقے میں گیروے رنگ کے لاتعداد جھنڈے لہرادیئے تھے اورنگ آباد کی پولیس موقع پر جانے والے اخبار نویسوں سے

واقف تھی وہ جلوس کا حصہ نہیں تھے اس کے باوجود پولیس نے ان پر لاٹھی چارج کیا۔

مہاراشٹر میں ہونے والے ان فسادات اور دوسرے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب شیوسینا کو الیکشن میں شکست ہوئی اسے اقتدار نہیں ملا تب یہ فسادات شروع ہوئے وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی نے پارلیمان میں بیان دیا تھا کہ گزشتہ سال چھ سو سے زیادہ فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ چنانچہ ایڈوانی کے بیان کو سامنے رکھ کر آل انڈیا ویمن ایسوسی ایشن کی جنرل سیکرٹری مس برنداکرت نے کہا تھا۔ بھارتی جنتا پارٹی کے مرکز میں تیرہ ماہ کے عہد اقتدار میں تقریباً ہر روز سات افراد فرقہ وارانہ فسادات کا نشانہ بنے۔ اس ضمن میں راجیہ سبھا کو جو اعداد و شمار فراہم کئے گئے ان کے حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ بی جے پی کی حکومت کے زمانے میں 626 فسادات ہوئے اور زیادہ تر عیسائیوں کے خلاف ہوئے۔ برنداکرٹ نے کہا کہ 207 افراد ان فسادات میں ہلاک ہوئے اور 2065 زخمی ہوئے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ بی جے پی کے عہد اقتدار فرقہ وارانہ فسادات سے بے داغ ہے غلط ہے۔ متذکرہ بالا دستاویزی حوالوں سے ثابت ہوا کہ 1999ء میں متعدد فرقہ وارانہ فسادات ہوئے یہ سچ ہے کہ بابری مسجدہ کے انہدام کے فوری بعد جس سطح پر فسادات ہوئے تھے اس سطح کے فسادات بعد میں نہیں ہوئے نہ اتنے بڑے نہ اتنے طویل۔ مگر اس کیلئے کوئی سیاسی پارٹی مبارکباد کی مستحق نہیں بلکہ ہوا یہ ہے کہ بابری مسجد کے بعد لوگوں نے اس مسئلہ پر توجہ کم کر لی ہے۔

(15 جنوری 2000ء)

فرقہ وارانہ فسادات 2000ء

پہلے برسوں کی طرح 2000ء میں بھی متعدد فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اگرچہ بی جے پی نے وعدہ کیا تھا کہ اب ہندوستان ان فسادات سے پاک ہو جائے گا۔ مگر اس وعدے کے باوجود کوئی سال ایسا نہیں گزرا جس میں فسادات نہ ہوئے ہوں تاہم بابری مسجد کے بعد کے خطوط پر پچھلے سال بھی چھوٹی سطح کے فسادات ہوئے۔ اکثر فسادات میں چند انسانی جانیں تلف ہوئیں۔ اسی کی دہائی کے فسادات بہت تباہ کن تھے۔ ہر فساد میں سو سے زیادہ جانیں لی گئیں۔

2000ء کا کھاتہ صوبہ یوپی کے اعظم گڑھ سے کھلا۔ 27 جنوری کو شبلی کالج سے مسئلہ شروع

ہوا۔ بی جے پی کے طالب علموں کی تنظیم آل انڈیا بھارتیہ ودیارتھی پریشد (اے بی وی ایچ) نے بندے ماترم گانا شروع کیا۔شرارت یہاں سے شروع ہوئی دوسرے طلباء نے ترانہ گانے سے انکار کردیا۔تنازع المناک شکل اختیار کر گیا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ بہت سی دکانیں لوٹی گئیں اور کئی نذر آتش کی گئیں۔ بعد میں ضلع اعظم گڑھ کے علاقہ مبارک پور میں دو افراد کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ان فسادات میں 180 سے بھی زائد افراد کو گرفتار کیا گیا۔اعظم گڑھ کے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تبدیل کردیا گیا اور صورتحال کو قابو میں لانے کیلئے پیراملٹری فورس کی چھ کمپنیاں لگائی گئیں۔

احمد آباد میں تو یہ فساد معمول کی بات بن گئے ہیں اور مذہبی اعتبار سے یہ انتہا درجے کا حساس شہر ہے۔بی جے پی کی حکومت آنے سے پہلے بھی یہ بہت حساس شہر تھا اور یہاں بڑے بڑے فسادات ہو چکے تھے۔صوبہ گجرات میں بی جے پی کے طاقت پکڑنے کی وجہ یہ فرقہ وارانہ وارداتیں بھی ہیں۔بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد وشواہندو پریشد اور بجرنگ دل بڑی نڈر ہو گئیں اور انہوں نے اقلیتوں سے زیادتیاں شروع کردیں جبکہ پولیس خاموش تماشائی ہے نوبت یہاں تک آ گئی کہ اب پریشد یہ فیصلہ کرتی ہے کہ آیا کسی علاقے میں اقلیتوں کو رہنا چاہئے یا نہیں۔اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ اس نے ہندو اکثریت والے علاقے میں کسی مسلمان کو دکان بنانے کی اجازت نہیں دی ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے لوگوں کی مخلوط علاقوں میں ہائش کی حوصلہ افزائی کی جائے مگر سنگھ پریوار اقلیتوں کو ہندو نچلے والے علاقوں میں آباد ہونے سے روکتے ہیں۔

پانچ فروری 2000ء کو احمد آباد میں چالیس پچاس افراد نے ہالڈی کے علاقہ میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ڈیزائن کے قریب وشوا کنج سوسائٹی میں میں پانچ منزلہ نوتعمیر عمارت پر حملہ کردیا جس سے بیس لاکھ کی مالیت کا نقصان ہوا۔قریب کھڑی ایک کار کو بھی آگ لگادی گئی۔ یہ ہجوم جے شری رام کے نعرے لگا رہا تھا۔لوگوں نے عمارت کے پہرہ دار کو دھمکی دی کہ اگر اس نے پولیس کو ان کے نام بتائے تو نتائج بہت خطرناک ہوں گے۔ یہ عمارت نسیم کوٹھی والا کی ملکیت تھی۔ایک پولیس آفیسر نے کہا کہ ہندوؤں کی اس گنجان آباد بستی میں ایک مسلمان کی مملوکہ عمارت کو ہندوؤں کے ایک گروہ نے تباہ کردیا۔

ہالڈی میں مسلمان خاندان پر حملے کے بعد احمد آباد میں فرقہ وارانہ جذبات پھر بھڑک اٹھے۔ جبکہ شہر کی پولیس اس مجنونانہ کارروائی کے ملزموں کے بارے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہی۔ پولیس کے ڈپٹی کمشنر ٹی ایس بشٹ نے کہا یہ حملہ آور اسی علاقے کے رہائشی ہیں اور انہوں نے مسلمان خاندانوں پر اس لئے حملہ کیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ یہ خاندان ان کے ہمسائے ہوں۔ راجستھان کے شہر ٹونک میں 20 فروری کو طلباء کے دو گرہوں میں تصادم ہوگیا۔ ایک طالب علم ہلاک ہوگیا شہر میں کرفیو لگا دیا گیا۔ اس ضمن میں آٹھ سے زائد افراد کو گرفتار کرلیا گیا۔ شروع میں مسلمان اور ہندو طالب علموں کے دو گرہوں میں ایک نے دوسرے پر حملہ کردیا۔ ناصر نامی طالبعلم کو مار مار کر شدید زخمی کردیا گیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لاکر مر گیا۔ ان واقعات کے بعد فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی۔ تو شام سے صبح پانچ بجے کا کرفیو لگانا پڑا۔ ان طلباء نے عبادت گاہوں کو بھی تباہ کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں تقریباً چالیس افراد گرفتار ہوئے پھر مہاراشٹر کے شہر تانڈ ڈی کی باری 2 مارچ 2000ء کو آئی جھگڑا زمین کے ایک ٹکڑے پر ہوا۔ اقلیت سے وابستہ ایک دکاندار نے دکان کو پکا بنانے کی کوشش کی پھر بارہ دکانیں جل گئیں اور کہا گیا کہ آگ بجلی کے شارٹ سرکٹ کے باعث لگی تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ آگ لگائی گئی یا شارٹ سرکٹ کے باعث لگی۔ متنازعہ پلاٹ پر ڈھانگر سماج والوں نے ملکیت کا دعویٰ کیا کہ وہ یہاں مندر بنانا چاہتے ہیں بہت سے فسادات ملکیت پر جھگڑوں کے باعث ہوئے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مخصوص مفادات والوں نے مذہب کی آڑ لے کر فساد کروادیئے۔ ذاتی ملکیت کے اس سوال پر ہونے والے فساد میں سبھی مذاہب کے ماننے والے ملوث ہوگئے۔

فسادات کا دوسرا سبب مسلمانوں اور ہندوؤں کے تہوار ہیں۔ فساد کبھی ہولی پر کبھی گنیش یا درگا دیوی کے جلوسوں یا محرم کے دوران تعزیہ کے جلوسوں پر ہوتے ہیں۔ 19 مارچ کو ہولی کے موقع پر ملک کے مختلف حصوں میں فسادات ہوئے جن میں پانچ افراد مارے گئے۔ صوبہ یوپی میں فرخ آباد کے مقام پر رنگ پھینکنے پر تنازع ہوا تو ایک عورت سمیت دو افراد مارے گئے۔ کلکتہ میں ہندو مسلمان بلوائیوں کو منتشر کرنے کیلئے پولیس نے فائرنگ کی تو تین افراد مارے گئے۔ ان میں سے ایک آدمی ہوڑہ میں مارا گیا۔ پولیس کے مطابق نشے میں بدمست ایک گروپ دوسرے مذہب کے لوگوں پر رنگ پھینک رہا تھا جب انکو پولیس نے ایسا کرنے سے

منع کیا تو انہوں نے پولیس پر خشت باری شروع کردی۔ دوسرا واقعہ ضلع ہگلی میں ہوا جس میں ایک شخص مارا گیا کئی ایک زخمی ہوئے۔ تیسرا بلوہ کلکتہ کے نواح میں ہوا جو بیس سال کے ایک نوجوان نے رنگ پھینکنے پر اعتراض کیا تو اسے قتل کردیا گیا۔

یو پی کے غازی آباد میں پولیس نے ہولی کے موقع پر الاؤ جلانے سے روک دیا تو ہندوؤں نے احتجاج کے طور پر ہولی منانے سے انکار کردیا۔ اس لئے کہ جس جگہ پر وہ الاؤ جلانا چاہتے تھے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان متنازع تھی ۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے مسلمانوں کو وہاں عید کی نماز پڑھنے کی اجازت دیدی تھی مگر ہولی کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا تھا چنانچہ شہر میں ہندو مسلم کشیدگی کے باعث پولیس کو خاص تدابیر کرنا پڑیں۔

ضلع بہرائچ کے گاؤں سادھو پور میں ہولی کے موقع پر ہندو مسلم فساد میں بارہ افراد شدید زخمی ہوئے۔ فساد اس وقت شروع ہوا جب ایک شرابی نے مسلمانوں پر رنگ پھینکنا چاہا اور مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا پھر اس ضمن میں 15 افراد کو گرفتار کرلیا گیا۔

ہولی کے بعد اپریل 2000ء میں محرم کی باری آئی مسلمان حضرت حسین کی شہادت پر دسویں محرم کو تعزیہ کا جلوس نکالتے ہیں صوبہ بہار میں سہسرام کے مقام پر مسلمانوں کے دو گروہوں میں تعزیئے کے مسئلے پر فساد ہوگیا۔ فساد کو ختم کرنے کیلئے پولیس کو گولی چلانی پڑی اور ایک پولیس والے سمیت دو درجن کے قریب افراد زخمی ہوئے۔ دونوں گروپوں نے ایک دوسرے پر مہلک ہتھیاروں سے حملے کئے۔

وارانا سی مذہبی اعتبار سے حساس شہر ہے۔ 19 اپریل کو یہاں فساد ہوا جس میں ایک آدمی مارا گیا اور پولیس والے سمیت دو زخمی ہوئے۔ پھر کرفیو لگانا پڑا۔ فساد بھڑک اٹھے تو چیت گنج تھانہ کے علاقے تیلا باغ میں جہاں کرفیو لگا ہوا تھا بم پھینکے گئے مزید دو افراد زخمی ہوئے 19 اپریل کو چیت گنج، لکسا، دشا سومر گھاٹ چوک اور بھیلو تیرا کے تھانوں میں غیر معینہ مدت کیلئے کرفیو لگا دیا گیا۔

19 اپریل کی شام کو مسلمان علاقے کے قریب سے گزرنے والے ایک نوجوان پر نامعلوم افراد نے حملہ کردیا۔ ہندو مسلم بلوہ ہوگیا جس میں ایک بائیس سالہ جوان کو چھرا گھونپ کر ماردیا گیا۔ مقتول ونود کمار اپنی موٹر سائیکل پر اس علاقے سے گزرنے کا قصوروار تھا۔ فساد ہوگیا اور نواحی علاقوں میں بھی پھیل گیا۔ صورتحال بڑی نازک ہوگئی اور امتحان ملتوی کرنے

پڑے یہاں کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ چھرا گھونپنے کی واردات کے سلسلے میں ایک اور آدمی کو گرفتار کیا گیا اس طرح ورانا سی میں فسادات کے سلسلے میں گرفتار ہونے والوں کی تعداد 63 ہو گئی۔

21 مئی کو احمد آباد کے علاقہ ساد ھے پورا میں اس وقت بلوہ ہو گیا جب سبزی خریدنے والے دو افراد کو چھرا مارا گیا۔ دونوں مذہبی گروہوں کا سوسو آدمی آمنے سامنے کھڑا ہو کر پتھراؤ کرنے لگا آتشزدگی اور لوٹ مار ڈھڈ یشوروک روڈ تک پہنچ گئی محلے کی ایک دکان اور ایک سکوٹر جلا دیا گیا۔ دو دکانوں اور ایک ریڑھی کی توڑ پھوڑ کی گئی۔ ہجوم کو منتشر کرنے کیلئے پولیس نے آنسوگیس کے 15 شیل چلائے۔ ایک پولیس سب انسپکٹر بھی زخمی ہوا۔ پولیس نے بتایا کہ وہ وشوا پریشد کے ایک رکن کی تلاش میں ہے جسے ایک سال پہلے ساد ھے پورا کے فساد میں گرفتار کیا گیا تھا۔

صوبہ مہاراشٹر کے ضلع احمد نگر کے کوپر گاؤں میں فرقہ وارانہ تشدد 25 مئی 2000ء کو ہوا آغاز اس بات پر ہوا کہ ایک درگاہ اور ایک مندر کے قریب لڑکیوں کو چھیڑا گیا پھر بعض لوگوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ اس جگہ سے درگاہ کو ہٹایا جائے وگرنہ ہندو عیدگاہ کے قریب مورتی نصب کر دیں گے۔ اس کے بعد سینا اور بی جے پی والوں نے مسلمانوں کی دکانیں جلانا شروع کر دیں۔ چوڑیوں کی تین، دو کباڑ خانے، سپئیر پارٹس کی دو اور پان کی ایک دکان جلا دی گئی۔ ان کے ساتھ ایک گیراج اور ایک ٹرک بھی جلایا گیا یہ ساری دکانیں وغیرہ مسلمانوں کی تھیں کوپر گاؤں کے مسلمانوں کا کہنا ہے کہ پولیس نے ان کی کوئی مدد نہیں کی یہ خاموش تماشائی بنی رہی۔ رات نو بجے کے بعد ایس آر پی (سٹیٹ ریزرو پولیس) پہنچی صورتحال پر قابو پایا اور دفعہ 144 نافذ کر دی۔ رات کو سات افراد کو گرفتار کیے گئے صبح کو رہا کر دیئے گئے۔

24 جون 2002ء کو دہلی کے علاقہ یمنا پشتہ میں پولیس نے دو بنگلہ دیشیوں اسحاق اور شاہ عالم کو بم کے دھاکے کے شبہ میں گرفتار کیا تو فساد ہو گیا۔ ارد گرد کے لوگوں نے کہا کہ اسحاق دن کو کام کرتا ہے اور رات کو مدرسہ میں پڑھاتا ہے۔ پھر افواہ پھیل گئی کہ پولیس نے قرآن شریف کی بے حرمتی کی ہے مسلمانوں نے پولیس چوکی کو گھیر کر پتھراؤ شروع کر دیا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا آنسوگیس پھینکی مگر صورتحال قابو میں نہ آئی۔ ہجوم نے چوکی کے پاس کھڑی پولیس کی گاڑی کو آگ لگا دی اور چوکی پر یلغار کر کے سارا ریکارڈ بھی تلف کر دیا۔ پھر پولیس نے گولی چلا دی ایک شخص گنگا رام زخمی ہو گیا اور مجاہد نامی شخص مارا گیا جو پولیس والے چوکی کے اندر گھر

گئے تھے وہ بچ گئے کیونکہ ہجوم کا خیال تھا کہ وہ مر گئے ہوں گے اس لئے ہجوم چلا گیا۔ دو پولیس کانسٹیبل چوکی کی طرف آ رہے تھے کہ ہجوم نے انہیں گھیر کر مارا انہوں نے آنسو گیس کے شیل اٹھا رکھے تھے۔

26 جون 2000ء کو گنتور کی مسجد میں بم دھماکہ کے بعد کرفیو لگا دیا گیا پولیس کے مطابق پیر کے روز صبح کے وقت کوٹھا پیٹ، لالا پیٹ اور پرانے شہر کے حصوں میں کرفیو لگا دیا گیا۔ باقی شہر میں دفعہ 144 نافذ رہی کرفیو کے نفاذ کے بعد فساد کی کوئی خبر نہیں ملی ار نہ ہی دھماکہ کے سلسلے میں کسی کو گرفتار کیا گیا۔ بنگلہ گیری میں مسجد کے دھماکے کیخلاف احتجاج کیلئے ایک کل جماعتی جلوس نکالا گیا۔ احتجاج کے طور پر کچھ دکانیں بھی بند رہیں۔

آندھرا پردیش کی حکومت نے صوبے میں مذہبی عبارت گاہوں پر حملے کرنے والوں کی نشاندہی کرنے والوں کیلئے پچیس لاکھ روپے کا انعام کا اعلان کیا وزیر اعلیٰ چندر بابو نائیڈو نے مذہبی رہنماؤں سے ملاقات کے بعد انعام کا اعلان کیا۔ باغیوں نے اقلیتوں کی ساری عبادت گاہوں کو پولیس کی حفاظت فراہم کرنے کا بھی کہا اور علاقے میں ریپڈ ایکشن فورس کی دو کمپنیوں سمیت مزید پولیس متعین کی گئی۔

لیکن اگلے ہی روز گنتور میں تشدد شروع ہو گیا۔ مرکز مسجد میں بم کا دھماکہ ہوا، بسوں کو جلایا جانے لگا۔ بس اڈے پر حملہ ہوا اور اس ضمن میں 30 افراد کو گرفتار کیا گیا۔ رپٹالہ ریلوے سٹیشن پر کچھ ریلوں کو پٹڑی سے اتار دیا گیا۔ تنالی میں آٹھ سو سے زائد افراد پر مشتمل جلوس نکالا گیا۔

10 جنوری کو راجستھان کے ضلع ٹونک کے موضع مال پورا میں ایک شخص کیلاش مالی کو قتل کر دیا گیا جو 1992ء میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہونے والے فسادات میں ملوث تھا۔ کیلاش مالی اور بھی اس قسم کے مقدمات میں ملوث تھا اس لئے لگتا ہے کہ اسے انتقام لینے کیلئے قتل کیا گیا۔ اس کے قتل کے بعد فرقہ وارانہ فسادات نے مال پورا کے چھ افراد کی جانیں لے لیں۔ راجستھان کے وزیر داخلہ گلاب سنگھ شیکھاوت کے کہنے کے مطابق مالی کی موت کے بعد ایک جیپ پکڑی گئی جس میں چار لاشیں تھیں جن پر تیز دھار آلے سے حملہ کیا گیا تھا۔ علاقے میں کرفیو لگا دیا گیا اور آرمڈ کانسٹیبلری کی دو کمپنیاں لگا دی گئیں۔

12 جولائی کو ٹونک میں پھر فساد ہوئے ایک عورت ماری گئی ضلع میں کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ پولیس کے کہنے کے مطابق قصبہ مال پورا میں توڈا ارائے سنگھ روڈ پر فساد میں ایک عورت ماری

MashalBooks.org

گئی تھی تین بچے زخمی ہوئے یہاں ہندو مسلم فسادات میں پہلے ہی دس آدھی مارے جا چکے ہیں۔ ضلعی ہیڈ کوارٹر میں دو دن اور مال پورا میں تین دن کرفیو لگا رہا۔ امن وامان برقرار رکھنے کیلئے دہلی سے ریپڈ ایکشن فورس کی تین کمپنیاں فوراً ٹونک بھیجی گئیں۔

احمد آباد کے پرانے شہر کے کالو پور، دریا پور اور جمال پور میں ہمیشہ مذہبی فضا بڑی حساس رہتی ہے۔ معمولی سی بات پر ہندو مسلمان لڑنا شروع کر دیتے ہیں مثلاً 14 جولائی 2000ء کو افواہ پھیل گئی کہ ایک مسلمان نے ہندو لڑکی کو چھیڑا ہے پانچ سو کے قریب آدمی اکٹھے ہوئے ایک دوسرے پر پتھراؤ کرنے لگے۔ پولیس نے 26 افراد کو گرفتار کر لیا اور 200 کو نظر بند۔ سہ پہر تین بجے کے قریب نگینہ پارک اور وڑ لکام کے علاقے میں سخت پتھراؤ اور لڑائی شروع ہو گئی۔ دریا پور تھانے کی پولیس سٹیٹ ریزرو پولیس کو لے کر فوراً موقع پر پہنچی قریباً ایک ہزار افراد نے پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ ہجوم کو منتشر کرنے کیلئے پولیس کو گولی چلانا اور آنسو گیس پھینکنا پڑی۔ فائرنگ سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ مگر اس سے بھی بدتر واقعہ تو ابھی ہونا تھا۔ مبینہ طور پر انتہا پسندوں نے کشمیر میں 100 یاتری قتل کر دیئے تو وشوا ہندو پریشد نے صوبہ گجرات میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ پریشد نے پورے گجرات میں تباہی مچا دی اور مساجد اور درگاہوں کی تباہی کے علاوہ لاکھوں کی مالیت کی جائیداد تباہ کر دی۔ گجرات کے بہت سے سیکولر کارکنوں اور این جی اوز نے مل کر ایک جامع رپورٹ تیار کی عنوان تھا گیروے تباہی بن گئے۔ لشکر کے کارناموں کا بھگتان گجرات کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔

اس رپورٹ کے مطابق احمد آباد، سورت، سبر کنتھا دلمبادیا، کھیڈ براہما اور موداس دیہات اور پالن پور اور راج کوٹ میں بھارتیہ جنتا پارٹی، وشا ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے منتخب نمائندوں کی سربراہی میں دہشت گردوں کے گروپ بنا کر مسلمانوں کے تجارتی ادارے، پاور لومز، پرنٹنگ پریس اور محلے کی دکانیں بے رحمی کے ساتھ نشانہ بنائی گئیں۔ فنانشل ایکسپریس کے سینئر نامہ نگار کے مطابق صرف سورت میں مسلمانوں کی پاور لومز نذر آتش کرنے سے دس کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔ سبر کنتھا ضلع کے موضع موڈاسا میں 63 دکانوں کو جلا دیا گیا جن میں سے 51 مسلمانوں کی تھیں بارہ ہندوؤں کی اور اس طرح ڈیڑھ کروڑ روپے کا نقصان ہوا۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ ہندوتوا کے بڑے بڑے نظریاتی پرچارکوں نے گجرات کو اس سیاسی فلسفے کی لیبارٹری قرار دیا ہے۔ بندھ (ہڑتال) کے اندر اور اس کے بعد پورا ایک ہفتہ

جو کچھ ہوا اسے ہندوتوا کا ایک اور سیٹ کیس سمجھا جانا چاہیے۔

مزید کہا گیا کہ امرناتھ کے یاتریوں کے قتل کے خلاف ہڑتال کے باعث زیادہ تجارتی ادارے اور دکانیں بند رکھی گئیں۔ مگر ہندو راشٹرا کی اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل نے کئی مقامات پر بی جے پی کے منتخب نمائندوں کی مدد سے یاتریوں کا انتقام لینے کیلئے علی الاعلان خون ریزی برپا کی۔ حکومت اور پولیس کے زیر سایہ صوبے کے مسلمانوں کی کروڑوں کی مختلف نوعیت کی جائیداد اور کاروبار تباہ کر دیا گیا۔

3 اگست کے بدقسمت دن کو صوبہ گجرات میں جو جو کچھ اس کی تفصیلات اس رپورٹ میں دینا ہی ممکن نہیں ہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہندوتوا کے ماننے والوں نے اس روز فاشزم کے ننگے ناچ کا مظاہرہ تھا۔ حالانکہ یہ لوگ یہ دعوے کرتے کبھی نہیں تھکتے کہ ہندو زیادہ فراخ دل ہیں اور بی جے پی نے اپنے منشور میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ ہندوستان کو فرقہ پرستی سے پاک کر دے گی۔ ایک درگاہ جلا دی گئی۔ ایشین ایج کے دیپک ترویدی نے لکھا ''وشوا ہندو پریشد کی ہڑتال کی بی جے پی نے باقاعدہ حمایت کی اور جب پریشد اور دل کے کارکن گیروے جھنڈے لے کر صوبے کے مختلف علاقوں میں ہڑتال کامیاب کرانے کیلئے نکلے تو ہڑتال قتل و غارت میں تبدیل ہوگئی۔ ترشول اور تلواریں لہراتے ہوئے انہوں نے پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف نعرے لگائے اور اقلیتوں کی دکانوں اور کاروباری اداروں پر حملے کئے۔

ترویدی کے کہنے کے مطابق احمد آباد میں امدا پور پولیس چوکی کے سامنے محلہ نفرودا میں ایک درگاہ کو زمین بوس کر دیا گیا۔ بلوائی درگاہ کو آگ لگانے سے پہلے اس کی چھت اکھاڑتے رہے در و دیوار کو گراتے رہے مگر پولیس خاموش تماشائی بنی رہی اس ضمن میں کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ ضلع سبر کنتھا کے تعلقہ میگھراج میں سینٹ اکسیوئر سکول میں پریشد اور بجرنگ دل والوں نے توڑ پھوڑ کی۔ اس حملہ میں فادر پیٹر زخمی ہوگیا۔ فادر سیڈرک پرکاش نے بتایا کہ ہڑتال کے اعلان کے باعث سکول بند تھا مگر شر پسند سکول کے احاطے کے اندر آ گئے جہاں کوئی 380 قبائلی طالب علم لڑکے لڑکیاں مقیم ہیں۔

سورت میں ہڑتال میں تشدد ہوا۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں ہوئیں ایک طالب علم مر گیا جب پچھلے پہر وشوا ہندو پریشد والوں نے دکانوں کو زبردستی بند کرانے کی کوشش کی تو معاملہ بگڑ گیا متعدد دکانیں لوٹی اور جلائی گئیں۔

MashalBooks.org

15 اگست 2000ء کو متھرا میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ چاقو زنی ہوئی ایک طالب علم مارا گیا۔ پولیس کی فائرنگ میں دو افراد ہلاک اور پندرہ زخمی ہو گئے۔ مرنے والوں میں سے ایک بارہ سالہ کالے تھا دوسرا بائیس سالہ مشتاق، فساد کرشن جنم بھومی کے قریب گوند انگر پولیس سٹیشن کے سامنے ہوا۔ جھگڑا ایک پلاٹ کا تھا جب ہندوؤں نے اس پر دیوار اٹھانا چاہی تو مسلمانوں نے اعتراض کیا کہ یہ رقبہ قبرستان کا ہے اور وقف بورڈ کی سپرواری میں ہے اکثریت نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر ایسڈ کی بڑی بوتلیں اور اس کے بعد کچی ساخت کے بم بھی پھینکے۔ آخر کار پولیس کو فائرنگ کرنا پڑی جس میں دو افراد مارے گئے۔ 13 ستمبر 2000ء کو مہاراشٹر کے ٹنڈ ڈ میں پھر فساد ہوا چھرے گھونپنے سے چار افراد ہلاک ہو گئے۔ حکام نے رات بھر کا کرفیو لگا دیا۔ چار دیہاتی شہر میں آئے تھے چاقو لگنے سے زخمی ہوئے ٹنڈ ڈ کے الوارا محلّہ میں چاقو زنی کی وارداتوں کے بعد 25 افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ الوارہ کے علاقہ میں گنیش کا جلوس نکلا ساتھ کی گلی سے شرپسندوں نے جلوس پر پتھر پھینک دیئے خبر آگ کی طرح پھیلی اور وسیع پیمانے پر بلوہ شروع ہو گیا۔ پولیس کے کہنے کے مطابق جب لاٹھی چارج بیکار ثابت ہوا تو پولیس نے فائرنگ شروع کر دی چار افراد اس سے زخمی ہو گئے۔ ان میں سے ایک کی حالت تویشناک تھی۔

اس کے بعد مذہبی اعتبار سے حساس شہر بہار شریف میں فرقہ وارانہ فساد ہوا بہار شریف میں 1981ء میں بہت قتل و غارت ہوئی تھی۔ 400 افراد موت کے گھاٹ اتر گئے تھے 9 اکتوبر کو درگا کی مورتی ایک متنازعہ جگہ پر رکھنے کے باعث جھگڑا شروع ہوا۔ پھر بلوہ ہو گیا پولیس نے گولی چلا دی ایک عورت بچیا دیوی ماری گئی تین اور زخمی ہوئیں جگہ جگہ بلوائیوں کو منتشر کرنے کیلئے کی گئی فائرنگ میں چار افراد زخمی ہوئے۔ فسادات پر قابو پانے کیلئے فوج کے تین کالم ریپڈ ایکشن فورس اور بہار ملٹری پولیس کو تعینات کیا گیا۔

جس متنازعہ جگہ پر درگاہ دیوی کی مورتی رکھی گئی تھی اسی جگہ پر مندر بنانے کیلئے ہزاروں کارسیوک پہنچے۔ حکام نے بعد میں اس جگہ سے مورتی کو ہٹا دیا تھا۔ مورتی کے ہٹانے اور تعمیر شدہ حصہ گرائے جانے کے باعث ہندوؤں کے جذبات مشتعل ہو گئے تو ہجوم نے سرکاری اور نجی املاک کی توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ ہجوم کو قابو میں لانے کیلئے کرفیو لگا دیا گیا۔ چشم دید گواہوں کی رپورٹ کے مطابق ایک مذہب والے بہت بڑی تعداد میں کرفیو کی خلاف ورزی کرتے

باہر نکلے ٹائر اور لکڑیاں جلا کر گلیاں بند کر دیں جب اقلیت کی دکانیں جلا لی گئیں اور سرکاری مدرسوں پر بھی حملہ کیا گیا تو پھر ساری رات چھاپے مار کر 145 افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ درگا دیوی کی سنگ مرمر کی مورتی متنازعہ جگہ سے اٹھا کر پولیس لائنز میں بھیج دی گئی اور پولیس حکام نے جلوس کے منتظمین سے کہا کہ وہ یہ مورتی اپنی مرضی کی مگر نجی جگہ پر گاڑ دیں حکام اپنی مرضی کی جگہ نصب کر دیں گے۔

صوبہ یو پی کا ضلع اعظم گڑھ ہندو مسلم فساد کے حوالے سے ہی حساس علاقہ نہیں یہاں شیعہ سنی تنازع اور فساد بھی ہوتا ہے۔ 6 نومبر کو ضلع کے مقام مبارک پور میں شدید شیعہ سنی فساد ہوا پولیس والوں کا خیال ہے کہ اس فساد کیلئے بڑی ہنر مندی سے منصوبہ بندی کی گئی تھی مرنے والوں کی تعداد گیارہ اور جو تین زخمی ہوئے ان کی حالت نازک تھی۔ فساد کے کئی دن بعد تک مبارکپور میں شدید کشیدگی رہی۔ پی اے سی کی چھ کمپنیاں اور ریپڈ آرمڈ فورس کی دو کمپنیاں یہاں بھیجی گئیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ سری نگر میں شیعہ لیڈر آغا سید مہدی کے قتل کے ردعمل کے طور پر مبارکپور میں فساد ہوا تاہم اسکی تصدیق نہیں ہوسکی۔ فساد ختم ہونے کے بعد بہت دیر تک فرقہ وارانہ آگ سلگتی رہی۔

وزیراعظم اے بی واجپائی نے بیان دیا کہ ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر دراصل قومی جذبات کے اظہار کی علامت ہے اس کے بعد پھر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے ہندوتوا وادیوں میں سے اکثر کی اس سے حوصلہ افزائی ہوئی ارانہوں نے بے شمار جگہوں پر یلغار کر دی ان میں یو پی کے رائے بریلی اور مراد آباد حتیٰ کہ گجرات میں نواساری میں بھی دنگا فساد ہوا حالانکہ نواساری ایسا قصبہ ہے کہ جب اس کے قریب میں واقع سورت میں 1992ء میں خوفناک فسادات ہوئے تھے یہ تب بھی پرامن رہا۔ اس قصبے کی تاریخ میں پہلی بار فرقہ وارانہ فساد ہوا۔

جنوبی گجرات کے قصبہ نواساری میں 3 دسمبر کے فساد میں 4 افراد شدید زخمی ہوئے۔ تھانے کے علاقے میں کرفیو لگانا پڑا پہلا مقابلہ علی پور کے علاقہ میں ہوا جہاں گاؤ رکھشا کے سوال پر اختلاف ہوا۔ تقریباً پندرہ دکانیں اور کھوکھے جلا دیئے گئے۔ ہجوم کو منتشر کرنے کیلئے پولیس کو چند راؤنڈ ہوائی فائر کرنے پڑے۔ ایک واردات چاقو زنی کی بھی ہوئی۔ مراد آباد میں

9 دسمبر کوفرقہ وارانہ تشدد ہوا تنازع کی وجہ یہ تھی کہ گل شاہد کے علاقے میں بعض سیاستدانوں نے ایک عبادت گاہ کی دیوار گرادی پھر سارے شہر میں بلوے ہوئے۔ پولیس کو تقریباً بارہ مقامات پر لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ تقریباً 20 افراد گرفتار کئے۔ کوئی شدید زخمی نہیں ہوا۔ تامل ناڈو کے ضلع ترنویلی کی ایک مسجد میں ایک پینتالیس سالہ مسلمان کا سر قلم کردیا گیا۔ اس بھیانک واقعہ کے بعد نواحی شہروں اور دیہات میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوگئی۔ جن دو افراد نے قتل کیا تھا وہ بھاگ گئے۔ تاہم پولیس کا کہنا تھا کہ صورتحال قابو میں ہے اور نازک مقامات پر پولیس لگادی گئی ہے۔ پولیس کے ذرائع کے مطابق دو افراد نے ہفتے کی رات مسجد کی دیوار پھلانگی۔ اندر مقتول عبدالرشید سمیت تین آدمی سحری تیار کررہے تھے ان کے علاوہ چھ اور افراد مسجد کے اندر سوئے ہوئے تھے ملزموں نے پہلے پٹرول بم چلایا پھر عبدالرشید کو چاقو گھونپ دیا۔

فرقہ وارانہ فسادات اور حادثات میں جو سال 2000ء میں پیش آئے سال نو کے موقع پر بھی فرقہ وارانہ صورتحال پریشان کن ہے فرقہ وارانہ پراپیگنڈا بڑھ گیا ہے فرقہ وارانہ قوتیں جب چاہیں اور جہاں چاہیں فسادات کرواسکتی ہیں۔ بدقسمتی سے فرقہ واریت کی مخالفت قوتیں زیادہ سرگرم نہیں فرقہ وارانہ قوتوں کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اکثر اوقات ان کو کوئی روکنے والا ہی نہیں ہوتا۔

(15-جنوری 2001ء)

بال ٹھاکرے کی گرفتاری

بمبئی کے شہریوں کو اس وقت شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا جب مہاراشٹر کی حکومت نے شوسینا کے سربراہ بال ٹھاکرے کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ مقدمہ چلانے کی وجہ بال ٹھاکرے کے دو اشتعال انگیز ایڈیٹوریل بنے جو انہوں نے بابری مسجد کے گرائے جانے کے بعد جنوری 1993ء میں ممبئی میں مذہبی فسادات کرانے کیلئے لکھے۔

یہ دس دن اہل بمبئی کیلئے بڑے مشکل تھے۔ ایڈیٹوریل لکھے سات برس ہوچکے تھے اور گرفتاری کا اب فیصلہ ہوا۔ چنانچہ قانونی ماہرین میں یہ بحث چل نکلی کہ آیا مقدمہ دائر کرنے کی مدت گزر چکی ہے یا باقی ہے وکلاء برادری اس مسئلہ پر برابر برابر تقسیم ہوگئی تھی تاہم مہاراشٹر کی

MashalBooks.org

حکومت (یا وزیر داخلہ بھجبال؟) بال ٹھاکرے کو گرفتار کر کے اور سزا دلوا کر یہ دکھانے پر تلے ہوئے تھے کہ کوئی بھی شخص قانون سے بالاتر نہیں مگر بال ٹھاکرے کو صرف چند منٹ کیلئے گرفتار کر کے جو ڈرامہ کھیلا گیا اس سے یہی ثابت ہوا کہ بال ٹھاکرے جیسے لوگ واقعی قانون سے بالاتر ہیں۔

یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر حکومت چاہتی کیا تھی کچھ اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ نیشنل کانگرس پارٹی کے کچھ اسمبلی ارکان اپنی پارٹی چھوڑ کر شیوسینا اور بی جے پی کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کی سازش کر رہے تھے مگر وہ ارکان کی ضروری تعداد اکٹھا نہ کر سکے۔ اس لئے کانگرس اور نیشنل کانگرس پارٹی کی مخلوط حکومت نہ گرائی جا سکی۔ جب یہ بات نکل گئی کہ کچھ لوگ پارٹی چھوڑنا چاہتے ہیں تو وزیر داخلہ بھجبال بہت ناراض ہوئے اور وہ ان کی حکومت گرانے کی کوشش کرنے پر بال ٹھاکرے کو سبق سکھانا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بال ٹھاکرے کو گرفتار کرنے کا حکم دیدیا۔ متذکرہ بالا قصے کی حقیقت اس وقت ظاہر ہوئی جب نیشنل کانگرس پارٹی کے دس ارکان نے لیجسلیٹو کونسل کے انتخاب میں پارٹی کے خلاف ووٹ دیا۔

بات سچی ہے یا نہیں، مسئلہ یہ نہیں ہے سوال یہ ہے کہ سات برس بعد بال ٹھاکرے کی گرفتاری کا یہ شوشہ کیوں چھوڑا گیا جس کے باعث ممبئی کی پوری آبادی کو یرغمال بنالیا گیا۔ 93-1992ء میں سدھا کار راؤ نائیک وزیراعلیٰ تھے ان کے ہٹائے جانے کے بعد شرد پوار وزیراعلیٰ رہے تو ان دونوں کے عہد میں بال ٹھاکرے کیخلاف کیوں کارروائی نہیں کی گئی حقیقت یہ ہے کہ جب ممبئی کو آگ لگی ہوئی تھی تب ایس آر نائیک سے ایک وفد نے مل کر امن وامان کی بحالی کیلئے کارروائی کا مطالبہ بھی کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ میرے پاس کیوں آئے ہو بال ٹھاکرے کے پاس جاؤ درخواست کرو کہ اشتعال پھیلانا بند کریں یوں ایس آر نائیک نے کاروبار حکومت بال ٹھاکرے کے سپرد کر دیا پھر ان کو گرفتار کرنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا تھا۔

شرد پوار نے مارچ 1993ء میں فسادات کے ذمہ داروں کو گرفتار کرنے کے مقابلے میں بم دھماکے کرنے والوں کیخلاف زیادہ سرعت سے کارروائی کی۔ انہوں نے بم دھماکے کرنے والے ملزموں کے پکڑنے پر زیادہ توجہ دی۔ حتیٰ کہ معصوم لوگوں خصوصاً ماہیم علاقے میں رہنے والوں کو گرفتار کیا مگر بال ٹھاکرے تو کجا فسادات کے ذمہ دار کسی ایک شیوسینک پر بھی ہاتھ نہیں ڈالا۔ ممبئی کی پولیس نے بال ٹھاکرے کو گرفتار کرنے کی اجازت مانگی مگر حکومت نے

کوئی جواب نہیں دیا۔سوال یہ بھی ہے کہ پولیس نے بال ٹھاکرے کوگرفتار کرنے کی اجازت ہی کیوں مانگی؟ وہ نہ تو سرکاری ملازم ہیں، نہ ممبر پارلیمینٹ اور نہ ہی ایم ایل اے انہوں نے تو اپنی زندگی میں کوئی ایک الیکشن بھی نہیں لڑا۔صرف سرکاری ملازم کوگرفتار کرنے کیلئے سرکار کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے غالباً پولیس گرفتاری کے نتائج سے خوفزدہ تھی اس لئے خود کوئی ذمہ داری لینے کیلئے تیار نہ تھی۔

جس طرح بال ٹھاکرے کو چند منٹوں کیلئے گرفتار کیا گیااس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں ایسے لوگ ہیں جو قانون سے بالاتر ہیں۔اگر وہ سازش کر کے سینکڑوں معصوم لوگوں کو مروا ڈالیں اور کروڑوں روپے کی جائیداد برباد کروادیں تب بھی ان کیخلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ایسے افراد میں سے ایک بال ٹھاکرے ہیں جب بال ٹھاکرے کوگرفتار کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا تو پھر حکومت نے مسلسل دس دن تک ڈرامہ رچائے رکھا۔دریں اثنا سارے شہر میں شدید کشیدگی تھی اور ممبئی والوں کی اکثریت نے اپنی سرگرمیاں معطل کردی تھیں۔ جو شخص بلوائیوں کے جذبات کو بھڑکانے میں بدنام ہے اس شخص کو اس طرح چھوڑ دینے کا یہ عجب طریق کار ہے۔ہماری جمہوریت کے طریقہ کار پر یہ بڑاافسوسناک تبصرہ ہے۔

آجکل جمہوریت وہ چلا رہے ہیں جو ذات پات اور مذہبی جذبات بھڑکا کر اپنی لیڈری چمکاتے ہیں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے معاملہ نمٹایانہیں جاتا صرف دکھاوا ہوا ہے۔اصلی بات یہ ہے کہ مسائل حل کرنے والی سیاست تو ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ ماضی کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ بعد کی دہائیوں کے مقابلے میں پہلی دہائی کی جمہوریت کی کارکردگی کہیں بہتر اور ٹھوس تھی۔ جولوگ پہلی دہائی میں حکمران تھے انہوں نے ملک کی آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ان کیلئے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر ذات اور مذہب کے معاملات اچھالنے کے بجائے ملک کے درپیش مسائل پر توجہ دینا زیادہ اہم کام تھا۔مثلاً نہرو جیسے لوگ سرکاری اہلکاروں کو ووٹ حاصل کرنے کیلئے استعمال کرنے کے بجائے ایسے اہلکاروں پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے جوخود کو سرعام مذہبی تقریبات سے وابستہ کرتے تھے۔ پانچویں دہائی کے شروع میں جب ملک کے صدر راجندر پرشاد نے کمبھ میلہ میں برہمنوں کے پاؤں دھوئے تھے تو نہرو نے سرعام ان پر تنقید کی تھی۔

زوال ساٹھ کی دہائی کے درمیان سے شروع ہوا تب نہرو جیسی شخصیات نہیں رہی تھیں۔

جنگ آزادی لڑنے والے قائدین کی پہلی نسل کی جگہ وہ سیاستدان آ گئے جو اقتدار حاصل کرنے کیلئے بے تاب تھے اور جنہوں نے آزادی کی خاطر کوئی بھی قربانی نہیں دی تھی۔انہیں اقتدار بڑے سستے داموں حاصل ہو گیا۔ساٹھ کی دہائی کے آخر میں ایس کے پاٹل جیسے لوگوں نے کانگرس کے اندر اپنی گروہی لڑائی لڑنے کیلئے بال ٹھاکرے جیسے لوگوں کو استعمال کیا۔تب بال ٹھاکرے ممبئی کے ایک انگریزی اخبار میں غیر معروف کارٹونسٹ تھے مگر کانگرس کے رہنماؤں نے اپنے حریفوں کو پچھاڑنے کیلئے انہیں استعمال کیا انکی زیر زمین مافیا بنانے، ہڑتالیں تڑوانے جنوبی ہند کے باشندوں اور مذہبی اقلیوں کے خلاف جذبات بھڑکانے کی حوصلہ افزائی کی گئی تا کہ کانگرس کے اندران لوگوں کے بجائے کوئی اور مخصوص لوگ لائے جائیں۔

پھر تیزی سے زوال اس وقت آیا جب 1975ء میں سیاست میں ایک اناڑی مگر طاقت کے بھوکے سنجے گاندھی کو ماں کی طرف سے بے پناہ اقتدار حاصل ہو گیا۔ سنجے گاندھی نے خود کو مضبوط بنانے کیلئے ہر قسم کے سماج دشمن عناصر کو استعمال کیا اور تو اور اندرا گاندھی بھی اس کی قیدی بن گئیں ایمر جنسی کے دوران اصل اقتدار کا مالک سنجے گاندھی ہی تھا اسی زمانے میں ملک میں اس بات پر گفتگو چل نکلی تھی کہ سیاست کو بھی جرائم کا رنگ دیا جا رہا ہے۔سیاست کو مجرمانہ بنانے کی اصطلاح ایمر جنسی کے دنوں میں ہی بنائی گئی اور عام ہوئی اور پھر یہ وبا کی طرح پھیل گئی۔اس سے پہلے کسی بھی ایسے لوگوں کا انتخاب کرنے کیلئے ٹکٹ نہیں دیا جاتا تھا جن کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ ہوتا تھا پھر قتل اور دوسرے سنگین جرائم کے ملزموں کا نہ صرف انتخاب ہوا بلکہ انہیں وزیر بھی بنایا گیا۔بی جے پی کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک مختلف وضع کی جماعت ہے اور رشوت ستانی کے خلاف برسر پیکار ہے مگر اس نے بھی مانتے ہوئے مجرموں کی خدمات سے کام لینا شروع کر دیا۔یو پی میں بی جے پی کی کابینہ میں جرائم پیشہ عناصر بھی ہیں اوران گروپوں کے لوگ بھی جنہوں نے مافیا بنا رکھا ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ بی جے پی نے رام جنم بھومی تحریک میں مذہبی جذبات کو برافروختہ کیا اور پارلیمینٹ میں متعدد نشستیں جیت لیں۔ جب تعصب زدہ ہندو جوانوں نے بابری مسجد کو گرانا شروع کیا اس موقع پر بی جے پی کے ایل کے ایڈوانی جیسے ہندو بھی موجود تھے۔ایڈوانی، مرلی منوہر جوشی اور بی جے پی کے متعدد دوسرے صف اول کے لیڈروں پر الزام لگا ہے کہ وہ مسجد

کے انہدام میں شریک کار تھے اگر ایسے صف اول کے قائدین لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے میں ملوث ہیں تو پھر کسی کو جمہوریت سے کیا توقع ہوسکتی ہے اس کے نہ صرف معیار حکمرانی پر بلکہ معاشرے میں امن وامان قائم رکھنے پر بھی سنگین اثرات پڑیں گے اور اگر کسی نے سیاست کو مجرمانہ رنگ دینے میں اپنے ہاتھ گندے کر لئے ہیں تو پھر اس رجحان کو روکنے میں کون کامیاب ہوسکتا ہے؟ کون کس پر دعوے اور نالش کرے اور کس کا ہاتھ پکڑے؟

بال ٹھاکرے نے اپنے ایڈیٹوریل کے ذریعے جس قدر اشتعال انگیزی کی کہ اگر وہ کسی اور ملک میں ہوتے تو یقیناً انہیں قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑتا۔ کمزور سے کمزور حکومت نے بھی اس معاملہ کو درگزر کر کے اتنی مدت نہ گزاری ہوتی کہ مقدمہ دائر کرنے کی مدت ہی ختم ہوجاتی۔ اگر واقعی مقدمے کی مدت ختم وگئی تھی تو حکومت نے پہلے خود عدالت سے وقت کی یہ پابندی ختم کرنے کی درخواست کیوں نہ کی۔ حکوت نے اتنی نااہلی کیوں دکھائی؟ یا یہ باہمی مفاہمت اور ساز باز سے دکھاوے کا ڈرامہ رچایا گیا تھا؟ یہاں راجیو گاندھی کی یاد آتی ہے جنھوں نے ارون نہرو کے مشورے پر بابری مسجد کے دروازے کھول دیئے تھے۔ یہ فیصلہ سیاسی تھا اس کے بعد ضلعی مجسٹریٹ نے دروازے کھولنے کا فیصلہ دیا یہیں سے سنگین مسئلہ شروع ہوا۔

بال ٹھاکرے کو صرف چند منٹوں کیلئے گرفتار کیا گیا پھر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا تو مجسٹریٹ نے یہ کہہ کر مقدمہ خارج کر دیا کہ میعاد گزر چکی ہے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شاید یہ سب کچھ پیشگی طے کر لیا گیا تھا اگر مہاراشٹر کی حکمت بال ٹھاکرے کو واقعی گرفتار کرنے پر تلی ہوئی تھی تو پھر اس نے یہ مقدمہ خاص توجہ سے تیار کیا ہوتا کیونکہ میعاد مقدمہ ختم ہونے کے علاوہ اسی ایڈیٹوریل کی بنا پر دائر مقدمہ ممبئی ہائی کورٹ نے رد کر دیا تھا۔ پٹیشن (حکومت مہاراشٹر کے سابق چیف سیکرٹری) جے بی ڈی سوزا وغیرہ نے عوامی مفاد کے حوالے سے اس بنا پر دائر کی تھی کہ یہ ایڈیٹوریل انتہا درجے کے اشتعال انگیز ہیں۔ بہرحال اصل وجوہات تو حکومت ممبئی کو ہی معلوم ہوں گی کہ یہ سارے کا سارے معاملہ انتہائی ناپختگی اور لاپرائی کے ساتھ اٹھانے کا مقصد صرف ان اقلیتوں کی تسلی کیلئے ایک سیاسی رسم ادا کرنا تھا جنہیں 93-1992ء میں بہت زیادہ نقصان پہنچا تھا۔

اگر مہاراشٹر کی حکومت واقعی بال ٹھاکرے کو گرفتار کرنے کیلئے سنجیدہ ہے تو پھر نہ صرف بال ٹھاکرے کو گرفتار کیا جائے (اور اگر حکومت واقعی اس ضمن میں کچھ کرنا چاہتی تو پھر گرفتاری

کے بعد پیدا ہونے والے حالات سے بھی نمٹ سکتی ہے) بلکہ سری کرشنا کمیشن رپورٹ پر بھی عملدرآمد کیا جائے جس پر سرکاری شیلف میں مٹی کی گہری تہیں جم رہی ہیں مگر اب تک حکومت نے (ایکشن ٹیلف رپورٹ) اس اے ٹی آر کا کوئی تدارک نہیں کیا جس میں شوسینا اور بی جے پی کی حکومت نے کہا تھا کہ یہ رپورٹ ہندوؤں کے خلاف ہے۔ یہ حملہ اپنی ذات میں انتہائی فرقہ وارانہ رنگ لئے ہوئے ہے جس میں کسی بھی سیکولر حکومت کی ایکشن ٹیلف رپورٹ (عملدرآمد ہوگا) کا حصہ نہیں ہونا چاہئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ تحقیقاتی رپورٹ کو مکمل کرنے میں اتنی تاخیر کی گئی کہ 1994ء میں ممبئی میں آنے والی ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ٹیم نے حکومت ممبئی سے کہا کہ اور نہیں تو عارضی رپورٹ پر ہی عمل کر دیا جائے۔ انسانی حقوق کی ایک تنظیم کے اس مطالبے کو بھی ممبئی کی حکومت نے ان سنا کر دیا۔

سری کرشنا کمیشن نے تیس پولیس حکام پر ذمہ داری عائد کی تھی مگر آج تک کسی بھی ایک پولیس افسر کے خلاف کارروائی نہیں کی گئی۔ ان میں سے ایک نے مہاراشٹر پولیس کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ تک ترقی کی ریٹائر ہو کر شیوسینا میں شامل ہو گیا۔ ایسے پولیس افسر لوگوں میں کیا اعتماد پیدا کر سکتے ہیں چنانچہ ضروری ہے کہ مہارشٹر کی حکومت فوری طور پر اس رپورٹ پر عمل کرے نہ صرف بال ٹھاکرے پر مقدمہ چلائے بلکہ سری کرشنا رپورٹ میں ذمہ دار ٹھہرائے گئے تمام افراد بشمول پولیس حکام کیخلاف کارروائی کی جائے۔ اس طرح حکومت نہ صرف اپنا وعدہ پورا کرے گی بلکہ عوام کی نظر میں اس کا اعتماد بھی بڑھے گا۔

(15-1 اگست 2000ء)

سری کرشنا کمیشن رپورٹ......عمل ہوگا؟

جہاں تک فسادات کے بارے میں کسی رپورٹ پر عملدرآمد کرنے کا سوال ہے تو 93-1992ء میں ممبئی میں ہونے والے فسادات کے بارے میں سری کرشنا رپورٹ کا انجام بھی کوئی مختلف نہیں۔ تین سال پہلے اسے حکومت کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ عمل آج تک نہیں ہوا۔ اس سے پہلے کے فسادات کے بارے میں سبھی رپورٹوں کا انجام یہی ہوا۔ مثلاً 1969ء میں احمد آباد کے فسادات پر ریڈی کمیشن نے رپورٹ تیار کی اور جسٹس ریڈی نے بڑی محنت اور دیدہ دلیری کے ساتھ یہ رپورٹ تیار کی تھی اور فسادات کے ذمہ دار افراد جماعتوں اور اداروں کی نشاندہی کی تھی مگر اس وقت کی صوبائی حکومت نے رپورٹ کی اہم سفارشات اور تجاویز کو

نظر انداز کر دیا اور صرف چند ایک غیر اہم غیر متعلق باتوں پر عمل کر دیا۔ مثلاً پولیس نے فورس کی اصلاح کیلئے یہ کیا جائے یا وہ کیا جائے۔

دوسری اہم رپورٹ 1970ء میں بھونڈی جلگاؤں میں ہونے والے فسادات کے بارے میں جسٹس مادھون کمیشن نے تیار کی تھی۔ رپورٹ سات جلدوں میں تھی جسٹس مادھون نے حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کیلئے بہت محنت کی۔ بھونڈی جلگاؤں کے فسادات میں بھی شیوسینا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان فسادات میں بھی پولیس نے اقلیت دشمن رویئے کا اظہار کیا تھا اور جسٹس مادھون نے رپورٹ میں پولیس کے بارے میں سخت سست بھی کہا تھا اور یہ بھی کہ بھونڈی کے ایس پی نے اقلیت کے لیڈروں کو ملوث کرنے کیلئے جعلی روزنامچے تیار کئے ہیں۔ مگر رپورٹ کا کچھ بھی نہیں ہوا نہ سیاسی لیڈروں کے خلاف نہ پولیس والوں کے بارے میں کوئی کارروائی کی گئی۔

انسانی حقوق کے کارکنوں اور سیکولر عناصر نے جسٹس کرشنا کی رپورٹ کی بڑی تعریف کی کیونکہ جسٹس کرشنا کئی مہینے فسادت سے متاثرہ لوگوں کے بیانات سنتے رہے۔ ان کے حلف ناموں، بیانات اور دوسری دستاویزات کو چھان پھٹک کر اصل حقیقت دریافت کی۔ جو کمیشن مقدمہ کی سماعت کر رہا تھا ان دنوں ایمنسٹی انٹرنیشنل کا ایک وفد بھی آیا جس نے دیکھا کہ حتمی رپورٹ تیار کرنے میں دیر لگے گی۔ اس لئے اس نے مطالبہ کیا کہ عارضی مختصر رپورٹ تیار کی جائے اور مجرموں کیخلاف کارروائی کی جائے۔ 1999ء کی عارضی رپورٹ پر عمل کرنا تو دور کی بات پوری رپورٹ دینے کے تین سال بعد تک مجرموں کیخلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور حکومت کی تبدیلی کے باوجود کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

ممبئی میں کوئی معمولی فسادات نہیں ہوئے تھے۔ شیوسینا نے بڑے منظم طریقے سے وسیع پیمانے پر یہ فسادات کروائے تھے کہ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اس اعتبار سے بھی اور اس دوران کی گئی بہمیت نے تمام دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان فسادات کے بارے میں تحقیقات کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا چنانچہ اصل حقیقت جاننے کیلئے غیر معمولی حوصلے اور اعلیٰ کردار کے جسٹس سری کرشنا ہی یہ کام کر سکتے تھے اور انہوں نے کیا۔

شیوسینا اور بی جے پی کی حکومت کو ہی یہ رپورٹ پیش کی گئی۔ قدرتی امر تھا کہ حکومت نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ ''یہ ہندوؤں کیخلاف تعصب پر مبنی ہے۔'' وزیر اعلیٰ منوہر جوشی نے

نہ صرف وزیراعلیٰ کی حیثیت سے بلکہ شیوسینا کے قائد کی حیثیت سے متعصبانہ بیان دیا کہ اگر کسی نے ہمارے راہنما بال ٹھاکرے کو ہاتھ بھی لگایا تو وہ وزیراعلیٰ کے عہدہ سے استعفے دے دیں گے اور احتجاج کرنے کیلئے سڑکوں پر آجائیں گے۔ اس قسم کے دھڑے بند وزیراعلیٰ سے رپورٹ پر عملدرآمد کے کارخیر کی توقع نہیں ہوسکتی۔ دوسری رپورٹوں کی طرح مہاراشٹر کی شیوسینا اور بی جے پی کی حکومت نے بھی دوسری رپورٹوں کی طرح اس رپورٹ میں سے بعض پولیس نظام کے اصلاح سے متعلق اہم سفارشات پر عملدرآمد کیا اور پھر رپورٹ داخل دفتر کردی۔

بنیادی حقوق کے کارکن اور ان کی تنظیمیں ان سفارشات پر عملدرآمد کرانے کیلئے مسلسل مطالبہ کرتی رہیں۔ مگر سرکار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پوار اور ان کی پارٹی نیشنل کانگرس پارٹی نے اپنے منشور میں وعدہ کیا کہ اقتدار میں آئے تو وہ تین ماہ کے اندر اس رپورٹ پر عملدرآمد کریں گے۔ نیشنل کانگرس پارٹی اور کانگرس کی مخلوط حکومت بنے سال ہونے کو آیا ہے مگر رپورٹ پر عملدرآمد کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے۔

شروع میں کانگرس این سی پی کی حکومت کہتی رہی کہ ہم اس رپورٹ کی قانونی حیثیت کا جائزہ لے رہے ہیں۔ 6 دسمبر 1998ء کو شہریوں کے ایک وفد نے وزیراعلیٰ ولیسراؤ دیش مکھ سے ملاقات کرکے رپورٹ پر عملدرآمد کا مطالبہ کیا۔ وزیراعلیٰ نے کارروائی کرنے کیلئے دو مہینے کی مہلت مانگی نربھے بنو (نڈر بنو) نام کی تنظیم نے دستخطی مہم شروع کی اور یہ دستخط وزیراعلیٰ کو پیش کیئے۔ حکومت نے رپورٹ پر عمل نہ کرنے کیلئے ایک اور راستہ نکالا اور سپریم کورٹ میں جنوری 2000ء میں درخواست دی کہ حکومت رپورٹ کا جائزہ لینے کیلئے کرائم برانچ کو بھیجنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہائی کورٹ کے سری کرشنا جیسے صاحب کردار جج کی نہایت محنت اور دل سوزی سے تیار کی گئی رپورٹ کا جائزہ کرائم برانچ کو لینا چاہئے؟ کیا سری کرشنا جیسے اعلیٰ جج کے بارے میں وہ پولیس حکام فیصلہ سنائیں گے جنہوں نے اپنے تعصب اور اقلیت دشمن رویئے کا اظہار کیا۔ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ رپورٹ جائزہ کیلئے کرائم برانچ کو کس کھاتے میں بھیجی جاسکتی ہے؟

فروری 2000ء میں خوراک اور سول سپلائرز کے وزیر مملکت نسیم خان نے سپریم کورٹ میں عرضی دائر کی کہ انہیں ممبئی پولیس پر کوئی اعتبار نہیں ہے اس لئے عملدرآمد کیلئے یہ رپورٹ سی

بی آئی (سنٹرل بیورو آف انویسٹی گیشنز) کے سپرد کی جائے اس کے بعد مہاراشٹر کے سابق چیف سیکرٹری جے بی ڈی سوزا ایک وفد کے ساتھ وزیراعلیٰ سے ملے اس مرتبہ وفود میں فساد کے کچھ متاثرین بھی شامل تھے۔ایک خاتون ہاجرہ بی بی نے وزیراعلیٰ کو بتایا کہ فسادات کے زمانے سے اس کے شوہر اور بھائی لاپتہ ہیں اسے معاوضہ دیا جائے وزیراعلیٰ نے اس معاملہ پر غور کرنے کا وعدہ کیا مگر آج تک اس ضمن میں کچھ بھی نہیں ہوا۔

دریں اثنا حکومت مسلسل یہ کہتی رہی کہ چونکہ سپریم کورٹ میں ایک پٹیشن زیر سماعت ہے اس لئے وہ رپورٹ پر کوئی کارروائی نہیں کرسکتی۔ اگر معاملہ سپریم کورٹ میں نہ ہوتا تو وہ رپورٹ کے بارے میں کارروائی کر چکی ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر حکومت نے اس رپورٹ پر کارروائی کردی ہوتی تو متاثرین کو سپریم کورٹ میں جانے کی ضرورت ہی نہ تھی پھر جون 2000ء میں نائب وزیراعلیٰ اور وزیر داخلہ چگن بھجال نے اعلان کیا کہ فسادات کے 1358 بند مقدمات میں سے 112 مقدمات کو دوبارہ شروع کیا جارہا ہے۔ یادہ تر مقدمات شیوسینا اور بی جے پی کی حکومت کے زمانے میں بند (یا داخل دفتر) کئے گئے تھے اور بہانہ یہ کہ کوئی مناسب ریکارڈ موجود نہیں ہے اور مقدمات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اس میں کوئی سچائی نہیں تھی اصلاً بی جے پی شیوسینا کی حکومت کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ مجرموں کو سزا دی جائے وجہ یہ کہ اکثر مجرم تو ان کی اپنی پارٹیوں کے رکن تھے۔بھجال نے یہ بھی کہا کہ ان مقدمات کی فرد جرم ایک مہینے کے اندر جاری کردی جائے گی مگر کسی کو کچھ خبر نہیں کہ ان مقدمات کا کیا ہوا اور کیا جرم کی فردیں واقعی دی گئی تھیں کوئی بھی پکی بات معلوم نہیں۔

7 اگست 2000ء کو سری کرشنا کمیشن رپورٹ کے پیش کئے جانے کی دوسری سالگرہ پر پھر شہریوں کا وفد وزیراعلیٰ سے ملا اور رپورٹ پر عملدرآمد کا مطالبہ کیا۔وزیراعلیٰ نے حسب دستور وعدہ کرلیا۔اس کے بعد حکومت نے کہا فسادات کے کیسوں کے بارے میں ٹاسک فورس قائم کی جائے گی کہا جاتا ہے کہ ٹاسک فورس میں اب مقدمات کا جائزہ لے رہی ہے۔

اس مرحلے پر کمیشن نے جن پولیس افسروں کو نامزد کیا ان کے کردار کے بارے میں کچھ روشنی ڈالنا دلچسپ ہوگا۔کمیشن نے 31 پولیس افسروں کو قصوروار قرار دیا تھا۔ان میں پولیس کے ڈپٹی کمشنر سے کر ہیڈ کانسٹیبل تک شامل ہیں۔پولیس کے کردار کے بارے میں رپورٹ کہتی

ہے کمیشن کے سامنے پیش ہونے والی شہادتوں کے مطابق پولیس اہلکار بھی فسادات، آتش زنی اور لوٹ مار میں ملوث دیکھے گئے۔ کمیشن پرزور سفارش کرتا ہے کہ حکومت ان اہلکاروں کیخلاف سخت تادیبی کارروائی کرے۔

مزید دلچسپ امر یہ ہے کہ شوسینا بی جے پی کی حکومت نے ان میں سے دس افسروں کو ترقی دے دی تو سزا کے مستحق پولیس افسروں کو اس طریق سے سزا دی گئی۔ اس حکومت نے ان میں سے ایک کو ممبئی کا پولیس کمشنر مقرر کر دیا۔ اب وہ پولیس کمشنر ریٹائر ہو گئے ہیں اب کانگرس اور این سی پی کی حکومت ایک ریٹائرڈ افسر کے خلاف کیا کارروائی کرسکتی ہے۔ ان 31 اہلکاروں میں سے پانچ کانسٹیبلوں کو معطل کیا گیا جبکہ افسر لوگوں کی باس پرس کوئی نہیں ہوتی یا انہیں انعام سے نوازا جاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ فسادات کے معاملات میں قصوروار اعلیٰ پولیس افسروں کو آخر کار ترقی دی جاتی ہے۔

اب مہاراشٹر کی سرکار نے سری کرشنا کمیشن کی طرف سے قصوروار قرار دیئے گئے بارہ پولیس والوں کو معاف کر دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کا اظہار سپریم کورٹ میں داخل کئے گئے حلف نامے سے ہوتا ہے۔ ان 12 میں سے ایک مر گیا ہے ان کو معاف ایک کمیٹی نے کیا تھا جو اڈیشنل چیف سیکرٹری داخلہ کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی۔ معاملہ پھر وہی ہے کہ ایک بے داغ شفاف کردار کے مالک ہائی کورٹ کے جج کی رپورٹ پر فیصلہ کیلئے ایک بیوروکریٹ کو بٹھا دیا گیا ہے۔ بری کئے گئے ان اہلکاروں میں سے دو کے بارے میں رپورٹ میں کہا ہے کہ انہوں نے بپھرے ہوئے لوگوں کو ایک شخص عبدالرزاق آبا کے قتل کا موقع دیا۔ اس طرح یہ اس کے ذمہ دار ہیں۔

(سی آر نمبر 13-1993ء)

اگر حکومتیں ان پولیس افسروں کو بچانا چاہتی ہیں تو پھر ان پولیس افسروں سے یہ توقع کی ہی نہیں جاسکتی کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے میں کوئی مؤثر کردار ادا کریں گے۔ اور 1992-93ء میں ممبئی کے فسادات کے دوران پولیس نے علی الاعلان جو دھڑے بندی والا کام کیا اور آیندہ بھی وہ یہی کچھ کرے گی تو پھر مستقبل میں ایسے فسادات کو روکنا تو مشکوک ہو جائے گا اگر حکومت ایسے پولیس افسروں کو مثالی سزا دینے کے اہل نہیں تو پھر کم از کم اپنے صوبے میں انہیں ترقی تو نہ دے۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز اس قسم کے پولیس افسران سے بھلا غیر جانبدارانہ

MashalBooks.org

رویئے کی توقع کی جاسکتی ہے؟

سچ ہے کہ پولیس افسر بھی آخر انسان ہیں ان پر بھی سماجی اور سیاسی ماحول اثر انداز ہوسکتا ہے مگر یہ وضاحت، ذمہ دار پولیس افسروں کے رویئے کا جواز فراہم نہیں کرتی۔ پولیس افسروں کے رویئے کو سیکولر بنانے کی بڑی ضرورت ہے اس لئے ورکشاپوں میں تمام پولیس والوں خصوصاً نیچے والوں کی تربیت کی ضرورت ہے۔ نیچے والوں کی خاص طور پر اس لئے کہ سر میدان تو انہیں ہی صورتحال سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہاں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ بعض افسر واقعی سیکولر ہیں انہوں نے فسادات کے دوران اپنے فرائض غیر جانبداری سے نبھائے کاش سری کرشنا کمیشن میں ان کا اس حوالے سے ذکر کیا جاتا۔ انہوں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض پورے کئے۔ پولیس افسروں کے ساتھ اپنے تعلقات کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے بہت سوں کو متنازعہ معاملات کے بارے میں اطلاعات ہی غلط دی گئی ہیں۔ معاملات کے بارے میں مناسب علم اور معلومات مددگار ثابت ہوتی ہیں چنانچہ فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ سیکولر اقدار اور فرقہ وارانہ چیلنج کو قبول کرنے کا اہل بنانے کیلئے ان کی تربیتی ورکشاپوں کا انتظام کیا جائے۔

(28-6- فروری 2001ء)

کانپور کے فسادات ...... لمحہ فکریہ

کانپور کے فسادات کو معمولی نہیں سمجھانا چاہئے ان فسادات کو سیکولر نظام میں ایمان رکھنے والوں کیلئے چشم کشا جاننا چاہئے۔ 1998ء میں کوئمبٹور کے فسادات اور بابری مسجد کے انہدام کے بعد کانپور میں سب سے بڑے فسادات ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بابری مسجد کے گرانے اور ممبئی کے فسادات کے بعد فرقہ وارانہ تشدد مخصوص وجوہ کی بنا پر خاصا کم ہوگیا ہے ان وجوہات پر یہاں بحث نہیں کی جارہی۔ بابری مسجد اور ممبئی کے فسادات دراصل ملک میں عرصہ سے ہونے والے فسادات کا عروج تھے۔ اس کے بعد یہ کم ہونے لگے مگر کوئمبٹور اور کانپور کے فسادات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پھر پرانا نقشہ بھرنے لگا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کے اعتبار سے اسی کی دہائی انتہائی بدترین تھی۔ اس عشرے میں 1980ء میں مراد آباد کے فسادات سے لے کر 93-1992ء کے ممبئی کے فسادات تک بڑے

بڑے بلوے ہوئے جنہوں نے قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد جو نسبتاً خاموشی آئی اس کی بنا پر لوگ تساہل میں پڑ گئے لیکن اسی کی دہائی میں بے انتہائی تشدد ہوا اس کی وجوہ میں یہ بھی ہے کہ پہلے مسز اندرا گاندھی نے محدود حد تک فرقہ واریت کا استعمال کیا اس کے جواب میں بی جے پی نے بڑے جارحانہ انداز میں اس صوبے کو آزمایا اور کانگرس کی سیاست کو ناکام بنانے کیلئے ہندوؤں کے درمیانے اور بالائی طبقے کو اپنا ہم آواز بنا کر خاصی کامیابی حاصل کی۔

اسی دہائی میں بی جے پی نے نہرو کے سیکولرازم کو نام نہاد سیکولرازم کہا۔ (یہ دوسری بات ہے کہ اس نے اقتدار میں آنے کے بعد اس قسم کے تھوتھے سیکولرازم کو اپنالیا۔) کانگرس پر الزام لگایا کہ وہ اقلیتوں کے بارے میں ترغیب، تحریص کی پالیسی چلا رہی ہے (مگر بی جے پی بھی اقلیتوں کے بارے میں اس پالیسی پر کاربند ہے۔) اس جارحانہ پراپیگنڈا میں اونچی ذات اور اونچے طبقے کے ہندوؤں میں بڑی کشش تھی وہ بہت بڑی تعداد میں بی جے پی کے پرستار بن گئے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ بے شمار مقامات خصوصاً یوپی اور بہار میں فرقہ واری کے لحاظ سے حساس علاقوں میں فسادت پھوٹ پڑے۔ رام جنم بھومی نے تو مذہبی جذبات کو اس طرح ابھارا کہ اس سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یوں تو بی جے پی کہتی ہے کہ وہ ایک مختلف قسم کی یا منفرد قسم کی جماعت ہے مگر حصول اقتدار کیلئے اس نے انتہائی بددیانتی کے ساتھ تمام فرقہ وارانہ تنازعات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

1997ء میں ایک مخلوط اتحاد میں بڑی پارٹی کے طور پر بی جے پی مرکز میں اقتدار میں آئی تو اس نے نظر بظاہر کانگرس والی سیکولر پالیسیوں پر بھی عمل شروع کیا مگر واضح رہے کہ یہ بھی ایک ''منفرد انداز'' میں۔ بی جے پی کو بڑے فساد کرانے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور نہ ہی سازش کے تحت بڑے فسادات کرائے گئے مگر اس نے فرقہ واریت کے بارے میں اپنے خفیہ ایجنڈے پر کام زور شور سے جاری رکھا۔ اس خفیہ ایجنڈے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے اس نے ہیومن ریسورسز کی وزارت اور وزارت داخلہ ایسے حساس شعبے راشٹریہ سیوک سنگھ سے متعلقہ لوگوں کو دے دیئے۔ اس کے بعد تمام یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کو راشٹریہ سیوک سنگھ اور وشوا ہندو پریشد سے متعلقہ انتہا پسندوں سے بھر دیا جواب علی الاعلان تعلیمی اداروں کو فرقہ وارانہ گیروے رنگ میں رنگ رہے ہیں۔

ان کھلی فرقہ وارانہ پالیسیوں کے باعث اقلیتوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ فرقہ وارانہ صورت میں سامنے آئے گا خصوصاً جہاں جہاں بی جے پی اقتدار میں ہے۔ کانپور ان فسادات کا مرکز ہے اس لئے اس مرتبہ یہاں فساد ہوا کانپور میں بیسویں صدی کے شروع سے ہندو مسلم فسادات ہونے لگے تھے۔ برطانوی عہد اقتدار میں یہاں بڑے بڑے فسادات ہوئے خصوصاً 1914ء اور 1932ء اور پھر بہت بڑا فساد بابری مسجد کے انہدام کا ہوا ہے۔

کانپور میں ایک طرف تو ہندو و برہمنوں کی بڑی آبادی ہے دوسری طرف مسلمانوں کی آبادی بھی خاصی ہے۔ صوبہ یوپی میں یہ شہر بدمعاشوں کا گڑھ بھی ہے۔ اس شہر میں کالا بچھا نامی بدنام بدمعاش کارروائیاں کرتا پھرتا تھا اور اس کا تعلق بی جے پی سے تھا۔ وہ بابری مسجد والے فساد سمیت بے شمار فسادات میں ملوث تھا۔

کانپور صنعتی شہر ہے اور زیادہ تر مسلمان چمڑے کی صنعتوں میں کام کرتے ہیں ان کی اکثریت ان پڑھ اور غریب ہے مگر آج کل صنعتی بحران کے باعث انہیں مشکل حالات درپیش ہیں۔ یہ سب باتیں مل کر فرقہ وارانہ فساد کیلئے چارے کا کام دیتی ہیں۔ غریب اور پسماندہ ہونے کے باعث مسلمانوں پر قدامت پسندی کا غلبہ ہے۔ زندگی میں کوئی خاص کشش نہ ہونے کے باعث انہیں مذہب کے نام پر حساس مسائل پر آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔ ان کے پاس کھونے کیلئے اپنی جان کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ایک اس وجہ سے بھی کانپور فرقہ واریت کے لحاظ سے بڑا احساس بن گیا ہے۔

کانپور اور مہاراشٹر میں اورنگ آباد، پونا اور دوسرے مقامات پر جو فسادات ہوئے وہ افغانستان میں مہاتما بدھ کے توڑے جانے والے مجسموں کے باعث ہوئے۔ ہر چند بھارتی مسلمانوں نے بامیان میں بدھ کے مجسمے توڑے جانے کی مذمت کردی تھی مگر وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے سرپھروں نے پہلے دہلی پھر امرتسر اور پٹیالہ میں قرآن شریف کو نذر آتش کیا مگر جب مسلمانوں نے اس پر سخت موًقف اختیار کیا تو پھر پریشد اور بجرنگ نے تردید کردی کہ انہوں نے قرآن شریف نہیں جلایا۔ مگر اس کے چشم دید گواہ بھی ہیں اور پھر انٹرنیٹ پر قرآن کو جلانے کی تصویریں دکھائی گئیں جو بعض مسلمانوں نے حاصل کرلیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بدھ کے مجسمے گرائے جانے پر بدھوں نے بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ مہذب انداز میں احتجاج

کیا مگر بجرنگ دل اور وشوا ہندو پریشد کے ہندو جنونیوں نے قرآن شریف جلانا شروع کر دیا۔ ہندوؤں کے مقابلے میں اصل غصہ تو بدھوں کو آنا چاہئے تھا۔

1977ء کی ایمرجنسی میں جماعت اسلامی کے رہنما گرفتار کر لئے گئے تو کٹر مسلمان جوانوں نے ایس آئی ایم آئی سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا بنالی اس کے تیس سال تک کے مسلمان رکن بن سکتے ہیں۔ یہ طلباء خاصے تنگ نظر اور کٹر قسم کے ہیں انہیں بڑی آسانی سے طیش دلایا جاسکتا ہے چونکہ نوجوان ہیں اس لئے انہیں نہ نتائج کا خوف ہے نہ ذہنی افق وسیع۔

کانپور اور مہاراشٹر میں فسادات اس وقت ہوئے جب سیمی (ایس آئی ایم آئی) نے قرآن کی بے حرمتی کے خلاف احتجاجی مظاہرے کئے۔ کانپور کی انتظامیہ کا کہنا ہے کہ سیمی والوں کے پاس جدید قسم کے ہتھیار بھی تھے مگر سیمی کے لیڈر اس سے انکار کرتے ہیں۔ جلوس کے ساتھ ڈیوٹی پر ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ بھی تھا اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ گولی ایک مسجد کے اندر سے چلائی گئی اور جس رائفل سے گولی چلائی گئی وہ پاکستان کے ادارے آئی ایس آئی نے فراہم کی تھی سیمی کے آئی ایس آئی سے تعلقات ہیں۔

ان الزامات کی تصدیق کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ صرف مقرر عدالتی تحقیقات ہی سچائی کو ثابت کر سکتی ہیں مگر دوسرے چھوٹے چھوٹے فسادات کی طرح اس فساد کا سچ بھی شاید دریافت نہ ہو سکے۔ یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ صورتحال پولیس کی اندرونی دھڑے بندی کے باعث بھی خراب ہوئی خصوصاً انسپکٹر جنرل اور ان کے ڈیوٹی افسر کے درمیان جھگڑا تھا اور دونوں کی بول چال بھی بند تھی۔ جب فساد شروع ہوا تو آئی جی صاحب بیڈمنٹن کھیل رہے تھے اور انہوں نے موقع پر پہنچنا ضروری نہیں سمجھا اور پھر فساد شدت اختیار کر گیا۔

پی اے سی مسلمانوں کی دشمنی میں بڑی بدنام ہے اور گولی چلانے کی شوقین بھی۔ صورتحال پر قابو پانے کیلئے اسے بلایا گیا اور پھر نتائج تو ظاہر تھے۔ اس نے مسلمانوں پر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ بیس افراد ڈھیر ہو گئے بہت سے زخمی ہوئے۔ پی اے سی کی مسلمان دشمنی کا سب کو علم ہے مگر یو پی میں فسادات فرو کرانے کیلئے اسے ہی بلایا جاتا ہے۔ 1987ء کے ضلع میرٹھ میں ہاشم پورہ اور ملیانا کے فسادات میں اس نے متعدد مسلمان جوانوں کو مار دیا تھا قتل کی ان وارداتوں کے بارے میں ملایم سنگھ یادیو کی حکومت سمیت کسی حکومت نے

آج تک کوئی کارروائی نہیں کی۔ نہ ہی کبھی یہ کارروائی ہوگی۔ یو پی کی راج ناتھ سنگھ کی حکومت نے فوج بلانے سے انکار کر دیا تھا پی اے سی کو بھیجا جس نے بالا رادہ لوگوں کا نشانہ لے کر گولیاں چلائیں ان معصوموں میں بعض راہ گیر بھی مارے گئے۔

سیمی کے لیڈروں کا کہنا ہے کہ وہ ان فسادات کے ذمہ دار نہیں کیونکہ وہ مکمل طور پر غیر مسلح تھے۔ ذمہ دار پولیس ہے جس نے غیر مسلح لوگوں پر گولیاں چلا کر آگ پر تیل چھڑک دیا یہ آدھا سچ ہوسکتا ہے مگر سیمی فسادات سے بری الذمہ نہیں ہوسکتی۔ اسے اس قسم کے جلوس نکالنے کے نتائج کا علم ہونا چاہئے تھا۔ اصل میں فرقہ وارانہ فضا کے پیش نظر اس قسم کا جلوس نکالنے کی ضرورت ہی نہیں تھی مگر پرانے طریقے سے کلکٹر کے نام ایک یادداشت دے کر یا صوبے کے گورنر سے ملاقات کر کے بھی یہی مقصد حاصل کر سکتے تھے۔ تاہم جذبات میں آجانے والے نوجوان طلباء نے گلیوں میں احتجاج کو ترجیح دی جس سے صورتحال اتنی خراب ہوئی کہ ان کے کنٹرول سے باہر ہوگئی۔

سیمی کے نوجوان لیڈروں سے زیادہ دانائی کی توقع نہیں کی جاسکتی مگر سینئر لیڈروں کو تو جاننا چاہئے اور ان جذبات نوجوانوں کو قابو میں رکھنے کے لیے کچھ بروقت کرنا چاہئے اگر یہ نوجوان بزرگوں کی بات نہیں سنتے تو پھر ان کے غیر دانشمندانہ اقدام سے علی الاعلان لاتعلقی کا اعلان کرنا چاہئے اگر کچھ جنونی مقدس کتاب کو آگ لگا دیتے ہیں تو اس طرح اس کی عظمت کو تو کم نہیں کیا جاسکتا ان جنونیوں نے مسلمانوں کو طیش دلانے کے لیے قرآن شریف جلایا اور مسلمان مشتعل ہو کر دراصل انہی کے ہاتھوں میں کھیل گئے۔

سیکولر طاقتوں کو یو پی میں کانپور اور مہاراشٹر میں اورنگ آباد اور پونے (اگرچہ مہاراشٹر میں بھی فساد کانپور جیسا ہی شدید تھا) کے فسادات سے آنکھیں کھولنی چاہئیں اور فرقہ واریت کے دوبارہ سر اٹھاتے بھوت کے مقابلے کے لیے خود کو سرگرم کار کرنا چاہئے۔ غیر فعال نہیں رہنا چاہئے۔ رشوت کے بارے میں تہلکہ کے تیار ٹیپوں سے غالباً فرقہ واریت کو ہوا ملے گی۔ سیاستدان اس طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے پھر فرقہ وارانہ فساد کروا سکتے ہیں اور اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی ملک میں فرقہ وارانہ صورتحال کو معمولی مسئلہ نہیں سمجھا جانا چاہئے سنگھ پریوار کے بعض ارکان فرقہ واری کا زہر زور شور سے پھیلا کر ملک کو دھماکہ خیز بنا رہے ہیں۔ وہ تمام لوگ جو ملک

کی سالمیت اور اتحاد کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں انہیں سیکولر اقدار کے فروغ اور فرقہ واری کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے سرگرم ہونا چاہیے۔

(15۔ جولائی 2001ء)

بمبئی کے فسادات میں ملوث پولیس افسروں کے لیے سزا

ہت دیر کی سوچ بچار، جھجک کے بعد مہاراشٹر کی حکومت نے سری کرشنا رپورٹ پر بہت آہستہ آہستہ عمل کرنا شروع کیا ہے اگرچہ پوار کی نیشنل کانگرس پارٹی نے اپنے منشور میں وعدہ کیا تھا کہ وہ چند ماہ کے اندر اس رپورٹ کے مطابق کارروائی شروع کردے گی مگر اقتدار میں آنے کے بعد اس نے طویل عرصہ تک اپنے آپ کو لاتعلق رکھا تاہم بعض اقلیتی تنظیموں، انسانی حقوق اور این جی او کے شدید دباؤ کے تحت اس نے آغاز کار کیا ہے۔ کیس پر سپریم کورٹ میں تھا اور مہاراشٹر کی حکومت نے رپورٹ پر عمل کرنے کا حلف نامہ داخل کیا تھا۔

ہر چند مہاراشٹر کی حکومت اس ضمن میں انتہائی سست رفتاری سے چل رہی ہے شوسینا نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ رپورٹ پر عملدرآمد کرانے کیلئے بمبئی ہائیکورٹ سے رجوع کرے گی۔ اس کا مؤقف یہ ہے کہ جب شیوسینا اور بی جے پی کی حکومت ایک بار اسے مسترد کرچکی ہے تو پھر اس کے بعد آنے والی حکومت کیسے اس پر عملدرآمد کرسکتی ہے۔ شیوسینا نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ وہ عوام کو بتائے گی کہ حکومت مسلمانوں کے ووٹوں کی خاطر انہیں خوش کرنے کیلئے رپورٹ پر عمل کرنا چاہتی ہے یہ ہندی، مراٹھی اور انگریزی میں ہزاروں کتابچے چھاپے گی۔ یوں دیکھیں تو یہ معاملہ کس قدر گمبھیر ہوگیا ہے یہ ساری صورتحال اصلاً سیاسی نوعیت کی ہے۔ اس پر عملدرآمد سے حکومت کو اس حزب مخالف کے بہت بڑے چیلنج کا سامنا ہے جو 93-1992ء کے بمبئی کے فسادات کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

سری کرشنا کمیشن رپورٹ میں پولیس افسروں کیخلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں ان کا جائزہ لینے کیلئے مہاراشٹر کی حکومت نے ٹاسک فورس قائم کردی ہے۔ کمیشن نے ان 32 سینئر اور جونیئر پولیس اہلکاروں کا ذکر کیا ہے جن پر الزام ہے کہ انہوں نے اقلیت کے خلاف نہ صرف متعصبانہ رویہ رکھا بلکہ خود اقلیتی افراد کو قتل بھی کیا۔ اصل میں بمبئی پولیس کو بذات خود ان

افسروں کو چارج شیٹ دے دینی چاہئے تھی کیونکہ یہ الزامات بمبئی ہائی کورٹ کے موجودہ جج نے لگائے تھے اوران کی بات کو معمولی بات نہیں سمجھا جاسکتا۔ تاہم معاملہ کو مزید تاخیر میں ڈالنے کیلئے الزامات کا جائزہ لینے کی خاطر ایک ٹاسک فورس بنادیگئی ۔ ٹاسک فورس نے بھی خاصا وقت لیااور جب این جی او نے فوری اقدام کا مطالبہ کیا تو اسے کہہ دیا گیا کہ ابھی ٹاسک فورس ان کا جائزہ لے رہی ہے۔

ابتدائی طور پر کچھ کانسٹیبلوں کو معطل کیا گیا تھا مگر آر ڈی تیا گی ایسے سینئر افسروں کیخلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تیا گی کو پولیس کا ڈائریکٹر جنرل بنایااور پھر وہ ریٹائر بھی ہوگئے ۔اب حال میں ہی بمبئی پولیس نے ان کیخلاف ایف آئی آر درج کروائی ہے کہ انہوں نے بمبئی کے فسادات کے دوران محمد علی روڈ پر بیکری کے نو کارکنوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا لیکن انہیں گرفتار نہیں کیا گیا۔

ایف آئی آر کا آخری پیرا یوں ہے''ملزموں کو جو اختیارات دیئے گئے انہوں نے ان کا ناجائز استعمال کیا کہ نو بے گناہوں کو قتل کردیا جن پر یہ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بیکری میں مجرمانہ کارروائی کرنے کیلئے بیٹھے تھے ۔ایف آئی آر میں کہا گیا کہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے پردے میں مبینہ ملزموں نے ایسی کارروائی کی جن کا ان کو اختیار ہی نہیں دیا گیا تھا۔''

ایف آئی آر پندرہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے آخر میں تیا گی وغیرہ کیخلاف مہاراشٹر کی حکومت نے ایف آئی آر درج کراتے ہوئے ان پر نو افراد کو بالاارادہ قتل کرنے اور دسویں کو مارنے کی کوشش کرنے کا الزام درج کیا ہے۔ یہ واقعہ 9 جنوری 1993ء کو صبح ساڑھے نو بجے ہوا۔ایف آئی آر میں درج ہے کہ تیا گی نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ (مسلمان بیکری) کے اندر جائیں ۔دروازے توڑ دیئے گئے اور تمام مبینہ ملزم (پولیس افسر) اندر چلے گئے وہ ''اسٹین گن'اے کے 47 اور کاربینوں سے لیس تھے ۔ تیا گی نے کہا کہ اس نے بیکری پر مکمل کنٹرول حاصل کرلیا سری کرشنا کمیشن کے مطابق تیا گی کے پاس 9 جنوری 1993ء کو نو غیر مسلح بے گناہ بیکری ورکروں کو مارنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ پھر تیا گی اکتوبر 1995ء کو ممبئی پولیس کمشنر بنائے گئے اور بال ٹھاکرے کے اشارے پر شیوسینابی جے پی کی مخلوط حکومت نے تیا گی کو اس اعلیٰ عہدے پر ترقی دی ۔اس تقرری میں اہم کردار فرقہ واریت کا بھی ہے ۔دراصل پولیس والوں کو یہ خفیہ

پیغام دیا گیا تھا کہ جو ایک اقلیت کے بے گناہ لوگوں کو مارے گا اسے انعام دیا جائے گا اور تعجب کی بات نہیں کہ ریٹائر ہونے کے بعد تیاگی نے شوسینا میں شمولیت اختیار کر لی اور شوسینا کی حمایت سے راجیہ سبھا کا الیکشن بھی لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ اقلیتوں کے خلاف شدید تعصب رکھنے والے افسروں کو اس طرح سے نوازا گیا۔ یہ واقعہ نہ تو پہلی بار ہوا ہے اور نہ ہی صرف شیوسینا کی حکومت میں بلکہ کانگرس حکومت کے دوران بھی انکوائری کمشنوں نے جن پولیس افسروں کی سرزنش کی تھی ان کو اعلیٰ عہدوں پر ترقی دی گئی۔ مہاراشٹر میں کانگرسی حکومت نے 1970ء کے بھونڈی اور جلگاؤں کے فسادات کی انکوائری کیلئے مادھون کمیشن بنایا تھا سری کرشنا کمیشن کی طرح مادھون کمیشن نے بھی پولیس کے کردار پر کڑی نکتہ چینی کی تھی اور کچھ افسروں کا نام لے کر کہا تھا کہ وہ مذہبی تعصب رکھتے ہیں۔

جسٹس مادھون نے رپورٹ کی جلد اول میں لکھا۔ ''اس انکوائری کے دوران ہم نے مشاہدہ کیا کہ سینئر افسروں سمیت پولیس والوں نے اپنے اپنے سینئر کو غلط رپورٹیں دیں اس طرح اپنے سینئر اور ان کے ذریعے حکومت کو گمراہ کیا......ایک متعلقہ پولیس افسر کو وارننگ دی گئی مگر وارننگ کافی نہیں جو افسر بھی غلط رپورٹ دینے کا ذمہ دار ہے اس کے ساتھ سختی سے نمٹنا چاہئے۔ مادھون رپورٹ میں مالیگاؤں کے انسپکٹر ساونت کا ذکر ہے جس نے تیواڑی کی طرح خود ہجوم کو ہاجرہ بیگم کے گھر تک لے جا کر اسے آگ لگوائی تھی جس میں اس کے تین بچے مر گئے۔ ساونت کے خلاف اس وقت تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی جب تک کہ خود ہاجرہ بیگم اندرا گاندھی سے نہیں ملیں۔ اندرا گاندھی کے کہنے پر ساونت کو معطل کیا گیا اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے آگے کوئی کارروائی نہیں ہوئی اور اسے بحال کر دیا گیا تھا۔

پھر ہاشم پورہ اور ملیانہ کے واقعات تو سبھی کو معلوم ہیں اس لئے اسے دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاشم پورہ سے 23 نوجوان پکڑ کر ٹرک میں ڈالے گئے اور میرٹھ شہر سے تھوڑا سا باہر کی طرف نہر کے پاس انہیں گولی مار دی گئی ان میں سے یہ واقعہ بتانے کیلئے صرف ایک لڑکا زندہ رہ گیا گولیاں پی اے سی کے جوانوں نے چلائیں اور آرڈر ان کے کمانڈنٹ ترپاٹھی نے دیا تھا۔ مگر کئی سالوں تک ترپاٹھی اور پی اے سی کے جوانوں کیخلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور ایف آئی آر بھی انسانی حقوق کے کارکنوں کے شدید دباؤ پر اس وقت درج کی گئی جب ملائم

سنگھ یادیوصوبے کے وزیراعلیٰ بنے۔اس کے بعد کچھ نہیں ہوا۔ملزموں کومعطل تک نہیں کیا گیا۔ آر ڈی تیا گی اوران کے ساتھیوں نے ممبئی کی مسلمان بیکری میں نو بے گناہ کارکنوں کوقتل کردیا تھا۔انہیں سالوں تک کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایاپی اے سی کے کمانڈنٹ کے خلاف ایف آئی آر لکھوانا تو بہت ہی دشوار کام تھا۔

یوں مختلف فسادات اور مختلف کمشنوں کی رپورٹوں سے بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ بڑے فساد کے بعد کمیشن بنانا ایک معمولی سا بن گیا ہے اور جب کمیشن کی رپورٹ حکومت کودی جاتی ہے اسے صرف رسم کے طور پر قبول کر کے داخل دفتر کر دیا جاتا ہے۔ ممبئی 93-1992ء کے فسادات کے بارے میں سری کرشنا کمیشن رپورٹ کا مقصد یہ ہے کہ اس سب انسانی حقوق کے کارکنوں اوراین جی او نے دلچسپی لی اور اس پر عملدرآمد کیلئے زور ڈالتی رہیں۔اسی دباؤ کے باعث یہ معاملہ ہاتھ میں لیا پی آئی ایل نے سپریم کورٹ میں بتایا کہ مہاراشٹر کی سرکار نے رپورٹ پر عملدرآمد کیلئے کچھ اقدامات کئے ہیں مگر ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

اب اہم ترین سوال یہ ہے کہ تیا گی اور دوسروں کیخلاف جو ایف آئی آر درج ہوئی اس کے تحت ان کی گرفتاری عمل میں آئی ہے یانہیں۔ پولیس کمشنر کا کہنا ہے کہ ان کو گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں اس معاملہ پر وکیلوں کی رائے میں بھی اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ ان کو گرفتار کیا جانا چاہئے وکیل اوران کی حقوق کے کارکن کولن کنسلو یز کا کہنا ہے کہ جرم کی سنگینی کے باعث اب جبکہ ایف آئی آر درج ہوگئی تو پھرانہیں خود بخود گرفتار کرلیا جانا چاہئے تھا۔صوبے کی حکومت کوان مبینہ ملزموں کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔اگر گرفتاری نہیں کی گئی تو قانون اور عدالت سے انصاف اٹھ جائے گا۔

دوسری طرف کچھ اور وکیل کہتے ہیں کہ جب تک تیا گی کے خلاف کوئی براہ راست شہادت نہیں ہے اس وقت تک اسے گرفتار کرنا ضروری نہیں (اس ضمن میں سری کرشنا کمیشن کی رپورٹ براہ راست گواہی سے بھی زیادہ معتبر گواہی ہے۔) ان وکیلوں کا کہنا ہے کہ پولیس تیا گی وغیرہ کو گرفتار کرسکتی ہے لیکن گرفتاری ان کا سرکاری فرض نہیں ہے کیونکہ سپریم کورٹ کے اس بارے میں کچھ خاص مشاہدات ہیں تیا گی کے خلاف پہلے بھی ممبئی کی عدالت میں ایک مقدمہ زیر سماعت ہے اور کہا جاتا ہے کہ 10 جون کی پیشی کے بعد اسے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

بعض پولیس آفیسر کہتے ہیں کہ تیاگی کی گرفتاری سے پولیس والوں کی حوصلہ شکنی ہوگی اور اس کے نتائج صحیح نہیں نکلیں گے۔ اس کا غلط مطلب لیا جائے گا۔ شیوسینا کے مطابق وزیر رائے کا کہنا ہے کہ (اگر ایسا کیا گیا تو) پولیس والے مجرموں کیخلاف کارروائی نہیں کریں گے۔ اپنی پارٹی پالیسی کو محفوظ رکھتے ہوئے انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ 93-1992ء کے ممبئی کے فسادات کے سلسلے میں تیاگی کی گرفتاری کا مطالبہ دراصل اقلیتوں کی خوشامد ہے۔

یہ دلیل کہ تیاگی کو گرفتار کرنے سے غلط مطلب لیا جائے گا اور پولیس آیندہ مجرموں کیخلاف کارروائی نہیں کرے گی عقل سے عاری ہونے والی بات ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ منصف افسروں کو بے گناہ اقلیتوں کو قتل کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے؟ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ بہت سے پولیس افسر (مگر سارے ایسے نہیں) مذہبی لحاظ سے متعصب ہیں اور یہ لوگ ایک مخصوص اقلیت کے بے گناہ لوگوں کو نظم ونسق اور امن وامان بحال رکھنے کی آڑ میں قتل کرسکتے ہیں۔ ممبئی کے فسادات کے دوران مسلمان بیکری کے کارکنوں کے ساتھ یہی ہوا تھا مگر کسی افسر کے خلاف اس بات کا معقول ثبوت ہے کہ وہ بعض لوگوں کی لوٹ کا سبب بنا تو پھر قاعدہ قانون کے مطابق ایسے افسر کے خلاف کارروائی کی جانی چاہئے چنانچہ جسٹس سری کرشنا کمیشن میں تیاگی وغیرہ کیخلاف کارروائی کیلئے خاصا جواز موجود ہے۔

سری کرشنا رپورٹ میں شوسینا کے بہت سے ایسے لیڈروں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جنہوں نے فسادات کروائے۔ ایسے لیڈروں کو گرفتار کرکے ان کیخلاف کارروائی کی جانی چاہئے۔ لگتا ہے کہ مہاراشٹر کی حکومت نے جو ٹاسک فورس بنائی وہ بہت سست ہے جبکہ کارروائی زیادہ تیزی سے کرنے کی ضرورت ہے۔ رپورٹ پر عملدرآمد میں کئی برسوں کی دیر ہوگئی۔ جب یہ رپورٹ حکومت کو دی گئی تھی اس وقت ابھی اس پر فوری عمل کی ضرورت تھی۔ جب تحقیقات جاری نہیں تھی ایمنسٹی انٹرنیشنل نے تجویز دی تھی کہ ایک عارضی رپورٹ تیار کی جائے اور مہاراشٹر کی سرکار اس پر عملدرآمد شروع کردے۔ تیاگی کی گرفتاری کے بارے میں معروف وکیلوں کی رائے میں اختلاف ہے۔

(15-1 جولائی-2001ء)

مالیگاؤں کے فسادات......تشدد کا نیا دور

MashalBooks.org

26 اکتوبر 2001ء کو جمعہ کی نماز کے بعد سہ پہر کو اچانک فرقہ وارانہ تشدد کے شعلے بھڑک اٹھے جس سے شہر ہل گیا۔ فرقہ وارانہ فساد کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق انتخابات کے اعلان کے ساتھ بھی ہے۔ چند ماہ بعد میونسپل کونسل مالیگاؤں (جس کو جلد ہی کارپوریشن قرار دیا جانا ہے۔) کے انتخابات ہونا قرار پائے ہیں۔ دوسرے شہروں میں بھی بلدیاتی الیکشن کا اعلان ہوگیا اس لئے پارٹیاں اور امیدوار اپنے ووٹوں کے بارے میں متفکر ہیں منتخب نمائندوں کے ذریعے قیام حکومت کیلئے بھی لوگوں کو قیمت دینی پڑتی ہے۔

مالیگاؤں کے فسادات 93-1992ء کے ممبئی کے فسادات کے بعد سب سے بڑے اور المناک ثابت ہوئے۔ یہ نہیں کہ جیسا کہ ایک تبصرہ کرنے والے نے کہا کہ 93-92ء کے بعد شیوسینا اور بی جے پی کی حکومت میں فسادات ہوئے ہی نہیں۔ ان کے دور حکومت میں کئی فسادات ہوئے مگر یہ بیان کرنا لازم ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد کے عرصہ میں مہاراشٹر میں مالیگاؤں میں سب سے بڑا بلوہ ہوا۔

مالیگاؤں ضلع ناسک میں مسلم اکثریت والا تعلقہ ہے۔ آبادی آٹھ لاکھ کے قریب ہے جس میں 60 فیصد مسلمان ہیں اکثر مسلمان 1857 میں یو پی اور بہار سے ہجرت کر کے آئے تھے کیونکہ وہاں بغاوت کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم ڈھائے گئے تھے یہ لوگ بڑے غریب اور ان پڑھ ہیں شاید ہی کسی حکومت نے ان کے معاشی حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہو۔ البتہ ہر حکومت نے ان کو ووٹوں کی خاطر استعمال کیا۔ ایک سروے کے مطابق مسلمانوں میں ٹی بی کا مرض بہت ہے۔ واضح رہے کہ بھونڈی کی طرح مالیگاؤں بھی پاورلومز کا بڑا مرکز ہے۔

مالیگاؤں کے فسادات کی ایک وجہ تو آنے والے الیکشن ہیں جن کا اعلان ہونے والا ہے۔ دوسری وجہ نیویارک امریکہ میں 11 ستمبر کے واقعات ہیں۔ بھارت کے دوسرے مسلمانوں کی طرح مالیگاؤں کے مسلمان بھی امریکہ سے بہت ناراض تھے کہ اس نے نیویارک کے ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں پینٹا گون پر حملوں سے مشتعل ہو کر افغانستان پر اندھا دھند (کارپٹ) بمباری شروع کردی۔ مسلمانوں نے امریکہ اور برطانیہ کے بارے میں اپنی نفرت کے اظہار کیلئے امریکی اور برطانوی سامان خصوصاً کوکا کولا اور پیپسی کولا کا بائیکاٹ کرنے کی

اپیل کی۔ دیوبند اور یو پی کے دوسرے شہروں سے مسلمان عالموں نے سارے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں سے ان مشروبات کے بائیکاٹ کی اپیل کی۔ بہت سے مسلمان ہوٹلوں میں ان مشروبات کی فروخت بند کر دی گئی جمعہ کے روز نوجوانوں کے ایک گروپ نے نماز کے بعد شہر میں اسی ضمن میں ایک پمفلٹ تقسیم کرنا شروع کر دیا۔

پمفلٹ میں نہ تو کوئی فرقہ وارانہ بات تھی نہ کوئی اور اختلافی بات نہ ہی 11 ستمبر کو نیویارک میں دہشت گردوں کے حق میں کوئی بات اس میں صرف امریکی اور برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ کی اپیل کی گئی تھی ضلعی انتظامیہ نے شہر کے تمام حساس علاقوں میں پولیس کا بندوبست کر رکھا تھا۔ مالیگاؤں کا مہاراشٹر کے فرقہ وارانہ اعتبار سے حساس ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے چنانچہ حکام کسی صورت کوئی خطرہ لینے کیلئے تیار نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے بندوبست سخت کر دیا۔

صوبے کی ریزرو پولیس کے کانسٹیبل نے ایک لڑکے سے پمفلٹ چھین کر اس کی گوشمالی بھی کی ایک دوسرے بیان کے مطابق کانسٹیبل نے اسے تھپڑ بھی مارے اور گرفتار بھی کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ لڑکے نے پولیس والے کو پمفلٹ دینے سے انکار کر دیا۔ اب مسجد سے باہر آنے والے نمازیوں نے بھی احتجاج شروع کر دیا اور پولیس سے جھڑپیں شروع ہو گئیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہی پمفلٹ شہر میں ہفتہ پہلے بھی تقسیم کیا گیا تھا اور اس دوران تقسیم کیا جاتا رہا تھا۔ بتایا گیا ہے کہ جامع مسجد کے امام مفتی محمد اسماعیل اور ایک وکیل شعیب نے درمیان میں آ کر لوگوں سے پرامن طریق سے اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کا کہا۔ بات صاف ہے اگر پولیس نے معقول طریقے سے پمفلٹ کیلئے کہا ہوتا اور طاقت نہ استعمال کی ہوتی تو یہ دنگا نہ ہونا تھا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پہلے پولیس نے پمفلٹ مانگا جب انکار کیا گیا تو پولیس نے طاقت استعمال کرنا شروع کر دی اصل میں ڈیوٹی پر موجو پولیس کا یہ کام ہی نہیں کہ وہ پمفلٹ کا مطالبہ کرے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس والا بڑی آسانی سے یہ پمفلٹ لے سکتا تھا نہ کہ ریزرو پولیس کا کانسٹیبل زبردستی پمفلٹ حاصل کرتا اور اس وجہ سے اتنا خون خرابہ ہوتا۔

شہر میں پولیس اور امریکہ دونوں کے خلاف شدید غم وغصہ تھا۔ ایس پی سریش آہیر مزید کمک لے کر پہنچا اور مقامی کانگرسی ایم این اے شیخ رشید سے بھی لوگ یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ

MashalBooks.org

پمفلٹ چھیننے اورلڑکے کوگرفتار کرنے پر پولیس معذرت کرے۔ جب ہجوم زیادہ بے چین ہورہا تھا پولیس نے شدید لاٹھی چارج شروع کردیا بہت سے لوگ زخمی ہوگئے اورانہوں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کردیا۔لوگ محمد علی روڈاورقدوائی روڈ کی طرف بھاگے وہاں بھی پولیس سے مقابلہ ہوگیا۔ پتھراؤ شروع ہوگیا اور کہا جاتا ہے کہ پولیس والوں سمیت بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔

اس کے بعد پولیس نے محمد علی روڈ کی طرف گولی چلانی شروع کردی نوراؤنڈ چلائے سات افراد زخمی ہوئے تین مرگئے ان میں سے ایک اٹھارہ سالہ نوجوان تھا جس کے سر میں گولی لگی دوسرا اٹھیس سال کا تھا جسے ناف کے اوپر گولی لگی تھی اور تیسری ایک خاتون بلقیس بانوتھی 45 برس کی جوچھت پر کپڑے سکھانے کیلئے ڈال رہی تھی گولی اس کے سینے میں لگی اسے فاران ہسپتال میں داخل کرایا گیا وہیں جاں بحق ہوئی۔ دیکھا آپ نے کہ تینوں کے تینوں کوگولی کمر سے نچلے حصے میں نہیں اوپروالے حصے میں لگی۔

آگے بڑھنے سے پہلے کچھ پولیس کے کردارک بارے میں پولیس خصوصاً ماتحت ملازمین کے بارے میں دیکھا گیا ہے کہ وہ اکثر معاشرے کے کمزورطبقوں خصوصاً اقلیتوں، قبائل اوردلت پرکھل کرگولیاں چلاتے ہیں۔ان کی نظر میں انسانی حقوق کی کوئی حیثیت نہیں نہ انسانی زندگی کی۔ جب پولیس والے ان طبقوں پرگولی چلاتے ہیں توانہیں ہلاک کرنے کی نیت سے چلاتے ہیں۔ کچھ سال پہلے گھٹکوپار میں سب انسپکٹر نے ایسے ہی گولی چلائی تھی اس رات کئی آدمی مارے گئے تھے۔ یہ ہے ایک اورثبوت پولیس کے کمزورطبقوں کے بارے میں رویئے کا گندپور کمیشن نے بھی کہا کہ فائرنگ بہت زیادہ کی گئی۔ پھر ہمارے پاس سری کرشنا کمیشن کی رپورٹ بھی تو ہے جس نے بڑی ہی محنت سے ایک ایک تھانے کی پولیس کے رول کے بارے میں معلوات اکٹھی کیں اورنتیجہ نکالا کہ پولیس اکثر مواقع پر بالارادہ مسلمانوں کوقتل کرنے کی مجرم ٹھہری۔

اگرحکومت نے انسانی زندگی کے ادب واحترام کیلئے پولیس کوتربیت نہ دی توپھر ماضی کی طرح پولیس ہنگامے اورفساد میں اسی طرح زیادتی کرتی رہے گی۔تاہم پولیس کے مسلسل ظلم و ستم کے باوجود ابھی تک ادھرتوجہ نہیں دی گئی یہ سچ ہے کہ انڈین پولیس سروس میں اعلیٰ درجے کے دیانتدارافسر موجود ہیں مگران کی تعداد بہت کم ہے۔ مثلاً مالیگاؤں میں بالی نام کا ایڈیشنل

ڈائریکٹر پولیس صورتحال پر قابو پانے کیلئے بھیجا گیا۔ یہ بہت صاحب کردار افسر ہے اس نے 1992-93ء میں بھونڈی میں فسادات پر قابو پایا تھا لیکن اسے دیر سے بھیجا گیا تھا۔ جب مالیگاؤں میں اسے بھیجا گیا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

فائرنگ کے بعد ہجوم زیادہ مشتعل ہو گیا دریں اثنا سات افراد کو کمر سے اوپر گولیاں لگ چکی تھیں اشتعال اور بڑھا محمد علی روڈ پر فائرنگ چار بجے کر پانچ منٹ پر شرع ہوئی وہاں سے ہجوم دریا عبور کر کے دوسری اطراف میں پھیل گیا اور پھر اکثریی فریق کی دکانیں اور جائیداد لوٹنے اور آگ لگانے لگا جواب میں اکثریتی فریق نے بھی مسلمانوں کی دکانیں اور جائیداد کو آگ لگائی۔ مالیگاؤں میں شوسینا کی تنظیم ہے جس کا مقامی نام جنتا راج ہے جس پر تھانے گروپ کے آنند ڈگھے سب گروپ کا قبضہ ہے۔ اس نے ہندوؤں کو مسلمانوں پر حملے کیلئے اکسایا۔ اخبار سنسار نے حسب معمول اشتعال انگیز مضامین چھاپے اور یہاں تک لکھ دیا کہ اگر مسلمان مالیگاؤں شہر میں اکثریت میں ہیں تو ہماری اکثریت دیہات میں ہے۔

26 اکتوبر 2001ء کو شام چار بجے سے سات بجے تک دانا بازار، گل بازار، کرانہ بازار، شاستری چوک، نیالی نگرا اور محمد علی روڈ پر آتش زنی کے بے شمار واقعات ہوئے۔ اکثریتی فرتے کے فرقہ پرست عناصر نے شہر کے اندر اور شہر سے باہر سمک سیر سوئی گاؤں اور دوسرے مقامات پر جذبات کو اشتعال دلانا شروع کیا وراس کے ساتھ ہی طرح طرح کی افواہیں پھیلا دیں سمک سیر میں مسلمانوں کی جائیدادیں لوٹی گئیں اور نذر آتش کی گئیں اب دونوں طرف کے سماج دشمن عناصر نے علی الاعلان جائیدادیں لوٹنا، برباد کرنا اور آگ کی نذر کرنا شروع کر دیں چاقو زنی کی دو وارداتیں ہوئیں۔ مرنے والوں میں بارہ مسلمان دو ہندو تھے اور ایک کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔

لوٹ مار آتش زنی اور غارت گری 3 نومبر تک جاری رہی۔ نازک حالات کے باعث سخت کرفیو لگا دیا گیا۔ 2 نومبر کو دن کے وقت کرفیو میں کچھ رعایت دی گئی۔ پھر فرقہ وارانہ فساد ہو گیا جس میں پولیس کی فائرنگ سے 15 افراد مارے گئے 12 زخمی ہوئے اور 477 افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ہم نے لوگوں کو قتل کرنے کی دردناک داستانیں سنی ہیں۔ ایک شخص خلیل جو امن کی بحالی کیلئے کام کیا کرتا تھا اسے گھر میں بہانے سے بلایا گیا کہ ہنگامہ ہو رہا ہے۔ وہ اسے ختم کرائے اور پھر اسے ہی قتل کر دیا گیا۔ شر پسندوں نے پانی کے پائپ توڑ دیئے جس وجہ سے

مالیگاؤں کئی دن تک پانی سے محروم رہا۔ یہ افواہ بھی اڑی کہ دودھ میں زہر ملا دیا گیا ہے چنانچہ کئی لوگ دودھ سے محروم رہے۔

اردگرد کے دیہات اور نواحی علاقوں میں مسلمانوں کا زیادہ نقصان ہوا۔ رسول گاؤں اور معروف قصبہ دیولا اور کالوان میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ صرف مالیگاؤں میں پندرہ کروڑ روپے کا مالی نقصان ہوا۔ دوسرے علاقوں میں نقصان کا اندازہ دو کروڑ روپے کا ہے بعض اندازوں کے مطابق نقصان اس سے بہت زیادہ ہوا تھا۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ فسادات انتخابی عداوت کے باعث ہوا جو کانگرس کے موجودہ ایم ایل اے اور جنتا دل سیکولر کے نہال احمد کے درمیان موجود ہے اس میں شک نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں اور کانگرسی ایم ایل اے عبدالرشید نے یہاں تک کہا کہ نہال احمد نے مسلمانوں کو اکسایا جس کے بعد فساد شروع ہوا۔ نہال احمد انکاری ہیں یہ سچ ہے کہ نہال احمد نے 19 اکتوبر (پچھلے جمعہ کے روز) کو افغانستان میں ہونے والی جنگ کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا تھا جس میں بہت سے مسلمان شریک ہوئے اور بعض نے اسامہ بن لادن کی تصاویر بھی اٹھا رکھی تھیں۔ نہال کا کہنا ہے کہ تصاویر اٹھانے والے نوجوان ان کے کنٹرول میں نہ تھے نہ ہی انہوں نے ان کو جلوس میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مالیگاؤں میونسپل کونسلروں کے الیکشن غالباً دسمبر میں ہونے والے ہیں اور سیاستدانوں کو اپنے ووٹروں کے جذبات کا خیال بڑھتا جا رہا ہے۔ عبدالرشید اور نہال احمد دونوں کی نظر الیکشن پر تھی اور دونوں اپنے ووٹروں کے جذبات کے مطابق رویہ رکھنا چاہتے تھے بہرطور ہم سب کے سوچنے کا مقام ہے۔ انتخابات مگر کس قیمت پر؟ کیا ہمیں اب تک اپنے ووٹروں کے جذبات کو بھڑکانے کی پرانی سیاسی روش کو اختیار کئے رکھنا چاہئے؟ کیا انتخابات صرف فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہی لڑے جا سکتے ہیں۔ یو پی میں الیکشن ہونے والے ہیں اس لئے بی جے پی والے پھر ایودھیا کے حوالے سے جذبات کو ہوا دے رہے ہیں۔ بی جے پی دہشت پسندوں کے مسئلہ سے پوری طرح فائدہ اٹھا رہی ہے۔ پوٹو کا قانون بنا رہی ہے اور اس قانون کو دہشت پسندوں کیخلاف ہندوؤں کے جذبات کے حوالے سے جائز ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کانگرس اور نیشنل کانگرس پارٹی کی حکومت مالیگاؤں اور نواح کو فوج کے حوالے کرنے کے باوجود فسادات پر قابو پانے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ اور فسادات کے

تیسرے روز فوج کو بلانا بذات خود تشویش کی بات ہے۔

یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ جب کانگرس اقتدار میں ہوتی ہے تو فسادات زیادہ ہوتے ہیں۔ کانگرس کی حکومت کے قیام سے اب تک مہاراشٹر میں چھوٹے موٹے 40 فسادات ہو چکے ہیں اور جب بی جے پی اور شیوسینا کی حکومت ہو تب فسادات کم ہی ہوتے ہیں۔ظاہر ہے جب کانگرس کی حکومت ہوتی ہے تو ایک طرف شیوسینا اور بی جے پی کانگرس کے مسلمان ووٹروں کو کانگرس سے متنفر کرانے کیلئے فرقہ وارانہ فسادات کراتے ہیں دوسری طرف اپنے ہندو ووٹروں کو پکا کرتے ہیں۔

اس طرح جب کانگرس اقتدار میں ہو تو فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کیلئے بہت زیادہ توجہ دینی چاہئے مگر دیکھا گیا ہے کہ جس طرح مالیگاؤں میں یہ فساد روکنے میں ناکام ہوئی اسی طرح مجموعی طور پر اس معاملہ میں ناکام رہتی ہے۔فرقہ وارانہ بلوؤں کو روکنے کیلئے ایک طرف پولیس اور دوسری طرف انتظامیہ کو مستعد رکھنے کی ضرورت ہے۔مگر کانگرس کی حکومت اس ضمن میں کوئی زیادہ توجہ نہیں رکھتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے کو عموماً نظر انداز کر دیتی ہے کانگرس نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ وہ پولیس فورس کو مستعد کرنے کے نااہل ہے اگر اسے دوبارہ حکومت کرنا ہے اور یو پی کے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہیں تو پھر جہاں کہیں اس کی حکومت ہے اسے فرقہ وارانہ صورتحال کو کنٹرول کرنے کیلئے غیر معمولی قسم کا کردار ادا کرنا ہوگا مگر اس کے کہیں آثار نظر نہیں آتے اور وہ بھی فرقہ وارانہ دباؤ کے سامنے جھک جاتی ہے۔

اگرچہ کانگرس کمیٹی کے صدر مدنی لال دوہرا نے فسادات سے نمٹنے کیلئے وزیراعلیٰ دلیش مکھ کی تعریف کی ہے مگر مالیگاؤں کے ستم گزیدہ لوگوں کی تسلی نہیں کر سکی۔ یہاں یہ بات بھی کہہ دینی چاہئے کہ انتہائی شدید قسم کی فرقہ وارانہ فضا میں بھی بعض مسلمانوں نے ہندوؤں اور بعض ہندوؤں نے مسلمانوں کی جان بھی بچائی۔مسلمانوں نے پورا گلی میں چار ہندو خاندانوں کو بچایا اور ہندوؤں نے دوسرے محلوں میں مسلمانوں کی جان بچائی۔ ملک میں انتہائی مایوس کن صورتحال کے باوجود ان باتوں سے اچھائی کی آس بندھ جاتی ہے۔حکومت نے شروع میں صرف مجسٹریٹ سے تحقیقات کرانے کا حکم دیا تھا مگر بعد میں سونیا گاندھی کے دباؤ پر عدالتی

انکوائری کرائی گئی۔ جہاں تک مالیگاؤں کے بارے میں حکومت کی سنجیدگی کا معاملہ ہے وہ اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وزیر داخلہ بھجبال نے مرنے اور زخمی ہونے والوں کو معاوضہ دینے کی درخواست اس بنا پر مسترد کردی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ شر پسندوں کو انعام دے رہے ہیں بھجبال کو خبر ہونی چاہئے کہ بہت ہی کم شر پسند مارے جاتے ہیں عموماً راہ گیر یا ادھر ادھر کھڑے لوگوں کی جان جاتی ہے۔ ایک خاتون چھت پر کپڑے سکھا رہی تھی وہ ماری گئی ہم اسے کیسے شر پسند کہہ سکتے ہیں؟ اب آ کر حکومت نے معاوضہ دینے کا اعلان کیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کتنا ہے۔

(30-1 نومبر 2001ء)

بابری مسجد کے انہدام کے بعد فرقہ وارانہ صورت حال

دسمبر 1992ء میں بابری مسجد گرائی گئی یعنی دس سال ہو گئے۔ بابری مسجد ایسا بڑا واقعہ ہے جس نے ہماری سیکولرازم سے وابستگی کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس انہدام نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے شناخت کا بحران پیدا کردیا۔ اس کے بعد ممبئی اور ملک کے اور متعدد شہروں میں ہولناک فسادات ہوئے ہم اس مضمون میں بابری مسجد کے بعد کی صورتحال کا مختصر سا جائزہ لیں گے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ بابری مسجد کے گرائے جانے کے بعد پورے ہندوستان خصوصاً ممبئی، احمد آباد، سورت کولکتہ، کانپور، مالیگاؤں، بھوپال، دہلی اور دوسرے کئی مقامات پر فرقہ وارانہ تشدد پھوٹ پڑا جس میں سینکڑوں افراد کی جان گئی اصلاً اسی کی پوری دہائی اور نوے کی دہائی کے شروع میں شدید فرقہ وارانہ بحران رہا۔

یہ بات سب کو بخوبی معلوم ہے کہ رام مندر کا تنازع خالصتاً سیاسی تھا نہ مذہبی نہ تاریخی۔ سیکولر مکتبہ فکر کے سر برآوردہ مورخوں نے پرزور انداز میں کہا کہ جہاں بابری مسجد ہے وہاں کسی مندر کی موجودگی کا نہ تاریخی نہ تعمیراتی ثبوت ہے جب یہ بات سامنے آئی تو سنگھ پریوار کے لیڈروں نے پینترہ بدلا اور کہا کہ یہ صرف تاریخی مسئلہ ہی نہیں یہ بنیادی طور پر ہندوؤں کے عقیدے کا مسئلہ ہے۔

اس مضمون میں ہمارا تعلق اس قسم کی نہ ختم ہونے والی دلیل سے نہیں بلکہ یہ دیکھنا مقصود ہے کہ بابری مسجد کے گرائے جانے کے بعد کے عشرہ میں فرقہ وارانہ صورتحال کیسی رہی۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ رام مندر کا مسئلہ دراصل ہندو اور مسلمان ووٹروں میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش تھی اور بلاشبہ بی جے پی کو اس تنازع سے بڑا فائدہ ہوا۔ رام مندر کا شکریہ اور بی جے پی کے اتحاد کا کہ پارلیمینٹ میں اس کی نشستوں میں اضافہ ہو گیا۔ 1982ء کے الیکشن میں اسے دو سیٹیشنوں کے مقابلے میں 88 سیٹیں مل گئیں اور وجہ رام مندر اور وی پی سنگھ کے جنتا دل اور دوسری سیکولر پارٹیوں سے اتحاد 1991ء میں یہ تنازع عروج پر تھا تو بی جے پی کو مزید فائدہ ہوا اس کی نشستیں 89 سے 114 ہو گئیں۔

نرسیما راؤ کی حکومت نے 1996ء میں اپنی باری مکمل کی حالانکہ 96ء میں بی جے پی نے زیادہ سیٹیں حاصل کی تھیں۔ اس نے سب سے بڑی پارٹی ہونے کی بنا پر حکومت بنانے کی کوشش کی اسے امید تھی کہ اگر وہ ایک بار اقتدار میں آ گئی تو دوسری سیکولر جماعتیں بھی اقتدار کے لالچ میں اس کی حمایت کریں گی تاہم اس وقت اکثر سیکولر پارٹیاں بی جے پی کو اچھوت سمجھ کر اسے بچانے نہیں آئیں اور تیرہ دن کی حکومت کے بعد بی جے پی کی حکومت ناکام ہو گئی۔ پھر جنتا دل سے کہا گیا کہ وہ اقتدار سنبھال لے کہ اس نے پارلیمینٹ میں ضروری طاقت حاصل کر لی تھی۔

پھر یہ بات سامنے آئی کہ سیکولر پارٹیوں کو نظریئے کا زیادہ خیال ہے اور وہ فرقہ وارانہ طاقتوں سے اتحاد کرنے کیلئے تیار نہیں۔ یہ صورتحال تھوڑا عرصہ ہی پھر متعدد سیکولر جماعتوں نے اقتدار کے گھوڑے پر سوار ہونے کیلئے بی جے پی کا ساتھ دیا۔ یہ سچ ہے کہ اب جدید دنیا میں نظریات بے معنی یا بے وزن ہو گئے ہیں جبکہ مذہبی نظریات جڑ پکڑ رہے ہیں اور دنیا جہان میں مذہبی بنیاد پرستوں نے طاقت پکڑ لی ہے جیسے کہ ہندوستان میں ہندو اور پاکستان میں مسلم بنیاد پرستی خاصی مضبوط ہوئی۔ اگر سیکولر پارٹیوں کو اقتدار کا لالچ نہ ہوتا تو بی جے پی نیشنل ڈیموکریٹک الائنس کی حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

دریں اثنا مہاراشٹر میں شوسینا اور بی جے پی کا اتحاد اقتدار میں آ گیا دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مرکز اور مہاراشٹر دونوں جگہوں پر کانگرس اقتدار میں تھی مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچا

کہ تھوڑے سے مسلمانوں نے ردعمل کے طور پر شیوسینا کے امیدواروں کو ووٹ دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چھپے دشمن کے مقابلے میں کھلے دشمن سے نمٹا جا سکتا ہے 1995ء میں شوسینا بی جے پی کے اتحاد کے جیتنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔

ممبئی میں 93-1992ء کے فسادات میں کوئی ایک ہزار آدمی مارے گئے یا لا پتہ ہو گئے۔ اس کے بعد بعض شر پسندوں نے پاکستان کی آئی ایس آئی کے پتلے بن کر داؤد ابراہیم کی سر براہی میں ممبئی کے گنجان آباد علاقوں میں لگا تار دھماکے کئے۔ یہ مارچ 1993ء میں ہوا۔ اس سے مہاراشٹر کے لوگ بہت ناراض ہوئے حکومت کانگرس کی تھی اور وزیر اعلیٰ شرد پوار تھے۔ اس کے علاوہ شوسینا نے ممبئی شہر کے جھگی نشستوں کے ساتھ ووٹ لینے کیلئے بڑے دعوے کئے مثلاً یہ کہ انہیں گھر بنا کر بلا قیمت دیئے جائیں گے۔ ان سب عوامل کے باعث 1995ء کے صوبائی انتخابات میں شیوسینا اور بی جے پی کا اتحاد جیت گیا۔

یہ بھی ہے کہ بی جے پی نے رام مندر والے جذبات سے بھی فائدہ اٹھایا۔ رام مندر تنازع کا مہاراشٹر پر بہت گہرا اثر ہوا تھا کیوں کہ یہ آخر راشٹریہ سیوک سنگھ، مہاراشٹر کے برہمنوں نے ہی قائم کیا تھا۔ شیوسینا اور بی جے پی کی کامیابی میں بابری مسجد رام جنم بھومی کے جھگڑے کا بھی حصہ ہے اور ممبئی کے 93-1992ء کے فسادات کے نتیجے میں مارچ 1993ء میں جو بم دھماکے ہوئے ان کا فائدہ بھی شیوسینا اور بی جے پی کو ہوا۔

بابری مسجد کے بعد فرقہ وارانہ تشدد

دلچسپ بات یہ ہے کہ گو بابری مسجد کے گرائے جانے کے بعد کے عشرے میں بڑے فسادات کم ہوئے۔ اس عرصہ میں چھوٹے چھوٹے کئی بلوے ہوئے جن میں دو سے لے کر چھ افراد تک مارے گئے مگر اس زمانے میں تین بڑے فساد ہوئے۔ 1997ء میں کوئمبٹور (تامل ناڈو) میں مارچ 2001ء میں یو پی کے شہر کانپور میں اور مارچ 2001 ء میں مہاراشٹر کے مالیگاؤں میں کوئمبٹور کے فسادات میں 40 سے زیادہ آدمی مارے گئے جبکہ کانپور اور مالیگاؤں میں پندرہ افراد کی جان گئی ان دو بڑے فسادات کے درمیان پورے ہندوستان میں 150 کے قریب فسادات چھوٹی سطح پر ہوئے۔

بڑے فسادات نہ ہونے سے ہمیں یہ خوشگوار نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد فرقہ وارانہ صورتحال بہتر ہو گئی ہے بلکہ اس کے برعکس یہ کیفیت بدتر ہو گئی ہے اس

دوران دو خاص رجحان قابل ذکر ہیں۔ جنوبی ہندوستان فرقہ وارانہ فسادات سے کسی حد تک پاک تھا مگراب وہاں بھی فرقہ وارانہ تشدد کی وارداتیں ہونے لگی ہیں اس کا مظہر 1997ء کوئمبٹور کے فسادات کے بعد 1998ء میں بموں کے دھماکے ہیں کوئمبٹور کے فسادات کا اصل سبب ہندوستان کا جارحانہ فرقہ وارانہ رویہ بنا۔ مسلمان نوجوانوں نے ایسے کو تیسا جواب دینے کیلئے تشدد کی راہ اپنالی۔ مسلمان نوجوانوں نے آر ایس ایس کے ایک کارکن کو قتل کر دیا جواب میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے ایک روحانی رہنما بلانی بابا کو قتل کر دیا۔ بلانی بابا کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نوجوانوں میں بنیاد پرستی کو راسخ کر رہا ہے۔ مس جے للیتا نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور رویہ ہندوتوا کے حق میں اختیار کیا۔ الزام لگایا جاتا ہے کہ بی جے پی کو جے للیتا کی حمایت حاصل ہے۔

دوسرا قابل ذکر رویہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بی جے پی کے مرکز اور گجرات میں برسر اقتدار آنے کے بعد عیسائیوں کے خلاف حملے شروع ہو گئے۔ پہلے مسیحیوں کیخلاف اس قسم کے واقعات نہیں ہوتے تھے۔ عملاً یہ بلوے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ہوتے تھے۔ بہر طور 1998ء کے بعد سے مسیحیوں کیخلاف تشدد شروع ہو گیا جس میں بجرنگ دل اور وشوا ہندو پریشد ملوث ہیں۔ گجرات کے بعد اس نوعیت کے واقعات یو پی، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، بہار اور اڑیسہ میں ہوئے۔ اڑیسہ میں یہ ہولناک واقعہ ہوا کہ بجرنگ دل کے کارکنوں نے مسیحی پادری گراہم سٹیفن اور اس کے دو بچوں کو زندہ جلا دیا۔ مادھون کمیشن کی رپورٹ میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ اس بہیمانہ قتل میں بجرنگ دل کا ہاتھ ہے۔

بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد گجرات میں خصوصاً اس کے دیہی علاقوں میں مسلمانوں کیخلاف اکثریت کا تشدد بڑھ گیا۔ بابری مسجد کے بعد بی جے پی نے گجرات میں زیادہ فرقہ وارانہ، جارحانہ رویہ اختیار کر لیا۔ وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل سے وابستگان نے گجرات جیسے حساس صوبے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کیخلاف زیادہ جارحیت شروع کر دی۔

جب سے بی جے پی مرکز میں اقتدار میں آئی ہے اسے اپنے اتحادیوں کی خاطر رویہ نرم کرنا پڑا ہے۔ نیشنل ڈیموکریٹک الائنس میں شامل سیکولر گروپوں کو مجموعی طور پر خصوصاً آندھرا پردیش میں اپنے مسلمان ووٹروں کی خاطر بھی ملحوظ رکھنا پڑتی ہے اس لئے (بی جے پی نے) ہندوتوا کو اپنے ایجنڈے سے نکال رکھا ہے۔ اس ایجنڈے میں ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر اب

بھی شامل ہے مگر سنگھ پریوار کی دوسری تنظیموں مثلاً وشواہندو پریشد پر اس قسم کا کوئی دباؤ نہیں۔ سنگھل اور پراوین جیسے رہنما علی الاعلان مارچ 2002ء میں رام مندر کی تعمیر شروع کرنے کا اعلان کرتے ہیں سنگھ پریوار نہ صرف اس معاملہ کو زندہ رکھے ہوئے ہے بلکہ 2002ء میں ہونے والے یوپی کے الیکشنوں کی خاطر اسے استعمال بھی کرتا ہے۔

بی جے پی کی سرکردگی میں جب سے این ڈی اے کی حکومت بنی ہے اس نے درسی نصاب کو زیادہ فرقہ وارانہ بنا دیا ہے۔ بی جے پی کی یہ پالیسی کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ اس نے انسانی وسائل جیسی حساس وزارتیں اپنے پاس رکھی ہیں جس کا کنٹرول نہ صرف تعلیم پر ہے بلکہ مندرجہ ذیل تحقیقاتی ادارے بھی اس کے ماتحت ہیں۔ آئی سی ایچ آر آئی سی ایس ایس آر، اینسی ای آر ٹی وغیرہ اب تمام اداروں پر آر ایس ایس کے کٹڑ عناصر کا قبضہ ہو چکا ہے اور تمام کلیدی تحقیقاتی کاموں پر انہی کی اجارہ داری ہے۔ ٹوورڈ زفریڈم جیسی اہم کتاب کی کچھ جلدوں میں جدوجہد آزادی کے درمیان آر ایس ایس کی برطانیہ دوستی پر نکتہ چینی کی گئی تھی اب یہ کتابیں نہیں چھپیں گی جو چھپ چکیں انہیں واپس لے لیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ نصابی کتابوں میں بھی اس نوعیت کی ترمیم و تنسیخ کی جارہی ہے حال ہی میں سی بی ایس ای (ثانوی تعلیم کا مرکزی بورڈ) نے ایک سرکلر چٹھی کے ذریعے تاریخ کی کتابوں میں سے سیکولر قسم کے معروف تاریخ دانوں کے لکھے حصوں کو ایڈٹ کر کے لگانے کا کہا ہے اس تاریخ دانوں میں رومیلا تھاپر آر ایس شرما بپن چندر اور ستیش چندر شامل ہیں۔ ان ابواب کے خاتمے کا مطلب یہ ہے کہ نوجوان ذہن کی سوچ کو خاص نہج پر لگا دیا جائے کہ وہ تاریخ کی افہام و تفہیم ناقدانہ انداز سے نہ کر سکے۔ فرقہ وارانہ قوتیں اکثر تاریخ کو مسخ کرتی ہیں اور ماضی خصوصاً اس ماضی کو سنہری دور کے طور پر پیش کرتی ہیں جس میں اکثریتی مذہب کے لوگ حکمران رہے تھے۔ ماضی کے اس حصے کو سر بسر رد کر دیتی ہے جس میں اقلیتی لوگ حکمران رہے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کی سیکولر پالیسی کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ملک بابری مسجد کے نہدام کے بعد بڑے نازک مرحلے سے گزر رہا ہے۔ نہ صرف سیاست بلکہ معاشرتی اور معاشی شعبوں میں بھی فرقہ وارانہ رنگ بھرا جارا ہے۔ اسی کی دہائی میں بلاشبہ بڑے بڑے بلوے ہوئے مگر اس دوران بی جے پی نے رام جنم بھومی اور فرقہ وارانہ سیاست کے ذریعے

MashalBooks.org

طاقت حاصل کرنا شروع کردی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا تاہم جب یہ این ڈی اے کے سربراہ کی حیثیت میں اقتدار میں آئی تو اس نے تعلیم اور ثقافت کو اجارے میں لے کر اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر رکھا ہے جو اور بھی زیادہ خطرناک کارروائی ہے۔ سنگھ پریوار نے بھارتی وزارت داخلہ کی طرف سے منظور شدہ فلم واٹر کی یو پی میں فلم بندی نہیں ہونے دی یوں ہندوستانی ثقافت کو زیادہ سے زیادہ فرقہ وارانہ بنایا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی وحدت اور سالمیت کیلئے تعلیم اور ثقافت کو سیکولر رکھنا لازمی ہے۔ اگر معاشرتی اور معاشی شعبوں کو فرقہ وارانہ نظریات غالب آ گئے تو اس سے ہندوستان کی وحدت کو سخت نقصان پہنچے گا اب ضرورت ہے کہ تمام سیکولر قوتیں مل کر اس صورتحال سے بچاؤ کی کوشش کریں۔

(15۔دسمبر2001ء)

فرقہ وارانہ فسادات2001ء

پچھلے سالوں کی طرح اس برس بھی ہندوستان کے طول وعرض میں چھوٹے بڑے کئی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ کولہاپور میں 31 دسمبر 2000ء کو یعنی سال کے آخری دور میں شروع ہوئے اور جنوری 2001ء تک جاری رہے۔ علاقائی آرمی کا ایک جوان ابھیجت سریاونشی جموں وکشمیر میں ایک خودکش بم دھماکے ہیں مارا گیا تھا۔ شوسینا نے بندھ (ہڑتال) کی اپیل کی مگر اقلیت کے کچھ لوگوں نے اپنی دکانیں بند نہیں کیں ان پر پتھراؤ ہوا۔ پتھراؤ کرنے والا ہجوم دس ہزار بلوائیوں پر مشتمل تھا۔ ہجوم کو ٹیکسٹائل کے وزیر مملکت پرکاش اودے کے ایک اور پنشنر کے بیان پر بھی غصہ تھا جو اس کی نظر میں مسلمانوں کے حق میں تھا۔

کولہاپور میں صورتحال پہلے ہی کشیدہ تھی شیوسینا کی ہڑتال نے اسے اور سنگین بنا دیا۔ انتظامیہ نے شوسینا کو کہا کہ وہ ہڑتال کا فیصلہ واپس لے لے مگر بہت سے شوسینکوں کو یہ منظور نہ تھا انہوں نے زر دار پتھراؤ کیا۔ اچانک پتھراؤ کے باعث مین مارکیٹ میں سراسیمگی پھیل گئی دکانیں اور تجارتی ادارے بند ہونے لگے۔ بہرطور کشیدگی اور پتھراؤ کے واقعات کے باوجود خوش قسمتی سے کوئی جان تلف نہیں ہوئی۔

اسی قسم کا فساد رانچی (بہار) میں 30 دسمبر میں ہوا اور جنوری تک پھیل گیا۔ 29 دسمبر کو عیدالفطر تھی پولیس کی فائرنگ سے تین مسلمان نوجوان مارے گئے۔ یہ تو معلوم نہیں ہوا کہ پولیس نے

MashalBooks.org

فائرنگ کیوں کی مگر نتیجہ یہ کہ تین مسلمان نوجوان مارے گئے۔ مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی مسلمان تنظیموں اور اقلیتی محاذ (میناریٹی فرنٹ) نے 30 دسمبر کو ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ مظاہرین نے پولیس کی دو چوکیاں اور آر اے ایف کی گاڑیوں کو شدید نقصان پہنچایا جمعہ کی نماز کے بعد بہت سے مسلمان سڑکوں پر آ گئے اور تشدد شروع کر دیا۔ انتظامیہ نے تین بجے کرفیو لگا دیا۔ حالات کو معمول پر لانے کیلئے فوج نے بھی گشت کیا۔ جھاڑکھنڈ کے وزیراعلیٰ بابولال میرانڈی نے پولیس فائرنگ کی تحقیقات کا حکم دیدیا۔ تاہم فساد یکم جنوری کو بھی جاری رہا۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جھا خشت باری میں زخمی ہوا تو اس نے ہجوم پر فائرنگ کا حکم دیدیا تین مسلمان نوجوان مارے گئے۔ یکم جنوری 2001ء کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بھی مر گیا۔ چنانچہ اس وجہ سے اس روز پھر فساد ہوا۔ ڈی ایس پی جھا کی موت پر پولیس بھی بہت ناراض ہوئی اور اس نے صوبے کی پولیس کی طرف سے کام چھوڑ دینے کی دھمکی دیدی تاہم معاملہ کنٹرول میں رہا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا فساد کشتواڑ (جموں) میں اس وقت ہوا جب جامع مسجد کو آگ لگ گئی حادثہ غالباً بجلی کے شارٹ سرکٹ ہونے کی وجہ سے ہوا۔ اس کی لائبریری اور مدرسہ سبھی کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ پولیس نے بڑھتے ہوئے ہجوم پر لاٹھی چارج کر دیا۔ وہ اور مشتعل ہوا ہجوم نے ایس ڈی ایم اور اے پی کے ساتھ بدتمیزی کی ایس ڈی ایم کے دفتر کو آگ لگا دی گئی چنانچ انتظامیہ کو کرفیو نافذ کرنا پڑا۔

5 جنوری کو احمد آباد کی ایک مسجد میں دو مردہ جانور پھینک دیئے گئے جس کے بعد فساد شروع ہو گیا۔ خبر ملی تو ہجوم اکٹھا ہو گیا اور قریب سے گزرنے والی گاڑیوں پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ حکام نے ذرا غفلت نہیں کی اور فوراً صوبے کی زیرو پولیس کے تین سو پولیس والوں کی ڈیوٹی لگا دی تمام دکانیں بند ہو گئیں علاقے میں پولیس کو خبردار کر دیا گیا۔ بی جے پی کے لیڈر گوپی ناتھ منڈے نے الزام لگایا کہ اس واقعہ میں آئی ایس آئی اور لشکر طیبہ ملوث ہیں۔

6 جنوری کو ایک انتہائی غیر متوقع علاقے گوا میں فساد ہو گیا بی جے پی کی حکومت کے سامنے یہ صورت اچانک آ گئی گوا کے شمالی قصبہ موپسا میں تراویح کیلئے ایک عارض ہال بنایا گیا تو اس علاقے میں بی جے پی کی دیرینہ اتحادی جماعت شیوسینا نے شوجی کا بت گاڑ دیا اور گیروا جھنڈا بھی لہرا دیا۔ پھر شیوسینا نے فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کی تاہم کوئی بڑا ابلوہ نہیں ہوا۔

25 جنوری کو ناسک میں ایک مسجد (نورانی مسجد) کے ایک حصہ کے گرانے پر کشیدگی پیدا

ہوگئی۔ مسجد کے گرائے جانیکی خبر سن کر ایک ہجوم اکٹھا ہوا اور پتھراؤ شروع کر دیا دراصل نورانی مسجد کا وضوخانہ اور امام کی رہائش گاہ بنا تو لی گئی تھی مگر میونسپل کارپوریشن سے نقشے وغیرہ کی اجازت نہیں لی گئی تھی چنانچہ اس حصوں کو گرایا گیا تو تشدد شروع ہوگیا۔ سنگ باری میں پچاس افراد زخمی ہوئے۔ ان میں دو پولیس والے اور تین آدمی فائر بریگیڈ کے تھے۔ پولیس کی انتظامیہ نے فوری طور پر کارروائی شروع کر دی۔ ناسک کے مسلمانوں نے رضا اکیڈمی کے وفد سے کہا کہ ان کی ہندو بھائیوں سے کوئی دشمنی نہیں انہیں پولیس کے ظلم وستم پر گلہ ہے۔ اس لئے مسلمان گھروں سے باہر آتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ یکم فروری کو محلّہ قاضی پورہ میں امن مارچ پر پتھراؤ ہوا تو پھر کرفیو لگا دیا گیا۔ فساد زدہ بھدرا کالی میں دوبارہ کرفیو لگانا پڑا۔ تشدد کے ڈر سے دکانیں، دفاتر اور سکول بند رہے پولیس نے 96 افراد کو گرفتار کر لیا ان بلوؤں میں 75 افراد زخمی ہوئے۔ پولیس نے ہجوم پر قابو پانے کیلئے نو راؤنڈ چلائے بھدرا کالی کے علاقہ کے بہت سے مسلمانوں کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا جبکہ انہیں ضمانت پر رہا کیا گیا تھا انہیں 8 فروری کو فساد کرانے کے الزام میں دوبارہ گرفتار کیا گیا تھا چنانچہ مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی۔ مسلمان وکلاء نے جج سے کہا کہ وہ پولیس سے کہے کہ جن کو گرفتار کرنا ہے ایک ہی بار سارے الزامات پر گرفتار کرے۔

5 مارچ کو عیدالاضحیٰ پر یو پی کے ضلع مراد آباد کے فسادات میں دو آدمی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ قصبہ سنبھل میں ایک مسلمان عیدالاضحیٰ کے حوالے سے اپنے گھر میں جانور کی قربانی دے رہا تھا کہ ہندو ہمسائے نے اس پر گولی چلا دی جس سے دو افراد ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد بلوہ شروع ہوگیا کئی مکانوں کو آگ لگا دی گئی اور کشیدگی انتہا کو پہنچ گئی۔ مکانوں میں آتشزدگی کے باعث 18 خاندان بے گھر ہوگئے۔ پولیس نے قتل کے الزام میں پانچ افراد کو گرفتار کر لیا۔ جن کو گولی لگی وہ راہ گیر تھے یا تماشائی جن کے گھر جلے انہوں نے شکایت کی کہ گھر میں زیوروں سمیت جو کچھ تھا تباہ ہوگیا مگر پی اے سی کے جوانوں نے بروقت کارروائی کرنے کی بجائے خاموشی سے تماشا دیکھا۔

9 مارچ کو دہلی میں قرآن کو جلایا گیا جس کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے۔ اورنگ آباد میں پتھراؤ کے باعث تیرہ افراد زخمی ہوگئے۔ ہجوم کو قابو میں لانے کیلئے پولیس کو فائرنگ بھی کرنا پڑی اور آنسو گیس بھی پھینکنا پڑی۔ ہجوم نے پولیس کی ایک

گاڑی کو بھی آگ لگانے کی کوشش کی۔ مرتھواڑا کے قصبات نیڈر اور پربھائی میں بھی اس قسم کے واقعات ہوئے حیدرآباد کے چار مینار علاقے میں مکہ مسجد سے راہگیروں پر پتھراؤ کیا گیا ایک اخباری فوٹوگرافر سمیت چار افراد زخمی ہوئے ممبئی میں بھی حالات کشیدہ تھے اور اکا دکا واقعات ہوئے بھی۔

پونا شہر بھی فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آیا۔ علاقہ غنی پیٹھ میں لوگ نماز کیلئے مکہ مسجد میں جمع تھے کہ ہندوؤں نے فساد شروع کر دیا۔ پتھراؤ کیا اس کے بعد بسوں کو گ لگائی جانے لگی۔ پتھراؤ کے باعث تمام دکانیں بند ہو گئیں غنی پیٹھ اور گھوڑ ڈیڈ پیٹھ بری طرح متاثر ہوئے۔ 78 سے زیادہ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ہجوم نے غنی پیٹھ اور لوہیا نگر میں ایک بیکری کو لوٹ لیا اور دواؤں کی ایک دکان تباہ کر دی۔ فسادیوں نے ایک رکشا بھی جلا دیا۔ فسادات سے دوسرے علاقے سوامی وویک آنند سوسائٹی، پی سی سٹاف کالونی ارغفور تکیہ بھی متاثر ہوئے۔ یہ واضح ہے کہ پونا نسبتاً پرامن شہر ہے۔

ہولی کے موقع پر عموماً فرقہ وارانہ فسادات ضرور ہوتے ہیں۔ 10 مارچ کو بہار کے ضلع نالندہ کے گاؤں شمجھ میں دونوں قوموں میں تصادم ہوا جس میں آٹھ افراد مارے گئے اور 6 زخمی ہوئے۔ جھگڑا دو گروپوں میں ہولی کے متعلق ایک گیت گانے پر ہوا۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ گپتیشور پانڈے موقع پر پہنچ گیا اور حالات پر قابو پالیا۔

فرقہ وارانہ حوالے سے کانپور انتہائی حساس شہر ہے یہاں بار بار فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ مارچ 2001ء میں دلی میں قرآن سوزی کے بعد مقامی سیمی (سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا) نے احتجاجی جلوس نکالا اور شہر میں قابل اعتراض پوسٹر لگائے اس جلوس پر پی اے سی نے فائرنگ کی جس میں بارہ سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ ہلاک شدگان میں 12 مسلم نوجوان تھے۔ بیکن گنج میں کئی دکانوں کو جلا دیا گیا۔ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ پی اے سی والے خود دکانیں لوٹنے میں شامل ہو گئے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ لاکھوں روپے کی مالیت کی جائیداد تباہ ہوئی پی اے سی کی اکثریت کے ساتھ ہمدردی کا یہ حال تھا کہ آخر کار انہیں مسلمان محلوں سے واپس بلانا پڑا۔ فورس خود فسادات میں شامل تھی ان بلووں میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (فنانس) بھی مارا گیا اور بڑے پراسرار انداز میں۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ خود پی اے سی نے اسے گولی ماری تھی کیونکہ اس نے جلوس پر

فائرنگ کا حکم دینے میں انکار کر دیا تھا۔ تاہم پولیس کہتی ہے کہ قریب میں واقع ایک مسجد کی طرف سے آنے والی گولی کے باعث وہ ہلاک ہوا اس معاملہ پر تنازع بہت ہوا مگر دونوں اطراف سے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پیش کیا جا سکا۔ صرف عدالتی تحقیقات ہی کے ذریعے اصل حقیقت کا پتہ چل سکے گا۔

یہ سچ ہے کہ دہلی میں قرآن کے جلائے جانے کے بعد کانپور میں سیمی نے احتجاجی جلوس نکالا اور قابل اعتراض پوسٹر بھی لگائے مگر پی اے سی کا رویہ شدید قسم کا فرقہ وارانہ تھا۔ مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا 28 مارچ 2001 ء کے ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق بلاشبہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔ کیمسٹ شاپ کے مالک وارثی مارکیٹ کے لیاقت علی، کپڑے کے تاجروں عتیق احمد، محمد عارف، رئیس احمد، رؤف احمد اور فرحان احمد ان سب نے گواہی دی کہ ان کی دکانیں دن کی روشنی میں پی اے سی کے جوانوں نے لوٹی تھیں۔ پی اے سی والوں کا متعصب ہندوؤں کی تنظیم والا رویہ ہے اور کسی نے بھی ان کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔

سیمی (SIMI) نے نوجوان مسلم بیروزگاروں کے حوالے سے کئی برسوں سے فرقہ وارانہ زہر پھیلانا شروع کر رکھا ہے اس کے پوسٹر بھی واقعی بڑے اشتعال انگیز تھے اس قسم کے جلوس اور اشتہاری مہم کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی سیمی کی اشتعال انگیز کارروائی کی بھاری قیمت بے گناہ مسلمانوں کو ادا کرنا پڑی۔ تمام سمجھدار مسلمانوں نے سیمی کے اشتعال انگیز اشتہار کی مذمت کی ہے یو پی کی بی جے پی کی حکومت نے پی اے سی کی جلوس پر اندھا دھند فائرنگ اور مسلمانوں کی دکانیں لوٹنے اور مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کے سلسلے میں پی اے سی کیخلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ یو پی میں ہونے والے تمام فسادات میں پی اے سی کا ہمیشہ سے یہی مسلمان دشمن کردار رہا ہے۔ لیکن جب بھی ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں اس فورس کو موقع پر بھیجا جاتا ہے کانپور کے فسادات کے بعد بعض مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ ایسے موقع پر مخلوط پولیس فورس بھیجی جانی چاہئے۔ مطالبہ یہ پرانا ہے کانپور میں اس درجہ ہولناک قتل و غارت گری اور لوٹ مار ہوئی کہ ٹائمز آف انڈیا کے 2 مارچ کے شمارہ کی سرخی تھی کانپور کی جلی گلیاں شمشان کا منظر پیش کرتی ہیں۔

آل انڈیا ڈیموکریٹک ویمنز ایسوسی ایشن کے ایک وفد نے بھی سیدھا پولیس پر الزام لگایا کہ فساد کروانے والی خود پولیس ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا 24 مارچ 2001ء) بی جے پی کا یہ دعویٰ

کہ اس کے عہد میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ کانپور میں بھی باطل ثابت ہوا اور بہت سے مقامات پر جہاں بی جے پی کے عہد حکومت میں بھی فرقہ وارانہ بلوے ہوئے ہیں آزادی کے بعد سب سے زیادہ فرقہ وارانہ فسادات یو پی میں ہوئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ایک سال میں ان فسادات اور جھڑپوں کی تعداد 7462 ہے جو 622 ماہانہ بنتی ہے۔

محرم بھی ایک ایسا ہی موقع ہے جب متعدد شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات ہو جاتے ہیں 16 اپریل کو ضلع اجمیر کے نواحی قصبے ناصر آباد میں تعزیہ کے جلوس پر جھگڑا ہو گیا۔ معین الدین چشتی کے شہر اجمیر میں بھی کرفیو لگانا پڑا۔ ناصر آباد کے تنازع کے بعد فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا اور فوج بلانا پڑ گئی۔ پتھراؤ، آتش زنی اور لوٹ مار کے متعدد واقعات ہوئے جب پولیس قابو نہ پا سکی تو کرفیو لگانا پڑا۔ اجمیر میں یہ خبر پہنچی کہ کسی نے ایک مندر کی بیرونی دیوار گرا دی ہے تو ایک جلتا ہوا ٹائر تعزیہ کے جلوس میں پھینک دیا۔ تاہم پولیس نے حالات پر قابو پا لیا۔

16 اپریل کو راجستھان کے قصبہ بیوار میں فرقہ وارانہ تشدد شروع ہو گیا۔ پولیس کو کرفیو لگانا پڑا فسادات کے دوران دو درجن سے زائد افراد زخمی ہوئے۔ ضلعی کلکٹر کے مطابق فساد اس وقت شروع ہوئے جب بعض شر پسند عناصر نے وشوا ہندو پریشد اور بی جے پی کے جلوس پر پتھراؤ کیا اور ایسڈ کی بوتلیں پھینکیں۔ پتھراؤ کے بعد صورت دھماکہ خیز ہو گئی۔ جلوس نکالنے کی وجہ یہ تھی کہ نواحی گاؤں میں کوئی مذہبی تعمیر کر لی گئی تھی جلوس کا مطالبہ تھا کہ اسے تعمیر کرنے والوں کو گرفتار کیا جائے۔

18 اپریل کو محرم کے موقع پر کوپر گاؤں (مہاراشٹر) میں محرم کے جلوس پر ہندو مسلم تصادم ہو گیا۔ پولیس کو ہوائی فائرنگ کرنا پڑی ان جھڑپوں میں آٹھ سے زائد افراد زخمی ہوئے جن میں ایک پولیس انسپکٹر بھی شامل تھا۔

مہاراشٹر میں احمد نگر فرقہ وارانہ حساب سے بڑا حساس شہر ہے۔ 12 اپریل کو پتہ چلا کہ گنیش کی مورتی کو توڑا گیا جس کے بعد فسادات شروع ہو گئے اس کے بعد مسلمانوں کی ایک عبادت گاہ کو سخت نقصان پہنچایا گیا بی جے پی اور شیوسینا کے کارکن اس جگہ کے باہر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے مہا آرتی شروع کر دی اس کے بعد شہر کے بے شمار علاقوں میں ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ پولیس کے مطابق گنیش کی مورتی کو نقصان پہنچانے کے الزام میں بارہ نوجوانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

MashalBooks.org

راجستھان میں بنسوادا میں فرقہ وارانہ معاملات کوئی زیادہ تو نہیں مگر وہاں بھی فساد ہو گیا۔ ان دونوں راجستھان بھی فرقہ وارانہ طاقتوں کا گڑھ بن چکا ہے وشوا ہندو پریشد نے ہندوؤں میں کھلم کھلا ترشول تقسیم کیے جبکہ اس سے پہلے بھی یہ تنظیم ہزاروں ترشول تقسیم کر چکی ہے۔

بنسوادا میں خبر پہنچی کہ ایک مذہب کے تین افراد سڑک کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ فساد کی آگ بھڑکانے کیلئے یہی کافی تھا چنانچہ 20 مئی کو پولیس کو کرفیو لگانا پڑا جو 24 مئی تک جاری رہا۔ راجستھان میں بھلوادا قصبے میں بھی یہ ہوا چل پڑی۔ صوبہ کرناٹک کے ضلع میسور کے شہر چم راج نگر میں 2 جون کو اقلیت سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان قتل ہو گیا۔ پھر آتش زنی اور لوٹ مار وسیع پیانے پر شروع ہو گئی۔ صورتحال اتنی سنگین ہو گئی کہ پولیس کو کرفیو لگانا پڑا۔ بارہ افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔

بی جے پی کے دور اقتدار میں لکھنو بھی فرقہ وارانہ حساب سے حساس ترین شہروں میں شمار ہونے لگا ہے اس سے پیشتر یہ صرف شیعہ سنی فسادات کی وجہ سے مشہور یا بدنام تھا۔ 5 مئی کو ایک پولیس کانسٹیبل نے ایک مسلمان لڑکی کو مخاطب کیا اور اسے پولیس سٹیشن چلنے کو کہا۔ یہ واقعہ ٹلے والی مسجد کے قریب ہوا۔ موقع شب برات کا تھا لوگ چراغاں کر رہے تھے جب انہیں یہ خبر ملی تو ان میں بے چینی پھیل گئی۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا اور تصادم شروع ہو گیا۔ مسلمان نوجوانوں نے کہا کہ کانسٹیبل لڑکی سے دست درازی کر رہا تھا جبکہ کانسٹیبل نے کہا کہ لڑکی اسے فحش اشارے کر رہی تھی بہت سے لوگ مسجد سے باہر آ گئے اور انہوں نے پتھراؤ شروع کر دیا۔ انہوں نے پولیس چوکی بھی جلا ڈالی۔ بعض پولیس والوں کی پٹائی بھی کی گئی چنانچہ پولیس نے فائرنگ کی گولی لگنے سے ایک نوجوان نعیم جاں بحق ہوا مناسب فورس علاقے میں موجود نہ تھی اس لئے پولیس معاملات پر قابو نہ پا سکی۔ زیادہ تر پولیس ایک دوسرے علاقے میں گئی ہوئی تھی جہاں سنیوں نے مدح صحابہ کا جلوس نکال رکھا تھا چنانچہ ہجوم بے قابو ہو گیا۔ اس نے مکانوں، دکانوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ متعدد آٹو رکشا جلا دیئے گئے ایک اور شخص جو ایک دن پہلے پولیس کی گولی سے زخمی ہوا تھا ہسپتال میں مر گیا چنانچہ لکھنؤ کے فسادات میں مرنے والوں کی تعداد دو ہو گئی۔

5 جون کی شام کو مہاراشٹر کے ضلع جلگاؤں میں جمنیرہ قصبہ میں اس وقت فساد شروع ہو گیا جب یہ کہا گیا کہ آنند میلہ میں لڑکیوں کو چھیڑا جا رہا تھا۔ آگ بھڑکنے کا بہانہ بہت سے

فرقہ پرست ہاتھوں میں تلواریں لے کر نکل آئے اور لوٹ مار اور آتشزنی شروع کردی۔جائیدادوں کو جلایا گیا جن میں سے چودہ مسلمانوں کی تھیں جبکہ تین ہندوؤں کی۔اس شہر کے ایم ایل اے اور سرپنچ کا تعلق بی جے پی سے ہے۔جمنیرہ کے مسلمانوں کا کہنا ہے کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین فساد نہیں تھا بلکہ بعض فرقہ پرستوں نے مسلمانوں کو ڈرانے کی کوشش کی تھی۔اس قصبے کی آبادی 65 ہزار ہے جس میں سے 30 ہزار مسلمان ہیں یعنی خاصی بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے افسوس یہ کہ جن لوگوں نے لوٹ مار کی وہ اس قصبے سے بھاگ گئے اور ان میں سے کسی کو بھی گرفتار نہیں کیا گیا۔مہاراشٹر کے ایک قصبے سنگم نیر میں بھی یہی واردات ہوئی۔لگتا ہے کہ اس برس مہاراشٹر میں زیادہ فرقہ وارانہ جھگڑے ہوئے ہیں یعنی چالیس سے زائد اور اس مسئلہ پر اسمبلی میں حزب اختلاف نے حکومت پر نکتہ چینی بھی بہت کی ہے۔سنگم نیر میں فساد فلم غدر کے بعد شروع ہوا۔یہ فلم بڑی متنازعہ ہے اور بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ اس فلم پر پابندی لگنی چاہیے سنگم شیر کے دو مذہبی گروہ آپس میں لڑ پڑے اور ایک شخص مارا گیا۔

دراصل فلم غدر دکھائی جا رہی تھی ایک اور فلم لگن دکھائی جا رہی تھی کہ اس میں فلم غدر کا ٹریلر دکھایا گیا تو جھگڑا کھڑا ہو گیا۔واقعہ 9 جولائی کا ہے۔سینما ہال سے نکلتے ہی دونوں گروپ لڑنے لگے ایک دوسرے پر پتھراؤ کیا جس سے بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ایک شخص عرفان تھولی شدید زخمی ہوا اور دو روز بعد انتقال کر گیا۔حکومت نے صورتحال پر قابو پانے کیلئے سی آر پی ایف کی کمپنی متعین کردی۔23 جولائی کو یوپی کے ضلع مراد آباد کے گاؤں سرسوا گوڑ میں شرپسندوں نے اقلیتی لوگوں کے گھروں پر حملہ بول دیا اور دو سالہ بچی شبینہ سمیت چھ افراد مارے گئے۔کوئی شخص گرفتار نہیں کیا گیا اس طرح یہ ایک پراسرار واردات بن گئی۔پولیس کا کہنا ہے کہ یہ چوری کی واردات ہو سکتی ہے قتل و غارت کا یہ عمل اڑھائی گھنٹے تک جاری رہا اور لوگوں کو لوہے کی سلاخیں مار کر قتل کیا گیا۔اس مار پیٹ کے باعث ایک شخص انور خان اس کی بیوی اور دو سالہ بیٹی موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔جمعیت العلماء کے ایک وفد نے گاؤں کا دورہ کیا اور پولیس کے اس موقف کو کہ قتل چوری کیلئے کیا گیا مسترد کر دیا۔انہوں نے کہا کہ جن لوگوں پر حملہ کیا گیا وہ اس قدر غریب تھے کہ ان کے گھر میں لوٹنے والی کوئی شے ہو ہی نہیں سکتی۔یہ واردات مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے کیلئے کی گئی ہے۔مولانا اسعد مدنی نے اس موقع پر تھانہ کے متعلق پولیس اہلکاروں کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا جن کی غفلت کے باعث یہ واردات ہوئی۔حزب

MashalBooks.org

اقتدار کے رکن نے اسمبلی میں بھی یہ معاملہ اٹھایا اور مکمل تحقیقات کا مطالبہ کیا اس مسئلہ پر پارلیمنٹ کے اجلاس میں گڑبڑ بھی ہوئی۔

5 اگست کو یو پی کے شہر مظفرنگر کی ایک مسجد میں انتہائی اشتعال انگیز اشتہار پھینکے گئے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصادم شروع ہوا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ جائیدادیں لوٹی اور جلائی گئیں۔ معاملہ سنگین ہوگیا تو پولیس نے کرفیو لگا دیا۔ میناکشی چوک میں جب دونوں گروپ آمنے سامنے آگئے تو پولیس کو ہوائی فائرنگ کرنا پڑی۔ دریں اثنا پتھراؤ بھی کچھ دیر جاری رہا اور آتش زنی بھی ہوتی رہی معاملہ اس قدر سنگین ہوگیا کہ اگلے روز پارلیمنٹ کے وقفہ سوالات میں جب سماج وادی پارٹی کے ممبران نے یہ معاملہ اٹھایا تو وہاں بھی ہنگامہ ہوگیا۔ مہاراشٹر کے ضلع مالیگاؤں کے قصبہ کرجگ ونت میں 2 اگست کو یو پی کے رائے بریلی میں 3 اگست کو ممبئی کے پاس سمبرا میں 28 اگست کو فرقہ وارانہ جھگڑے ہوئے پتھراؤ کیا گیا اور ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات ہوئے بڑے تصادم کو روکنے کیلئے کرفیو لگا دیا گیا۔

2 اگست کو مہاراشٹر کے ضلع ناگ پور میں امراوتی کے مقام پر شوسینا کے کارکنوں نے ان مسلمانوں پر حملہ کردیا جو بیل کو ذبح کرنے کی غرض سے لے جارہے تھے اس پر فساد ہوا تو دو افراد مارے گئے اور 30 کے قریب شدید زخمی ہوئے۔ پولیس نے ستر افراد کو گرفتار کرلیا اس اثنا میں بجرنگ دل کے کارکنوں نے مذبح خانے کو گھیر لیا اور مسلمان قصابوں کو جانور مذبح خانے میں لے جانے سے زبردستی روکتے رہے ان قصابوں پر حملے بھی کرتے رہے اس وجہ سے ایک طرف شوسینا اور بجرنگ دل اور دوسری طرف مسلمان قصابوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی رہی تو 12 اگست کو بڑا فساد ہوگیا جس میں دو افراد مارے گئے اور متعدد زخمی ہوگئے۔

احمد آباد میں 24 اور 25 اگست کو بلوے ہوئے بلوائیوں نے اقلیتی فرقے کے ہاکروں کو مانی نگر میں مارا پیٹا۔ چونکہ پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی اقلیتی لوگوں نے ہڑتال کا اعلان کردیا۔ ہڑتال میں دکانیں زبردستی بھی بند کرائی گئیں اور پتھراؤ بھی کیا گیا جس میں چار پولیس والوں سمیت دس افراد زخمی ہوئے۔ پتھراؤ مراد پور، کالوپور، گارڈن چوک، اور پنچ کوئی کے علاقوں میں ہوا۔ پھر 25 اگست کو احمد آباد کے دریاپور والے علاقے میں فرقہ وارانہ آگ بھڑک اٹھی تو پولیس کو غیر معینہ مدت کیلئے کرفیو لگانا پڑا۔ پولیس نے گولی بھی چلائی جس سے ایک آدمی مارا گیا پولیس نے چھ راؤنڈ چلائے پھر ایک اور زخمی مسلمان مرگیا تو پولیس نے

بجرنگ دل کے مقامی کارکنوں کو فرقہ وارانہ اشتعال پھیلانے پر گرفتار کرلیا۔ اس ہنگامے میں مرنے والوں کی تعداد 2 ہوگئی۔

5 ستمبر کو مہاراشٹر کے ضلع جلگاؤں کے قصبہ بھڈگاؤں میں ہنومان کی مورت پر کسی نے غلاظت کا لیپ کر دیا یہ واقعہ سہ پہر چار بجے کے قریب ہوا خبر ایک دم شہر میں پھیل گئی اور فرقہ وارانہ کشیدگی خطرناک حدوں کو چھونے لگی۔ ہجوم نے آس پاس دکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا اور مذہبی عمارتوں کی بے حرمتی شروع کر دی۔ مٹی کے تیل کے ٹینک بھی الٹ دیئے گئے پولیس کو حالات پر قابو پانے کیلئے بڑا زور لگانا پڑا۔

26 اکتوبر کو مہاراشٹر کے شہر مالیگاؤں میں بہت بڑا فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں تیرہ آدمی مارے گئے بے شمار زخمی ہوئے اور کروڑوں کی جائیداد تباہ ہوگئی۔ ایک مسلمان نوجوان مسجد کے باہر پمفلٹ تقسیم کر رہا تھا جس میں لوگوں سے امریکی مال کے بائیکاٹ کی اپیل کی گئی تھی پولیس نے اس کو گرفتار کرلیا اور پولیس وین میں ڈال لیا جمعہ کا روز تھا اس کے بعد جامع مسجد سے نکلنے والے نمازیوں نے پتھراؤ شروع کر دیا تو فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے۔ دونوں مذہبی گروپوں کے لوگ ہجوم کی صورت میں نکل آئے اور توڑ پھوڑ اور آتش زنی شروع کر دی۔ پولیس نے فائرنگ کی تو موقع پر تین افراد ہلاک ہوگئے۔ دو آدمی چاقو زنی کے باعث مر گئے اس کے علاوہ بعد میں کئی شدید زخمی ہوگئے۔

فسادات کئی نواحی دیہات میں بھی پھیل گئے شوسینا نے کے مسلمانوں پر حملے کئے جہاں وہ چھوٹی سی اقلیت میں تھے ان کی جائیدادیں لوٹ لی گئیں یا تباہ کر دی گئیں ان دیہات میں یہ تصادم ایک ہفتے تک جاری رہا۔ مالیگاؤں میں کئی روز تک کرفیو نافذ رہا اور پھر آہستہ آہستہ اٹھایا گیا۔ مارچ میں کانپور اور اکتوبر میں مالیگاؤں میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات 2001ء کے دو بہت بڑے فرقہ وارانہ واقعات ہیں جن کی وجہ سے پورا ملک ہل گیا۔

ہر چند بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہونے والے یہ فسادات اسی کی دہائی کے بلووں کے برابر نہیں پھر بھی ان کا ہونا سیکولر ہندوستان کیلئے شرم کا باعث ہے۔ بیسویں صدی کی اسی کی دہائی میں جو فسادات ہوئے تھے ان میں اڑھائی اڑھائی تین تین سو کے قریب لوگ مارے جاتے تھے بابری مسجد کے انہدام کے بعد اوسطاً بڑے فسادات میں 25، 30 کے درمیان

اموات ہوئی ہیں تاہم یہ بھی کوئی اطمینان کی بات تو نہیں اصل بات تو یہ ہے کہ فساد ہوں ہی نہیں۔ مغربی بنگال میں کمیونسٹ پارٹی مارکسسٹ کی حکومت فرقہ وارانہ امن قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔ وہ صوبہ دوسرے صوبوں کیلئے ایک مثال بننا چاہئے اب تک جتنے بھی فسادات ہوئے ان کے ذمہ دار سیاستدان ہیں صرف عوام مسائل اور عوام سے جڑی سیاست ہی کے ذریعے فسادات روک سکتے ہیں طاقت کی سیاست میں اس فرقہ واریت کا کوئی علاج نہیں۔

(15۔جنوری2002ء)

بی جے پی کا فرقہ وارانہ فسادات سے پاک ہندوستان

آزادی کے بعد ہندوستان میں اب تک ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں سے سب سے بدترین فسادات صوبہ گجرات میں ہوئے جن میں اب تک 740 افراد مارے گئے ہیں یہ تعداد سرکاری ہے غیر سرکاری تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ فسادات مرنے والوں کی تعداد اور حیوانیت کے مظاہرہ میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتے۔ بی جے پی نے 1999ء کے لوگ سبھا کے انتخابی منشور میں وعدہ کیا تھا کہ یہ ہندوستان کو فرقہ وارانہ فسادات سے پاک کردے گی۔ متذکرہ بالا فسادات کی کانگریس حکومت یا کسی بھی دوسری پارٹی کے دور حکومت میں نہیں ہوئے بلکہ بی جے پی کی حکومت میں صوبہ گجرات میں ہوئے جسے ہندوتوا کی لیبارٹری کہا جاتا ہے۔

گجرات ہندوتوا کی لیبارٹری ہے جو دوسرے مذہب کے ماننے والی اقلیت کیلئے مقتل گاہ بنادی گئی۔ گودھرا میں 27 فروری کی صبح سویرے جو کچھ ہوا وہ بلاشبہ انتہائی قابل مذمت ہے اور جس شخص کے دل میں ذرا سا بھی احترام انسانیت ہے وہ اسے نہ قابل معافی سمجھے گا نہ اسکی توجیہہ پیش کرے گا۔ کارسیوک والوں کے حوالے سے جو کچھ بھی اشتعال کا سبب بنا اس سے قطع نظر فسادات کا ہونا انتہائی بہیمانہ کارروائی ہے۔

اس سے اگلے روز ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ اس روز جو کچھ ہوا وہ اور بھی دل کو دہلانے والا تھا۔ کوئی سیکولر جمہوری حکومت اس قسم کی المناک قتل وغارت کو برداشت ہی نہیں کرسکتی جمہوری حکومت میں قانون کو اپنا راستہ خود اختیار کرنا چاہئے لوگوں کو یہ اجازت دی ہی نہیں جاسکتی کہ وہ ادلے بدلے میں سڑکوں پر قتل کرتے پھریں۔ گودھرا میں کارسیوکوں اور دوسرے معصوم لوگوں کے گاڑی کی بوگی نمبر ایس ٹی اور ایس کے میں مارے جانے والوں کے قتل کے ملزموں کو

تو فوراً گرفتار کر لیا گیا تھا اور وزیراعلیٰ نریندر مودی نے یہاں تک کہہ دیا کہ انہیں پوٹو کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ قانون نے اپنا عمل شروع کر دیا ہے اور عنقریب تحقیقات کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔ وشوا ہندو پریشد نے اگلے روز ہی ہڑتال کا اعلان کر دیا جس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہڑتال کا اعلان اس وقت کیا جاتا ہے جب حکومت کسی زیادہ سنگین واقعہ کے باوجود کوئی قدم اٹھانے سے انکار کر دے لیکن یہاں تو حکومت فوری طور پر قدم اٹھانے کیلئے مستعد ہو گئی تھی اور اس کارروائی کے بعد بھی ہڑتال ضروری تھی تو کیا یہ بھی ضروری تھا کہ اس طرح سینکڑوں بے گناہ لوگوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا جائے؟

اور اگر وشوا ہندو پریشد انتقام کے شدید حیوانی جذبات کے باعث اندھی ہو گئی تھی تو گجرات کی حکومت اور اسکی انتظامی مشینری کو کیا ہوا تھا؟ اب یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حکومت آنے والی قتل و غارت کو روکنے کی خاطر کوئی اقدام کرنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل کی عسکریت کو جانتے ہوئے حکومت کو خبر تھی کہ قتل و غارت کا کس قسم کا بازار گرم ہو گا۔ اب اگر صوبے کی حکومت اس ضمن میں کوئی بھی کارروائی نہیں کرتی تو پھر حکومت کے قتل و غارت میں شریک کار ہونے کیلئے کیا کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے؟ اور تو اور دو دن تک فوج کو بھی نہیں بلایا گیا اور کہا گیا کہ فوج کے ہر دستے کے ساتھ بھیجنے کیلئے اتنے مجسٹریٹ ہی دستیاب نہیں ہیں۔

جب این ڈی اے کی حکومت کی طرف سے جارج فرنینڈس کو گجرات میں ہنگامے فرو کرنے کیلئے بھیجا گیا اور انہوں نے فوج کو بلانے پر زور دیا تو ان کی کار پر سرعام پتھراؤ کیا گیا۔ اندرون خانہ کا حال جاننے والے بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ پتھراؤ نریندر مودی کے اشارے پر ہوا یہ بے رحمانہ قتل و غارت ایک ہفتہ تک جاری رہی پھر دیہی علاقوں میں پھیل گئی جہاں بے شمار لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کی تعداد کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اب تک ان کے جلے ہوئے جسم مل رہے ہیں۔

گجرات میں فرقہ وارانہ فسادات پہلی بار نہیں ہوئے چھوٹے چھوٹے بلووں کے علاوہ اس صوبے میں عموماً اور احمد آباد میں خصوصاً بڑے بڑے فسادات ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد سب سے بڑا فساد 1969ء میں ہوا جس میں سرکاری طور پر 660 افراد ہلاک ہوئے تھے۔

موجودہ فسادات میں مرنے والوں کی تعداد اس وقت تک 704 تک پہنچ چکی ہے جو یقیناً بڑھ جائے گی کیونکہ دیہی علاقوں میں ابھی لاشیں نکالی جا رہی ہیں۔ یہ اعداد و شمار وزیر اعلیٰ کے دفتر سے اس وقت جاری کئے جا رہے ہیں جب نریندر مودی ضمنی انتخاب لڑ رہے ہیں۔ یعنی یہ ثابت کر رہے ہیں کہ چھ مہینے پہلے مودی وزیر اعلیٰ تھے تو اس اثنا میں گجرات میں کتنا فرقہ وارانہ امن اور سکون رہا گویا مودی کے چھ ماہ کے دور اقتدار میں فرقہ وارانہ فسادات میں جانی نقصان کا 1969ء کا ریکارڈ بھی ٹوٹ گیا۔

گجرات میں 1969ء کے بعد 1981ء، 1985ء، 1990ء 1992ء اور اب 2002ء میں فسادات ہوئے ان کے علاوہ درمیانی وقفے میں بھی تصادم ہوتے رہے۔ ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق مہادیو سنگھ سولنکی جو تین بار گجرات کے وزیر اعلیٰ رہے ان کے دور حکومت میں 117 فسادات ہوئے جن میں 276 افراد مارے گئے۔ امر سنگھ چودھری وزیر اعلیٰ تھے تو 413 بلووں میں 563 افراد ہلاک ہوگئے۔ 1990ء میں جب ایل کے ایڈوانی نے سومناتھ سے ایودھیا تک رتھ یاترا شروع کی تو 220 افراد جان سے گئے۔ 1992ء میں بابری مسجد کے گرائے جانے پر 325 افراد مارے گئے اور 1993ء میں مزید 116 آدمی جان سے گئے۔

کانگرس کے عہد اقتدار میں جتنے بھی فسادات ہوئے ان سے کانگرس کو کسی صورت بری الذمہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے مگر فساد کی اصل جڑ بی جے پی اور جن سنگھ والے تھے۔ بی جے پی نے شروع سے ہی گجرات کو ہندوتوا کی لیبارٹری کے طور پر منتخب کر لیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ گجرات کو منتخب ہی کیوں کیا گیا؟ اس کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں۔ صوبہ گجرات میں غلبہ تاجروں کا ہے۔ اس لئے یہاں نہ تو بائیں بازو کی کوئی تحریک مؤثر طور پر چل سکی نہ ہی نچلے طبقے خصوصاً دلت کی طرف سے کوئی تحریک ابھری۔ دلت لوگوں کی تحریک دراصل فرقہ وارانہ تحریک کا ایک طرح سے توڑ کرتی ہے مگر گجرات میں ایسی کوئی بھی تحریک نہیں ہے۔ نہ یہاں پر کوئی مہاتما پھوکے پیدا ہوا نہ امبید کر۔

یہاں سوشلسٹ تحریک بھی بڑی کمزور تھی۔ مہاراشٹر میں معاشرتی اصلاح کیلئے تحریکیں ہیں مگر گجرات میں ایسی کوئی تحریک بھی نہیں یہاں سوامی نرائن نام کی ایک معاشرتی اصلاح کی تحریک چلی تھی جو تاجروں خصوصاً پٹیل لوگوں کے لئے زیادہ پر کشش ثابت ہوئی یہ ایسی تحریک تھی کہ اس نے ذات پات کی تقسیم کے خلاف کوئی بھی بات نہیں کہی۔ سوراشٹر سمیت گجرات میں

سب سے زیادہ دیسی ریاستیں یا رجواڑے تھے۔ جاگیردارانہ اثرات بہت گہرے تھے۔ آزادی کے بعد جن سنگھ اور راجہ جی کی بنائی پارٹی سونترا پارٹی میں اتحاد رہا۔ یہی سونترا پارٹی تھی جس میں سب سے زیادہ تعداد میں دیسی راجواڑوں کے سربراہ شامل ہوئے۔

اس اعتبار سے یہ بات کوئی ایسے اچنبھے کی بھی نہیں کہ پہلے جن سنگھ نے پھر بی جے پی نے بڑے منظم طریق سے اپنے سیاسی فروغ کیلئے دلت لوگوں کو استعمال کیا اور دلت نوجوانوں کے ذریعے دوسری اقلیتوں پر حملے کرائے۔ یہ غریب دلت نوجوان فرقہ وارانہ فسادات میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ دلت قیادت اتنی کمزور ہے کہ وہ دلت نوجوانوں کو اقلیتوں پر ظلم و ستم کرنے سے روکنے کی اہل ہی نہیں۔ بی جے پی کے اونچی ذات کے پیروکاروں کو تو مار دھاڑ اور قتل و غارت سے دور رکھا جاتا ہے جبکہ دلت جوانوں کو قتل و غارت کا کام سونپ دیا جاتا ہے۔

درمیانی ذات کے لوگ انتہائی قدامت پسند ہیں اور بی جے پی سے وابستہ رہتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ میں آباد ان لوگوں کی تنظیمیں (این آئی آر) بھی سنگھ پریوار وغیرہ کی کھل کر مالی امداد کرتی ہیں اس طبقے سے سنگھ پریوار کو بڑی مدد اور طاقت ملی ہے۔ انہوں نے واقعی گجرات کو ہندوتوا کی لیبارٹری بنا دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر فرقہ وارانہ قتل و غارت نے بی جے پی کو تقویت دی ہے اور اس کے مقاصد پورے کئے ہیں اور اسی لئے گجرات میں اس کیلئے کسی دوسری پارٹی کا سہارا لئے بغیر اقتدار میں آنا بہت آسان کام رہا ہے۔ سولنکی حکومت نے کھشتری، ہری جن، آدی واسی اور مسلم فارمولے کے ذریعے پسماندہ اور غریب اقلیتوں کی مدد کرنے کی کوشش کی اس کیلئے سرکاری ملازمتوں کا فارمولا بھی بنایا گیا لیکن بی جے پی کی سرکردگی میں درمیانے طبقے نے اس کے خلاف تحریک چلا کر اسے ختم کر دیا اور 86-1985ء میں کوئی سال ڈیڑھ سال کے فرقہ وارانہ فسادات کے باعث خود سولنکی کو بھی جانا پڑ گیا۔ یہ فسادات بی جے پی نے ہی سوچے اور کرائے تھے۔ اس طرح بی جے پی مضبوط ہوئی کانگرس کچھ اس کی وجہ سے کمزور ہوئی کچھ اس کے اندر گروہ بنتے چلے گئے۔

گجرات میں حالیہ قتل عام نتیجہ ہے برسوں کے فرقہ وارانہ تشدد کا۔ اس وجہ سے ایل کے ایڈوانی نے ہر بار گاندھی نگر کی نشست سے لوک سبھا کے انتخاب لڑے ہیں اور ہر بار گجرات میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے وہ ظلم و جبر کے لحاظ سے پہلے تمام فسادات سے آگے نکل جاتا ہے۔ اس بار زندہ جلانے اور چھوٹے بچوں کو جلتے شعلوں میں پھینکنے کا زیادہ ہولناک اور ظالمانہ

طریقہ اپنایا گیا۔ اس مرتبہ بڑے اہتمام سے یہ کوشش کی گئی کہ گجرات کے مسلمانوں کو معاشی لحاظ سے تباہ کیا جائے۔ اتفاق کی بات کہ ہندوستان میں گجرات واحد صوبہ ہے جس میں مسلمانوں کے تین تاجر خاندانوں یا برادریوں بوہرا، کھوجہ اور میمن نے ترقی کی۔ یہ تینوں پرامن اور غیر سیاسی خاندان ہیں اس لئے ان کا فرقہ وارانہ معاملات میں ملوث ہونا دور کی بات ہے لیکن گجرات کے فسادات میں ان تینوں کو ہی سب سے زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے اور اس مرتبہ تو بڑے منظم طریقے سے ان کی فیکٹریاں، گودام اور دکانیں تباہ کی گئیں۔

صوبہ گجرات میں سنگھ پریوار بہت ہی زیادہ سرگرم رہا ہے اس لئے سول سوسائٹی اور سرکاری محکمے سبھی فرقہ وارانہ رنگ میں رنگے گئے ہیں۔ عدالت بھی اس سے نہیں بچ سکی۔ جب بابری مسجد گرائی گئی ہے تو ایک وکیل کے کہنے کے مطابق احمد آباد ہائی کورٹ کے تیئس ججوں میں سے بیس جج بہت خوش ہوئے تھے باقی تین نے کہا کہ انہیں افسوس ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ 1969ء سے لے کر گزشتہ 33 برسوں میں شاید ہی اکثریتی مذہب سے وابستہ کسی ملزم کو کوئی سزا ہوئی ہو۔ پولیس اور سول سرونٹس بھی وہی کچھ ہیں جب گجرات میں فساد ہو جاتا ہے تو پھر یہ انتظامی مشینری کو اتنی تیزی سے پھیلا تو دیتے ہیں مگر یا تو یہ خاموش تماشائی بن جاتی ہے یا مار دھاڑ کرنے والے ہجوم کے ساتھ ہو جاتی ہے گودھرا کے حادثہ کے بعد جو قتل عام ہوا اس کے دوران تو اعلیٰ عدالتوں کے اکثریتی مذہب کے ججوں اور انسپکٹروں پولیس تک کو نہیں بخشا گیا۔ اقلیتی فرقے کے ہائی کورٹ کے ججوں کو اپنی جان بچانے کیلئے اپنے گھروں سے بھاگنا پڑا اور حکام نے ان کی باتوں وغیرہ پر کوئی توجہ ہی نہیں دی بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک زندہ اور متحرک سول سوسائٹی ہی ان فرقہ وارانہ نفرت کا علاج کر سکتی ہے لیکن اگر سول سوسائٹی ہی اس حد تک فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ دی گئی ہے تو وہ ان کا کیا تدارک کر سکتی ہے۔ معاشرے میں اس قدر ناخواندگی، غربت اور بیروزگاری ہے کہ ہم ایک جیتی جاگتی مضبوط سوسائٹی کہاں سے لا سکتے ہیں ہمارے سیاستدان خصوصاً بی جے پی سے وابستہ سیاستدان انتہائی غلط طریقے سے مذہب کو استعمال کر رہے ہیں بیس سال پہلے جن سنگھ پریوار بھی یہی کام کرتا تھا۔ یہ نہ صرف سیکولرازم کو چیلنج کرتے ہیں اسے نام نہاد سیکولرازم کہتے ہیں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ سیٹیں حاصل کرنے کیلئے گزشتہ کئی سالوں سے رام مندر کا مسئلہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ ہندوستانی سیاست اور سیکولرازم کیلئے یہی تو نازک مرحلہ ہے۔ بی جے پی کے سیاستدان اقتدار حاصل کرنے کیلئے ملکی مفادات

کو پس پشت ڈال رہے ہیں جبکہ عوام کی طرف سے ان کی سخت مزاحمت کئے جانے کی ضرورت ہے۔ سیکولر جماعتیں تو آپس میں ہی الجھی ہوئی ہیں سماج وادی بی ایس پی سے، سوشلسٹ کانگرس کے ساتھ اور بعض نے تو مخالف سیکولر گروپوں کو ختم کرنے کے خیال سے بی جے پی سے اتحاد کر رکھا ہے۔ نیشنل ڈیموکریٹک میں شامل ان پارٹیوں کو اگر ملک کی وحدت اور سیکولرازم عزیز ہے تو پھر انہیں ان واقعات کا موقع پر ہی فوراً ترک کر دینا چاہیئے۔

(31۔ مارچ 2002ء)

گجرات......حلقہ تاریک

اگر کوئی بھی حساس شخص گجرات کا دورہ کرنے نکلے تو یہ تجربہ اسے ہلا کر رکھ دے گا۔ فساد کو ایک مہینے سے زائد کا عرصہ ہو گیا مگر صوبہ اب بھی جل رہا ہے۔ قتل و غارت کے واقعات اس قدر بہیمانہ ہیں کہ آدمی سمجھتا ہے کہ گجرات تو ابھی رشنی کے دور میں داخل ہی نہیں ہوا اور اگر کبھی اس میں داخل ہوا بھی ہے تو اس میں سے نکل کر پھر تاریک کرب میں داخل ہو گیا ہے۔ چند قابل احترام استثنا کو چھوڑ کر گجرات مجسم درندگی بن چکا ہے۔

اپوزیشن جماعتیں صرف نریندر مودی کو ہٹانے کا مطالبہ کر رہی ہیں مگر یہ تو کافی نہیں۔ دراصل نرنیدر مودی کی حکومت کو برطرف کیا جانا چاہیئے اور صوبے میں صدر راج قائم ہونا چاہیئے۔ نریندر مودی کی حکومت کے متعدد وزیر قتل عام میں پورے پورے ملوث ہیں وزیر داخلہ اور وزیر مال پرین پانڈیا کو بہت سے لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ لوٹ مار کرنے والے ہجوم کے ساتھ ساتھ تھے۔ بعض ایف آئی آر میں ان کا نام بھی آیا ہے۔

جب تک حکومت اقتدار میں ہے ستم گزیدہ اور بچ جانے والے لوگوں کو انصاف ملنے کی کوئی امید نہیں۔ پولیس یا تو ایف آئی آر ہی درج نہیں کرتی یا قاتلوں اور لوٹ مار کرنے والوں کیخلاف معمول جرائم کی ایف آئی آر لکھ لیتی ہے۔ جب تک یہ حکومت اقتدار میں ہے کسی مجرم کو سزا نہیں مل سکتی۔ قتل عام کرنے والوں کو تو حکومت کی طرف سے یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ان کا بھرپور تحفظ کیا جائے گا صرف صدر راج ہی سے تھوڑی بہت تبدیل آ سکتی ہے ان دنوں جو گورنر ہیں وہ خود آر ایس ایس کے آدمی ہیں بہت سے لوگوں نے خود مجھ سے کہا کہ موجودہ گورنر

کو بھی الگ کیا جانا چاہئے مگر ایسا ممکن ہی نہیں لگتا۔

گجرات کا قتل عام دراصل ہندوستانی جمہوریت اس کے تنوع اور اس کی کثرت الوجودیت پر ایک حملہ ہے۔ ہندوستان نے 1950ء میں ری پبلک بننے کے بعد ہی جمہوریت اور سیاسی کثرت الوجودیت کو اختیار نہیں کیا اس سے پہلے بھی یہ ہی کچھ تھا۔ یہ صوبوں کے حوالے سے سیاسی لحاظ سے کثرت الوجود تھا اوراس کے لئے اس سیاسی ورثے پر فخر بھی ہے ہمارے سیکولرازم کا لنگر تو یہی کثرت الوجودیت ہے ہم اس کا بغیر سیکولر جمہوریت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مگر گزشتہ ایک ماہ میں گجرات میں جو کچھ ہوا وہ تو سیاسی کثرت الوجود پر سوچا سمجھا حملہ ہے۔ چاہا یہ جا رہا ہے کہ مسلمان کو الگ تھلگ کر کے ایک کونے میں اکٹھا کر دیا جائے ان کو غیر ہندوستانی سمجھا جا رہا ہے۔ وشوا ہندو پریشد اوراس کے سازشی ساتھی موجودہ حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں کے معاشی بائیکاٹ کیلئے پمفلٹ تقسیم کر رہے ہیں کہ نہ مسلمانوں کے ہاتھ کوئی چیز بیچی جائے نہ خریدی جائے۔ بہت سے لوگ اس ہدایت پر عمل بھی کر رہے ہیں۔ ایک ہندو ڈاکٹر کو ایک نامعلوم شخص نے چھرا گھونپ دیا اور ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ ان مسلمانوں کے محلوں میں پریکٹس نہیں کریں گے مگر جب ایک مسلم ڈاکٹر کو قتل کر دیا گیا تو پھر کسی نے کوئی ہاؤ ہو نہیں کی کسی نے تشویش تک کا اظہار نہیں کیا۔

بہت سے ہندو تاجروں نے اپنے مسلمان ملازموں سے کہہ دیا ہے کہ وہ کام پر نہ آئیں۔ وشوہندو پریشد کے پرجوش کارکن متعدد سکولوں کے ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں کے پاس جا رہے ہیں کہ وہ اپنے اداروں سے مسلمان طالب علموں کو نکال دیں۔ اس خیال سے ہی آدمی کو جھرجھری آ جاتی ہے کہ اگر وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل کی دھمکی کے باعث واقعی مسلم طلباء کو تعلیمی اداروں سے نکال دیا جاتا ہے تو ہو گا کیا؟ مسلمانوں کی مکمل علیحدگی ہو جائے گی۔

بی جے پی اور آر ایس ایس والے شروع دن سے یہ کہتے نہیں تھکتے کہ مسلمان ہندوستان کے قومی دھارے کا حصہ بننے سے انکاری ہیں اول تو یہ بات صحیح نہیں لیکن اگر صحیح بھی ہے تو ان کو بڑے دھارے سے الگ کرنے والا کون ہے؟ اگر انہیں سرکاری اور نجی سکولوں سے نکال دیا جائے گا تو وہ مدرسے شیل (بم) کی طرف جانے پر مجبور نہیں ہو جائیں گے؟ لگتا ہے کہ گجرات میں مودی کی حکومت بڑی خاموشی سے وشوا ہندو پریشد کے کارکنوں کی اس ضمن میں حوصلہ

افزائی کررہی ہے کہ وہ اپنے'' منصوبہ ہندو ہندوستان'' پر سب سے پہلے گجرات میں عمل کرلیں۔ جولوگ ہندوستان کی سیکولر ڈیموکریسی کے حامی ہیں انہیں اس معاملہ کو ہنسی خوشی میں نہیں لینا چاہیئے اگر ایسا ہو گیا یا جزوی طور پر بھی ایسا ہو گیا تو پھر یہ ہماری کثرت الوجودیت اور ہماری سیکولر جمہوریت کی تباہی کا حرف آغاز ہوگا۔

آج ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ انتظامیہ برسراقتدار فاشسٹ طاقتوں کے سامنے کس طرح ہتھیار ڈال دیتی ہے گجرات کی حکومت کیلئے ہندوستان کے آئین کا کوئی وجود نہیں۔ یہی حال گجرات کی انتظامیہ کا ہے انتظامیہ گجرات کی حکومت کے خلاف قانون اور ماورا آئین قسم کے احکامات کو کو مانتی ہے جو کوئی قانون کی حکمرانی کی بات کرتا ہے اس کا فوراً تبادلہ کردیا جاتا ہے ایک باضمیر آئی اے ایس آفیسر ہرش مندر صورتحال سے اس قدر برگشتہ خاطر ہوا کہ اس نے مایوس ہوکر استعفیٰ دیدیا اس نے گجرات کے قتل عام پر ایک پرتاثیر تاثر رقم کیا ہے۔

انتظامیہ کی طرح پولیس فورس بھی مکمل طور پر تابعدار ثابت ہورہی ہے۔ بہت سے لوگوں نے پولیس کے اس رویئے کو شرمناک قرار دیا ہے جب پولیس کے ڈائریکٹر جنرل جیولو را بیرو نے گجرات کا دورہ کیا تو کئی سینئر افسروں نے شرم کے مارے ان سے ملنے تک سے گریز کیا۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا جب کبھی میں گجرات جاتا ہوں تو عموماً سینئر افسر مجھے ملنے آتے ہیں مگر اس مرتبہ انہوں نے مجھ سے آنکھیں چرائیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ گجرات میں پولیس کی ناکامی کی وجوہ کیا ہیں تو انہوں نے کہا اعلیٰ افسروں پر الزام آتا ہے مجھے ان اعلیٰ پولیس افسروں میں قیادت کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آئی سینئر افسروں کو خاموش تماشائی بنادیا گیا ہے جیسے ان کا پولیس فورس پر کوئی کنٹرول ہی نہ ہو۔

(ٹائمز آف انڈیا 10 اپریل 2002ء)

احمد آباد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے میری یہی بات ہوئی فرض شناسی کے بعد وہ خود بی جے پی کی کا نخچیر بنے۔ اس کا تبادلہ اس لئے کردیا گیا کہ اس نے اپنے علاقے میں فرقہ وارانہ فساد ہونے ہی نہیں دیا ریبیرو نے جو کچھ اپنے انٹرویو میں کیا اس پولیس افسر نے اسکی توثیق کی۔ نیچے کے افسروں اور سپاہیوں کی ہمدردیاں حملہ آوروں اور لوٹ مار کرنے والوں ے ساتھ ہیں۔ فساد کا شکار ہونے والے کئی لوگوں نے خود مجھ سے کہا کہ پولیس نے ان کا راستہ روک لیا اور ہجوم نے ان پر حملہ کردیا اور ان کے عزیزوں کو زندہ جلادیا اگر انہوں نے بھاگنے کی

کوشش کی تو پولیس نے پیچھے سے ان پر گولی چلا دی۔

کہا جاتا ہے کہ باپونگر میں پولیس نے چالیس نوجوانوں کو پوائنٹ بلینک رینج میں گولی ماری۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتہ چلا کہ گولیاں ان کے سروں اور سینوں میں لگی ہیں تاہم جب فوج آ گئی تو کئی جانیں بچالی گیں وگرنہ مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی اور احمد آباد کے اکبر نگر میں تو اسسٹنٹ کمشنر پولیس کے دفتر کے عقب میں ایک پورا محلّہ تباہ کر دیا گیا۔

پکے مکانوں کو اڑانے کیلئے گیس کے سلنڈر بھی استعمال کئے گئے۔ ان کو اتنی تعداد میں گیس کے سلنڈر کس نے دیئے؟ ایک ٹرک میں بہت سے سلنڈر انصار نگر میں لائے گئے وہاں جامعہ قاسم کا مدرسہ تھا اس عمارت کو ان سلنڈروں سے اڑایا گیا میں نے عمارت دیکھی ہے اس کو شدید نقصان پہنچا ہے۔

معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے پوری سنجیدگی سے زیرِ غور لایا جانا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ اس قتل عام میں دلت اور دوسری پسماندہ ذاتوں کے افراد نے بھی حصہ لیا۔ کئی لوگوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ فرقہ وارانہ رجحان کا مقابلہ کرنے کیلئے مسلمانوں اور دلت میں اتحاد ہونا چاہئے مگر ہندوتوا وادیوں نے دلت کو مسلمانوں کیخلاف استعمال کر کے ان میں ایک خاص قسم کی ہندوویت پیدا کر دی ہے۔ کوئی دس سے پندرہ ہزار افراد کے ہجوم نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا ان میں اکثریت دلت اور پسماندہ قبائل کی تھی۔ گجرات میں دلت کی کوئی برائے نام قیادت ہی نہیں ہے۔ 1981ء میں دلت کے خلاف فسادات میں جن لوگوں نے دلت کی طرفداری کی تھی وہ اب غیر مؤثر ہو چکے ہیں دلت نے اس زمانے میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے خلاف بڑے غم و غصے اور لڑنے کا اظہار کیا گیا تھا مگر وہ دوبارہ انہی سے مل گئے ان کو شراب اور پیسہ دیا گیا اس کے علاوہ فساد میں لوٹ میں حصے کی ترغیب بھی دیگئی مگر جس جوش اور غصے کے ساتھ انہوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا یہ اس کا کوئی جواز فراہم نہیں کرتا۔

مسلمانوں کیخلاف مسلسل پراپیگنڈا کیا گیا ہے کہ مسلمان ملک اور قوم کے دشمن ہیں انہیں سبق سکھایا جانا چاہئے اس پراپیگنڈے کا بھی بڑا اثر ہوا۔ ایسی صورت احوال میں وشوا ہندو پریشد نے مسلمانوں کے خلاف دلت کو ساتھ ملا کر لڑنے کیلئے ان سے بڑی یگانگت کا اظہار کیا ان کو دلت کے بجائے ہندو کہا اور ان میں مضبوط ہندوویت پیدا کی۔ ہندوتوا کی سیاسی تدبیر کاری میں نہ صرف مسلمانوں کی نسل کشی میں دلت لوگوں کی حمایت ضروری ہے بلکہ انہیں

MashalBooks.org

چھوٹے موٹے کام دے کر انتخابات جیتنے کا بھی سامان ہے۔

انہوں نے دلت قیادت کو حکومتی ڈھانچے میں کچھ حصہ دے کر ساتھ ملانے کا حیلہ بھی کیا۔ مایاوتی ہو یا پاسوان سبھی نے پہلے دلت لوگوں کی طرف سے بی جے پی اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا مگر پھر انہوں نے بھی اونچی ذات کی ہندو قیادت سے سمجھوتہ کر لیا۔ مایا وتی اور پاسوان جیسے لوگ گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی کے دوران خاموش رہے جب مایاوتی سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے ترنت جواب دیا۔ گودھرا کے بارے میں کیا خیال ہے؟ صرف وہ دلت لیڈر جو ابھی تک نظام اقتدار میں نہیں آ سکے وہی اونی ذات کے ہندوؤں کے خلاف غصے کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ سیاسی طور پر مسلمانوں اور دلت لوگوں کا اتحاد کبھی بھی مؤثر نہیں رہا۔

ہندوتوا وادیوں کے ہاتھوں اس قتل عام میں یہ حوصلہ افزا بات تھی کہ ریلیف کیمپوں میں مسلمان اداس ضرور تھے مگر تلخ اور ناراض نہیں تھے اس سے کچھ امید بندھتی ہے بوہرے کھوجے اور میمن لوگ جو تجارت کرتے ہیں وہ دوبارہ کاروبار شروع کرنے کے بارے میں فکر مند ہیں۔ بہر طور ان کیلئے ساز و سامان اور روپیہ حاصل کرنا بڑا مشکل ہوگا۔ ایک اعلیٰ پولیس افسر نے مجھے بتایا کہ وزیر اعلیٰ نریندر مودی نے ایک اجلاس میں انہیں واضح طور پر بتا دیا تھا کہ فساد زدگان (یعنی مسلمانوں) کی آباد کاری کیلئے کچھ نہیں کرنا حالانکہ وزیر اعظم نے کہا تھا کہ فساد زدگان کو دوبارہ بحال ہونے میں مدد دی جائے گی۔ مودی نے کہا کہ چند دن تک ریلیف دیا جائے گا۔ اس کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ وہ واپس اپنے گھروں کو آ جائیں۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ گجرات سے باہر دوسرے علاقوں اور صوبوں میں اب امن سیکولرازم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بارے میں زیادہ باتیں ہونے لگی ہیں پہلے اتنی باتیں نہیں ہوتی تھیں گاندھی کے بہت سے پیروکار شروع کے فسادات پر تو خاموش رہے مگر بعد میں انہوں نے احتجاج بھی شروع کیا اور امن کی بحالی کیلئے بھی سرگرم ہو گئے۔ ملکہ سارا بھائی نے احمد آباد میں جو امن اجلاس بلایا تھا اور جس میں پورے ہندوستان سے خاصی تعداد میں لوگ شامل ہوئے اس میں شوا ہندو پریشد نے گڑبڑ کرنے کی بھی کوشش کی۔

گجرات کے جونی بھائی واڈیا گاندھی کے پیروکار ہیں وہ سرگرمی سے کام کر رہے ہیں اور انہیں ڈرایا دھمکایا بھی جا رہا ہے۔ اس قتل عام کیخلاف پورے ہندوستان میں احتجاج ہوا جو بڑا

امیدافزا واقعہ ہے اور اگر چہ بی جے پی نے گجرات میں کچھ سیاسی فائدہ حاصل کرلیا ہوگا مگر پورے ہندوستان میں یہ خسارے میں رہی۔ اس طرح این ڈی اے میں اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی سیاسی نقصان ہوگا۔ انہوں نے ادھرادھر صرف دکھاوے کیلئے شور شرابا کیا مگر گجرات میں امن کے قیام کیلئے فکر مندی کا کوئی سچا اظہار نہیں کیا۔ تیلگو دیسم پارٹی (ٹی ڈی پی) نے آندھرا پردیش میں مسلمان ووٹروں کے خیال سے گجرات میں فسادات کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا مگر اس وقت جب بربادی ہوچکی تھی پاسوان نے بھی یہی کیا یقیناً ان کے ووٹر ان کے رویئے کو پسند نہیں کریں گے۔

(30-اپریل2002ء)

گجرات کی خونریزی میں پولیس کا کردار

فرقہ وارانہ فسادات میں مجموعی طور پر پولیس خصوصاً گجرات کے فسادات میں پولیس کا کردار بے حد ناپسندیدہ رہا ہے۔ 1962ء میں جبل پور کے فسادات کے بعد سے میں ان پر کام کررہا ہوں۔ جبل پور کے فسادات اس قدر بھیانک اور خوفناک تھے کہ انہوں نے جواہر لال نہرو تک کو ہلا کر رکھ دیا تھا جنہوں نے ایک سیکولر ہندوستان کا خواب دیکھا تھا۔ جبل پور کے فسادات میں بھی پولیس کا کردار حیران کن تھا۔ ایس آر پی کے آدمیوں نے نہ صرف فسادیوں کی مدد کی بلکہ عورتوں کی بانہوں سے سونے کی چوڑیاں اور گلے سے منگل سوتر بھی اتروالئے کہ وہ فساد زدگان کے گھروں میں گھس گئے۔ عورتوں کو مارا پیٹا اور جو کچھ ہاتھ لگا اٹھالے گئے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں یہ میرا پہلا تحقیقی کام تھا اس لئے مجھے یقین نہیں آیا کہ واقعی پولیس یہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ یقیناً یہ انتہائی ناقابل یقین تھا۔

جبل پور کے بعد فسادات پر فسادات ہوئے اور میں ان میں پولیس کے کردار کا مشاہدہ کرتا رہا یہ رویہ اقلیتوں کے شدید خلاف تھا۔ میرٹھ میں دو مرتبہ پولیس کے کردار کو دیکھا۔ 1982ء اور 1987ء میں ان دونوں فسادات میں پی اے سی کا کردار فسادیوں سے بھی بدتر تھا 1982ء کے میرٹھ کے فسادات میں پی اے سی والوں نے ڈاکٹر شبیر کے اکلوتے بیٹے کو گولی مار کر ہلاک کردیا اور پھر باپ سے کہا کہ وہ بیٹے کی لاش ٹرک میں رکھوائے پھر ڈاکٹر شبیر کی ڈسپنسری کو مکمل طور پر تباہ کردیا پی اے سی نے بھی بہت سے ایسے لوگوں کو مارا جو اپنے گھروں

میں چھپے ہوئے تھے۔ کچھ عورتوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے فساد میں مارے جانے کے ڈر سے اپنے شوہروں کو ٹرنکوں میں چھپا لیا تھا مگر پی اے سی والوں نے انکو وہاں سے نکال کر گولی ماردی۔ جسٹس کرشنا آئر نے فسادات کے بعد میرٹھ کا دورہ کیا اور وہ پی اے سی کے رویے پر اس قدر حیران ہوئے کہ انہوں نے اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی کو ایک کھلی چٹھی لکھی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ پی اے سی کے کردار کے بارے میں تحقیقات کروائیں۔

پی اے سی نے 1987ء میں پھر یہی کردار دہرایا پی اے سی کے کمانڈنٹ تریپاٹھی پر الزام تھا کہ اس نے ہاشم پورہ سے تیئس مسلمان نوجوانوں کو ان کے گھروں سے پکڑا ٹرک پر سوار کرایا شہر سے باہر ایک نہر کنارے لے جایا گیا وہاں انہیں گولی ماردی گئی اور ان کی لاشیں نہر میں بہا دی گئیں۔ دو بچے معجزانہ طور پر بچ گئے اور انہوں نے یہ قصہ سنایا مگر پی اے سی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوا کچھ برس بعد ملایم سنگھ یادیو کے دور حکومت میں ایف آئی آر کٹوائی گئی مگر ایف آئی آر کے لکھے جانے کے علاوہ اور کوئی بھی کارروائی نہیں ہوئی۔

1992-93ء کے ممبئی کے فسادات میں پولیس کے کردار کے بارے میں بہت سی این جی او نے شدید نکتہ چینی کی اور سب سے بڑھ کر سری کرنا کمیشن میں ایسے بائیس پولیس افسروں کو نامزد کیا گیا جو اقلیتوں کے خلاف فسادات میں مجرم بن گئے اعلیٰ پولیس افسروں میں تیواڑی کا نام تھا جس پر الزام تھا کہ اس نے مینار مسجد کے پاس واقع سلیمان بیکری میں نوجوان مسلمان لڑکوں کو قتل کروایا تھا۔ انسانی حقوق کے کارکنوں کی طرف سے کڑے احتجاج کے بعد تیواڑی کو علامتی طور پر گرفتار کر کے فوراً ہی چھوڑ دیا گیا۔

27 فروری 2002ء میں گودھرا کے حادثوں کے بعد گجرات کے قتل عام میں بھی یہی داستان دہرائی گئی۔

گجرات پولیس نے پھر فسادیوں کی مدد کی بلکہ انہیں فساد کرنے کی ترغیب دی۔ اس مرتبہ آئی اے ایس وانڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے افسروں کے کردار پر بھی کڑی تنقید ہوئی۔ ایک آئی اے ایس افسر ہرش مندر ایم پی کیڈر کا تھا اور ان دنوں گجرات میں ایکشن ایڈ انڈیا میں کام کر رہا تھا۔ اس نے گجرات میں آئی اے ایس کے افسروں کو دیکھا کہ وہ سیاسی حکام کے سامنے مکمل طور پر ہتھیار ڈالے بیٹھے ہیں تو ہرش اس قدر مایوس ہوا کہ اس نے ملازمت سے استعفیٰ لکھا کہ اس کی نظر میں اس قسم کی ملازمت میں رہنا اسے منظور نہیں۔ ہرش مندر نے اپنے

ایک مضمون میں کہا میں خوف اور شدید مایوسی کی بے بس کیفیت میں گجرات سے واپس آیا جہاں دس دن پہلے دہشت اور قتل عام نے پورے صوبے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرا دل ٹوٹا، میری روح مرجھا گئی اور شرم اور احساس جرم کے بوجھ سے میرے کندھے دکھنے لگے۔ اس نے مزید کہا کہ بے ضمیری کے باعث صوبے کی پولیس اور انتظامی مشینری کی طرف سے فسادیوں کی بھرپور امداد کے قصے اب دنیا جہاں میں عام ہو گئے ہیں پولیس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے لوگوں کو گمراہ کیا اور سیدھا فسادیوں کے گھیرے میں میں پہنچا دیا۔ پولیس نے آتش زنی عصمت دری، قتل و غارت گری اور فساد کرنے والوں کو حفاظتی چھتری مہیا کر دی اور نشانہ بننے والے مسلمانوں جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے کی فریاد پر کان ہی نہیں دھرا۔ بہت سی یہ خبریں بھی ہیں کہ پولیس نے زیادہ تر اقلیتی برادری پر براہ راست گولی چلائی جبکہ منتشر ہجوم کا نشانہ بھی یہی اقلیت والے تھے۔

گجرات کے قتل عام میں پولیس کے اس کردار کے بارے میں صرف ہرش مندر نے ہی مضمون نہیں لکھا بعض اعلیٰ پولیس افسروں سمیت اور لوگوں نے بھی گجرات میں پولیس کے کردار کی مذمت کی ہے۔ مہاراشٹر کے سابق ڈائریکٹر جنرل پولیس جولیو رابیرو نے ان پولیس والوں کو اس لئے مطعون کہا کہ انہوں نے بوڑھے مردوں، عورتوں اور بچوں پر حملے کئے۔

فسادات کے خاتمے پر بھی پولیس صحیح ایف آئی آر درج نہیں کر رہی تھی اس کی وجہ اوپر کے سیاسی حکام کا دباؤ تھا یا ان کی فرقہ وارانہ ذہنیت تھی۔ رابیرو نے ٹائمز آف انڈیا کو ایک انٹرویو میں کہا پولیس کی معمول سی کسلمندی اور سستی کے علاوہ گواہ نے بتایا کہ پولیس بالکل غلط ایف آئی آر درج کرتی تھی۔ میری ملاقات ایک واجب الاحترام ہندو سے ہوئی جس نے فسادیوں کو خود دیکھا تھا پولیس نے ان کے نام تک نہیں لکھے اس کی جگہ یہ لکھا کہ ایک گروپ تھا جس کی شناخت نہیں ہو سکی۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی ماؤں بہنوں کی عصمت دری ہوتے دیکھی ہے انہیں آگ میں جلتے دیکھا ہے اگر انہیں انصاف کی کوئی امید نہیں رہتی تو لامحالہ وہ سب کے سب دہشت پسند بن جائیں گے۔ پھر رابیرو نے خود سوال کیا جب ہم خود دہشت گرد پیدا کر رہے ہیں تو پھر آئی ایس آئی اور پاکستان کے بارے میں کیوں باتیں کرتے ہیں ان کا کام تو ہم خود کر رہے ہیں۔

ایک اور اعلیٰ پولیس افسر وبھوتی نرائن رائے ہیں آج کل یوپی میں انسپکٹر جنرل پولیس

ہیں۔انہوں نے متعدد فسادات میں فرض انجام دیا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ اگر انتظامیہ چاہے تو چوبیس گھنٹے کے اندر فسادات پر قابو پایا جاسکتا ہے ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق رائے نے گجرات کے فرقہ وارانہ فسادات کے حوالے سے آئی پی ایس کے تمام افسروں کو خط لکھے کہ پولیس اپنی ناکامی کیلئے سامان یا فورس کی کمی کو بہانہ نہ بنائے۔ان کوتاہیوں کے باوجود بڑے بڑے فسادات روکے جاسکتے ہیں رائے نے یہ بھی کہا کہ لوگوں کو واقعی یہ لگا کہ پولیس بالکل غیر جانبدار ہے اور اس رویئے سے لوگوں کو صحیح پیغام پہنچ جاتا ہے۔

تقریباً ہر فساد میں پولیس اس وقت انتقامی کارروائی پر اتر آتی ہے جب اس کا کوئی آدمی مارا جائے یا زخمی ہوجائے اس کے بعد یہ پاگل ہوجاتی ہے۔93-1992ء میں ممبئی کے علاقہ دیوریا میں ایسا ہوا وہاں ایک پولیس مین نامعلوم مجرموں کے ہاتھوں مارا گیا جس کے جواب میں ہندو مسلمان نوجوانوں کو اپنی زندگیوں سے یہ قرض چکانا پڑا۔اس وقت پوار جیسا ایک سینئر اور صاحب کردار پولیس افسر تھا جس نے صورتحال پر قابو پالیا۔2 اپریل کو احمد آباد میں بھی اس قسم کا واقعہ ہوا۔

ایک پولیس والا امر راؤ پٹیل مارا گیا تو پولیس نے انتقاماً فائرنگ شروع کی جس سے دس افراد ہلاک ہوئے جن میں دو عورتیں بھی تھیں اور 14 زخمی ہوئے۔یہ قتل پٹیل کی چالی اور مودی کی چالی میں ہوئے جہاں کے طیش میں آئے لوگوں نے کہا کہ پولیس نے سخت انتقامی کارروائی کی ہے۔ان علاقوں میں 28 فروری تک کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور پولیس کی فائرنگ اور دس افراد کی ہلاکت سے پہلے وہاں کوئی تشدد بھی نہیں ہوا تھا۔

پولیس والوں کا ایک اپنا بیان تھا، انسپکٹر بی پرماد نے کہا کہ فساد پر آمادہ ہجوم سے عام غیر مسلح یا کم مسلح پولیس نمٹ سکتی ہے۔اگر گولی سے ایک عورت زخمی ہوتی ہے تو یہ غیر ارادی بات ہوسکتی ہے اور ہوسکتا کہ یہ عورت خود فسادیوں میں شامل ہو۔وضاحت جیسی بھی ہو اس سے قطع نظر ہجوم کے تشدد کے مقابلے میں فائرنگ بہت زیادہ کی گئی۔

تو کیا ہماری پولیس فورس قابل مذمت ہے؟ اگر فسادات کے دوران پولیس بے گناہ لوگوں کو بھی قتل کر دیتی ہے یا گرفتار کرتی ہے تو ساری فورس کی مذمت نہیں کی جاسکتی ایسے افسر بھی ہیں جو غیر متعصب ہیں اور پیشے کی اقدار کے ماننے والے ہیں انہوں نے کامیابی کے ساتھ فسادات کو کنٹرول کیا۔رابیر و اور وی این رائے نے دونوں اعلیٰ پولیس افسر ہیں وہ خود

MashalBooks.org

پولیس فورس میں اچھے لوگوں کی موجودگی کی مثال ہیں اور ایسے اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ اپنی تحقیقات کے دوران مجھے گجرات میں ایسے بہت سے لوگ ملے۔ بعض افسروں کو صورتحال پر قابو پانے کے لئے پیشہ ورانہ انداز میں تیار پایا مگر بدقسمتی سے ان کو سیاسی حکام خصوصاً نریندر مودی نے آزادانہ فرائض انجام نہیں دینے دیئے۔ ان لوگوں کا فوراً تبادلہ کر دیا گیا اور تبادلوں کو یا معمول کی بات قرار دیا یا ترقی کا نام دیا۔ یہ سیاسی حاکموں کی مجرمانہ کارروائی تھی نہ کہ پولیس افسروں کی پیشہ ورانہ کارکردگی کی کمی۔

بہت سے دوسرے عوامل بھی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات دیانتدار پولیس افسروں میں حوصلے کی کمی ہوتی ہے وہ قانون قاعدے کے مطابق کام کرنے کے بجائے سیاسی حکام کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں کچھ ایسے بھی جو پیشہ ورانہ طریق سے اپنا کام کر جاتے ہیں انہیں فوراً تبدیل کر دیا جاتا ہے وہ بے اثر ہو جاتے ہیں مگر گجرات میں اعلیٰ افسروں کی اکثریت نے بڑی بزدلی کے ساتھ سیاسی حکام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے پھر بھی کچھ واجب الاحترام مثالیں ہیں۔ میری ملاقات ایک ایڈیشنل کمشنر پولیس سے ہوئی جس نے اپنے علاقے میں فساد نہیں ہونے دیا چنانچہ اسے فوراً احمد آباد کے پولیس ہیڈ کوارٹر کے ایک انتظامی شعبہ میں تبدیل کر دیا گیا۔

پولیس فورس کے جونیئر افسروں کی حد تک خصوصاً کانسٹیبلری کی سطح تک فرقہ واریت اور ذات پات بہت گہری سرائیت کر گئی ہے۔ بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ کانسٹیبلری اور جونیئر افسروں کو تربیتی کورسوں کے ذریعے ان عوارض سے رہائی دلوائی جائے۔ اس سطح پر انہیں سیکولرازم کی کوئی تربیت نہیں دی جاتی۔ میں نے خود کئی پولیس ورکشاپوں میں تربیت دی ہے اور کانسٹیبلری اور جونیئر افسران کے ذہنوں پر اس قسم کی پڑھائی کے گہرے اثرات بھی دیکھے ہیں۔ میں نے مہاراشٹر میں ایسی ورکشاپیں کی ہیں جہاں کے وزیر اعلیٰ پولیس افسروں نے اس قسم کی ورکشاپوں کی اہمیت کو محسوس کیا اور پھر زیادہ سے زیادہ ورکشاپیں کرنے میں تعاون کیا۔ تمام صوبوں میں ایسی ورکشاپوں کی بڑی ضرورت ہے جہاں تک اعلیٰ پولیس افسروں کا تعلق ہے ان کی ترقی اور تبادلے کا نظام بہتر ہونا چاہئے۔ تبادلے سیاسی حکام کی من مرضی پر نہ کئے جائیں۔ سیاستدانوں کا اپنا ایک ایجنڈا ہوتا ہے جس میں وہ بعض اوقات قانون کی حکمرانی کے قائل نہیں رہے۔ پانچویں پولیس کمیشن نے جس طرح تبادلے کے بارے میں طریق کار کی

سفارش کی تھی اس طریقہ کے مطابق تبادلہ ہونا چاہئے ایک کمیٹی ہو جس میں وزیراعلیٰ حزب اختلاف کا لیڈر، پولیس کا ڈائریکٹر جنرل اور چند اہم شہری یہ کمیٹی پولیس افسر کی تبدیلی کے فیصلہ کرے۔ تبادلے اور ترقی کیلئے اس قسم کی پالیسی سے دیانتدار اور پیشہ ور پولیس افسروں کو تقویت ملے گی اور وہ سیاسی حکام کے دباؤ کے باوجود بہتر طور پر فرائض انجام دے سکیں گے۔

اس کے علاوہ پولیس کے سارے ڈھانچے اور طریقہ کار کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں اب بھی برطانوی سامراجی عہد کی پولیسنگ چل رہی ہے۔ اسے نوآبادیاتی نمونے کے بجائے جمہوری نمونے کے مطابق منظم کیا جانا چاہئے اگر افسروں کے تبادلے کے بارے میں مناسب پالیسی اختیار نہ کی گئی تو پولیس میں سیاست سرائیت کرتی رہے گی اسے سیاسی طور پر استعمال کیا جاتا رہے گا اور پولیس کی افادیت کے نقطہ نظر سے یہ طریق کار تباہ کن ثابت ہوگا۔ گجرات کے قتل عام میں دراصل یہی کچھ ہوا ہے بعض اعلیٰ پولیس افسروں کو سیاست میں ملوث کر لیا گیا۔ انہوں نے اپنے پیشے کے تقاضوں کے مطابق صوتحال کو کنٹرول نہیں کیا اور جنہوں نے یہ اچھا کام کر دکھایا انہیں بالکل یکطرفہ طور پر کارروائی کر کے تبدیل کر دیا گیا۔

(30۔ جون 2002ء)

فرقہ وارانہ تشدد اور سول سوسائٹی کا کردار

جب گجرات میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ آسمان کو چھو رہی تھی اس وقت کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ایسے فسادات کو روکنے کیلئے ایک متحرک سول سوسائٹی ہونی چاہئے۔ بلاشبہ یہ تاثر بڑا موزوں ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایسے فرقہ وارانہ قتل عام اس متحرک سول سوسائٹی میں نہیں ہوں گے؟ کیا بھارت میں کہیں یہ متحرک سول سوسائٹی وجود رکھتی ہے؟ اگر ہم اپنی جمہوریت میں سول سوسائٹی کا کردار کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پھر یہ سوال بڑے برمحل ہیں۔

واضح رہے کہ ایک سیاسی معاشرے یا سوسائٹی اور ایک سول سوسائٹی میں واضح خط تفریق کھینچنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ تصور اصلاً مغرب کا ہے۔ سیاسی اور سول سوسائٹی کا باہمی رشتہ بڑا پیچیدہ ہے اور اسے سہل نہیں جاننا چاہئے۔ آخر کار جو کچھ سیاسی کہلاتا ہے وہ مظہر ہے معاشرے کا اور جو سیاسی ہے اس میں معاشرے کا عکس ہے۔ جب جنتا دل یا پارٹی 1977ء میں برسراقتدار آئی تو میں نے اپنی بوہرہ برادری میں بعض اصلاحات کے نفاذ کیلئے جنتا پارٹی کے سیاستدان کی مدد

چاہی تو اس نے کہا کہ وہ میری مدد نہیں کر سکتی کیونکہ معاشرہ ہماری رہنمائی کرتا ہے، ہم معاشرے کی راہنمائی نہیں کرتے اور اگر معاشرہ اتنا ہی قدامت پسند اور کٹر عقیدے والا ہے تو پھر ہمیں بھی ایسا ہی ہونا پڑے گا۔

بوہروں کے امام صاحبان اصلاح پسندوں کو سزا دینے کیلئے ان کا سماجی بائیکاٹ کرتے ہیں یہ طریقہ ختم کرنے کیلئے قانون بنوانے کی خاطر میں کئی وزرائے اعظم سے ملا ہوں سبھی نے یہ کہہ کر معذوری کا اظہار کر دیا کہ سوسائٹی اصلاحات کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں اس لئے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تو صورت یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان سوسائٹی کی رہنمائی نہیں کرتے بلکہ سوسائٹی ان کی رہنمائی کرتی ہے۔

ہم معاشرہ میں تبدیلیاں لانے کیلئے اکثر سیاسی قوت ارادی کا ذکر کرتے ہیں مگر یہ قوت ارادی تو اس فرق کے باعث موجود ہی نہیں کہاں تبدیلیوں سے معاشرے میں بے چینی اور انتشار پیدا ہوگا اور سیاستدانوں کو اٹھا کر اقتدار سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ ہمارے سیاستدان مندروں اور درگاہوں میں اس لئے جاتے ہیں کہ سول سوسائٹی ان سے اس کی توقع کرتی ہے۔ یہ جانی پہچانی حقیقت ہے کہ سیاستدان مقدس مذہبی جگہوں کا دورہ اس لئے نہیں کرتے کہ یہ ان کے عقیدے کی بات ہے عقیدے کے اعتبار سے بھی وہ ان جگہوں پر نہیں جاتے جو ان کے اور ان کے ووٹروں کے مذہبی عقیدے سے مختلف ہیں تو اپنے ووٹروں کو خوش کرنے اور جیتنے کیلئے ان جگہوں پر جاتے ہیں۔

واضح رہے کہ جمہوریت ہمارے معاشرے کے اندر سے پیدا نہیں ہوئی۔ یہ اس وقت یورپ میں پیدا ہوئی جب چرچ کی طاقت کو زوال آ گیا۔ یورپ میں بڑی ہلچل ہوئی اور ایک سول سوسائٹی پہلے ہی وجود میں آ چکی تھی اس کی سربراہی تاجر پیشہ بورژوازی کر رہی تھی اور سول سوسائٹی جمہوریت سے پہلے تشکیل پا چکی تھی مگر ہندوستان میں معاملات یوں نہ تھے۔ ایک نوآبادیاتی سوسائٹی میں جمہوریت کی ترقی بڑا پیچیدہ عمل تھا اس لے کہ ہماری سوسائٹی بنیادی طور پر جاگیردارانہ تھی ہمارے جمہوری طرز کو اپنانے سے پہلے سرمایہ داری نہ مضبوط ہوئی تھی نہ متحرک جب سے ہمارا آئین بنا ہے تو پیداواری عمل میں جاگیردارانہ رشتے کچھ کمزور تو ضرور ہوئے تھے مگر ختم نہیں ہوئے تھے ہمارے آئین میں انتہائی ترقی یافتہ جمہوری ممالک کے آئین کی بہترین باتیں شامل ہیں مگر آئین کو جن آدرشوں پر بنایا گیا وہ اصل حقیقت حال سے

کوسوں دور تھے۔ طلوع آزادی پر ہماری سوسائٹی بڑی پسماندہ قدامت پسند اور روایت پرست تھی۔ اگر چہ لوگوں میں بطفیل مہاتما گاندھی آزادی کی جدوجہد کے دوران شعور پیدا ہوا تھا مگر سچی جمہوری روایت اس وقت بھی موجود نہ تھی۔

ایک اور بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہماری سوسائٹی اور مغرب کی سول سوسائٹی میں معیاروں کے بہت فرق پائے جاتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ مغرب میں جمہوری روایات نے کئی صدیوں میں جا کر ترقی پائی اور یورپ میں عرصہ ہوا ناخواندگی کا مکمل خاتمہ ہو چکا تھا بہر طور ہندوستان میں جمہوریت برطانیہ کی دین نہ تھی اور ہندوستان کے عوام کو 1947ء میں آزادی سے پہلے بالغ حق رائے دہی حاصل نہ تھا۔ ہندوستان کے عوام افلاس ناخواندگی اور پسماندگی کا شکار تھے اور ذات پات کا نظام سب سے بڑی آفت تھی۔ آزادی کے پچاس برس تک ذات پات کے نظام کو نہیں توڑا جا رہا بلکہ اس کے برعکس اس کو حیات نو مل گئی ہے اب ذات پات پر منحصر پارٹیاں بڑھتی پھیلتی جا رہی ہیں جو اچھی جمہوریت کیلئے ہرگز خوش آیند نہیں ڈاکٹر امبید کر کی سب سے پہلی ترجیح یہی تھی کہ آزادی سے پہلے ذات پات کی سوسائٹی ختم کی جائے کیونکہ آزادی کی اتنی جلدی نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان رسمی نہیں اصل معیاری جمہوری دور میں داخل ہو۔ رسمی جمہوریت اور حقیقی معیاری جمہوریت میں ہمیشہ ایک کشمکش جاری رہی۔ معیاری جمہوریت کیلئے وسیع پیمانے پر تعلیم اور خواندگی نسبتاً خوشحال عوام اور احتیاج سے کسی حد تک آزادی چاہئے۔ مذہبی معاشروں میں روزگار بہت ہے۔ سو فیصد خواندگی ہے اور رائے سازی کیلئے اطلاعات کا پورے عالم پر پھیلا نظام یہ عوامل ہیں جو متحرک یا جیتی جاگتی سوسائٹی کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں ذات پات کے علاوہ فرقہ وارانہ تقسیم ایک اور بہت بڑی کمزوری ہے۔ فرقہ واریت دراصل ایک نوآبادیاتی سوسائٹی کی پیداوار ہے۔ برطانوی حکمرانوں نے ہندوستانی باشندوں کے ذہن میں فرقہ واریت پیدا کی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نوآبادتی دور میں شناخت کیلئے مذہبی حوالہ اہم بنتا گیا۔ اس طرح فرقہ واریت آہستہ آہستہ ہماری سول سوسائٹی میں سرایئت کرنے لگی اور فرقہ وارانہ تقسیم اتنی بڑی حقیقت بن گئی کہ آزادی کے موقع پر ملک کی تقسیم کو روکنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔

تیسری دہائی کے آخر میں ہماری تحریک آزادی میں فرقہ واری سب سے بڑا موضوع گفتگو بن گیا۔ اگر چہ مہاتما گاندھی، نہرو اور ابوالکلام آزاد تینوں سیکولرازم سے پیوستہ رہے مگر یہ

MashalBooks.org

بہت حد تک کمزور ہو چکا تھا سہ فریقی سیکولر قیادت سیکولرازم کے کیلئے سرگرم رہی مگر تقسیم کے موقع پر اس کی کوشش کے باوجود فرقہ وارانہ جنون کو نہ روکا جا سکا ہماری سول سوسائٹی کو فرقہ وارانہ رنگ میں رنگنے کے باعث آزادی آئی تو دس لاکھ افراد کی جان لے کر ہم نے نوآبادتی دور سے جو سوسائٹی ورثے میں لی ہے وہ فرقہ وارانہ سوسائٹی تھی۔ آزادی کے بعد اس موروثی فرقہ واریت سے چھٹکارے کیلئے کوئی شعوری کوشش نہیں کی گئی ایک طرف تو ہماری سوسائٹی ہی مذہبوں میں تقسیم تھی دوسری طرف سیاستدانوں نے اپنے انتخابی مقاصد کیلئے فرقہ واریت کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ فرقہ وارانہ طور پر تقسیم معاشرہ زیادہ تر متوسط طبقے کی سطح تک ہی سہی ایک جیتی جاگتی سول سوسائٹی میں تبدیل نہیں ہو سکتا سوسائٹی کو بنیادی طور پر سیکولر ہونا پڑے گا اور ذات پات اور فرقہ واری تقسیم کو ختم کرنا پڑے گا۔ ایسی سوسائٹی کے مقاصد اور آورش مشترکہ ہوتے ہیں۔ سیاسی آراء میں فرق ہوتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے کے بارے میں یہ مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ آدرشوں پر متحد ہے۔ اس لئے کہ یہاں مذہبی اکثریت اور اقلیت سیاسی اکثریت اور اقلیت کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے ہماری ساری سیاست کی بھاگ ڈور مذہبی اکثریت اور مذہبی اقلیت پر مبنی ہے۔ فرقہ وارانہ ذات پات کی تقسیم انتہائی گہری ہے اور ہماری سول سوسائٹی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔

ہماری ساری سیاست کا مزاج یہ ہے کہ جیسا ہے ویسا رہنے دو (سٹیٹس کو) نہ کہ تبدیلی پسند۔ چنانچہ معاشرتی اور معاشی ترقی اور تبدیلی کی بنا والی سیاست پر ہماری شناخت کی سیاست حاوی ہے تاہم یہ بات تسلیم کرنا چاہئے کہ اس زمانے میں یعنی ماڈرن عہد کے بعد کے زمانے میں نسلی اور مذہبی شناخت کو نئی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ حالیہ اشتراکیت کے روس اور چین جیسی کمیونسٹ سوسائٹیوں میں بھی نسلی اور مذہبی شناختوں کی ہوا چلنے لگی ہے بڑی سوسائٹیوں میں بھی کثرت الوجودیت اور متنوع نوعیت کے رنگوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ وہاں بھی سول سوسائٹی کا پرانا نمونہ نہیں رہا۔

یہ تو خیر اپنی جگہ، مگر یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ مغربی معاشروں میں تقسیم نسلی اور مذہبی بنیادوں پر نہیں ہے۔ چند خاص جمہوری مقاصد یا آورش انہیں متحد رکھتے ہیں اور بنیادی ترقیاتی مسائل کو مذہبی اور فرقہ وارانہ مسائل پر فوقیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں ایسا نہیں ہے

MashalBooks.org

یہاں فرقہ وارانہ اور ذات پات کے مسائل سب سے زیادہ اہمیت حاصل کر کے دھماکہ خیز سیاسی مسئلے بن جاتے ہیں۔

بی جے پی نے اسی کی دہائی کے آخر میں رام مندر کا مسئلہ اٹھایا تھا۔ فرقہ وارانہ لحاظ سے حساس معاشرے کی طرف سے فوراً جواب آیا اور رام مندر سیاسی میدان میں گہری تقسیم کا سبب بن گیا۔ فرقہ واریت والے سیاستدان اس قسم کے وسائل اپنانے اور ہندوستانی معاشرے کو اپنی خطوط پر ڈالنے کے مجرم ضرور ہیں مگر سول سوسائٹی بھی اس جرم سے بالکل بری الذمہ نہیں ہوسکتی۔ سیاستدان اور سوسائٹی دونوں ایک دوسرے کا سہارا ہیں اور ایک دوسرے کی تقویت کا باعث۔

سنگھ پریوار نے ہوس اقتدار میں لکشمن ریکھا (بابری مسجد کے پاس کھینچی حفاظتی یا وارننگ کی حد) کو عبور کر لیا۔ رام مندر سے بہت ہی زیادہ فائدہ اٹھایا اور اور آئینی اقدار کو بھی پامال کیا۔ گجرات میں جو فرقہ وارانہ قتل عام ہوا وہ بھی سنگھ پریوار کی وجہ سے سول سوسائٹی کو فرقہ وارانہ رنگ میں رنگنے کی وجہ سے ہوا۔ گجرات کے منظر نامہ کے بہت سے شاہدوں کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے ہندوتوا کے گڑھ گجرات میں فرقہ وارانہ قتل عام کیا انہیں اپنے ظالمانہ کردار پر کوئی مجرمانہ پشیمانی بھی نہیں ہے۔ تو اس طرح گجرات کی سول سوسائٹی کے ایک حصے میں فرقہ وارانہ شعور اتنا گہرا چلا گیا ہے کہ وہ اس قتل عام کو بھی فطری سی بات سمجھتا ہے جس پر افسوس و تاسف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب سول سوسائٹی میں فرقہ واریت اور بھی تیزی سے پھیل رہی ہے کیونکہ مرکز میں مخلوط حکومت کے حوالے سے سنگھ پریوار بھی اقتدار میں ہے اور سنگھ پریوار کے نظریہ ساز اپنے مقاصد کی ترویج کیلئے سرکاری وسائل کو بھرپور طریقے سے استعمال کر رہے ہیں اب تک آر ایس ایس کی طاقت بڑھ گئی ہے اور اس نے بھی ملک بھر میں اپنے پرچارک بھیجنے شروع کر دیئے ہیں اور یوں یہ فرقہ واریت ،اب دیہات میں بھی پھیل رہی ہے اب سیکولر سیاستدانوں کا معاملہ ہے کہ وہ یہ فرقہ وارانہ چیلنج قبول کریں تاہم یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ سیکولر طاقتیں بھی آپس میں تقسیم نہیں اور خطرناک حد تک کمزور ہو گئی ہیں سیکولر سیاستدان فرقہ وارانہ خطرے کو پورے بھرپور انداز سے مقابلہ کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا مقابلہ کر رہے ہیں ان کا انداز جارحانہ ہونا چاہئے مگر نرم ہے۔ بائیں بازو والے سب سے الگ ہیں۔ وہ فرقہ

واریت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن بائیں بازو کے پاس تو چند ایک ریاستیں ہیں۔ ہندوستان کے مرکز میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ایک متحرک سول سوسائٹی مذہبی بنیاد پرستی کے بجائے سیکولر ہوتی ہے جمہوری اصولوں اور آدرشوں سے وابستہ ہوتی ہے اور اسی صورت میں گجرات جیسے قتل عام روکے جاسکتے ہیں۔

(15۔جولائی2002ء)

MashalBooks.org

مشترکہ ثقافت، سیکولرازم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی

مشترکہ ثقافت............ ہندوستانی اتحاد کی مظہر

ہندوستان کی مشترکہ یا متحدہ ثقافت کے مظاہر کچھ لوگ مانتے ہیں اور کچھ اسے مسترد کردیتے ہیں۔ تمام مذاہب کے خالص پسند یا پاک باز لوگ مشترکہ ثقافت کے تصور کو ہی رد کرتے ہیں۔ خالص ہندو اور خالص اسلامی کے سوا کسی اور شے کو قبول نہیں کرتے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ خالص ثقافت ملک کے لوگوں کو تقسیم کردیتی ہے جبکہ مشترکہ ثقافت انہیں متحد کرتی ہے۔ مشترکہ ثقافت کے باعث علیحدگی پسند خود کو مشکل میں گھرا محسوس کرتے ہیں چنانچہ ثقافت خود ایک اپنی قسم کی سیاست پیدا کرتی ہے اور جمہوریت میں ثقافت پر بھی سیاسی اثرات پڑتے ہیں۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں عموماً (خاص طور پر عوامی سطح پر) مشترکہ ثقافت ہی رائج تھی۔ برسر اقتدار طبقوں میں بھی خاص طور پر مغلوں کے عہد میں یہی مشترکہ ثقافت رائج تھی۔ مشترکہ ثقافت پر تو ہم کچھ دیر بعد روشنی ڈالیں گے انیسویں صدی میں انگریزوں کے آنے پر یہاں ایک نئی ثقافتی سیاست کا آغاز ہوا۔ دونوں مذہبوں ہندو اور مسلم کے اوپر کے طبقوں نے اپنی اپنی ثقافت کی خاصیت پر زور دینا شروع کیا اور مدعا یہ تھا کہ دو الگ شناختوں کو ابھارا اور واضح کیا جاسکے۔

الگ الگ شناختوں کی ضرورت اس وقت پیدا ہوئی جب انگریزوں نے بلدیات کے انتخابات متعارف کرائے۔ شدھی اور تبلیغ نام کی تحریکوں نے نئے تجرباتی عمل کے شروع ہوتے ہی خالص ہندو اور خالص مسلمان ثقافت پر اصرار شروع کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ چند علاقوں کو

MashalBooks.org

چھوڑ کر خالص ثقافت کا مسئلہ کہیں بھی نہیں تھا۔عوام اور خواص دونوں نے صدیوں تک ایک دوسرے کی روایات سے کسب فیض کیا اور یہ فیض صرف فنون لطیفہ فن تعمیر، کھانوں اور لباس تک ہی محدود نہ تھا مذہب اور مذہبی عقائد تک پھیلا ہوا تھا۔

سوال یہ ہے کہ بہت سے مذاہب اور بہت سی ثقافتوں والی سوسائٹی میں کیا کوئی بھی فرقہ یا طبقہ خالص مذہبی یا ثقافتی روایت زندہ رکھ سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔اگر مختلف مذاہب اور ثقافتیں رکھنے والے اکٹھے رہتے ہیں تو پھر ان کے اعمال اور دوسرے عوامل کیسے خالص رہیں گے۔اپنی پوتر تا یا خالصیت کو برقرار رکھنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔علماء اور براہمن اپنی اپنی پوتر تا قائم رکھنے پر بضد تھے جبکہ دوسری طرف صوفی اور بھگتی کے بھگت مشترک رجحانات بنانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔جب برہمن سنسکرت اور مسلمان عربی میں تحریر پر زور دے رہے تھے صوفی اور بھگتی بھگت مقامی زبانوں اور بولیوں میں لکھ رہے تھے۔بابا فرید' کبیر اور سنت تکارام سبھی نے مقامی بولیوں میں لکھا اور لوگوں کے بہت قریب ہو گئے۔ان کی شہرت اور مقبولیت بے انتہا تھی اور انہوں نے مشترکہ روایت کی تشکیل کی۔مسلمانوں میں سے جہانگیر کے ہم عصر مجدد الف ثانی مذہب اور ثقافت کی پوتر تا کے علمبر دار تھے اور اسلام کو تمام ہندو اثرات سے پاک کرنا چاہتے تھے مگر عام لوگوں میں ان کا نام شاید ہی کہیں سنا گیا ہو بڑے لوگوں میں تو ان کا شمار دور کی بات ہے۔ان کا اثر جہانگیر کے دربار کے کچھ اشراف تک محدود تھا۔

خالص پسند مجدد الف ثانی کا لوگوں کو کچھ پتہ نہیں تھا مگر صوفی لوگ عوام میں بہت مقبول بھی تھے اور اثر بھی رکھتے تھے۔اس لئے کہ وہ مقبول روایات کے ساتھ رہتے تھے۔ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج، عقائد اور عبادات کے اختلاط کی انہوں نے کبھی مخالفت نہیں کی اسی طرح بنارس اور دوسری متبرک جگہوں کے پنڈت عوام کے مقبول طریقوں اور مشاغل سے دور رہتے تھے جبکہ کبیر گنیشور اور تکارام نے عوام کے ساتھ اپنی شناخت کرائی۔اس بنا پر انہیں پنڈتوں کے ہاتھوں تکلیفیں بھی اٹھانا پڑیں۔سزائیں بھی ملیں اور آخر کار بھگتی کے یہی بھگت اور صوفی لوگوں میں اتنے مقبول ہو گئے کہ خود بڑے بڑے حکمران ان پر رشک کیا کرتے تھے۔ہم یہاں مشترکہ ثقافت کے چند مثالیں پیش کریں گے جن کی وجہ سے عوام میں اتحاد پیدا ہوا۔یہ ہمارا قیمتی اثاثہ اور روایت ہے جو ہندوستان کے لوگوں میں زیادہ ربط محبت اور اتحاد پیدا کرے

گی۔ہمیں ایسی شاندار مثالیں تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں بلکہ اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔خسرو، نظام الدین اولیا کے معروف مرید تھے۔خود بڑے صوفی اور عہد سلطانیت کے دربار کے شاعر مشترکہ ثقافت کے عظیم علمبردار تھے۔جب انہوں نے مقامی بولی میں لکھا اور کہیں کہیں اسے فارسی سے بھی آمیز کیا تو عوام میں ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔فارسی اور مقامی بولی کی ترکیب یوں تھی کہ ایک مصرع مقامی بولی میں اور دوسرا فارسی میں۔انہوں نے کئی راگ بھی بنائے اور نئے ساز بھی ایجاد کیے۔وہ دلی میں رہے اور انہیں اس شہر پر ایسا فخر تھا کہ انہوں نے اس کا تقابل دنیا کے بڑے بڑے شہروں خصوصاً وسطی ایشیا کے شہروں سے کیا اور دلی کو سب سے اعلیٰ اور برتر دکھایا۔انہوں نے ہندوستان کی نباتات اور حیوانات (گل بوٹے اور چرند پرند) کا مقابلہ دوسرے ممالک سے کیا اور کہا کہ اس ضمن میں ہندوستان کی کوئی مثال ہی نہیں۔انہوں نے دور کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا اور کہا کہ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں اس جیسا خوبصورت پرندہ نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح رس خان اور رحیم نے اودھی اور دوسری مقامی بولی میں ہندوستانی روایت اور ثقافت کی تحسین کی اور کرشن مہاراج کے حضور بھی نذرانہ پیش کیا۔ بیسویں صدی کے ایک معروف اردو شاعر اور جنگ آزادی کے بڑے مجاہد حسرت موہانی جنم اشٹمی کے موقع پر برندابن میں باقاعدگی سے جایا کرتے تھے اور گزشتہ کئی صدیوں سے ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کی تقریبات مشترکہ طور پر مناتے چلے آرہے تھے اور تو اور بعض مسلمان ان مذہبی ڈراموں میں رام یا ہنومان کا کردار بھی ادا کیا کرتے ہیں۔

آج بھی ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں بڑودہ صوبہ گجرات کے ساٹھ سالہ عبدالرشید اس اشتراک اور امتزاج کا سنگم بنے ہوئے ہیں وہ پیدائشی طور پر مسلم ہیں۔مگر لباس ہندوانہ، گنیش دیوتا کے پجاری اور ایم ایس یونیورسٹی کی حدود کے اندر گنیش کے باقاعدہ متولی اور پجاری' سنسکرت زبان کے عالم ہیں اور انہیں شلوکوں پر استاد کا درجہ حاصل ہے۔صبح اور شام مندر میں پوجا کرتے ہیں میں یہاں مسلم براہمن ہوں وہ کہتے ہیں۔یونیورسٹی کیمپس میں چاچو کے نام سے معروف ہیں۔

ممبئی میں سنسکرت کے ایک اور عالم غلام دستگیر ہیں۔ویدوں کا بالتفصیل مطالعہ کیا ہے اور تمام ہندوستان میں ویدوں پر لیکچر دینے کیلئے بلائے جاتے ہیں۔انہوں نے مجھے قرآن کا

MashalBooks.org

سنکسرت میں ایک ترجمہ بھی دکھایا جس کے بارے میں لوگوں کو کوئی زیادہ خبر نہیں۔ وہ ہندوازم کے علماء میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ دہلی میں انسٹی ٹیوٹ آف انڈین فارن ٹریڈ کے ڈپٹی ڈائریکٹر جیوتی پانڈے ہیں۔ وہ اسلام کے شیعہ مسلک سے بہت متاثر ہیں اور رسول اللہ کے نواسے امام حسین کے ماننے والے ہیں۔ امام حسین کو 62 ہجری میں کربلا میں شہید کر دیا گیا تھا۔ جیوتی پانڈے کا تعلق مدھیا پردیش کے فنکاروں کے ایک خاندان سے ہے وہ امام حسین کے بارے میں مرثیے شستہ اردو میں ترنم سے پڑھتے ہیں میں نے بنگلور میں جب انہیں عظیم شاعر انیس کا مرثیہ پڑھتے دیکھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی ہندوستان کے مختلف شہروں کے امام باڑوں میں ہونے والی رسومات کی ویڈیو فلم بنانا ان کا شوق ہے۔

پیچھے قرون وسطیٰ میں گرونانک اسلام اور ہندوازم دونوں سے بے انتہا متاثر تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا مذہب دونوں مذاہب کا تخلیقی امتزاج ہے۔ بابا نانک کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک مسلمان تھا اور تقسیم تک بہت سے مسلمان راگی بابا نانک کے کلام گایا کرتے تھے۔ گرو نانک کئی مسلمانوں کے مقدس شہروں میں بھی گئے۔ ان میں کعبہ بھی شامل ہے جو مسلمانوں کا سب سے بڑا مقدس مقام ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ بغداد بھی گئے جہاں ان کے پاؤں کے نشان محفوظ کئے گئے ہیں جب ہرمندر صاحب کا سنگ بنیاد رکھا جانے والا تھا تو یہ رسم ادا کرنے کیلئے مسلم صوفی میاں میر سے گزارش کی گئی۔ گزشتہ دنوں کرناٹک میں وشوا ہندو پریشد کے احتجاج کے بعد بابدانگری کی درگاہ بھی متنازعہ بن گئی ہے۔ یہ درگاہ بھی اس علاقے میں مشترکہ ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے اس درگاہ میں دو بزرگ دفن ہیں ایک طرف مسلمان صوفی اور دوسری طرف (سمادھ) ہندو دیوتا دتاتریہ پیٹھم۔ مجموعی طور پر یہ ایک مسلمان متولی کے پاس ہے۔ وشوا ہندو پریشد نے درگاہ کو اس مسلمان متولی سے آزاد کرانے کیلئے اس پر حملہ کیا وی ایچ پی چاہتی ہے کہ یہ دراصل خالص ہندو متبرک مقام بن جائے۔

کلیان میں ایک درگاہ حاجی ملنگ کی ہے جس کا متولی کیتھکر کا ایک برہمن خاندان ہے۔ عرصہ دراز سے یہ برہمن خاندان بھی اس درگاہ کا متولی چلا آتا ہے۔ موجودہ متولی کاشی ناتھ گوپال کیتکر ہے۔ تھانے کے علاقے کی شیوسینا کا دعویٰ ہے کہ یہ کسی مسلمان کی درگاہ نہیں بلکہ ایک ہندو تارک دنیا مچھندر ناتھ کی سمادھی ہے پہلے یہاں بابا ملنگ کا عرس ہندو، مسلمان، عیسائی اور پارسی مشترکہ طور پر منایا کرتے تھے مگر اب ہر سال عرس کے موقع پر حکومت کو اس خیال سے

یہاں پولیس لگانی پڑتی ہے تا کہ کوئی فساد نہ ہو جائے۔

مغل حکمران بہت سے ہندو تہواڑ بڑی شان وشوکت سے منایا کرتے تھے۔ مغل بادشاہ ہولی کا تہوار بڑے پیانے پر منایا کرتے تھے آج یہ تہوار اکثر ہندو مسلم فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہولی کے موقع پر بادشاہ احمد شاہ بن محمد شاہ (54-1748ء) رقص وسرود کی محفل سجایا کرتے تھے۔ مغل دربار کے تمام اشراف اس تقریب میں شریک ہوتے تھے۔ شاہ عالم ثانی (1759-1806ء) بھی ہولی کا تہوار بڑے پیانے پر منایا کرتے۔ اودھ کے آصف الدولہ بڑے جوش وخروش سے ہولی کا جشن منایا کرتے تھے۔ اگر ہم آگرہ کے اردو کے معروف شاعر نظیر اکبر آبادی کی شاعری پڑھیں تو یہی پتہ چلے گا کہ انیسویں صدی تک مسلمان درباری اشراف نواب اور جاگیردار خاص طور پر ہولی کا تہوار منایا کرتے تھے۔

ہمارے عہد میں بھی ہندوستان کے دیہات میں یہ مشترکہ روایت اب بھی زندہ ہے۔ مثال کچھ کی ہے جو اپنی پر مایہ ثقافت اور دیوی دیوتاؤں سے عقیدت کے اظہار کے لئے مشہور ہے۔ ونکینار تعلقہ میں تھکر یہ نام کا ایک گاؤں ہے اس میں ہندو آباد ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خوبصورت مثال کے لئے یہ گاؤں منفرد حیثیت رکھتا ہے گاؤں میں 2200 ہندو افراد کی آبادی ہے یہ لوگ اساڑھ کے مہینے میں مسلم صوفی اسمل پیر کا عرس منانے کیلئے اس کی درگاہ پر اکٹھے ہوتے اور مزار پر چادریں اور جھنڈے چڑھاتے ہیں۔ لاپسی (میٹھا بھنڈارا) تیار کرنے کیلئے ہر فرد روپے یا 250 گرام غلہ دیتا ہے پھر عرس کے موقع پر بلا امتیاز مذہب وملت یہ سب لوگ اکٹھے بیٹھ کر یہ میٹھا کھاتے ہیں پورے گاؤں میں پیر کی بڑی عزت واحترام ہے۔ گاؤں میں صرف ایک مسلمان خاندان ہے وہ ہے حاجی شاہ گیگا شاہ کا خاندان یہ گزشتہ سات نسلوں سے اس درگاہ کا مجاور ہے۔

ایسی بہت سے مثالیں دوسرے دیہات سے بھی دی جاسکتی ہیں مہاراشٹر کے مراٹھاواڑا علاقہ میں قریب قریب دو گاؤں ہیں ایک کی ساری آبادی مسلمانوں کی ہے مگر اس گاؤں میں ہنومان کا مندر ہے جس کی دیکھ بھال مسلمان کرتے ہیں اور ہر سال اس کا تہوار بھی اپنے پیسوں سے مناتے ہیں اس روز نواحی گاؤں کے ہندو بھی وہاں پر آتے ہیں اور انہیں مسلمانوں کی طرف سے کھانا بھی کھلایا جاتا ہے نواحی گاؤں کی ساری آبادی ہندوؤں کی ہے مگر وہاں پر ایک مسلمان کی درگاہ بھی ہے ہندو بھی اس درگاہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور خود پیسے اکٹھے

کر کے سالانہ عرس بھی مناتے ہیں۔

یہ مخلوط یا مشترک ثقافت آج بھی بہت وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے مگر اس کا احساس زیادہ عام نہیں۔ اس کا واضح اظہار ایک حالیہ سٹڈی میں ہوا جو اینتھر وپولاجیکل سروے آف انڈیا کے ''ہندوستان کے لوگ'' پراجیکٹ کے تحت کروائی گئی۔ اس مطالعے کا نتیجہ یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں معاشی اور پیشہ ورانہ معاملات میں ثقافتی اشتراک کی شرح (96.77) فیصد ہے مسلمانوں اور سکھوں میں اس اشتراک کی شرح 89.95 فیصد ہے اور مسلمانوں اور بدھوں کے درمیان 91.95 فیصد ہے۔ ہمارے مخلوط معاشرے کا یہ مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ثقافتی قوم پرستی کے اس منصوبہ کی ہماری سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں اور شاید یہ لوگ اس کو مانتے ہوں کہ یہ صرف ہندوتوا کے علمبرداروں کے اندر ہی محدود رہے گا۔

(15۔ مارچ 1999ء)

سیکولرازم کی تذلیل

ہماری سیاست کا بلند ترین آدرش سیکولرازم رہا ہے۔ یہ ہماری قوم کا بنیادی فلسفہ ہے۔ ہماری تحریک آزادی کی علمبردار انڈین نیشنل کانگریس نے 1885ء میں سیکولرازم کو ہی اپنا فلسفہ بنایا تھا کانگریس ہماری سوسائٹی کے مخلوط پہلو سے پوری طرح آگاہ تھی اور اس نے ہمیشہ اقلیتوں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی۔ کانگریس کے پہلے تین سربراہوں کا تعلق اقلیتوں سے تھا ڈبلیوسی بینر جی عیسائی، بدرالدین طیب جی مسلمان اور فیروز شاہ مہتا پارسی تھے۔ ہمارے بانی بزرگوں اور تحریک آزادی کے رہنماؤں کا سیکولرازم یہ تھا کہ ملک کو کسی بھی مذہب سے منسوب نہیں کیا جائے گا اور اقلیتوں کے حقوق کا پورا تحفظ ہوگا۔

یہ سیکولرازم کا ہی فلسفہ تھا جس کی روشنی میں ہماری تحریک آزادی چلی اور ہمارے آئین سازوں نے بھی اسی فلسفہ کو اپنایا۔ آزاد ہندوستان میں جواہر لال نہرو اور ابوالکلام جیسے لوگ سختی سے اس فلسفہ پر کاربند تھے اور اگرچہ عملی طور پر راہ میں بڑی مشکلیں آئیں مگر انہوں نے اصولی طور پر اس معاملہ پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ نہرو نے مجہول قسم کی رسوم پر کڑی نکتہ چینی کی اور کئی صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بے شمار خط لکھے جن میں انہیں کہا گیا کہ وہ اپنی سرکاری حیثیت میں خود کو کسی مذہبی تقریب سے وابستہ نہ کریں۔ مولانا آزاد نے 1952ء میں رام پور سے انتخاب لڑنے سے اس لئے انکار کر دیا کہ اس حلقہ انتخاب میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ

پارلیمینٹ میں صرف مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتے۔

مگر یہ مثالی صورتحال آزادی کے بعد صرف پانچ چھ سال تک رہی پھر 1964ء میں نہرو کی وفات سے اسے بڑا دھچکا لگا۔ سیکولرازم کے خلاف دو قسم کے رجحانات تھے ایک کانگریس کے اندر جسکی نمائندگی ٹنڈن اور دوسرے کرتے تھے اور دوسرے جو جن سنگھ کے رویئے تھے۔ نہرو جن سنگھ کو بطور سیاسی پارٹی رجت پسند سمجھتے اور اس پر کڑی نکتہ چینی بھی کرتے وہ اپنی پارٹی کے اندر سیکولرازم کے مخالفوں پر بھی شدید تنقید کرتے مگر نہرو اپنی ہی پارٹی میں تنہا ہو کر رہ گئے اور 1961ء کے جبل پور کے فسادات نے ان کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ اپنی موت تک اس صدمے سے بحال نہ ہوئے۔ ان کے سامنے ان کا سیکولر آورش ریزہ ریزہ ہو گیا۔ نہرو کو خیال تھا کہ آزادی کے بعد سیکولرازم ہموار طریق سے آگے نہیں بڑھا۔ اسے بہت سے پیچ و خم سے گزرنا پڑا۔ جب اندرا گاندھی وزیر اعظم بنیں تو انہوں نے پھر اس پر زور دینا شروع کر دیا۔ وزارت عظمیٰ کے پہلے مرحلے پر سیکولرازم اور سوشلزم پر جب اندرا گاندھی نے زور دینا شروع کیا تو وہ اقلیتوں اور غریب عوام میں مقبول ہونے لگیں تاہم ہنگامی صورتحال کے نفاذ کے بعد وہ بھی الگ تھلگ ہونے لگیں۔ انہوں نے نرم قسم کی ہندوانہ فرقہ وارانہ طرفداری کے سبب سیکولرازم کو ترک کر دیا۔ ہندوستان میں یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ وزیر اعظم نے حلف تو سیکولرازم پر لیا مگر رویہ اس کے برعکس اختیار کر لیا۔ یہ ہندوستانی سیکولرازم کی قدر و قیمت گھٹانے اور اس کی تحقیر کی پہلی مثال تھی۔ اب تک ہماری پالیسیوں کا رخ سیکولرازم متعین کرتا تھا مگر اس کے بعد ہماری سیاست نے سیکولرازم کی نئی صورت متعین کرنا شروع کر دی۔ اسی کی دہائی نے اس ضمن میں خاصا ستم کیا۔ ایک طرف اندرا گاندھی کی نرم سی ہندویت نے سیکولرازم کی بے وقعتی شروع کی دوسری طرف ہندو فرقہ پرستی نے نہرو کے سیکولرازم کے تصور تک کو رگیدنا شروع کر دیا۔ وہ اسے نام نہاد سیکولرازم کہتے اور مثبت سیکولرازم کا تصور لے کر آتے۔ یہ بنیادی طور پر ایک پینترہ تھا اور اب سیکولرازم اور فرقہ واریت پر بحث شروع ہو گئی جس کا نتیجہ بہت تباہ کن ہوا اور اسی کی دہائی میں بہت بڑے بڑے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ 1961ء میں جبل پور کے ہولناک فسادات نے تو نہرو کو ہلا کر رکھ دیا تھا مگر اسی کی دہائی میں اتنے بڑے بڑے فسادات کا نئی قیادت پر ذرہ بھر اثر نہیں ہوا گویا اس عہد میں فرق وارانہ تشدد زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ لفظ سیکولرازم ہندوستانی سیاست کا جز ولاینفک بن گیا اور تو اور فرقہ

درانہ طاقتیں بھی اسی کی قسم کھاتی تھیں اور بی جے پی جیسی پارٹی خود کو سیکولر پارٹی کہلاتی تھی۔ اس کے واجپائی اور ایل کے ایڈوانی جیسے راہنماؤں کا دعویٰ تھا کہ صرف مندر ہی سیکولر ہو سکتے ہیں کیونکہ ہندو مذہب ہی بڑا کشادہ مذہب ہے ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان اس لئے سیکولر ہے کہ یہاں ہندو اکثریت ہے۔ بدترین صورت یہ ہوئی کہ جیسے جیسے ہندو آزاد خیالی کے گن گاتے ویسے ویسے ہی فرقہ وارانہ اور مذہبی تشدد بڑھتا جاتا۔ وہ کہتے کہ خدا پر یقین رکھتا ہے یا نہیں مندر میں جاتا ہے یا نہیں ہندو ہندو ہے انہوں نے رام جنم بھومی کی تحریک کو ہوا دی اور ملک کو گہری کھائی کے دہانے پر لے آئے۔ وسروں کے نزدیک تو سیکولرازم اور سیکولر فلسفہ قوم کے لئے لازمی تھا مگر ان کیلئے یعنی ہندوتوا کو ماننے والوں کیلئے رام مندر کی تعمیر ملک کیلئے لازم وملزوم ہوگئی۔

جب اسی کی دہائی میں ملک کو فرقہ وارانہ عذاب درپیش تھا تب پھر دوسروں کے علاوہ وی پی سنگھ، ملایم سنگھ یادو، لالو پرشاد یادو، کانشی رام اور مایاوتی جیسے سیکولرازم کے نئے چیمپئن میدان میں آ گئے۔ اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں نے سوچا کہ یہ سیاست کے مسیحا آ گئے ہیں وہ انکے پرجوش طرف دار بن گئے۔ ان کے پہلے ہیرو ملایم سنگھ یادو بن گئے۔ جنہوں نے کانشی رام کے ساتھ مل کر یوپی کے مسلمان ووٹروں پر اجارہ قائم کرلیا۔ خوفزدہ اقلیتوں کیلئے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہ تھا انہوں نے کانگریس پر اعتماد کرنا شروع کیا مگر اندرا گاندھی کے نرم ہندوارانہ رویئے سے بے اعتمادی پیدا ہوئی اور جب کانگریس کے دور اقتدار میں نرسیما راؤ وزیراعظم تھے بابری مسجد گرائی گئی تو ان کا اعتماد کانگریس پر سے بالکل اٹھ گیا۔

ملایم سنگھ یادو مسلمانوں کے ذہن میں بس گئے اور ان کے بارے میں سمجھا جانے لگا کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنے میں واقعی پرخلوص ہیں۔ 1990ء میں یوپی میں ایک جلوس میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ روز روز کے فرقہ وارانہ تشدد سے بچاؤ کیلئے مسلمانوں کو مسلح کر دینا چاہیئے یہ ملایم سنگھ یادو کا سیکولرازم کا وہ عظیم سیاسی آدرش نہیں تھا جو ہمارے آئین کا خاصا ہے یا نہرو والا سیکولرازم نہیں تھا جو ووٹ بینک کی سیاست کا مرہون منت نہیں تھا بلکہ اس سے وابستگی بطور فلسفہ حیات کے تھی۔ سیکولرازم کے یہ چیمپئن اب نہرو اور ابوالکلام آزاد کی طرح سیکولرازم کے فلسفہ سے وابستہ نہیں تھے بلکہ ان کا مقصد وحید اقلیتوں کے ووٹ حاصل کرنا تھا۔ ان لوگوں کیلئے سیکولرازم اس وقت تک اچھا ہے جب تک اس نعرے کے ذریعے انہیں اقلیتوں

MashalBooks.org

کے ووٹ حاصل ہوتے ہیں۔لیکن اگر اس کے ذریعے ووٹ حاصل نہیں ہوتے تو اس سے دور رہنا چاہئے۔جمہوریت میں اقتدار کے حصول کیلئے سیاستدانوں کو ووٹ درکار ہوتے ہیں اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہیں ووٹوں کا خیال رکھنا چاہئے لیکن اگر اقتدار ہی اولین اہمیت حاصل کر لے اور باقی سب کچھ ثانوی بن جائے تو پھر سنگین مسائل پیدا ہوتے ہیں او ہمارے سیاسی نظام کی بنیاد ہی ہل جاتی ہے۔

سیکولرازم کے ان نئے دعویداروں ملایم سنگھ یادو، کانشی رام اور دوسروں کا یہی مسئلہ ہے۔انہوں نے سیکولرازم کو ووٹ بینک سے نتھی کر دیا ہے اور ایک سیاسی فلسفہ کی حیثیت سے سیکولرازم سے ان کی کوئی وفاداری نہیں۔اس حوالے سے ہم نے وہ وقت دیکھا جب 17 / 16 اپریل 1998ء کو بی جے پی کی حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پر بحث ہو رہی تھی اور اس کے بعد جب کانگریس دوسری مخالفت جماعتوں کے ساتھ مل کر مرکز میں ایک متبادل حکومت بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈی ایم کے اور اے آئی ڈی ایم کے جیسی درارڑ پارٹیوں نے سیکولرام کو بطور فلسفہ قبول کر لیا تھا اور وہ بہت دیر اس کی علمبردار رہتی رہیں مگر پہلے اے آئی ڈی ایم کے کی جے للیتا نے گزشتہ پارلیمانی الیکشن میں بی جے پی سے اتحاد کیا اور پھر ڈی ایم کے نے اعتماد کے ووٹ کے وقت بی جے پی کی حکومت بچانے کیلئے ووٹ دیا۔ حالانکہ ڈی ایم کے کو دراوڑی فلاسفی، (سیکولرازم) کا ہمیشہ سے بڑا علمبردار سمجھا جاتا تھا۔دراواڑوں کی دونوں پارٹیوں کیلئے سیکولرازم کا رکھنا یا چھوڑنا اس بات پر منحصر ہے کہ سیاست کا رخ کیا ہے اور ان کے حریف کس طرف ہیں اگر اے آئی ڈی ایم کے بی جے پی کی طرف ہے تو ڈی ایم کے سیکولرازم کی علمبردار بن جاتی ہے اور اگر آئی اے ڈی ایم کے کانگرس یا بائیں بازو کے ساتھ ہے تو پھر یہ ہندوتوا کے کیمپ میں چلی جاتی ہے۔آندھرا پردیش کی تلیگو دیسم پارٹی کا حال بھی ایسا ہی ہے۔این ٹی راماراؤ سیکولرازم کے چیمپئن بنے رہے اور انہوں نے جنتا دل، سی پی آئی اور سی پی ایم سے تعلق جوڑے رکھا۔مگر چندرابابو نائیڈو نہیں چاہتے کہ مرکز میں کانگرس حکومت بنائے اس لئے بی جے پی کی حکومت سے اتحاد کر لیا۔ اس لئے کہ آندھرا پردیش میں کانگرس ان کی بڑی حریف جماعت ہے۔اگرچہ انہوں نے دعوے یہی کیا کہ وہ بی جے پی سے اتحاد نہیں کر رہے صرف بعض مسائل پر اس کی حمایت کر رہے ہیں مگر اس سے سنگھ پریوار کی پوزیشن مضبوط ہوئی۔اور

MashalBooks.org

اس نے مرکز میں اقتدار کی باگ ڈور اپنے بس میں کر لی۔

سیکولرازم کے بہت سے دوسرے حامی جارج فرنینڈس، ہیگڑے اور رام دلاس پاسوان جیسے چیمپئن بھی کوئی مختلف ثابت نہیں ہوئے۔ ان سب نے ہندو تعصب پر شدید حملے کئے اور خود کو اقلیتوں میں مقبول بنایا مگر اب اقتدار کی خاطر وہ سب بی جے پی کی صفوں میں شامل ہیں۔ جارج فرنینڈس نہ صرف بی جے پی کی حکومت میں شامل ہوئے اس کے پر جوش ترجمان اور محافظ بھی بن گئے کہ انہوں نے بی جے پی کی حکومت کو بارہا بحران سے بچایا ہے۔ آر کے ہیگڑے بی جے پی کی سرکردگی میں محاذ بنانے کیلئے کرناٹک کے وزیر اعلیٰ جے ایچ پٹیل کی خوشامد کر رہے ہیں کہ لوک سبھا کے اگلے الیکشن میں اکٹھے حصہ لیا جائے اس بات پر جے ایچ پٹیل بھی بہت راضی ہیں۔

رام دلاس پاسوان دلت لیڈر ہیں۔ انہوں نے بہار میں دلت سینا بھی بنا رکھی ہے اور وہ بھی بی جے پی سے اتحاد کے علمبردار بن کر نکلے ہیں۔ وہ ہمیشہ بی جے پی پر کڑی تنقید کیا کرتے تھے مگر لالو پرشاد یادو سے جھگڑ پڑے تو ان کی ترجیحات بدل گئیں یہ اچنبھے کی بات نہیں کہ انہوں نے اعتماد کے لئے ووٹ بی جے پی کو دیا اور اب وہ بہار میں بی جے پی اور سمتا پارٹی سے اتحاد کیلئے تیار ہیں۔ انہوں نے بہار کی تمام سیاسی پارٹیوں سے اپیل کی ہے کہ سب متحدہ طور پر راشٹریہ جنتا دل کا مقابلہ کریں۔ ان کی نظر میں صوبہ بہار میں سیکولرازم اور کمیونزم (فرقہ واریت) کوئی مسئلہ ہی نہیں ور رشوت ستانی اور جنگل کے قانون کیخلاف جنگ ہونی چاہئے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اس مقصد کیلئے بی جے پی، سمتا پارٹی، کانگرس اور بائیں بازو کی جماعتوں سے انتخابی اتحاد کیلئے تیار ہیں۔

لیکن یہ ملایم سنگھ یادو ہیں جو سیکولرازم کے علمبردار ہیں اور جنہوں نے مرکز میں کانگرس کی سرکردگی میں حکومت بنانے کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا اور بعض وجوہ کے باعث یہ بات قابل یقین ہے کہ انہوں نے جارج فرنینڈس کے کہنے پر یہ مؤقف اختیار کیا اس مرحلے پر کانگرس کی حکومت بنانے کی حمایت نہ کر کے دراصل بی جے پی کی حمایت کی ہے۔ خیال ہے کہ انہوں نے کانگرس کی حمایت اس لئے نہیں کی کہ اس طرح ان کے مسلمان ووٹر کانگرس کی طرف چلے جانے کا خطرہ ہے۔ مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ وہ مسلمان ووٹروں کی حمایت بھی کھو بیٹھے۔ واضح شواہد موجود ہیں کہ مسلمان اب کے ان کی سماج وادی پارٹی کو ووٹ نہیں دیں گے۔

مسلمان ان سے اس لئے ناراض ہیں کہ انہوں نے کانگرس کی حمایت کیوں نہیں کی۔

ایک اور دلچسپ مثال جموں وکشمیر کے فاروق عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کی ہے۔ فاروق شیخ عبداللہ کے بیٹے ہیں جو نہرو کے سیکولرازم کے حامی تھے۔ فاروق عبداللہ نے بھی اپنا وزن بی جے پی کے اتحاد کے پلڑے میں ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔ فاروق عبداللہ کی سیاست سراسر سمجھوتے کی سیاست ہے۔ نیشنل کانفرنس کے ارکان میں سے واحد سیف الدین سوز نے سیکولرازم کی زوردار طرف داری کر کے ان کی کچھ عزت بچالی۔ اگرچہ اس وقت وادی میں فاروق عبداللہ کا کوئی متبادل نہیں مگر شاید انہیں بھی بے اصول سمجھوتہ بازی کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

تو یوں دیکھیں تو لگتا ہے کہ نظریئے کے طور پر سیکولرازم کی کشش ختم ہوگئی ہے اور بابری مسجد کے انہدام سے پہلے اور بعد میں سیکولرازم کے جو نام نہاد نئے علمبردار نکلے ہیں انہیں سیکولرازم کے اعلیٰ سیاسی فلسفے کے بجائے اپنے ووٹوں کی زیادہ فکر ہے۔ ان کا عہد وفا سیکولرازم کے ساتھ نہیں اور نہ ہی زیادہ تر اقلیتوں کے ساتھ ہے۔ وہ سیکولرازم کو صرف استعمال کرتے ہیں اور اقلیتوں کے ووٹ حاصل کرنے کیلئے ان کے مفادات کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری جمہوری سیاست بڑے خطرے میں ہے۔

(31-1999ء)

بین المذاہب اور بین الثقافت مکالمہ

دنیا بھر میں مختلف مذہبوں اور ثقافتوں کے درمیان کشمکش بڑھ رہی ہے اس لئے ضروری ہوگیا ہے کہ مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان مکالمہ ہو۔ اس کشمکش کی کئی وجوہ ہیں دنیا شمال اور جنوب میں تقسیم ہوگئی ہے۔ شمال انتہائی ترقی یافتہ ہے جنوب پسماندہ بھی ہے، ناخواندگی بھی بہت اور افلاس بھی زیادہ جنوب میں پڑھے لکھے نوجوانوں کو اپنی مرضی کی ملازمتیں نہیں ملتیں اس لئے وہ روزگار کیلئے شمال کی طرف دیکھتے ہیں پھر یہ غیر ترقی یافتہ پسماندہ ممالک شمال والوں کی نوآبادیات رہے ہیں۔ ان کے لوگوں کو ترقی یافتہ شمال ممالک میں بڑی کشش نظر آتی ہے جب جنوب سے بڑی تعداد میں لوگ شمال میں نقل مکانی کرتے ہیں تو وہاں مقامی سفید فام برا مانتے ہیں اس طرح نسلی کشمکش بڑھ جاتی ہے۔ خصوصاً جب یہ ترقی یافتہ ممالک بھی معاشی مسائل کا شکار ہوں اور روزگار کے مواقع بھی کم اگرچہ پس پردہ محرکات تو معاشی یا سیاسی

ہوتے ہیں مگر کشمکش کا اظہار ثقافتی یا مذہبی شکل میں ہونے لگتا ہے اور ہر چند معاشی وجوہ دور کر کے ہی اس کشمکش کو کم کیا جا سکتا ہے مگر مذہبی اور ثقافتی کشمکش کو بھی موئثر طریق سے کم کرنے کی ضرورت ہے۔ مذہبی اور ثقافتی اظہار سے بڑا نقصان ہوتا ہے اور اس طرح ان لوگوں میں غلط فہمی پھیلتی ہے جو براہ راست معاشی کساد بازاری سے متاثر نہیں ہوتے انتہائی بلند بانگ بنیاد پرستوں کے پھیلائے گئے ثقافتی اور مذہبی تعصبات جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ بھی ان تعصّبات کو ہوا دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ میڈیا تعمیری خبریں دینے کے بجائے سنسنی خیز خبریں دینے میں زیادہ دلچسپی دکھاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں اگر مسلسل منفی نوعیت کو رپورٹنگ ہوتی رہے تو پھر خاص مذاہب یا ثقافتی گروپوں کیخلاف زوردار تعصّبات پھیلنے لگتے ہیں۔ یہ معروف حقیقت ہے کہ مغربی ذرائع ابلاغ میں اسلام کے خلاف مسلسل تنقید ہوتی رہتی ہے۔ یہ بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ امریکہ کی سرکردگی میں مغربی ممالک چند خاص مسلم ممالک ایران، لیبیا، عراق کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں کیونکہ یہ ممالک امریکہ کی حاکمیت سے انکاری ہیں۔ امریکہ نہ صرف انکو کڑی سزا دیتا ہے مثلاً عراق پر بمباری اور سوڈان میں دواساز کمپنی پر بمباری بلکہ ان کے ذرائع ابلاغ اسلام اور اسلامی ممالک کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں پھر انتہائی مایوسی کے عالم میں کچھ عسکریت پسند نوجوان امریکی اداروں پر حملہ کر دیتے ہیں مثلاً چند سال پہلے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دھماکے۔ ان واقعات کی بنا پر عام امریکی اسلام اور مسلمانوں کیخلاف خوفناک تعصّبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلام کو تشدد اور جنون کا مذہب سمجھا جانے لگتا ہے۔

اسی طرح الجزائر کا اندرونی انتہا پسندانہ تشدد فرانس تک پہنچ جاتا ہے۔ الجزائر کے بعض انتہا پسندوں نے پیرس میں اس لئے بم دھماکے کئے کہ ان کے خیال میں الجزائر کے مسلم عسکریت پسندوں کو ختم کرنے کیلئے فرانس الجزائر کی حکومت کی مدد کرتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اس طرح فرانس والوں کے دل میں اسلام کے بارے میں تعصب پیدا ہوتا ہے۔ جرمنی میں ان دنوں شدید معاشی اتار ہے اور وہاں پر بیروزگاری کی حد بارہ فیصد کو چھو رہی ہے مگر ساٹھ کی دہائی میں جرمنی کی معیشت پھل پھول رہی تھی اور اسے غیر ملکی لیبر کی بڑی ضرورت تھی بڑی تعداد میں ترکی باشندے جرمنی میں لائے گئے مگر اب معاشی اتار کے باعث ان ترکوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے جرمنوں اور ترکوں کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی ہے۔

MashalBooks.org

سری لنکا میں نسلی کشمکش کے باعث بہت سے تامل یورپین ممالک خصوصاً جرمنی چلے گئے ہیں۔ جرمنی میں نئے نازیوں نے گزشتہ چند سالوں میں تاملوں پر کئی حملے بھی کئے ہیں تعجب کی بات ہے کہ نازیوں کی نئی تحریک مشرقی جرمنی میں سر اٹھا رہی ہے جہاں کمیونسٹوں کی حکومت رہی تھی۔ مشرقی جرمنی کے نوجوان ترکوں اور تاملوں پر حملوں میں ملوث ہیں اور یہ اس لئے کہ جرمنی میں قومی سطح کی بیروزگاری کی نسبت مشرقی جرمنی میں زیادہ بیروزگاری ہے۔ یہ تقریباً 20 سے 25 فیصد تک ہے۔ چنانچہ ایک عام امریکی کی طرح عام جرمن بھی اسلام، مسلمانوں اور تاملوں کے بارے میں بڑا متعصب ہے۔ بوسنیا سے آنے والے مسلمانوں کی وجہ سے یہ مذہبی ثقافتی کشمکش اور بڑھ گئی ہے۔ مغرب میں مذہبی اور ثقافتی کھچاؤ کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کے ترقی پذیر ممالک میں بھی مذہبی اور ثقافتی بنیادوں پر تنازع بڑھ رہا ہے۔ ہندوستان یں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اور اب ہندوؤں اور مسیحیوں میں بھی افریقہ کے نائیجیریا اور سوڈان جیسے ممالک میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اسی طرح ان ممالک میں مختلف نسلی اور لسانی گروپ ایک دوسرے پر تشدد کرتے ہیں مثلاً آسام میں بوڈو اور دوسرے قبائل منی پور میں ناگا اور میتیس، تری پورہ میں بنگالی اور قبائلی شمالی اور مغربی ہندوستان میں جنوب کے ہندوستانیوں کے خلاف تعصبات میں مہاراشٹر کے ہندوؤں کی تنظیم شوسینا بمبئی میں مسلمانوں اور جنوبی ہندوستانیوں پر حملے کرتی ہے اس نے مہاراشٹر کی نوجوان نسل میں عسکریت پیدا کر دی ہے۔

ایسے ٹکراؤ کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں مگر زیادہ تر سیاسی اور بعض جگہوں پر معاشی وجوہ ہیں ترقی کا عمل بڑا غیر ہموار ہے اس لئے دیہی علاقوں سے لوگ شہروں کو اور پسماندہ علاقوں سے نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں کی طرف منتقل ہو رہے ہیں چنانچہ ان شہروں میں مختلف قسم کے ثقافتی اور مذہبی گروہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اس لئے دیہی علاقے کے مقابلے میں شہرں میں یہ کشمکش زیادہ ہے۔ دیہی علاقوں میں نسبتاً زیادہ ہم آہنگی ہے اس لئے وہاں ایسی کشمکش کم ہے بعض شہری علاقے تو نسلی مذہبی اور ثقافتی تنازعوں کے گرم بازار بنے ہوئے ہیں۔ ہر مذہبی یا نسلی گروہ اپنے علاقے میں اپنی برتری قائم کرنا چاہتا ہے اور وہاں سے مخالفوں کو صاف کر دینا چاہتا ہے۔ اپنے اپنے ہم خیالوں کو ساتھ ملانے کیلئے مذہبی اور ثقافتی تفریق کو ابھارا جاتا ہے اس طرح دوسرے مذہبی اور ثقافتی گروپوں کے ذہن میں گہرے تعصّبات بو دیئے جاتے ہیں۔

MashalBooks.org

واضح رہے کہ یہ صورتحال کوئی نئی نہیں ہے تاریخ عالم میں ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک ملک کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں لاتعداد ہجرتیں ہوئیں اس لئے یہ کشمکش بھی کوئی نئی نہیں۔ عیسائی اور مسلمان فلسطین پر قبضہ اور کنٹرول کیلئے لڑتے رہے ان کو تاریخ میں صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جس مذہبی جوش وخروش سے یہ جنگیں لڑی گئی تھیں اس جوش وجذبہ کا نام کردسیڈنگ سپرٹ (جذبہ جہاد) رکھ دیا گیا۔

انہی صلیبی جنگوں کی وجہ سے قرن وسطیٰ میں مغربی ممالک میں اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ مسلمانوں کی یہ تصویر کہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار انہی صلیبی جنگوں کی دین ہے اسی طرح شمالی ہندوستان پر ہونے والے مسلم حملوں کے باعث بہت سے ہندوؤں کے ذہن میں اسلام کا تصور بطور متشدد مذہب کے پیوست ہوا (ہر چند اس میں خاصے ہندو مسلمانوں کے ساتھی تھے۔) آج عصری سیاسی مفادات کی خاطر اسلام کے اسی تصور کو جدید سیاق وسباق میں پیش کیا جارہا ہے تاہم بہت زیادہ پراپیگنڈے کے باعث ایک عام ہندو مسلمانوں کو جنونی اور متشدد سمجھتا ہے۔ اسی قسم کے خیالات اور تصورات عام کرنے میں ذرائع ابلاغ خاص کردار ادا کرتے ہیں رام جنم بھومی اور بابری مسجد کی تحریک نے بھی انہی تصورات سے جڑ اور طاقت پکڑی ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کا خیال ہے کہ انہوں نے مندروں کی شکست وریخت کی۔ بی جے پی خود ایک بنیاد پرست جماعت ہے اس نے ہندو ووٹروں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے زوردار مہم چلائی۔ پرانے زمانوں میں سیاسی مفادات کی خاطر عوام کو متحرک کرنے کیلئے ایسی مہموں کی ضرورت نہ تھی اور بادشاہ اپنے مفاد کی خاطر مذاہب میں خاص توازن قائم کرتے تھے۔ آج کے زمانے میں لوگوں کو ڈرانا ہی ایک طریقہ ہے۔ عوام کو مخصوص سیاسی مفاد کے حوالے سے اپنے ساتھ ملایا جاتا ہے عوام پر یہ غلبہ قائم کرنے میں ذرائع ابلاغ کی بڑی طاقت ہوتی ہے پرانے زمانے میں یہ وسیلہ میسر نہ تھا۔ یوں لوگوں پر غلبہ پانے کے لئے ذرائع ابلاغ کی ضرورت ہے۔ اب نہ صرف چھپا ہوا لفظ اخبار وغیرہ بلکہ الیکٹرانک میڈیا کا اضافہ ہوگیا اور یہ ذرائع بین المذاہب اور بین الثقافت جھگڑے پھیلانے میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ نے کسی مذہب یا ثقافت کے بارے میں جو تصور بنائے ہیں ضروری نہیں کہ وہ درست بھی ہوں مگر اس حوالے سے کسی مذہب کے خلاف بہت زیادہ تعصّبات پھیلائے

جاتے ہیں جن سے خوفناک تباہی آ سکتی ہے ہمارے عہد میں ذرائع ابلاغ کا کردار بہت ہی اہم ہو گیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور اگر میڈیا کو مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں دلچسپی ہو تو یہ بہت ہی تعمیری کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ سارا ہی میڈیا اس کشمکش کو سنسنی خیز بنانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو اس ضمن میں بڑا مثبت کردار ادا کر رہا ہے۔ اور یہ کام ان لوگوں کا ہے جو مختلف مذہبی اور ثقافتی دھڑوں میں مکالمہ کے خواہش مند ہیں ہمیں متحارب فریقوں کے درمیان بات چیت کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے جو کچھ ہو سکتا ہے کرنا ہو گا۔

مذاہب اور ثقافتوں کی باہمی تفہیم اور ان کے اندر گفت وشنید

متحارب گروپوں کے درمیان بہتر افہام وتفہیم صرف باہمی گفت وشنید ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ مختلف ذرائع سے غلط اطلاعات کے پھیلنے سے بھی بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اس کا توڑ کرنے کیلئے صحیح اطلاعات پہنچانا بہت ہی ضروری ہے اور یہ کام زیادہ مؤثر طریقے کی مکالمے اور گفتگو کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے، ہم اس قسم کے مکالمے اور بات چیت کے بارے میں چند ایک نکات پیش کرتے ہیں۔

مکالمہ مختلف قسم کے گروپوں کے درمیان ہو سکتا ہے۔

1۔ سیاسی گروپ، 2۔ مذہبی گروپ، 3 سیاسی یا مذہبی گروپوں کے حامیوں کے درمیان گفتگو کئی سطحوں پر ہو سکتی ہے اور ایک جامع انداز میں یہ تمام سطحیں شامل کی جا سکتی ہیں ایک سطح سیاسی اور مذہبی لیڈروں کی ہے دوسری سطح مختلف گروپوں کے دانشوروں کی اور پھر عوامی سطح مکالمے کی نوعیت ان تمام سطحوں پر الگ الگ ہو گی۔

دانشوروں کی سطح پر واقعات وحالات کا تجزیہ ہو گا اور ان طاقتوں کا جائزہ لیا جائے گا جو اختلافات بھڑکانے میں لگی ہوئی ہیں اس سطح پر یہ بھی دیکھا جائے گا کہ بین المذہبی اور بین الثقافتی ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے کیا کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ سیاسی سطح پر ان لیڈروں کے بارے میں مکالمہ ہو سکتا ہے جو نظریاتی بنیاد پر مذہب اور ثقافتی مخاصمت کے مخالف ہیں اور سیکولر سیاست پر ایمان رکھتے ہیں سیاسی سطح پر ایسا طریقہ کار بھی سوچا جا سکتا ہے کہ کس طرح

فرقہ وارانہ اور بنیاد پرست فرقوں کو سیکولر اتحادوں کے ذریعے الگ تھلگ کیا جاسکتا ہے۔

مذہبی سطح پر صورتحال کو مذہبی حوالے سے دیکھا جاسکے گا کہ کون کون سے اور کس نوعیت کے معاملات ہیں۔ایک مذہب کی مختلف سطحوں پر تفہیم کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔یعنی رسم و رواج، مذہب، عبادات و احکام اداروں اور اقدار کی سطح پر رسم و رواج، مذہبی عبادات اور ادارے و احکام تو سبھی مذہبوں میں الگ الگ ہوں گے۔مگر ان کی اقدا میں اشتراک اور مطابقت ہوسکتی ہے۔مثلاً ہندوازم میں عدم تشدد پر زور ہے۔بدھ ازم رحم دلی، عیسائیت، محبت اور اسلام انصاف اور مساوات کی تلقین کرتا ہے۔

دیکھا جائے تو یہ ساری صفات سب مذاہب میں مشترک ہیں رسم و رواج، عبادات مذہبی احکام اور ادارے سب کے مختلف اور نادر ہیں اور انہی کی وجہ سے عموماً غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ ہر مذہب کی اپنی روایت ہے کہ بعض عبادات اور رسوم کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔اسی روایت کو مرکز سمجھا جاتا ہے اور اپنے مذہبی احکام یا شریعت اور رسوم کو دوسروں سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔مثلاً اسلام کے طریق عبادت میں بتوں کی عبادت یا ان کے سامنے جھکنے کی ممانعت ہے۔اسلام اللہ کی وحدانیت پر زور دیتا ہے اور کسی دوسرے کو اس کے برابر لانے کو گناہ قرار دیتا ہے۔دوسری طرف ہندو مذہب بتوں کی پرستش اور ان کے سامنے جھکنے کو اہمیت دیتا ہے۔ ہندوستان میں یہی اختلافات تشدد کا باعث بنتے ہیں۔تاہم یہ واضح رہنا چاہیئے کہ ان اختلافات کو مذہبی رہنما نہیں بلکہ وہ سیاسی رہنما ہوا دیتے ہیں جن کو نہ عقیدوں سے اور نہ ہی رسوم سے کوئی علاقہ ہے نہ وہ ان کی پروا کرتے ہیں۔

امن کا یہ مطلب ہی نہیں کہ مذہبی رہنما اختلاف نہیں کرتے انہی اختلافات پر لڑنے کے بجائے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے بہت سے صوفیا اور بھگتوں نے یہی کچھ تو کیا ہے۔انہوں نے نہ صرف ان اختلافات کو سمجھا ان کی تفہیم کی کہ اکثر اوقات ان کو ہٹایا بھی ہے۔مثلاً سکھ مذہب کے بانی بابا نانک نے اسلام اور ہندومت دونوں کا بہت احترام کیا اور پھر ان دونوں کا ایک تخلیقی امتزاج خلق کیا۔ وہ مسلمان صوفیا کا بہت احترام کرتے تھے اور انہوں نے پنجاب کے بہت بڑے صوفی بابا فرید کے کلام آدی گرنتھ میں شامل کیا۔

مغل شہزادہ دارا شکوہ صوفی روایات میں بہت دلچسپی لیتا تھا اور ہندوؤں کی مذہبی

روایات کو بھی سراہتا تھا۔ اس حوالے سے اس نے کتاب مجمع البحرین لکھی۔ (دو عظیم سمندر، اسلام اور ہندومت کا ملاپ) اس نے کتاب میں دونوں مذہبوں کی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ کیا اور دکھایا کہ کس طرح دونوں میں حیرت ناک حد تک مماثلت ہے۔ اسلامی اور ہندو مقدس صحیفوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد اس کو یقین تھا کہ اگرچہ بظاہر ہندو مذہب کثیر تعداد میں خداؤں کو مانتا ہے مگر اصلاً یہ بھی وحدانیت کا مذہب ہے۔ ہندوؤں کے صحیفوں، اپنے پیشروں کے مطالعے کے بعد اس نے ثابت کیا کہ ہندومت بھی بنیادی طور پر وحدانیت کا مذہب ہے۔

اٹھارہویں صدی کے ایک اور صوفی مظہر جان جاناں کا کہنا تھا کہ ہندوؤں میں بتوں کی پرستش کرنا بہت سے خداؤں کو ماننا نہیں بلکہ ان کے ذریعے خدا تک پہنچنا ہے۔ اور بت خود خدا نہیں ہیں۔ اس سے بہت پہلے گیارہویں صدی میں محی الدین ابن عربی (سپین کے صوفی) نے خدا سے محبت پر زور دیا تھا اور انسان کے دل کو محبت کا مرکز کہا اور اس طرح دل کو خدا کا مرکز قرار دیا۔ ان کے فلسفۂ وحدت الوجود کے مطابق تمام تر تخلیق اللہ کی ہے اس لئے انسانوں کے درمیان جو مختلف مذہبی روایات کی دیواریں بنا دی ہیں اور انہیں گرا دینا چاہئے۔ ان کا نقطۂ نظر یقیناً آفاقی تھا۔ یہ صوفی صاحبان عبادات اور رسوم کے بجائے روحانیت پر زیادہ زور دیا کرتے تھے چنانچہ انہیں مذہبوں کی روایات میں بنیادی اتحاد یا وحدت نظر آتی تھی۔

ہندو صحیفوں میں بھی کہا گیا کہ دوسرے سب مذاہب اور روایات کا احترام کیا جائے۔ ہندو روایات میں بھگتی تحریک کے بھگت صوفیوں کی طرح بھگتی یعنی محبت پر زور دیتے تھے۔ بھگتی بھی خدا سے جو خالق عظیم ہے لو لگانا ہے۔ ان کی نظر میں بھی رسوم و عبادات کی حقیقت ثانوی تھی اور اولیت روحانیت کو دی جاتی تھی۔ عیسائی روایت میں بھی زور روحانیت اور اللہ سے لو لگانے پر دیا جاتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لوگوں کی نظر میں رسوم و عبادات اور احکام کے کوئی معنی نہیں۔ لاکھوں کروڑوں آدمی اپنے مذہبی آداب و احکام کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اس لئے مذہبی مکالمہ آتے وقت مذہبی احکامات اور رسوم کو ہی بنیاد بنایا جانا چاہئے۔ بین المذاہب مکالمے کیلئے میں یہاں کچھ ضابطے اور قواعد پیش کرنا چاہوں گا۔ مذہبی مکالمہ کرنے کیلئے مندرجہ ذیل قواعد بڑے مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔

بین المذاہب مکالمے کے لیے قاعدے

MashalBooks.org

1- جو لوگ یہ مکالمہ کرنے چاہیں وہ اپنی مذہبی روایت میں پختہ ہونے چاہئیں اور ان کا ان پر مکمل ایمان ہونا چاہئے۔ فرقہ پرست بنے بغیر اپنے عقائد پر مکمل ایمان ہی وہ مضبوط بنیاد ہے، جس پر مکالمہ ہو سکتا ہے۔

2- مکالمے میں حصہ لینے والوں کے دل میں اپنی مذہبی روایت کے بارے میں کسی قسم کا احساس برتری نہیں ہونا چاہئے اس احساس سے مکالمے کی روح داغدار ہو جائے گی۔

3- مکالمہ مناظرہ نہیں بن جانا چاہئے۔ مناظرے کا انداز تو مکالمے کا ایک طرح کا دشمن ہے۔ مناظرے میں دوسروں کو ہر صورت میں غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جبکہ مکالمے کا مدعا ایک دوسرے کو سمجھنا سمجھانا ہوتا ہے۔

4- مکالمہ نہ صرف دوسرے کو سمجھنے کی ہی کوشش ہونی چاہئے بلکہ دوسرے کی دیانتداری کو بھی محترم جاننا چاہئے۔ اگر دوسرے کی دیانتداری اور راست روی اور عقیدے کے بارے میں احترام نہیں پھر تو کوئی مکالمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

5- مکالمے کا مدعا یہ ہونا چاہئے کہ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا جائے نا کہ دوسرے کے نقطۂ نظر کو نظر انداز کر کے اسے اپنے حساب میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ ایسی معمولی سی کوشش بھی مکالمہ کی روح کو فنا کر دے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا آپ اسے اپنی بات تسلیم کروانا چاہتے ہیں اور اس سے نفرت پیدا ہوگی۔ اس کوشش کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ آپ جن کے عقائد میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہے ہیں آپ ان کے عقائد کو اپنے عقائد سے اچھا نہیں سمجھتے۔

6- مکالمے کے شرکاء کو دوسروں کے عقائد، رسم رواج اور مذہبی احکام اور عبادات کے نظام کو مختلف اور منفرد تسلیم کرنا چاہئے۔ یہی انفرادیت ہے جو دوسرے کو نادر بناتی ہے یہ غلط اور صحیح کا سوال نہیں بلکہ ندرت اور تنوع کا ہے۔

7- مکالمے کے شرکاء کو تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ تنوع زندگی کی بنیاد ہے۔ یہ تنوع نہ ہو تو زندگی بے رنگ اور بے کشش ہو جائے گی۔ قرآن نہ صرف اس تنوع کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے جائز بھی قرار دیتا ہے۔ یہ اللہ کی خواہش ہے کہ تنوع ہو (5/48/2-148) تنوع کو تسلیم نہ کرنا اور اپنا نظام عقائد یا نظریاتی نظام ٹھونسنے کا آخر کار انجام فاشزم اور آمریت ہوگا۔ یوں مذہبی ریاستیں نظریاتی ریاستوں کی طرح انتہا درجے کی حاکمیت پسند ہوتی ہیں۔

MashalBooks.org

8- مکالمے کو دراصل معاشرے میں کشیدگی اور تنازع کو کم کرنے اور ایک دوسرے کیلئے گنجائش اور مطابقت کا سبب بننا چاہئے۔ مکالمے کی روح یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی مشکلات اوران کی پیچیدہ صورتحال کو سمجھا جائے مکالمے کے کلچر کی اصلیت یہ ہے کہ ایک دوسرے کو قبول کرنے کی گنجائش پیدا کی جائے۔

9- مؤثر مکالمے کیلئے لازم ہے کہ مکالمے اور یکطرفہ بیان یا تقریر کے فرق کو سمجھا جائے مکالمے میں غالب آنے کی خواہش ہی خود کلامی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مکالمے میں شریک ہرایک (مرد یا عورت) کو اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کیلئے برابر کا موقع ملنا چاہئے۔ مکالمہ صحیح جمہوری روح کے ساتھ اسی وقت ہوسکتا ہے جب سب شرکاء کے حقوق تسلیم کئے جائیں۔

10- سمجھنے کی آخری بات یہ کہ مؤثر مکالمہ صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک فریق نہ صرف دوسرے فریق کے نقطۂ نظر کو پوری طرح سنے اور مخصوص سیاق وسباق میں اسے سراہ بھی سکے اور تو اور اکثر صحیفوں میں سے اقتباس پیش کئے جائیں تو وہ بھی صحیح معنوں میں موقع محل کی قدر و قیمت کے مطابق ہوں۔ صحیفوں کے متن پر تنقید بھی عموماً متن سے لاعلمی کی بنا پر کی جاتی ہے۔

مختلف مذاہب اور نظریوں کے مکالمے میں ان قواعد وضوابط کا خیال رکھا جائے تو نتیجہ یقیناً حوصلہ افزا ہوگا۔ آج دنیا کا کوئی ایک ملک یہ دعوے نہیں کرسکتا کہ اس میں صرف ایک مذہب، ایک ثقافت ہے۔ نقل وحمل کی تیز رفتاری کے ساتھ مختلف مذہبی اور ثقافتی گروپ اب ساتھ ساتھ رہتے ہیں اس لئے کوئی چاہے یا نہ چاہے اسے اس رنگا رنگی کے ساتھ گزر بسر کرنا ہوگی۔ اس صورتحال سے کوئی مفر نہیں اور پھر ان میں سے کچھ گروپوں کی اکثریت ہوگی اور کچھ کی اقلیت یا یہ کہ بہت سے اقلیتیں مل کر ایک اکیلی اکثریت کے مقابلے میں اکثریت بن جائیں گی۔ جیسے کہ کینیڈا میں مستقبل قریب میں ہونے والا ہے یہ نوع بنوع معاشرہ صرف اسی وقت اپنا حسن برقرار رکھ سکتا ہے جب تک اس میں ہم آہنگی ہے اور اگر اس میں کشمکش اور اختلاف شروع ہوجائے پھر اس بوجھ اور دباؤ سے نوع بنوع ہر ایک کا جوڑ جوڑ ہل جائے گا۔

آخر میں میں یہ بھی کہوں گا کہ ایک مکالمہ زندگی کا ہے اور یہ مکالمہ عوامی سطح پر مسلسل ہو رہا

ہے اور زندگی کے اس مکالمے کی صورت یہ ہے کہ تمام مسائل، دباؤ اور مشکلات کے باوجود لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ ہم زندگی کے یہ مظاہر عوامی سطح پر باقاعدہ دیکھتے ہیں ان میں نہ کوئی ایسی تھیوریاں شرعی یا مذہبی احکام اور تصورات ہیں جن پر جھگڑا کریں۔ لوگوں کی زندگی میں مسائل اور مشکلات ہیں جن کا مقابلہ وہ مشترکہ طور پر کرتے ہیں۔ یہی زندگی کا اصل مکالمہ ہے۔ ایک ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہنے کا مکالمہ حیات۔

(15۔نومبر 1999ء)

اکیسوی صدی، مذہب اور امن

نیا ہزاری طلوع ہونے والا ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ مذاہب نئی صدی کے چیلنج کا مقابلہ کیسے کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں دنیا میں امن کے قیام میں مذہب کے کردار کے بارے میں نیویارک کی مذہب و امن کی عالمی کانفرنس ورلڈ کانفرنس آف ریلیجن اینڈ پیس ڈبلیو سی آر پی کے زیر اہتمام چار روزہ کانفرنس 29,25 نومبر 1999ء کو عمان (اردن) میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں دنیا کے سو ممالک سے تقریباً پندرہ مذاہب کے نمائندگان نے شرکت کی۔ نامور مذہبی رہنماؤں اور مذہبی گروپوں کے سربراہوں نے اس کانفرنس کی کارروائی میں حصہ لیا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ مذہبی منافرت کے شکار بوسنیا اور کوسووا سے یہودی مسیحی اور مسلمان سبھی لیڈر موجود تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کی اور عہد کیا کہ وہ علاقے میں امن قائم کریں گے۔ بوسنیا ہرزیگووینا کے مفتی اعظم رئیس العلماء مصطفیٰ نے بڑا دلچسپ تبصرہ کیا اور کہا کہ سیاست کو صرف سیاستدانوں تک اور مذہبی مسائل کو صرف مذہبی رہنماؤں پر چھوڑ دینا بہت ہی خطرناک ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اصل میں سیاستدانوں اور مذہبی رہنماؤں نے ہی مسائل پیدا کر رکھے ہیں یہ سچ ہے کہ سیاست اور مذہب کو پیشہ وروں (سیاستدانوں اور مذہبی رہنماؤں) پر نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اصل میں عام لوگوں کا پورا حق ہے کہ وہ خود ان مذہبی اور سیاسی مسائل میں حصہ لیں کوئی سیاسی اور مذہبی کارروائیاں انہیں الگ کر کے نہیں کی جاسکتیں۔ جب یہ امور صرف پیشہ وروں پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں تو وہ عوام کے مفاد کو نظر انداز کر کے اپنے مفادات کے حصول میں لگ جاتے ہیں۔

ایک اور اہم سوال کا جواب بھی چاہئے کہ کیا عالمی کشمکش اور تنازعات کا ذمہ دار صرف مذہب ہے۔ بوسنیا کوسووا جیسے دنیا کے بہت سے حصوں میں تو جھگڑے کا سبب مذہب ہی ہے۔ اردن کے پرنس حسن بن طلال کا کہنا ہے کہ مذہب نہیں سیاست مجرم ہے۔ حسن بن طلال نے کہا کہ میرا ایمان ہے کہ اس دنیا میں ایک مثبت قسم کی تبدیلی آ رہی ہے جو تیزی سے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر مربوط کر رہی ہے جہاں ملکوں کی سرحدیں بے معنی بن رہی ہیں یا ٹوٹ رہی ہیں۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ہم واحد دنیا اور اس کے واحد ایجنڈے کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کے سارے ملک اور ساری ثقافتیں اس ایجنڈے کی تشکیل میں حصہ لیں اور اس ایجنڈے میں سب کے مفادات اور مسائل کی جھلک نظر آئے۔ انہوں نے ایک اور اہم رائے بھی دی۔ اگر واحد ثقافت کے معیاروں کے مطابق واحد دنیا کا واحد ایجنڈا بنایا گیا یعنی جس کی تشکیل میں دوسروں کو شریک نہ کیا گیا ہو تو پھر یہ دنیا ایسی ہوگی جس میں بے انصافی اور بعض ثقافتوں کو پس پشت ڈالنے کے سبب لازماً مزید تنازع پیدا ہوں گے اور انجام جنگ پر ہوگا۔ تاہم اگر ایک واحد دنیا ایسی بنائی جائے جس کی بنیاد دس ہزار ثقافتوں پر ہو اور ان سب کی مشترکہ قدریں اور نوع بنوع رنگ اس واحد دنیا کا اثاثہ ہوں اور اس کی سب سے بڑی صفت باہمی تعاون ہو اور مشترکہ حیات گزارنے کی یہی واحد بنیاد ہو تو پھر ایک ایسے روشن مستقبل کی تعمیر کیلئے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہے جس میں تمام افراد اور برادریوں کو اپنی پوری صلاحیت پر دکھانے کے مکمل مواقع میسر ہوں

جو کچھ حسن بن طلال نے کہا ہے اس میں بڑی سچائی ہے۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ مغرب کا اپنا ایجنڈا ہے جو وہ ایشیا اور افریقہ کے لوگوں پر لاگو کرنا چاہتا ہے۔ جنہوں نے اس کانفرنس میں حصہ لیا تھا ان سب نے کہا کہ امن کے قیام کیلئے ایک دوسرے کے مذہب اور ثقافت کا احترام ضروری ہے۔ جب مغرب اپنا اس قسم کا ایجنڈا پوری دنیا کیلئے وضع کرتا ہے تو پھر مغربی اجارے کا مقابلہ کرنے کیلئے اسامہ بن لادن جیسے آدمی پیدا ہوتے ہیں جو مذہبی منافرت اور انتہا پسندی پھیلاتے ہیں اسامہ بن لادن جیسے لوگ مذہبی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو گولی سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ بوسنیا کے مصطفیٰ نے مزاحیہ انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ انتہا پسندانہ اصطلاحات مثلاً مقدس جنگ یا مقدس امن کا ''تخفیف اسلحہ'' ہونا چاہئے۔

اسرائیل سے ربی ڈیوڈ اورن نے کہا یہ بات اچھی ہے کہ ایک شخص اپنے ہمسائے سے محبت کرے اور اگر اس اصول کے برعکس کوئی شخص اس کو منفی انداز میں استعمال کرے اور کہے کہ اگر میرا ہمسایہ مجھ سے نفرت کرتا ہے تو میں بھی اس سے نفرت کروں گا تو اس طرح تو پھر فساد اور خونریزی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ لازم بات یہ ہے کہ قطع نظر اس کے کہ دوسروں کا رویہ کیا ہے۔ اپنے تجربے کے باعث ہونے والے دکھ کے باوجود اسے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ نسل رنگ، عقیدہ یا جنس سے بالاتر انسان خدائی صفات کا ایک مظہر ہے۔ چنانچہ لازم ہے کہ ہم ہر شخص کی زندگی اور عزت کا خیال رکھیں قطع نظر اس بات کے کہ وہ کس قسم کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ہمارا اپنا ان کے بارے میں کتنا تلخ تجربہ ہے۔ مگر یہ نظریہ اس قدر اخلاقی ہے کہ عام فانی انسانوں کیلئے اس پر کامیابی سے عمل پیرا ہونا ممکن نہیں۔ انسان چاہتا تو ہے کہ ہر شخص اس قسم کا ہو جس قسم کے انسان کا ذکر ربی ڈیوڈ ارون نے کیا ہے۔ ربی نے یہ بھی کہا کہ مشترکہ حیات کرنے کے چیلنج کا مطلب ہے کہ ہم میں اتنی صلاحیت ہو کہ ہم اپنے درد وغم اور لاتعلقی پر قابو پا سکیں اور آدمی کو ایک بچے کے طور پر دیکھ سکیں۔ انہوں نے یہ بھی صحیح کہا ہماری مذہبی برادریوں کے ارکان کی بھاری اکثریت تاریخی اور عصری حوالوں سے خود کو مظلوم سمجھتی ہے یہ بات شمالی آئرلینڈ، سابق یوگوسلاویہ، سری لنکا، مشرق وسطیٰ اور دنیا بھر میں وہاں وہاں لاگو ہوتی ہے جہاں جہاں ایسے علاقائی تنازع چل رہے ہیں جن میں انسانوں کی شناخت خصوصاً مذہبی اور ثقافتی شناخت کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ اس صورتحال اور اس جیسی دوسری صورتوں میں مختلف مذہبی نظریات کے علمبردار محسوس کرتے ہیں کہ ان سے زیادتی کی جا رہی ہے اور دوسرے ان کا نہ صحیح احترام کرتے ہیں نہ انہیں قبول کرتے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اصل مسئلہ یہی ہے جب تک ہم دوسروں کو پورے احترام اور وقار کے تحت قبول نہیں کرتے امن ہو ہی نہیں سکتا اور کمی بھی اسی بات کی ہے کہ دوسروں کو عزت واحترام کے ساتھ دل سے قبول نہیں کیا جاتا۔ اس کا الزام ہم مذہب پر لگا دیتے ہیں۔ مذہب اور مذہبی اقدار تو صرف ہماری رہنما ہو سکتی ہیں ضروری یہ ہے کہ ہم اپنے اندر انقلاب لائیں اور دوسروں کو دل و جان سے قبول کرنے کی ثقافت کو فروغ دیں۔ دراصل ہمارے یا کسی کے اندر جو احساس برتری ہے وہی دراصل آخر کار ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے۔ ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ دوسرا تو ہمارے وجود اور غلبے کیلئے خطرہ ہے۔ اس خطرے سے نمٹنے کیلئے ہم اپنے احساس برتری کو

بروئے کار لاتے ہیں جو دراصل حقیقی نہیں خیالی ہوتا ہے یوں ہم دوسروں کو مسترد کر دیتے ہیں اور فساد شروع ہو جاتا ہے۔ شہزادہ حسن بن طلال کی طرح آرچ بشپ آف کینٹر بری کیرے نے بھی ایک سوال اٹھایا کیا مذہب فساد کا باعث ہیں پھر ان کا دوسرا سوال تھا کیا مذہب مسئلہ حل کر سکتا ہے؟

اول الذکر کا جواب تو نفی میں ہے مگر موخر الذکر کا جواب اثبات میں ہو سکتا ہے بشرطیکہ مذہب کو ذاتی اغراض کے حصول کیلئے استعمال نہ کیا جائے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ذاتی اغراض کا حصول مذہب کی اصل روح کے منافی ہے اس لئے اپنے اپنے مفادات کا ڈھول پیٹنے والوں کو چاہئے کہ وہ مذہب کا اس نوعیت کا استعمال نہ کریں۔ الازہر (یونیورسٹی) کے مفتی اعظم شیخ تنتوی نے قرآن وحدیث سے ثابت کیا ہے کہ اسلام کا تو پیغام ہی امن ہے اور جنگ کی تو اس میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ آنے والی صدی میں مذہب کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟ ٹیکنالوجی کی حیران کن ترقی کے باعث کیا مذہب کی اہمیت بالکل کم ہو جائے گی؟ یا آئندہ برسوں میں یہ امن کے قیام کا بڑا وسیلہ بنے گا؟ یا فساد کا باعث ہو گا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر غور وفکر بھی ضروری ہے اور ان کے جواب بھی ڈھونڈنے چاہئیں۔ مذہب فساد کا باعث نہیں ہے بلکہ ان کے قیام میں بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ مذہبی افتراق یا شناخت کے نام پر فساد ہوتا ہے مگر یہ صرف مذہبی عقائد کا معاملہ نہیں ہوتا اور بہت کچھ ہوتا ہے مذہبی حوالہ صرف مذہبی نہیں ہوتا اس میں ثقافتی اور علاقائی برتری کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے کیونکہ ان دو شعبوں میں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کی جاتی ہے اس کے علاوہ بھی مذہبی حوالے سے جنگ لڑی جاتی ہے۔ وہ یوں کہ دوسری ثقافتوں کے مقابلے میں اپنی مخصوص ثقافتی صفات کو برتر ثابت کرنے کیلئے بھی مذہب کا نام استعمال ہوتا ہے۔ سیاسی اور ثقافتی برتری کی جنگ بھی مذہب کے نام پر لڑی جاتی ہے اور اب جو عالمگیریت یا گلوبلائزیشن کا عمل شروع ہوا تو اس میں ایسے ٹکراؤ کے خدشات بڑھ گئے ہیں۔ گلوبلائزیشن کے ذریعے مغرب ایشیا اور افریقہ کے لوگوں پر سیکولر اور صارفین والی اقدار کا سہاگہ پھیرنا چاہتا ہے حالانکہ افریقہ اور ایشیا والوں کی اپنی شاندار ثقافتی روایات موجود ہیں تاہم وہ ترقی یافتہ مغربی ممالک کے مقابلے میں خود کو محروم سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے انہیں اس وقت کونے میں لگا دیا گیا ہے۔

اس علاقے میں پرتشدد کشمکش کا بڑا سبب یہ ہے کہ لوگوں کو احساس ہے کہ انہیں ایک

کونے میں لگا دیا گیا ہے ان کا وجود بے معنی ہو رہا ہے اور ان کا استحصال بھی کیا جا رہا ہے جب تک یہ عدم توازن درست نہیں کیا جاتا اس وقت ایک بامعنی ہم موجودیت نہیں ہو سکتی۔ ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ آج کی دنیا بنیادی طور پر اعدادی کثرت کی دنیا ہے نقل وحمل کے جدید اور تیز ذرائع نے ملک کے اندر اور بین المملکی طور پر ہجرت کو وسیع پیمانے پر ممکن بنا دیا ہے۔ بے شمار لوگ بہتر روزگار اور زندگی کیلئے دوسرے ممالک مغربی ممالک کو نقل مکانی کر رہے ہیں۔ یہ باہر سے آنے والے پہلے تو روزگار حاصل کرنے کیلئے مقامی لوگوں کے مقابلے میں آتے ہیں یا سستی لیبر کا وسیلہ بن کر مقامی لوگوں میں نفرت کا نشانہ بننے لگتے ہیں۔ ایسی جنگیں اکثر مذہبی یا ثقافتی حوالے سے لڑی جاتی ہیں چنانچہ ایک طرف گلوبلائزیشن اور دوسری طرف وسیع نقل مکانی ایشیاء افریقہ اور مغربی ممالک میں مذہبی اور ثقافتی تصادم کو ہوا دے رہی ہیں۔

آنے والے دنوں میں ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے تو یہ عمل تیز ہو رہا ہوگا۔ نتیجے میں مذہبی اور ثقافتی ٹکراؤ بھی بڑھ جائے گا۔ ٹکراؤ جس قدر شدید ہوگا اس قدر ہم موجودیت کی ضرورت بھی بڑھ جائے گی لیکن اگر ایک عادل معاشرہ قائم کرنے کیلئے سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو یہ ہم موجودیت بھی ممکن نہیں رہے گی۔ اس طرح اس ضمن میں مذہب عدل اور امن کے قیام میں ایک اہم سبب بن سکتا ہے۔ اگر مذہبی رسم ورواج اور عبادات کے بجائے مذہبی اقدار پر زور دیا جائے تو پھر ایک منصفانہ اور پرامن سوسائٹی قائم کرنے کا امکان بہت بڑھ جائے گا۔ یہ واضح رہے کہ تمام مذاہب کی بنیادی صفات متضاد نہیں بلکہ یک رنگ اور ہم آہنگ ہیں اگر ہندومت اور جین مت عدم تشدد پر زور دیتے ہیں تو بدھ مت رحم دلی کا نقیب ہے اگر مسیحیت کا زور محبت پر ہے تو اسلام انصاف اور مساوات پر زور دیتا ہے یہ بنیادی صفات ہی ایک بامعنی اور پرامن سوسائٹی کے قیام میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

مگر آئندہ آنے والے زمانوں میں مذاہب کو بعض اہم چیلنج درپیش ہوں گے یہ چیلنج اس وقت بھی نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا چیلنج ہے صنف کے بارے میں یعنی عورت اور مرد کے بارے میں انصاف، دنیا میں اس وقت نہ انتہائی ترقی یافتہ مغرب میں اور نہ ہی ایشیا اور افریقہ کے روایتی معاشروں میں سے کوئی ایک مثال موجود ہے جہاں عورتوں اور مردوں کے

ساتھ برابر کا سلوک اور انصاف کیا جارہا ہو۔ بدقسمتی سے مذہب اور امن کی عالمی کانفرنس میں بھی اس سوال پر توجہ نہیں دی گئی چند لوگوں نے ذکر کیا مگر صرف چلتے چلتے اس کانفرنس میں عورتوں کی شرکت بھی نہ ہونے کے برابر تھی آیندہ آنے والی صدی میں اس جینڈر سوال کی حیثیت بنیادی ہوگی اور اس مسئلہ کو حل کئے بغیر پرامن سوسائٹی کا قیام تو دور کی بات ہے منصفانہ سوسائٹی کا قیام بھی ناممکن ہوگا۔

31۔دسمبر1999ء

قومی ریاست، مذہب اور شناخت

قومی ریاست یا قوم کی ریاست کے موضوع پر بیسویں صدی میں بہت کچھ لکھا کیا گیا ہے مگر اس متنازعہ موضوع پر اب بھی اتفاق رائے نہیں ہوسکا۔ ایک ایسے ملک میں یہ تصور اور بھی متنازعہ بن جاتا ہے جس میں مذہبی ثقافتی اور لسانی ہم آہنگی کم ہوتی ہے اور جہاں متعدد مذہبی اور لسانی گروپ موجود ہوں۔ جدید زمانے کے محاورے میں ہندوستان جیسے کثرت المذاہب والے معاشرے میں قومی ریاست کا تصور سو مسائل میں پھنسا ہوا ہے۔ کلاسیکل قومی ریاست مشترک لسانی اور ثقافتی روایت اور مستقبل کے معاشی نقشے کی بناپر وجود میں آئی تھی۔ مگر افریقہ اور ایشیا کے نو آبادیاتی ممالک میں صورتحال یہ نہیں تھی۔ نو آبادکاروں نے مذہبی اور لسانی اعتبار سے ہم آہنگ علاقوں میں نو آبادیاں نہیں بنائیں۔ انہوں نے جہاں کہیں قبضہ کیا حکومت بنالی اور ان میں صرف انتظامی وحدت پیدا کی۔ انتظامی طور پر منتھی کئے گئے یہ علاقے ہی نو آبادکاروں کے جانے کے بعد قومی ریاست بن گئے۔

بعض ممالک میں قومی ریاست کے تصور پر بہت زور کا تصادم ہوا۔ انگریز آقاؤں کے جانے پر ہندوستان میں یہی کچھ ہوا۔ مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد ترجمان ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے مشترکہ قومیت کے تصور کو رد کردیا اور مذہبی قومیت کا تصور پیش کردیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مذہبی بنیاد پر قوم کا تصور پہلی بار سرزمین برصغیر ہندوستان میں ہی پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے دنیا بھر میں کہیں بھی یہ تصور نہیں دیا گیا تھا اس وقت تک نیشنلزم کا رشتہ مشترکہ تاریخ ثقافت زبان اور نسل سے عبارت تھا نہ کہ مذہب سے۔ دلچسپ بات یہ ہے اور ہم نے اس کا زور دے کر کہیں اور بھی ذکر کیا ہے کہ مذہبی نیشنلزم کا یہ تصور

مسلمانوں کی مذہبی قیادت نے نہیں ان کے اوپر کے سیکولر طبقوں نے پیش کیا تھا۔

یہ بھی اہم بات ہے کہ دوقومی نظریہ مذہبی نہیں سیاسی مصلحتوں میں سے پیدا ہوا تھا۔ دراصل یوں دو بڑی برادریوں کے سیکولر بالائی طبقوں کے درمیان مسابقت کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں نے دوقومی نظریہ کی مخالفت کی اور مذہبی بنیادوں پر ہی مشترکہ نیشنلزم کو جواز فراہم کیا انہوں نے کہا کہ مذہب میں علاقہ ہی نیشنلزم کی بنیاد بنا کرتا ہے۔ جن علماء نے دوقومی نظریئے کو بڑے زور سے مسترد کیا ان میں مولانا حسین احمد مدنی نمایاں تھے ان کا تعلق علماء کے مکتبہ دیو بند سے تھا۔

اس طرح ہندوؤں میں بھی مذہبی قیادت نے دوقومی نظریئے کو جواز نہیں بنایا۔ ویر ساورکر اور ان جیسی سیکولر قیادت نے ہی اسے مانا۔ نہ مسلم لیگ نہ ہی ہندو مہا سبھا مذہبی جماعتیں تھیں۔ ہندو مہا سبھا کے رہنماؤں نے جناح صاحب اور ان کی مسلم لیگ سے اتفاق کیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں یہ دوسری بات ہے کہ مسلم لیگ نے تو تقسیم کا مطالبہ کر دیا مگر ہندو مہا سبھا نے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ ہندو مہا سبھا ہندوؤں کی بالادستی کی خاطر اکھنڈ بھارت کی حامی تھی۔ پہلے ہندو مہا سبھا اور اس کے بعد راشٹریہ سیوک سنگھ والے ہندو راشٹر قائم کرنا چاہتے تھے جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں کو غیر ملکی سمجھا جائے جن کی شہریت ہو نہ سیاسی حقوق۔ اس وقت آر ایس ایس کے سربرگرد گولوالکر تھے۔ انہوں نے ان خیالات کا اظہار اپنی دو کتابوں میں کیا۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ مذہبی نیشنلزم کا قطعی کوئی جواز نہیں ہے اور اگر یہ پیش کیا جائے تو ایسے الجھے مسائل پیدا ہوتے ہیں جنہیں حل کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اب یہ نظریہ مکمل طور پر بے بنیاد بن چکا ہے۔ جہاں تک اسلام کا سوال ہے تو اس حوالے سے اور بھی پریشان کن سوال پیدا ہوتے ہیں مولانا حسین احمد مدنی ان مسائل سے آگاہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی اہم کتاب متحدہ قومیت اور اسلام میں ان سب کا ذکر کیا ہے۔ نوآبادیاتی دور کے بعد اب بہت سی مسلم قومیں بن چکی ہیں اگر اسلام نیشنلزم کی بنیاد فراہم کرتا ہے تو پھر ان سب مسلم ممالک کو ایک قوم اور ایک ریاست بنا لینی چاہئے مگر کوئی یہ دلیل دے گا کہ ان میں علاقائی ربط نہیں ہے اس لئے علاقائی طور پر ایسی ریاست کا قیام ممکن نہیں اگر نظریاتی سطح پر اس دلیل کو بھی مان لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان، افغانستان، ایران اور وسطی ایشیا

MashalBooks.org

کے بہت سے ممالک جغرافیائی طور پر جڑے ہوئے ہیں دوسری طرف عرب ممالک جغرافیائی طور پر مربوط ہیں تو پھر یہ کیوں واحد اسلامی قوم اور ملک نہیں بنا لیتے۔

کسی بھی قوم میں پہلا سوال اور سب سے زیادہ اہمیت شناخت کی ہوتی ہے اور شناخت کا عموماً انحصار تاریخی، ثقافتی اور لسانی مشترکہ طرز احساس پر ہوتا ہے اس میں ضروری نہیں کہ مذہب بھی مشترک ہو۔ واضح رہے کہ صرف مذہب مشترکہ نیشنلزم کی مؤثر اور مربوط بنیاد نہیں بن سکتا۔ پرانے یورپ میں بھی عیسائی مذہب تو سب میں مشترک تھا مگر یورپ میں مختلف قوموں کی تقسیم ثقافتی اور لسانی روایات پر مبنی تھی۔ اس طرح ایک قوم کی تشکیل میں مشترک زبان، ثقافت اور مشترکہ تاریخی احساس اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ملائیشیا میں اسلام کے علاوہ ملائی قومیت کا اہم کردار ہے۔ ان لوگوں کیلئے ملائی شناخت اتنی ہی اہم ہے جتنا اسلام، ان کی ملائی اور اسلامی شناخت میں تمیز کرنا مشکل ہے یہ ان کی ایسی شناخت ہے جس میں وہ ملائیشیا کے دوسرے مسلمانوں اور مسلم ممالک کے مسلمانوں کو حصہ دار نہیں بنا سکتے۔ ملائیشیا میں غیر ملائی مسلمان بھی ہیں وہ اصلاً ہندوستان نژاد ہیں مگر ان کی شناخت باقی ملائی مسلمانوں سے بہت مختلف ہے ملائی نیشنلزم اپنے طور پر ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے اور ملائیشیا میں ملائی نیشنلزم ہی کا غلبہ ہے۔

ہندوستان کی طرح ملائیشیا بھی کثرت نسل و ثقافت والا ملک ہے وہاں چینی ہیں، غیر ملائی مسلمان ہیں عیسائی اور ہندو ہیں۔ چینی 37 فیصد کے قریب ہیں ان سے زیادہ ملائی مسلمان ہیں۔ یو ایم این او بی کو بھی اقلیتوں کی حمایت حاصل ہے۔

ملائیشیا اور ہندوستان کی صورت حال میں کچھ نمایاں اختلاف بھی ہیں۔ ہندوستان میں ہندو اکثریت کے برعکس ملائیشیا کے مسلمان معاشی تعلیمی اور معاشرتی اعتبار سے انتہائی پس ماندہ اور محروم لوگ تھے چینی تعلیمی اور معاشی اعتبار سے غالب تھے۔ ملائی مسلمانوں کو ملائی اسلام کے پرچم تلے اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے منظم کیا گیا۔ یہ لوگ زیادہ تر دیہی علاقوں سے آئے تھے۔ چنانچہ احیا کی یہ تحریک دراصل انہی ملائی مسلمانوں کی خواہشات کی نمائندہ تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کو ان کے حق کے مطابق مراعات دے کر حکومت نے اس تحریک کو اپنے حق میں کر لیا۔ ملائیشیا والوں کے اسلام کی بھی منفرد ثقافتی صفات ہیں۔ ان ملائی مسلمانوں کے نیشنلزم میں کہیں پر یہ احساس نہیں کہ ملائیشیا کے اندر یا دنیا کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے ساتھ

MashalBooks.org

ان کی کوئی تاریخی اور ثقافتی ورثے کی سانجھ بھی ہے۔

انڈونیشی اسلام کے بھی اپنے منفرد ثقافتی اور تاریخی پہلو ہیں قرون وسطی کے ابتدائی عرصے میں انڈونیشیا میں ہندومت کا غلبہ تھا چنانچہ انڈونیشیا کے اسلام خصوصاً جاوا کے اسلام پر ہندومت کی گہری چھاپ ہے۔ انڈونیشیا کی زبان بھاسا میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ ہیں اس طرح بہت سے ہندوانہ نام مثلاً سینتا (سیتا) اور لکشمی نام انڈونیشیا کی مسلمان عورتوں کے بھی ہیں۔ مسلمان مردوں میں رام اور وشنو نام بھی ہیں انڈونیشیا کے صدر عبدالرحمٰن واحد نے ایک مرتبہ مجھے جکارتہ کے مذاکرے میں بتایا کہ انڈونیشیا میں سب سے بڑے مبلغ اسلام کا نام مولانا وشنو ہے۔ مختلف ممالک میں اسلام کی اپنی بہت سی عمرانی اور ثقافتی منفرد خصوصیات ہیں اور ان ممالک میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ثقافت اور تاریخ کے بھی متعدد مشترک ورثے ہیں، تاریخ اور ثقافت کے اس مشترکہ احساس نے ان میں قومی شناخت کا شعور پیدا کر دیا ہے۔ بہت سے عرب ممالک میں عربی بولنے والے یہودی اور عیسائی بھی ہیں اور ان کی تاریخ بھی مسلمانوں کے ساتھ سانجھی ہے مثلاً اردن میں بہت سے عیسائی عرب بھی ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ امن و امان سے رہتے ہیں اور تاریخ و ثقافت میں بھی وہ مشترکہ ورثے کے حصہ دار ہیں۔ لبنان میں مسلمان اور میرونائٹ عیسائی برادیوں کا نیشنلزم مشترکہ ہے۔ لبنان میں ان میں خوفناک تشدد کی وجہ سے اختلاف ہو گیا تھا مگر یہ زیادہ تر اسرائیل جیسی بیرونی طاقت اور کچھ اندرونی مذہبی تفریق کا کیا دھرا تھا۔ جب وہ مسئلہ حل ہو گیا تو یہ ایک قوم کی حیثیت سے اور سیاسی یگانگت اور وحدت کے شعور کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

ان تمام مثالوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ سیاسی اتحاد اور مشترکہ قومیت کا شعور مذہبی شناخت کا مرہون منت نہیں ہوتا اس کا انحصار سیاسی تاریخی اور ثقافتی عوامل پر ہوتا ہے۔ مذہبی قوم پرستی کوئی کارآمد تصور نہیں کیونکہ مذہب کو تو مختلف سیاسی، لسانی، ثقافتی اور نسلی گروپوں نے اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ مذہب ایک روحانی اور اخلاقی مسئلہ ہے جبکہ نیشنلزم تاریخی اور علاقائی نسبت رکھتا ہے دونوں کو باہم خلط ملط نہیں کرنا چاہئے صرف مذہب کے مقابلے میں متحدہ ثقافت نیشنلزم کی بہتر بنیاد بن سکتی ہے مذہب مشترکہ مذہبی تجربہ اور مشترک اخلاقی شعور مستقبل کے حوالے سے ایک مقام رکھتا ہے جبکہ نیشنلزم سیاسی مسائل، ثقافتی رسم و

MashalBooks.org

رواج اور تاریخی ورثے کے عوامل کی بنا پر تشکیل پاتا ہے۔جنوبی ایشیا میں بہت سا ورثہ مشترک تھا مگر مذہب کی بنیاد پر نہیں۔بعض بیرونی عوامل خصوصاً انگریزوں کی پالیسیوں کے باعث مذہبی اختلافات کو ہوا مل گئی۔اس علاقے کے امن اور خوشحالی کیلئے جنوبی ایشیا کی کنفیڈریشن بڑی ضروری ہے۔نوآبادیاتی عہد کے بعد کے بعض سیاسی نظریہ ساز نیشنلزم کے نظریئے کو ہی سراسر رد کرتے ہیں۔

15۔مئی2000ء

کانگرس سیکولرازم اور اقلیتیں

آج بی جے پی کی سرکردگی میں نیشنل ڈیموکریٹک الائنس کی مرکزی حکومت کو اقلیتیں بڑے شک وشبہ کے ساتھ دیکھ رہی ہیں۔اقلیتوں پر حملے مجرمانہ فعل ہی نہیں یہ سوچی سمجھی سکیم اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ سیاسی بنیادوں پر ہو رہے ہیں۔افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی ابھی تشکیل دیئے گئے نیشنل میناریٹیز کمیشن نے آگرہ اور متھرا اضلاع میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کو عام مجرمانہ حملے قرار دیا ہے اور یہی تو بی جے پی حکومت کی منطق ہے۔یہ بھی دیکھئے کہ چند ایک واقعات کو چھوڑ کر یہ سارے فسادات ان علاقوں میں ہو رہے ہیں جہاں بی جے پی کی حکومت ہے یا بی جے پی حکومت میں شریک ہے اور اب تک زیادہ تر واقعات گجرات اور یوپی میں ہوئے ہیں۔کچھ عرصہ پہلے کیرالا کا ایک عیسائی مبلغ برادر جارج یوپی کے ضلع متھرا میں اس وقت قتل کیا گیا جب وہ تبلیغ کر رہا تھا۔عیسائیوں پر پہلا حملہ صوبہ گجرات میں ہوا جہاں بی جے پی کی حکومت نے ضلع ڈانگ میں بہت سے چرچ گرا دیئے گئے۔بعض دیہات میں ان علاقوں کو بھی نہیں بخشا گیا جہاں کسی مسلمان لڑکے نے ہندو لڑکی سے شادی کر لی تو اس بہانے بے شمار دیہات میں مسلمانوں کو ہراساں کیا گیا۔جنوبی گجرات کے کئی دیہات سے تو مسلمانوں کو بھاگنا پڑا اور یہ بی جے پی کی گجرات کی حکومت تھی جس نے اپنے ملازمین کو راشٹریہ سیوک سنگھ میں شامل ہونے کی اجازت دیدی جو اقلیتوں کو خوفزدہ کرنے والا فعل ہے۔

اسی کی دہائی خصوصاً آخری حصے میں بی جے پی نے مسلمانوں کے خلاف بڑی زوردار مہم چلائی بی جے پی نے دو نظریئے دیئے پہلا یہ کہ کانگرس کا سیکولرازم نام نہاد سیکولرازم تھا اور دوسرے یہ کہ کانگرس نے مسلمانوں کو خاص ترغیبات اور مراعات دیں۔بی جے پی نے

مسلمانوں کو" لازمی اقلیت" قرار دے کر ہندوؤں میں مسلمانوں کیخلاف زہر بھرا اور کہا کہ کانگرس ووٹ لینے کیلئے اس سے لاڈ کرتی ہے۔ یہ پراپیگنڈا بڑا موثر تھا اور اس کا ہندوؤں کے متوسط طبقے پر بڑا اثر ہوا۔ بی جے پی نے اس مہم کی قیمت نوے کی دہائی کے انتخابات میں ووٹوں کی صورت میں وصول کی۔ اگر وہ اقلیتوں کے خلاف مہم نہ چلاتی تو اس کے اقتدار میں آنے کی گنجائش بہت کم تھی۔

مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ رویہ کانگرس کا تھا جو اس نے غصہ میں اختیار کئے رکھا۔ کانگرس نے نہ صرف اس پراپیگنڈے کا توڑ نہیں کیا بلکہ اس نے بھی گیروا رنگ اختیار کرلیا۔ بہت سے لوگوں کو یوں لگا جیسے کانگرس بی جے پی کی بی ٹیم بن گئی ہے۔ راجیو گاندھی یا تو خود صورتحال کو صحیح طرح سے نہیں سمجھ سکے یا انہیں غلط مشورہ دیا گیا تھا۔ ہندوؤں کی تشفی کیلئے رام مندر تنازع کا سنگ بنیاد انہوں نے ہی رکھا اور مسلمانوں کو تنہا کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ کانگرس الیکشن ہار گئی۔ کانگرس کی بدترین کارکردگی اس وقت دیکھنے میں آئی جب وزیراعظم نرسیما راؤ بابری مسجد کے انہدام کے وقت ساکت وصامت رہے۔ اگر نرسیما راؤ کا ارادہ ہوتا تو مسجد کے انہدام کو روکا جاسکتا تھا۔ کانگرس کے وزیراعظم کے اس رویئے سے مسلمانوں کا ناراض ہونا قدرتی امر تھا۔ یہی نہیں جب ممبئی میں دنیا کو دہلا دینے والے فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے نرسیما راؤ خاموش تماشائی بنے رہے۔

اس طرح کانگرس نے اقلیتوں کی نظر میں خود کو مکمل طور پر بے وقار کرلیا۔ اقلیتیں شدت سے اپنے الگ تھلگ ہونے کو محسوس کرنے لگیں۔ اس لئے اگر اگلے الیکشن میں کانگرس ہار گئی اور اقتدار سے نکل گئی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ کانگرس کی طاقت دراصل دو اصولوں سوشلزم اور سیکولرازم پر منحصر ہے ان اصولوں کی وجہ سے ایک تو سوسائٹی کے کمزور حصے اور دوسرے اقلیتیں کانگرس کی طرف متوجہ ہوئیں پھر 1991ء میں وزیر خزانہ من موہن سنگھ کی صنعتوں و تجارت کو نسبتاً آزاد کرنے کی پالیسی نے اقلیتوں کے علاوہ معاشرے کے کمزور حصوں کو بھی کانگرس سے دور کردیا۔ پھر بی جے پی اس پالیسی کو اس کے منطقی انجام تک لے گئی اور معاشرے کے مفلس اور کمزور حصوں کو بڑا گزند پہنچا۔ اس پالیسی کے حوالے سے اگر کانگرس پارٹی کو اے کہا جائے تو بی جے پی اس کی بی ٹیم بن گئی۔ اور تو اور صنعتوں وغیرہ کو آزاد کرنے اور نج کاری کے حوالے سے آر ایس ایس تک بی جے پی کے خلاف ہے۔

بی جے پی اقلیتوں کے خلاف پالیسیوں پر بڑے زور شور سے عمل کر رہی ہے۔ دوسری طرف صنعتوں کی نجکاری وغیرہ کے حوالے سے نچلے غریب طبقے کو ناراض کر دیا ہے اس لئے وہ تیزی سے دونوں سے محروم ہو رہی ہے۔ آج کل بی جے پی صرف اونچی ذات اور اونچے طبقوں کے ووٹروں کو خوش کر رہی ہے۔ کانگرس اپنی کھوئی طاقت حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہے مگر ابھی وہ اس منزل سے دور ہے۔ اس کی بھی کئی وجوہ ہیں۔ اب اس کے پاس پنڈت نہرو جیسا کرشمہ ساز لیڈر نہیں رہا۔ اب پسند کریں یا نہ کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک طلسمی رہنما دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اثر ورسوخ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ معجزہ آسمان سے نازل نہیں ہوتا یہ حاصل ہوتا ہے اپنے آدرشوں اور اور طریقہ کار سے پر خلوص وابستگی کے ذریعے۔

نہرو نے یہ طلسمی رنگ جدوجہد آزادی کے دنوں میں قربانیاں دے کر حاصل کیا اور پھر انہوں نے سوشلزم اور سیکولرازم سے اپنا عہد وفا نبھایا۔ انہوں نے ساری زندگی ان آدرشوں کی پاسداری کی۔ معاشرے کے کمزور اور غریب حصوں اور اقلیتوں میں اعتماد پیدا کیا۔ ان کی سرکردگی میں کانگرس کوئی مقامی قسم کی تنظیم نہیں تھی۔ اس میں کوتاہیاں اور خرابیاں بھی تھیں نہرو کو اپنی پارٹی کے اندر فرقہ پرستوں سے لڑنا پڑا ان کے اپنے ساتھی اکثر اوقات ان کی ہدایت کو نظر انداز کر دیتے تھے اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ان کے عہد اقتدار میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کو ان سے اور ان کی پارٹی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اقلیتوں میں اپنا اثر ورسوخ بنانے اور اعتماد پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے' اس لئے کہ اقلیتوں کو نظر آتا تھا کہ یہ شخص سیکولرازم کے ساتھ مخلص ہے۔ وہ نہرو کے زیر سایہ خود کو محفوظ سمجھتے اور حفاظت اور امن وامان کیلئے انہی کی طرف دیکھتے۔

شروع میں اقلیتوں اور معاشرے کے کمزور طبقوں نے اندرا گاندھی کی طرف رجوع کیا کیونکہ انہوں نے بھی ابتداً نہرو والی پالیسیاں جاری رکھی تھیں۔ پارٹی کی قیادت ہاتھ میں لینے کے بعد انہوں نے ملک کے بڑے بڑے بینکوں کو قومی تحویل میں لے لیا جس سے غریب اور کمزور طبقوں میں بھی اعتماد پیدا ہوا۔ انہوں نے سیکولرازم پر زور دیا تو اقلیتوں نے بھی کانگرس کے قریب آنا شروع کیا۔ اس طرح نہرو کی طرز کی طلسماتی شخصیت اندرا گاندھی کی بھی بننا شروع ہوگئی۔ مگر نہرو کے برعکس اندرا اپنی پالیسیوں پر سختی سے کاربند نہ رہیں۔ اندرا ان کو ان آدرشوں

کے بجائے طاقت میں زیادہ کشش نظر آتی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے 1975ء میں اس وقت ایمرجنسی لگا دی جب ان کیخلاف مخالفت بہت بڑھنے لگی اور الہ آباد ہائیکورٹ کے ایک فیصلے کے مطابق انہیں (لوک سبھا) اپنی نشست چھوڑنا پڑی تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹے سنجے گاندھی کو بھی کارسرکار میں مداخلت کا حق دے دیا۔ سنجے گاندھی نے زبردستی خاندانی منصوبہ بندی کے علاوہ غریبوں اور اقلیتوں کے مکانوں، دکانوں کو گرا کر اور بدنامی کمائی۔ چنانچہ اندرا گاندھی کا طلسم ٹوٹنا شروع ہوا اور وہ 1977ء کا انتخاب ہار گئیں۔

جو سیاسی میدان ان سے چھن گیا وہ آخری دم تک واپس نہ لے سکیں 1980ء کے لوک سبھا کے انتخابات کے ذریعے وہ دوبارہ اقتدار میں آتو گئیں مگر وہ اقلیتوں کو کبھی باور نہ کرا سکیں کہ انہیں اسی زور شور کی حمایت دی جائے جیسی حمایت ساٹھ کی دہائی کے آخر میں ملی تھی جب وہ مشکل حالات کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ اب انہوں نے خود کو بے انتہا غیر محفوظ بھی سمجھنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اپنی سیاسی بقا کیلئے ہندوؤں کو خوش کرنا شروع کر دیا تھا وہ تو اس حد تک گئیں اور اگرچہ بڑے پراسرار انداز میں گئیں کہ لوگوں کے اسلام قبول کرنے کے خلاف وشوا ہندو پریشد نے جو مہم چلائی تھی' انہوں نے اس کی بھی حمایت کر دی۔ اپنے کچھ وزیروں کے ذریعے انہوں نے یہ بات بھی عام کروائی کہ عربوں کی طرف سے اسلام پھیلانے کیلئے ڈالروں کی صورت میں پیسا آ رہا ہے۔ انہوںؒ نے اس مہم کی بھی حمایت کی کہ مراد آباد کے 1980ء کے فسادات میں عربوں کا سرمایہ کام آیا۔ 1984ء میں کانگریس اس لئے الیکشن میں جیت گئی کہ سکھ باڈی گارڈ کے ہاتھوں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد کانگریس کے حق میں ایک لہر چل پڑی تھی اور اگرچہ مسلمانوں کیلئے اندرا گاندھی یا کانگریس میں کوئی کشش نہیں رہی تھی وہ ان کے حامی نہیں رہے تھے مگر جب قتل کے بعد ہمدردی کی لہر چلی تو مسلمانوں نے کانگرس کی حمایت کی۔

راجیو گاندھی میں اپنی ماں جیسی بھی طلسمی کیفیت نہیں تھی۔ انہوں نے جلدی ہی مسلمانوں میں اپنا اعتماد گنوا لیا اور اب مسلمانوں کے دل میں ان کیلئے کوئی جگہ نہ رہی۔ جب انہوں نے سپریم کورٹ کی طرف سے آئے شاہ بانو کیس کے فیصلے کو تبدیل کر کے مسلمان عورتوں کے نان نفقے کا قانون بنا دیا جو بھاری غلطی تھی۔ پھر انہوں نے رام جنم بھومی مندر کا سنگ بنیاد رکھ کر مسلمانوں کو ناراض کر لیا۔ اور پھر جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ نرسیما راؤ نے بابری مسجد کے انہدام کے دوران خاموش تماشائی بن کر کانگرس کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی۔

کانگرس سونیا گاندھی کی قیادت میں خود کو بحال کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت سونیا گاندھی کو بڑی مشکلات کا سامنا ہے بالکل اپنی ساس کی طرح۔ اندرا گاندھی کو سینئر کانگرسی لیڈروں کے خلاف لڑائی لڑنی پڑی جس میں مرار جی ڈیسائی ایس کے پاٹل، اٹلیا گھوش وغیرہ تھے مگر انہوں نے سیکولرازم اور سوشلزم پر زور دیا تو اس صورتحال سے بھی بچ گئیں۔ سونیا گاندھی بھی بڑی مشکلات کا سامنا کر رہی ہیں پہلے تو ان پر غیر ملکی ہونے کا داغ ہے دوسرے انہیں کانگرس کے شرد پوار جی ایس سنگما، طارق انور اور کئی دوسرے چھوڑ گئے اور نئی پارٹی بنالی۔ سونیا کو غیر ملکی ہونے کا داغ چھڑانے کیلئے بھی لڑائی لڑنی پڑی۔ اپنی ساس کی طرح سونیا نے بھی سیکولرازم کی اہمیت کو محسوس کر لیا ہے اور گجرات کی بی جے پی حکومت کی طرف سے سرکاری ملازموں کو آر ایس ایس میں شمولیت کی آزادی دینے کیخلاف مہم چلائی اور سونیا گاندھی ہی کے طفیل بی جے پی حکومت نے وہ گشتی چھٹی واپس لے لی اور سرکاری ملازموں پر دوبارہ پابندی لگا دی ہے۔ بے شک صرف کاغذی حد تک ہی سہی۔

اندرا گاندھی کی طرح سونیا بھی نج کاری کی پالیسی پر غور کر رہی ہیں اور اس ضمن میں ایک کمیٹی بنا رہی ہیں جو اس پالیسی پر غور کرے گی جس نے ملک کے غریب اور نادار لوگوں کو پریشان کر دیا ہے۔ اس پالیسی کے محرک من موہن سنگھ تھے اور اگرچہ ان کو بھی اس کمیٹی میں شامل کیا گیا ہے لیکن توقع ہے کہ کانگرس اس پالیسی کو نرم بنائے گی تاکہ نچلے غریب طبقے کیلئے کانگرس میں پھر کشش پیدا ہو جائے۔ اگر کانگرس کو دوبارہ اپنی توانائی بحال کرنا ہے تو پھر اسے غریب طبقوں اور اقلیتوں کو اپنی طرف لانا پڑے گا۔ اونچے طبقے تو بی جے پی سے وابستہ رہیں گے کیونکہ موجودہ صورتحال میں ان کیلئے یہی بہتر راستہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ نہرو اور اندرا گاندھی کے زمانوں میں اونچی ذات کے ہندو خصوصاً براہمن کانگریس کے ساتھی تھے مگر اب ان کو دوبارہ کانگرس کے اندر لانا خود کانگرس کے بس کی بات نہیں رہی۔

اس صورتحال میں کانگرس کو اقلیتوں اور معاشرے کے غریب اور کمزور طبقوں کی ضمانت چاہئے مگر یہ حمایت صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کانگرس کے بارے میں لوگوں کا تصور بہتر ہو۔ اگرچہ کانگریس کو اس بات کا احساس ہو رہا ہے مگر اقلیتوں میں اعتماد پیدا کرنے کیلئے اتنا ہاؤ ہو نہیں کر رہی جتنا کہ کرنا چاہئے۔ سونیا گاندھی کو اگر اقتدار حاصل کرنا ہے تو اسے نہرو خاندان کی طرف سے ورثے میں ملی نیک نامی اور خیر سگالی کے علاوہ خود اپنا طلسم پیدا

کرنا پڑے گا اور وہ اس صورت میں کرسکتی ہیں کہ فرقہ واریت اور نج کاری کے خلاف ڈٹ کر لڑیں۔ اندرا گاندھی کے برعکس سونیا میں کچھ کمی بھی ہے ایک تو اٹلی کا باشندہ ہونا، دوسرا عیسائی ہونا تاہم ان کا غیرملکی ہونے والا داغ تو بڑی حد تک اب صاف ہو چکا ہے اور اگر وہ فرقہ واریت کے خلاف اور سیکولرازم کے حق میں زوردار لڑائی لڑتی ہیں اور اقلیتوں کا اعتماد حاصل کر لیتی ہیں تو یہ عیسایت والا داغ بھی بڑی حد تک ڈھل جائے گا۔ آخر کار اس ملک کو رواداری بہت سے مذہبی عقائد کی کثرت وغیرہ ماضی سے ورثے میں ملے ہیں تنگ نظر فرقہ پرست قوتیں زیادہ دیر تک اس ملک پر حکمرانی نہیں کرسکیں گی۔

(30۔جون2000ء)

اسلام اور سیکولرازم

کیا اسلام سیکولرازم کے موافق ہے؟ یہ سوال موجودہ سیاق وسباق خصوصاً اکیسویں صدی کے حوالے سے خاصا اہم ہے کہ غیرمسلم اور قدامت پسند مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ اسلام سیکولرازم کے موافق نہیں ہے۔ بنیاد پرست مسلمان سیکولرازم کو اسلام کے مخالف اور حرام قرار دیتے ہیں جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی نے کہا تھا کہ جو لوگ سیکولرازم کی سیاست کر رہے ہیں وہ اس کے رسول کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اٹھا رہے ہیں یہ بات پاکستان میں ہجرت کرنے کے موقع پر کہی گئی تھی سعودی علماء بھی سیکولرازم کو اسلامی شرعی لحاظ سے مسترد کرتے ہیں۔

بنیاد پرست ہندو کہتے ہیں کہ مسلمان جہاں اقلیت میں ہوں سیکولرازم کی حمایت کرتے ہیں اور جہاں اکثریت میں ہوں وہاں اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ مگر یہ پورا سچ نہیں ہے سعودی عرب اور بعض دوسرے ممالک واقعی سیکولرازم کو رد کرتے ہیں مگر مسلم اکثریت والے سارے ممالک تو اسے رد نہیں کرتے۔ انڈونیشیا کی 85 فیصد آبادی مسلمان ہے مگر وہ سیکولرازم کو رد نہیں کرتا۔ بہرطور بہت حد تک یہ صحیح ہے کہ بہت سے مسلم اکثریت والے ملک خود کو اسلامی ملک کہتے ہیں یا اسلام کو ریاستی مذہب قرار دیتے ہیں۔

یہ اہم بات یاد رکھنی چاہئے کہ ایک اسلامی ریاست میں اور ایک ایسے ملک میں جس نے اسلام کو سرکاری مذہب قرار دے رکھا ہو فرق ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں اس کے تمام

قوانین اسلامی شریعت کے مطابق ہونے چاہئیں جبکہ ایک ایسی ریاست میں جس نے اسلام کو اپنا مذہب بنا رکھا ہے اس کا مطلب ہے کہ اسلام کو دوسرے سارے مذاہب پر ترجیح دی گئی اور اسے ملک کے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں نسبتاً اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ 1948ء میں پاکستان میں اعلان کیا گیا تھا کہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے مگر پاکستان اس وقت تک اسلامی مملکت نہیں بنا جب تک ستر کی دہائی میں ضیاء الحق نے اس کے اسلامی ریاست ہونے کا اعلان نہیں کیا پھر انہوں نے پاکستان میں شرعی قوانین نافذ کرنے شروع کر دیئے۔

اسلام کو سیکولرازم کے ناموافق کہا جاتا ہے کیونکہ سیکولر ملک میں مذہبی احکامات کیلئے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور اسلام کو سیکولر قوانین قبول نہیں۔ ہر چند کہا جاتا ہے کہ اسلام سیاست اور مذہب کو الگ الگ نہیں کرتا اس بنا پر سکہ بند مسلمان سیکولرازم کو مکمل طور پر رد کر دیتے ہیں وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ سیکولرازم الحاد ہے اور اسلام میں الحاد کیلئے بالکل کوئی جگہ نہیں۔ اسلام اللہ پر ایمان رکھنے پر بہت زور دیتا ہے۔ یہ چند وجوہ ہیں جن کی بنا پر سکہ بند مسلمان سیکولرازم سے پریشان ہوتا ہے۔ اسلام حیات بعدالموت پر بھی یقین رکھتا ہے جبکہ سیکولرازم کا احاطہ صرف ان معاملات پر ہے جو اس دنیا کے معاملے ہیں جہاں تک سیکولر فلاسفی کا تعلق ہے اس میں آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔

ہم یہاں پر دیکھیں گے کہ کیا یہ نکات سچے ہیں اور کیا واقعی اسلام سیکولرازم کے موافق نہیں ہے یہ تصور کہ سیاست اور دین کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا مذہب سے زیادہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ریاست کا کہیں کوئی تصور ہی نہیں۔ اس میں صرف ایک سوسائٹی یا معاشرہ کا تصور ہے قرآن کا معاملہ سیاسی نظام سے نہیں اخلاقیات سے ہے۔ قرآن شریف میں جن صفات کو اہمیت دی گئی ہے وہ ہیں سچا کردار، عدل، سچائی، فیض رسانی، رحم اور انسانی وقار۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں اسلامی معاشرے کیلئے یہ صفات ضروری اور بنیادی ہیں۔

یہ نقطۂ نظر کہ اسلام میں سیاست کو مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا دراصل معاشرے میں ان خوبیوں کی موجودگی پر اصرار کی وجہ سے بنالیا گیا ہے شروع کے اسلامی علماء اور قانونی ماہرین نے یہ سوچا کہ اگر سیاست کو مذہب سے الگ کر دیا گیا تو حکمران اس بنیادی اسلامی اقدار کو نظر انداز کر دیں گے اور ان کا رویہ اور طریق کاران کی ہوس اقتدار تک محدود ہو جائے

گا۔ دراصل ان دنوں انسانیت پسندی کے معنوں میں سیکولرازم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ علماء خائف تھے کہ اگر مذہب اور سیاست کو الگ الگ کر دیا گیا تو پھر حکمران کے کردار کا کوئی محاسبہ نہیں ہو سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی اسلامی علوم میں کہیں کوئی ایسا واضح حکم نہیں کہ مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تصور بھی دراصل انیسویں صدی کا ہے۔ جب سامراجی طاقتوں نے مسلم ممالک میں سیکولر قوانین نافذ کرنے شروع کئے ایسے قوانین جن کا منبع شریعت نہیں تھی۔

اسلام کے ابتدائی دور میں شرعی قوانین کے سوا کوئی قانون نہیں تھا اور چونکہ قرآن میں ریاست کا تصور ہی نہیں تھا اس لئے اسلامی مملکت بھی دراصل تاریخ کی پیداوار ہے۔ اسلامی مملکت کا ڈھانچہ بھی خاصے لمبے عرصے میں تشکیل پایا تھا اس ریاست کیلئے قرآن اور حدیث ہی قانون سازی کے زاویئے تھے۔ واضح رہے کہ اسلام سے پہلے مکہ یا مدینہ میں کوئی ریاست نہیں تھی۔ قبائلی سربراہوں کی مجلس تھی۔ وہ اجتماعی فیصلے کرتے تھے اور یہ قبائلی سردار ہی اپنے اپنے قبیلے کے علاقے میں ان فیصلوں کو نافذ کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کوئی تحریری قانون نہیں تھے صرف قبائلی رواج اور روایات تھیں فیصلہ انہی رواجوں کے اندر رہ کر ہی کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ قانون کا کوئی وسیلہ نہیں تھا مکہ کے معاشرتی افق پر جب اسلام طلوع ہوا تو منظر بدلنا شروع ہو گیا۔ مدینہ میں خود پیغمبر اسلام نے طریقہ حکمرانی کا ڈھانچہ میثاق مدینہ کے حوالے سے بنانا شروع کیا اس میثاق میں ان قبائلی رواجوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا جو یہودی مذہب اسلام اور اسلام سے پہلے کی بت پرستی سے وابستہ تھا۔ اس میثاق میں ہر قبیلے اور اس کے رسوم و رواج کو ایک خود مختار اکائی تصور کیا گیا تھا اور اس کی تفصیل رسول اکرم کے پہلے سیرت نگار ابن اسحاق نے دی ہے۔ یونہی میثاق شہر مدینہ میں شہریوں کی قبائلی اور مذہبی خود مختاری کو تسلیم کیا گیا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایک زیر تشکیل ریاست کے آئین کا یہ ابتدائی ڈھانچہ ہے اس میثاق میں بعض اصول رکھے گئے جو آج ایک سیکولر ریاست میں بھی جائز اور کارآمد ہیں جب پیغمبر اسلام نے یہ میثاق بنایا تھا اس وقت تک شرع بطور ضابطہ قانون وجود میں نہیں آئی تھی۔ مدینہ والوں کی اس اہم دستاویز میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے یہودیوں اور بت پرستوں کے مختلف قبیلوں کو اسلامی قوانین پر عمل کرنے کیلئے مجبور نہیں کیا۔

اسلام میں رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد ایک ریاستی ڈھانچہ تشکیل پانے لگا تھا کیونکہ

بہت وسیع علاقے فتح کر لئے گئے تھے اور نئے نئے مسائل پیدا ہونے لگے تھے۔ رسول اکرم کے زمانے میں حکومت صرف ایک شہر تک محدود تھی۔ فتح مکہ کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ ہی نہیں رہے مگر ان کی وفات کے بعد ریاست کی حدیں عرب علاقوں سے بھی باہر پھیل گئیں رسول اکرم کے زمانے میں لوگوں کو زیادہ تر روزمرہ کے معاملات مثلاً شادی، طلاق، ترکہ اور دوسری طرف چوری، راہزنی، قتل اور اسی نوعیت کے دوسرے معاملے درپیش تھے اس کیلئے رسول کریم اور قرآن بطور وسیلہ موجود تھے۔ لوگ رسول اکرم سے راہنمائی حاصل کرتے اور پھر ان کے فیصلے یا قرآن حکیم پر رضا کارانہ طور پر عمل کرتے کیونکہ فیصلہ پر عملدرآمد کیلئے کوئی ریاستی مشینری نہیں تھی نہ پولیس فورس تھی نہ باقاعدہ فوج۔ الگ سے عدلیہ بھی نہیں تھی جہاں تک رسول اکرم کا تعلق ہے وہ قانون ساز بھی تھے فیصلہ پر عملدرآمد کی انتظامیہ بھی اور عدلیہ کے جج بھی۔ یعنی ان کی ذات میں یہ تینوں شعبے اکٹھے ہو گئے تھے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ رسول اکرم کے عہد میں کوئی ریاستی ڈھانچہ نہیں تھا وہ خود ہی قانون کا وسیلہ تھے اور ان کی ایسی نادر شخصیت تھی جس کے اندر یہ تینوں پہلو سما گئے تھے۔ بہر طور رسول کریم ﷺ کی وفات کے باعث ایک خلا پیدا ہوا اور کوئی دوسرا شخص اس خلا کو پر نہیں کر سکتا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے اس وقت تک بہت سے علاقے فتح کر لئے گئے تھے اور پیچیدہ مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ دور دراز علاقوں کے لوگ مدینے والوں کی طرح اسلام کے ماننے والے نہ تھے۔ اس لئے رضا کارانہ طور پر قوانین یا اصولوں پر عملدرآمد نہ کرتے چنانچہ قانون کے نفاذ کیلئے ایک پولیس فورس کی ضرورت پڑی۔ رسول کریم کے زمانے میں لوگ اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنے کیلئے رضا کارانہ خدمات پیش کرتے تھے اس لئے تنخواہ دار فوج کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ ان کی وفات کے بعد ایک تنخواہ دار فوج رکھنے کی ضرورت پڑی۔ سرحدوں کی مسلسل حفاظت کی ضرورت تھی مگر رسول کریم کے عہد میں اسی کوئی حدیں نہیں تھیں۔

اب شرعی احکام کو مرتب کیا جا رہا تھا اور نئی صورت حال کیلئے رسول اکرم سے ہدایت حاصل نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے ایک طرف تو قرآن کو دیکھنا پڑتا دوسرے صحابہ سے مشورہ کرنا تاکہ یہ فیصلہ قرآنی احکامات کے مطابق ہو اس وقت قرآن اور حدیث قانون سازی کا سب سے بڑا ذریعہ تھے مگر فوج یا پولیس یا انتظامی مشینری کے سیکولر قسم کے ادارے بنانے کیلئے انہوں نے رومی یا ایرانی روایات سے کسب فیض کرنے میں تردد نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ نے دیوان

کا طریقہ اختیار کیا یعنی فوج اور انتظامی مشینری کو دی جانے والی تنخواہوں کا ریکارڈ رکھنا۔ اس طرح خلفا کے سامنے مزید قانون بنانے کے معاملات آئے مثلاً ملکیت زمین، ہنگامی حالات اور قحط کے دوران سب سزاؤں کی معطلی۔

فتوحات کے بعد مسلمانوں میں اندرونی کشمکش، مختلف قبائلی گروہوں اور شخصیات میں اقتدار کیلئے رسہ کشی اور دیگر عوامل کی بنا پر اس قدر دباؤ بڑھا کہ اس میں خلافت کا ادارہ بھی باقی نہ رہ سکا اور اس کی جگہ بادشاہت اور خاندانی حکومت نے لے لی۔ یہ صورتحال قرآن کی روح کے سراسر منافی تھی مگر بڑی تیزی سے تبدیلی ہوتی ہوئی صورتحال کے باعث یہ تبدیلیاں لازمی ہوگئیں اسلامی ماہرین قانون کو نئی صورتوں سے واسطہ پڑا تو انہیں ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہی پڑا اور انہیں قانونی جواز فراہم کیا گیا۔ جب ایک بار خلافت کی جگہ خاندانی حکومت نے لے لی تو پھر خلافت کا ادارہ پوری اسلامی تاریخ میں آج تک بحال نہیں ہوسکا اور مغربی نوآبادیاتی نظام کے آنے سے پہلے مسلم ملکوں میں بادشاہت اور خاندانوں کی حکومت ہی رہی۔

نوآبادیاتی نظام کے تحت مسلمانوں کو جمہوریت کی خوبیاں نظر آنے لگیں اور انہیں خلافت کا عہد اسلامی جمہوریت کا سنہری دور معلوم ہونے لگا۔ یہ درست ہے کہ خاندانوں کی حکومت میں بھی شرعی قوانین کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے حاکموں کیلئے ضروری تھا کہ علماء کو خوش رکھیں اس کے باوجود وہ اکثر ایسی راہ نکال لیتے جو شریعت کی روح کے خلاف ہوتی مگر وہ شریعت کی تعظیم کا اظہار کرنے میں کبھی نہ جھکتے۔ انیسویں صدی میں جب نوآبادیاتی حکومت عالم اسلام پر بھی قائم ہوگئی تو حالات میں بڑی بنیادی تبدیلیاں آئیں نوآبادیاتی فتوحات نے بہت سے ایسے قوانین نافذ کئے جو اصلاً سیکولر تھے۔ خود مغربی ممالک میں ایک زمانے میں چرچ کی حکومت تھی اور چرچ کے قوانین ہی اعلیٰ تر تھے مگر متحرک اصلاح نے سب کچھ تبدیل کرکے رکھ دیا اور چرچ کے خلاف جدوجہد نے سیکولر تصور کو ابھارا۔ چرچ اور ان حاکم شہزادوں کے درمیان بڑی شدید جنگ ہوئی جو چرچ کی بالادستی سے آزاد ہوکر آزادانہ حکومت کرنا چاہتے تھے۔ تازہ ابھرنے والا پرزور طبقہ بھی اس مقدس حکمرانی سے آزاد ہونا چاہتا تھا اور اس نے دیکھا کہ سیاست اور سوسائٹی کو سیکولر بنانے اور مذہب اور مذہبی اداروں کو اس طرف آنے میں تین صدیاں لگیں جب ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک میں نوآبادیاتی حکومتیں قائم ہوگئیں اس وقت سیکولرازم ترقی یافتہ ممالک میں پوری طرح جڑیں پکڑ چکا تھا اور معاشرے کو

سیکولر بنانے کا عمل پورا ہو چکا تھا۔ نوآبادیاتی طاقتوں کے زیر قبضہ آنے والے اکثر مسلم مما لک تھے سامراجی مما لک ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بالا دست تھے اس لئے وہ نوآبادیاتی مما لک میں اسلام کیلئے بڑا چیلنج بن گئے۔ ان مما لک کے علماء اور دانشوروں نے ماضی کی عظمت میں پناہ لینا شروع کر دی۔ مگر بعض مغرب کی بالاتری سے حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے معاشرے میں سیکولر جدیدیت لانے کی کوشش شروع کر دی۔ چنانچہ بہت سی اصلاحی تحریکیں مسلم مما لک میں ہی پیدا ہوئیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ (مصر) ان میں شامل تھے۔ بعض دوسرں نے مغربی سیکولرازم کو سر بسر مسترد کر دیا اور ماضی کے احیا کیلئے زبردست کوشش کی۔ جانبدار اصلاح پسند تحریکیں خود کو مسلمانوں میں سیاسی اور سماجی سطح پر مقبول کرانے کیلئے کوشاں تھیں اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کیلئے بھی۔ مغرب کے چیلنج کا مقابلہ کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھے جنہوں نے مذہب کو مکمل طور پر مسترد کر دیا اور مغرب کی سیکولر انسانیت پسندی کو قبول کر لیا لیکن یہ بہت یہ چھوٹی اقلیت تھی۔ مسلمان معاشروں کیلئے بڑا چیلنج تبدیلیوں کو قبول کرنے یا ان سے مطابقت پیدا کرنے کا تھا۔ بہت سے عمرانی ماہرین کا خیال ہے کہ دراصل یہ مزاحمت اسلامی تعلیمات کا نتیجہ تھی مگر یہ حقیقت نہیں ہے اسلام سمیت کوئی مذہب تبدیلی کا مخالف نہیں ہے تبدیلی کو قبول نہ کرنے کی جڑیں مذہب میں نہیں معاشرے میں ہوتی ہیں۔ دراصل زیادہ تر مسلمان معاشروں پر جاگیردار غالب تھے اور یہ معاشرے جدید طبقہ نہ پیدا کر سکے۔ ان معاشروں میں کوئی پکا اور مستحکم طبقہ تاجروں اور صنعتکاروں کا نہ تھا۔ یہی بات ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے۔ دوسرے طرف ہندوؤں میں صدیوں سے تاجر طبقہ موجود تھا جس نے بڑے آرام سے جدید سرمایہ کاری سے مطابقت پیدا کر لی۔ جنہوں نے سرمایہ کاری والا کلچر اختیار کیا انہیں احساس ہوا کہ سوسائٹی کو تبدیل اور سیکولر بنانے کی ضرورت ہے دراصل جو تبدیلیاں زمانے میں آ رہی تھیں انہی کی بنا پر معاشرے میں تبدیلی لانے کیلئے دباؤ پڑ رہا تھا۔

اس کے برعکس مسلمانوں میں کوئی مضبوط تاجر طبقہ نہیں تھا جو زمانے کے مطابق جدید تبدیلیاں لانے کی ضرورت کو محسوس کرتا۔ ہندوستان سمیت اکثر مسلمان مما لک میں اسلام غریب اور کمزور طبقوں نے قبول کیا تھا کیونکہ اسلام کی مساوات اور انصاف کی صفات میں ان لوگوں کیلئے اپیل تھی۔ ان غریب طبقوں کو بھی تبدیلی کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا وہ روایتی قسم کے عالموں کی گرفت میں رہے جو بہر طور سیکولرازم کے عمل کے خلاف تھے۔

MashalBooks.org

دوسرے مذاہب کے برخلاف اسلام میں شرعی قوانین بہت مضبوط تھے اور انہیں متفقہ طور پر مذہبی یا آسمانی قوانین مانا جاتا تھا چنانچہ بہت سے عالموں نے سیکولر قوانین کے تصور کو ہی قبول کرنے سے انکار کر دیا جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔علماء ہی عام مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اس لئے کسی تبدیلی کے خلاف وہ علماء کا ساتھ دیتے تھے۔جاگیرداروں کیلئے بھی سیکولرازم کوئی زیادہ کار آمد شے نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے علماء سے اتحاد کر لیا اور ان کی حمایت کی۔اس طرح علماء نے شرعی قوانین میں نہ صرف کسی تبدیلی کی شدید مخالفت کی بلکہ انہوں نے دوسرے معاملات میں بھی کسی تبدیلی سے انکار کر دیا۔محمد عبدہ اور ان جیسے کئی دوسرے علماء نے جب اجتہاد (شرعی قوانین کی جدید تقاضوں کے مطابق تعبیر) کا نام لیا تو وہ بھی ناپسندیدہ قرار پائے۔اسلام اور سیکولرازم پر بحث کرتے ہوئے ان اہم معاشرتی اور معاشی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں سیکولرازم کی موروثی کمیوں یا حدود کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا۔ انیسویں صدی میں عقلیت پسندی بھی ایک طرح کا مذہب بن گیا تھا۔عقل پسندوں اور سیکولرازم کے چاہنے والوں نے عقلیت کی پوجا شروع کر دی اور مذہب کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ دراصل عقلیت پسند بھی اسی طرح مذہب کو حقارت سے ٹھکرا دیتے جس طرح مومن سیکولرازم کو حقارت سے ٹھکراتا تھا۔دونوں نے اپنی اپنی کمیوں اور حدود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح مذہب میں بنیاد پرست ہوتے ہیں اس طرح عقلیت پرستوں اور سیکولر لوگوں میں بھی بنیاد پرست ہوتے ہیں۔سیکولر بنیاد پرست ایمان والوں کا کوئی احترام نہیں کرتے اور تو اور بعض ثقافتی رسوم کو بھی اسی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔بعض نے تو زندگی کے پر مایہ جذباتی پہلو کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔

عقیدے اور عقل کے درمیان ایک توازن کی ضرورت تھی۔ایمان بھی انسانی وجود کیلئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا عقل۔عقل دراصل ایک ہتھیار ہے جو انسان اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے استعمال کرتا ہے چنانچہ عقل بطور افادیت تو تسلیم مگر یہ حتمی اور آخری (فیصلہ کن) شے نہیں بن سکتی۔صرف عقیدہ کوئی آلہ یا ہتھیار نہیں ہے بلکہ اعلیٰ اقدار پر ایمان کا نام ہے اس جہاں میں ایک بامعنی زندگی گزارنے کے لئے۔یہ اقدار بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔عقل زیادہ سے زیادہ بامعنی زندگی گزارنے کے لیے ہے۔عقل اور عقیدے میں ایک تخلیقی امتزاج ضروری

MashalBooks.org

ہے۔ مذہب اور سیکولرازم کو دو ایسی چیزیں نہیں سمجھنا چاہئے جن میں قطبین کا بعد اور تضاد ہو وہ ایک دوسرے کیلئے لازم وملزم ہیں۔

صاحب ایمان کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ عقیدے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ماضی کی روایات کی اندھا دھند پیروی کرے۔ ایمان تو ماضی کی روایات پر نہیں اقدار پر ہونا چاہئے۔ انتہا درجے کے سیکولرازم نے زندگی کو بے مقصد بنا دیا ہے ادھر ایمان محض ایک ایسے حاکم یا امام کی اندھی پیروی کرواتا ہے جو انتہا درجے کے استحصال کا سامان کرتا ہے دوسرے لفظوں میں عقل کو خود سر نہیں ہونا چاہئے اور عقیدے میں اندھا نہیں ہونا چاہئے۔

اگر ان حالات کو اسی مفہوم میں سمجھا جائے تو عقل اور عقیدے اور مذہب اور سیکولرازم میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اسلام اور سیکولرازم میں بھی مطابقت ہے۔ اگر سیکولرازم کو الحاد کے معنی دیئے جائیں تو اسلام کو ماننے والا تو درکنار کوئی بھی ایمان والا اسے قبول نہیں کرے گا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اسلام اللہ اور اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے پر بہت زور دیتا ہے۔ مسلمان قرآن کو اللہ کے احکام اور رسول کو اللہ کا پیغامبر سمجھتے ہیں۔ سیکولرازم کے نام پر ان عقائد کو ہرگز چیلنج نہیں کرنا چاہئے۔ سیکولرازم کو سیاسیات کا حصہ سمجھنا چاہئے نہ کہ فلسفے کا۔ سیاسی معنوی میں سیکولرازم تمام مذہبی برادریوں میں معاشرتی اور سیاسی تعلقات پیدا کرتا ہے۔ انیسویں صدی کی عقلیت پسندی اور جدیدیت کو بھی آج چیلنج درپیش ہے۔ ہمارے عہد کو بعد جدیدیت کہا جاتا ہے جس میں مذہبی کثرت کو رد کرنے کے بجائے قبول کیا جاتا ہے مابعد جدیدیت عہد تسلیم کرتا ہے کہ عقل کی پرواز بھی محدود ہے اور وہ مذہب کے خلقیہ رنگ کو بھی قبول کرتا ہے۔ آج ہم جس جہاں میں رہ رہے ہیں وہ اس زمانے سے بہت دور ہے جب چرچ اور عام آدمی ایک دوسرے سے دست وگریباں تھے۔ چرچ نے بھی مان لیا ہے کہ معاشرے کو سیکولر ہونا چاہئے اب اس کا دور اصلاحات سے پہلے کے زمانے کا دور نہیں رہا۔ چرچ نے نئی سائنسی سچائیاں دریافت کرنے والوں کو جو سزائیں دیں ان کے بارے میں معذرت کر لی ہے اس نے جمہوریت اور انسانی حقوق کے تصورات کو بھی قبول کر لیا چنانچہ اب چرچ اور سیکولرازم میں کوئی سنگین تضاد باقی نہیں رہا۔ اسلام میں منظم چرچ کا کوئی تصور نہیں رہا کوئی بھی واحد عالم حرف آخر نہیں سمجھا جاتا جبکہ دوسری طرف اس میں علماء کی طرف سے اجتہاد کی گنجائش ہے جو بہت حد تک جمہوری نوعیت کا ہے۔ سنیوں کے اسلام میں اجماع یا متفق علیہ کو اسلامی قانون

سازی کا ایک وسیلہ مانا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اسلام میں اجتہاد کا تصور بھی ہے جو مذہب میں متحرک اور تحریک کی روح پھونکتا ہے۔ یہ الگ بات کہ کچھ عرصہ سے علماء نے تبدیلی لانے کی خاطر اس (اجماع) کے استعمال سے گریز کیا تاہم مسلمان معاشروں میں دباؤ بڑھ رہا ہے کہ اجتہاد کا وسیلہ بھی استعمال میں لایا جائے تمام اسلامی معاشرے تبدیلی اور جدیدیت دور میں مبتلا ہیں اسلامی قوانین بھی کوئی روایات کا جامع مجموعہ نہیں۔ اب ان میں بھی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں۔

چونکہ اسلام میں کوئی منظّم حاکمیت (چرچ کی طرح) نہیں ہے اس لئے علماء جدیدیت اور تبدیلیوں کے بارے میں منقسم ہیں۔ ایران میں بھی اصلاح پسندوں اور قدامت پسندوں میں زور آزمائی ہورہی ہے سعودی عرب میں اگرچہ بادشاہت محتاط ہے اور پرانے کٹر علماء کو ہی ساتھ لے کر چل رہی ہے مگر وہاں بھی ایسی تبدیلیاں آرہی ہیں جو دیکھی جاسکتی ہیں سعودی معاشرے میں تبدیلیوں اور جدیدیت کے معاشرتی ابھار پیدا ہورہے ہیں افغانستان میں طالبان کی حکومت زیادہ آمرانہ اور جابرانہ ہے اور اجتماعی اتفاق پر قائم نہیں اس لئے طالبان کا صرف سیاسی دبدبہ تو ہے معاشرتی اہمیت کوئی نہیں۔

اسلام ضمیر کی آزادی اور جمہوری حقوق کو تسلیم کرتا ہے اس کے بارے میں دو آرا نہیں ہیں۔ اسلام تو سرکاری یا رسمی طور پر کثرت مذاہب کو تسلیم کرتا ہے کیونکہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ دوسرے مذاہب کو مساوی تعظیم و تکریم دو اور جب کہ پہلے ذکر آچکا ہے پیغمبر اسلام نے میثاق مدینہ کے ذریعے مدینے میں موجود تمام مذہبی گروہوں کو برابر کی مذہبی اور معاشرتی اہمیت دی ہندوستان میں جمعیت العلماء نے دوقومی نظریئے کو مسترد کر دیا اور اسی میثاق کی بنیاد پر متحدہ نیشنلزم کی حمایت کی تھی آج کے ہندوستان میں کثرت مذاہب اور متحدہ نیشنلزم تو سیکولرازم کی روح ہیں اور اسلام کے ہرگز خلاف یا متضاد نہیں ہندوستان کے تمام علماء نے سیکولرازم کو قبول کررکھا ہے حتیٰ کہ جماعت اسلامی ہند نے نہ صرف ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرازم کو تسلیم کررکھا ہے بلکہ ایک سیکولر جمہوری محاذ بھی قائم کررکھا ہے۔ سیکولر جمہوریت کی دوسری صفات یہ ہیں کہ یہ انسانی وقار اور انسانی حقوق کا احترام کرتی ہے قرآن کریم میں واضح طور پر ان دونوں صفات کو اعلیٰ درجہ دیا گیا ہے یہ درست ہے کہ عالم اسلام کے بعض حکمران انسانی حقوق کے مغرب آفریدہ تصور کو رد کردیتے ہیں اور اپنے معاشرے کیلئے مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر وہ اسلامی اصولوں کی سربلندی کے

بجائے اپنے ہمہ گیر اقتدار کو کسی بھی خطرے سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسئلہ مذہبی سے زیادہ ثقافتی اور سیاسی ہے۔ عالم اسلام کے مختلف ممالک میں مختلف قسم کے سیاسی نظام مثلاً بادشاہت سے لے کر فوجی آمریت تک اور محدود جمہوریت سے لے کر پوری جمہوریت تک ہے مگر اس کیلئے اسلام کو موردالزام قرار دینا سادہ لوحی ہوگی۔ اصلاً ان ملکوں کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالنا ہوگی۔ نہ اس بات کی ریسرچ کہ اسلامی قوانین نے کیا نتائج مرتب کئے۔ اسلام میں حتمیت (حرف آخر) نام کی کوئی شے نہیں ہے غالباً دوسرے مذاہب میں یہ صفت نہیں ہے قرآن کا زور تو مشاورت (شوریٰ) پر ہے اور خود پیغمبر اسلام نے بھی دنیاوی معاملات میں اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔

اگر سیکولرازم مذہبی عقائد کو مسترد نہیں کرتا تو پھر اسلام سیکولرازم کا مخالف نہیں ہے آج ساری دنیا میں اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ کس طرح مختلف مذاہب ہم وجودیت اور ہم آہنگی کے ساتھ رہ سکیں اور اسلام نے تو شروع سے یہی جذبہ پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ دین اور سیاست الگ نہیں ہو سکتے یہ نظریہ قرآن کا نظریہ نہیں یہ بعد میں تاریخی حالات کی پیداوار ہے۔ یہ اللہ کا نہیں انسانوں کا بنایا ہے آج کے سیکولرازم کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ ریاست اور مذہب کو الگ الگ کر دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ نہ ریاست مذہبی امور میں دخل دے نہ مذہبی عالم ریاستی امور میں پھڈا ڈالیں۔ ہندوستانی علماء نے جدوجہد آزادی کے دوران اس بات کو دل و جان قبول کئے رکھا اور اسی بنا پر وہ کانگرس کے ساتھ تھے۔ مسلمان ممالک میں ریاست کی خودمختاری کا ایک مسئلہ ہے مگر ان کی وجوہ مذہبی تعلیمات میں تلاش کرنے کے بجائے ان ممالک کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں دیکھی جائیں۔ یہ ممالک اپنے جاگیردارانہ ماضی سے شاید ہی باہر نکلے ہیں ان ممالک میں لوگوں نے جمہوری حقوق کے لئے کوئی جدوجہد بھی نہیں کی نہ اس کی کوئی تاریخ ہے۔ ان ممالک میں بہت ہی کم تعداد میں مذہبی اقلیتیں ہیں جنہوں نے تاریخی طور پر اسلامی، بالادستی کو قبول کر رکھا ہے۔ اس صورتحال کے تبدیل ہونے میں خاصا وقت لگے گا کہ ان کا حال بھی جاگیردارانہ ماضی کے گھنے سائے میں ہے تاہم اندر سے دباؤ بڑھ رہا ہے اور ان سب ممالک میں انسانی حقوق کی تحریکیں ابھر رہی ہیں گلوبلائزیشن یا عالمگیریت دوسری کئی وجوہ کی بنا پر شاید مطلوب نہ ہو مگر ایسے حالات پیدا کر رہی ہے جس میں بہت سے ثقافتی اور سیاسی نظاموں میں باہمی ربطہ وضبط اور عمل ردعمل ہو رہا ہے۔ اطلاعات کا

MashalBooks.org

انقلاب ایک ایسی لہر ہے جسے روکا ہی نہیں جا سکتا اور یہ انقلاب زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہو رہا ہے اور مسلمان ملک بھی اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے اور انہیں نئے خیالات کیلئے اپنے دروازے کھولنے پڑیں گے۔

15۔ اکتوبر 2000ء

قومی پرستی، فرقہ پرستی اور بیسوی صدی

بیسوی صدی قوم پرستی کی صدی تھی اور اکیسوی صدی گلوبائزیشن کی صدی ہوگی حالانکہ قوم پرستی کا بھی خاتمہ نہیں ہوگا۔ جغرافیائی طور پر قومی حکومتیں برقرار رہیں گی تاہم قوم پرستی کا تصور کمزور پڑتا جائے گا۔ یورپی ممالک ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں انہوں نے یورپین یونین بنالی ہے مغرب میں قومی احساسات تیزی سے کم ہو رہے ہیں لیکن کرہ ارض کے جنوب میں ایسا نہیں ہو رہا ہے جہاں کہ تیسری دنیا کے زیادہ تر ملک واقع ہیں۔ جنوبی کرہ میں نیشنلزم اب بھی بڑی طاقت ہے مشرق میں نیشنلزم کی پیدائش مغرب کے نیشنلزم سے قطعی مختلف تھی مغرب میں نیشنلزم چرچ اور بورژوازی کے درمیان کشمکش کے باعث پیدا ہوا بورژوازی کا نظریہ سیکولرازم تھا چنانچہ نیشنلزم کے جذبات کے ساتھ ساتھ سیکولرازم مضبوط ہوتا گیا نوآبادتی دنیا میں معاملہ اس کے برعکس تھا یہاں سامراجی طاقتوں کے خلاف جدوجہد میں سے نیشنلزم پیدا ہوا اور جدوجہد کے لئے بڑا نصب العین سیکولرازم نہ تھا۔ کئی ملکوں میں تو آزادی کی جدوجہد کی قیادت کرنے میں بورژوازی موجود ہی نہ تھی اس لئے آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والوں میں مذہبی جاگیردارانہ اور کمزور سی بورژوا قیادت شامل تھی۔ بعض جگہوں پر تو مذہبی طاقتیں زیادہ آگے آگئے تھیں۔ یہ ملک ایسے ترقی یافتہ نہیں تھے کہ یہاں پر مضبوط بوروژای پیدا ہوتی یہ طبقہ تو ابھی منظر پر ابھر رہا تھا۔

اسی طرح ہندوستان میں بھی نوآبادیاتی نظام کے باعث مذہب کا احیا شروع ہوا اور مذہبی شناختیں نمایاں ہونے لگیں۔ ہندوستان کثیر مذہبی ملک تھا جس میں کئی مذاہب، ثقافتیں اور زبانیں تھیں اور جس میں دوسرے مذاہب کے علاوہ ہندومت اور اسلام دوسرے مذہب تھے۔ پھر سامراجی طاقت نے ترغیب وتحریض کے ذریعے ان مذاہب میں سیاسی مقابلہ بازی شروع کرادی تا کہ سامراج دشمنی میں ان کو الگ الگ رکھا جاسکے۔ اقتدار میں شرکت اور حصہ

MashalBooks.org

کے باعث باہمی مخاصمت تیز ہوئی پھر اسلام اور ہندومت کی قیادتوں نے اپنی صفوں کو عسکری خطوط پر مضبوط کرنے کیلئے علی الترتیب تبلیغی اور شدھی کی تحریکیں شروع کر دیں۔

کانگرس کی قیادت قوم پرستانہ جدوجہد میں سیکولرازم پر ڈٹ گئی۔ یورپی ممالک کے زیرنگیں ان نوآبادیاتی ممالک اور یورپی ممالک کی قوم پرستانہ جدوجہد میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا یورپ میں سیکولرازم نہ صرف راہنما نظریہ تھا بلکہ یہ مذہب سے بھی دست وگریباں تھا اس میں مذہب کی کوئی گنجائش نہ تھی جبکہ نوآبادیاتی ممالک میں ہرچند سیکولرازم ہی راہنما نظریہ تھا مگر انہیں مذہب کے لئے گنجائش نکالنا پڑی کیونکہ مذہب کی مخالفت تو دور کی بات ہے اسے نظرانداز تک نہیں کیا جاسکتا تھا یہی سب سے بڑا فرق تھا چنانچہ اکثر اوقات مذہبی نظریات کے ساتھ بڑے بڑے سمجھوتے کرنے پڑے۔

تحریک آزادی کے دوران ہندومت اور اسلام کا اکثر ٹکراؤ ہوا آخرکار ہماری قوم تقسیم ہوگئی اور آزادی آئی اور تقسیم بھی ہوگئی۔ برطانوی حکمرانوں نے وہاں پر بھی ہندو مسلم کشیدگی پیدا کی جہاں یہ پہلے تھی ہی نہیں اور اس پر ایسی پالیسیاں اختیار کیں جس سے یہ کشیدگی مزید تیز ہوئی انہوں نے 1909ء میں جداگانہ انتخابات متعارف کرائے حالانکہ ان کیلئے کوئی خاص تحریک بھی نہیں تھی اور یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جداگانہ انتخاب تقسیم کی طرف پہلا قدم تھے ستم ظریفی یہ ہے کہ اب وشوا ہندو پریشد ہندوستان میں پھر جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کر رہی ہے۔ سنگھل نے حال ہی میں احمد آباد میں ایک بیان میں مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کیلئے جداگانہ انتخابات کرائے جائیں اس موضوع پر مزید باتیں بعد میں۔

قومی جدوجہد میں مہاتما گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد جیسے رہنماؤں کی انگلیاں قوم کی نبض پر تھیں اس لئے دوسرے مذاہب کے احترام کے ساتھ سختی سے سیکولرازم کو قومی نظریہ مانتے رہے تاہم دوسری طرف فرقہ وارانہ قوتوں نے نہ صرف سیکولرازم کو رہنما قومی نظریہ نہیں سمجھا انہوں نے اپنے نیشنلزم کی بنیاد مذہب پر رکھ دی۔

اگرچہ ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ میں ناقابل مصالحت اختلافات تھے مگر ان دونوں کا اس بات پر اتفاق تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ جناح صاحب کی طرح گرو گول والکر کا بھی یہی کہنا تھا کہ نیشنلزم کی بنیاد جغرافیہ نہیں ثقافتی اور مذہبی ماحول ہے۔ آر ایس ایس تو اب تک ثقافتی نیشنلزم کی بات کرتا ہے۔

ہندوستان کی قومی تحریک کی دونامور شخصیات مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد تھے۔ دونوں کا مذہب پر بھرپور ایمان تھا اوراس کے ساتھ ساتھ سیکولرازم کے بڑے علمبردار بھی تھے۔ ان کیلئے یہ صرف پالیسی یا تدبیر سازی کا معاملہ نہ تھا بلکہ اس پر ان کا پختہ ایمان تھا اور اگرچہ دو مذہبوں کے مضبوط مخالف رجحان بھی کام کررہے تھے۔ مگر مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے باعث دونوں برادریاں ایک دوسرے کے نزدیک آگئیں یہی دانش مندانہ وطیرہ تھا۔ اس وقت بھی ہندوستان میں مضبوط فرقہ وارانہ قوتیں موجود تھیں اسی طرح آزادی کے پچاس سال بعد وہ آج بھی موجود ہیں اور ہماری سیاست کی شکل زیادہ سے زیادہ فرقہ وارانہ ہوتی جارہی ہے۔

گزشتہ دنوں شوسینا کے بال ٹھاکرے اور وشواہندو پریشد کے سنگھل نے دو بیانات دیئے جنہیں آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان پر توجہ نہیں دینی چاہئے۔ نیشنلسٹ کانگرس پارٹی نے ٹھاکرے کے بیان کو بے معنی قرار دے کر نظرانداز کردیا۔ میرے خیال میں صحیح رویہ نہیں تھا اس خطرناک سوچ کی راہ روکنے کی بڑی ضرورت ہے ٹھاکرے نے کہا تھا کہ جب تک مسلمانوں کو ووٹ کے حق سے محروم نہیں کیا جاتا اس وقت تک مسلمانوں کی خوشامد کی پالیسی جاری رہے گی۔ ٹھاکرے کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے بہت ووٹ ہیں اس لئے سیاسی پارٹیاں اس وقت تک انہیں خوش کرتی رہیں گی جب تک انہیں ووٹ کے حق سے محروم نہیں کیا جاتا۔ جب ایک دفعہ انہیں اس حق سے محروم کردیا جائے گا پھر ان کو خوش کرنا تو درکنار ان کے پاس بھی کوئی بھی نہیں جائے گا۔

یہ دراصل مسلمانوں سے مخاصمت کے سوا اور کچھ نہیں ورنہ کون سا قبیلہ اور کون سی ذات ہے جس کا ووٹ بینک نہیں ہے اگر یہ منطق قبول کرلی جائے تو کیا دلت لوگوں کو بھی ووٹ کے حق سے محروم کیا جانا چاہئے؟ پسماندہ ذاتوں اور طبقوں کو بھی یا یہ کہ وہ چونکہ ہندو ہیں اس لئے ان کے ووٹ بینک کی وجہ سے ان کی خوشامد کرنا پڑتی ہے؟ کیا ٹھاکرے صاحب جو کچھ کہتے ہیں اس پر اس نقطہ نظر سے غور بھی کرتے ہیں کہ اس طرح ہندوستان کی سیاست کے کیسے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ یا صرف اس لئے کہ انہیں مسلمانوں سے شدید قسم کا بیر ہے، اور اگر ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت جس کی تعداد 130 ملین ہے یعنی بہت سے مسلمان ملکوں کی آبادی سے بھی زیادہ ہے کہ ووٹ کے حق سے محروم کردیا گیا تو نتائج کیا ہوں گے۔

کیا ہندوستان میں جمہوریت چلائی جاسکتی ہے۔ جلتی پر تیل کا کام صوبے کے وزیر صنعت اور شوسینا کے لیڈر منوہر جوشی نے یہ کہہ کر کیا کہ مسلمانوں میں جو ہندوؤں کے خلاف ہیں اور جو غدار ہیں ان کو ووٹ کے حق سے محروم کیا جائے۔ بال ٹھاکرے اکثر کہتے ہیں میں ان مسلمانوں کیخلاف نہیں جو قوم کے خلاف نہیں کسی کو بال ٹھاکرے اور منوہر لال جوشی سے پوچھنا چاہئے کہ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ غدار کون ہے اور قوم دشمن کون ہے؟ اور کیسے؟ کیا الزام لگانے والا ہی جج بھی ہوگا؟ اگر بال ٹھاکرے اور پریشد کے رہنماؤں کو اختیار مل جائے تو پورے ہندوستان میں بجز اونچی ذات کے ہندوؤں کے باقی سب کو ووٹ کے حق سے محروم کر دیں۔ یہ عمل شروع تو مذہبی اقلیتوں سے ہوگا مگر آخر ہندوستانی معاشرے کے کمزور طبقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ بی جے پی اور شیوسینا قومی دھارا قومی دھارا کہتے نہیں تھکتے اس قومی دھارے کا انجام بھی یہی ہوگا ان کے کہنے کے مطابق قومی دھارا اونچی ذات کے ہندوؤں سے بنتا ہے۔ اس ملک کی اصل ثقافت تو ویدوں کی ہے اور باقی سب کلچر ویدوں کے کلچر کیلئے اجنبی ہیں یا اس کے ماتحت وید کلچر کے کوئی بھی مخالف نہیں ہے یہ ہندوستانی کلچر کی بڑی ثقافتوں میں سے ایک ہے مگر نہ تو واحد ہے نہ ہی سب سے اہم۔ کثرت الوجودی جمہوریت میں کوئی ثقافت اجارہ دار نہیں ہوسکتی۔

دوسری طرف وشواہد ہندو پریشد کے سنگھل کی تجویز ہے کہ اگر مسلمانوں کو حق رائے دہی سے محروم نہیں کیا جاسکتا تو پھر جداگانہ طریقہ انتخاب رائج کیا جائے اور وہ اپنے لیڈر خود منتخب کریں۔ پاکستان میں پہلے ہی ہندوؤں اور اقلیتوں کیلئے جداگانہ طریق انتخاب رائج ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کچھ پاکستان میں ہوا وہ غلط ہوا تمام اقلیتیں اس پر احتجاج کر رہی ہیں اور اکثریت سے تعلق رکھنے والی اکثریت بھی یہ نہیں چاہتی۔ یہ طریقہ فوجی ڈکٹیٹر ضیاء الحق نے رائج کیا تھا جسے پاکستانی کے لوگ ناپسند کرتے تھے اور اگر پاکستان نے ایسا کیا ہے تو ان کا تو نظریہ ہی مذہبی نیشنلزم ہے ایک سیکولر جمہوری ہندوستان اس کی تقلید کیوں کرے اس قسم کا تصور کو زوردار طریقے سے رد کر دینا چاہئے اور یہ پاکستان ہمارے اعصاب پر سوار کیوں ہے؟ جو پاکستانی کرتا ہے اسے کرنے دیں ہندوستانیوں کو تو سمجھداری سے اپنا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔
(جنرل مشرف کی حکومت نے جداگانہ انتخاب کا طریقہ ختم کر دیا ہے۔ (مترجم)

MashalBooks.org

اوراس پر طرہ یہ کہ اس ملک کے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی جیسے راہنما کہتے ہیں کہ رام مندر کی تعمیر ہندوستانی قوم کے جذبات کے عین مطابق ہے۔مگر ان تینوں شوسینا کے بال ٹھاکرے، وشو ہندو پریشد کے سنگھل اور وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے بیانات ایک ساتھ رکھیں تو ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے ہندوتوا کے یہ رہنما ہندوستان کو کہاں لے جارہے ہیں؟ کیا ان کی سربراہی میں ہندوستان ایک سیکولر جمہوری ملک رہ سکتا ہے؟ کیا یہ وہ وقت نہیں کہ جب تمام سیکولر اور جمہوری طاقتیں مل کر ان لیڈروں کا مقابلہ کریں جو ہندوستان کے متحدہ سیکولر کردار کو تباہ کرنا چاہتے ہیں؟ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ سیکولرازم کی حامی بہت سی پارٹیاں عارضی مفادات کیلئے اس ملک میں بی جے پی کے اقتدار کو پکا کررہی ہیں۔

انہیں احساس ہونا چاہئے کہ ایک سالہ دوراقتدار میں فرقہ پرست اس قدر نڈر ہو گئے ہیں کہ ایسے بیانات جاری کررہے ہیں جو ملک کی بنیاد پر ضرب لگاتے ہیں انہوں نے ہماری تقسیم کو گیروے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کو فرقہ وارانہ بنا دیا ہے۔ سارے ہندوستان میں اپنا جال بچھا دیا ہے اور اب علی الاعلان ہندوراشٹرا قائم کرنے کی باتیں کررہے ہیں جس طرح جرمنی میں سیکولر طاقتوں کو بہت بعد میں ہوش آیا تھا اسی طرح ہندوستان میں بھی سیکولر طاقتوں کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوگا کہ انہوں نے موقع پر بزدلی دکھائی تھی۔ہاں یہ صحیح ہے کہ سیاست میں نظریئے اور عہد وفا سے زیادہ مفادات زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔

(31۔جنوری2001ء)

واجپائی کا بیان اور قرون وسطیٰ کی تاریخ

مؤرخ بتاتے ہیں کہ ایک تاریخی واقعہ کے سوطرح کے بیان ہوتے ہیں اور مورخ اپنے نظریئے کے مطابق ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیتا ہے۔تاہم یقین کسی کو بھی نہیں ہوتا کہ صحیح بیان کونسا ہے۔انسانی کرداروں کو ملنے والی تحریک بہت پیچیدہ ہوتی ہے اور حکمرانوں کی تحریک تو اور بھی پیچ دار ہوتی ہے اس کی بہترین مثال رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے بارے میں اٹل بہاری واجپائی کا جاری کردہ بیان ہے۔لوک سبھا میں حزب مخالف نے ان دو وزیروں کے بارے میں سوال اٹھایا جن پر بابری مسجد کے انہدام کی فرد جرم لگی تھی ان کے استعفےٰ کا مطالبہ کیا اور کئی دنوں تک پارلیمانی کارروائی روکے رکھی تو واجپائی نے بیان دیا کہ رام مندر کی تعمیر قومی جذبات کو ملحوظ رکھ کر کی جائے گی۔اس کے بعد ان کے اپنے این ڈی اے کے بعض

ساتھیوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا تو پھر کہا کہ رام مندر کی تعمیر یا تو گفت وشنید کے بعد ہوگی یا عدالت کا فیصلہ آنے تک انتظار کیا جائے۔اس سے ان کے ساتھی خاموش تو ہو گئے مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی کیونکہ انہیں اپنے اپنے حلقوں کے مسلمانوں کو بھی جواب دینا تھا جو واجپائی کے بیان کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے رہے۔حزب مخالف واجپائی کے اس قسم کے بیانات سے بالکل ہی مطمئن نہ ہوئی اور واجپائی کے پہلے بیان کے قومی جذبات والے حصے پر آواز بلند کرتی رہی۔

جب وزیر اعظم آرام کی خاطر کیرالا میں کمھاراکوم گئے تو انہوں نے اپنے شاعرانہ قسم کے افکار، اخبار کو جاری کر دیئے اور اس میں انہوں نے رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے بارے میں ایک اور موٴقف اختیار کیا ان کے بیان میں رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے بارے میں کئی پیرے بڑے دلچسپ اور جمہوری صفات کے ہیں انہوں نے کہا کہ ان کی حکومت آئینی طور پر عدالت کے فیصلے پر عملدرآمد کی پابندی کرے گی خواہ یہ فیصلہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔انہوں نے زور دے کر کہا کہ اگر کسی تنظیم نے اس وقت موجودہ صورت (سٹیٹس کو) کو توڑنے کی کوشش کی تو قانون اپنا راستہ خود بنائے گا۔

مزید یہ کہ انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ عدالت کے فیصلہ کا انتظار کئے بغیر متنازعہ مسجد کو گرانا قانون کی صریحاً خلاف ورزی تھی انہوں نے یہاں تک کہا کہ ماضی کی غلطی کو جدید عہد میں کی گئی اسی قسم کی غلطی سے صحیح نہیں کیا جا سکتا۔اب اہم سوال یہ ہے کہ کل کا مورخ ان کے کون سے بیان کو توجہ کے لائق سمجھے گا ان کے پہلے بیان کو جس میں انہوں نے کہا تھا کہ رام مندر کی تعمیر قومی جذبات کے مطابق ہوگی یا اس بیان کو جو انہوں نے شاعرانہ خیال میں ظاہر کیا۔قدرتی بات ہے کہ مختلف مورخ ان کے بیانات کو ایک جنونی ہندو یا آزاد خیال جمہوریت پسند کی حیثیت سے دیکھنے کے لائق توجہ سمجھیں گے۔تاریخ کے ایک واقعی کے بارے میں ان کو مورخ اس طرح دیکھے گا کہ بیان دینے والا کون ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے تاریخ کے کردار خاص حالات اور خاص خبر یا مجبوری کے تحت ایک بات کرتے ہیں یا ایک عمل کرتے ہیں۔کوئی کیا کہتا ہے یا کرتا ہے یہ بھی اہم ہے اور یہ بھی کہ یہ یوں کیوں کہتا ہے یا کرتا ہے؟

واجپائی نے متذکرہ بالا دو متضاد بیانات دو خاص مجبوریوں کے تحت دیئے۔جب سنگھ پریوار ان پر دباؤ ڈالتا ہے اور یوپی کے الیکشن ہونے والے ہوں تو اس وقت وہ ایک بیان دیتے

ہیں مگر جب دیکھتے ہیں کہ قومی جذبات والے بیان کے حوالے سے ان کے بطور متوازن قومی ہیولے یعنی شخصیت کو ضعف پہنچا ہے اور اتحادیوں میں بھی وہ تنہا رہ گئے ہیں تو وہ اپنے پہلے والے بیان پر نظر ثانی کرتے ہیں اور پھر نقاب اتار دیتے ہیں۔ گویا ایک سیاسی کردار کچھ کہتے یا کرتے وقت اپنی سیاسی مجبوریوں سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بات سب تاریخی ایکٹروں، حکمرانوں اور سیاستدانوں پر صادق آتی ہے۔

انسانی رویہ صرف اس کے آدرشوں اور مذہبی عقائد سے ہی تشکیل نہیں پاتا۔ اصل رویہ ساز عنصر تو اس کا اپنا مفاد ہے اور حکمران یا سیاستدان کے بارے میں تو یہ بات اس وقت اور بھی سچ ہے جب اسے متضاد مفادات میں توازن پیدا کرنا ہوتا ہے اس طرح حکمرانوں کے تاریخی افعال کو آج کے سیاق وسباق میں دو برادریوں کے درمیان منافرت پھیلانے کیلئے استعمال نہیں کیا جانا چاہئے۔

اگر کچھ مندر مسلمان حکمرانوں نے گرادیئے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کیا جانا چاہئے کہ انہوں نے یہ کارروائی ہندو مذہب اور بت پرستی سے نفرت کے باعث کی۔ یہ کام مؤرخوں کے لئے ہے یہ بتائیں کہ کن حالات میں یہ کارروائی کی گئی تھی۔ اس قسم کے انہدام کے بارے میں مختلف بیانات ہیں۔ ایک معروضی نقطۂ نظر رکھنے والا مورخ تمام بیانات کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کرے گا کہ حقیقت کے سب سے قریب کون سا بیان ہے مثلاً ایک معروف مورخ رومیلا تھاپر نے سومناتھ کے مندر کے بارے میں مختلف بیانات کا ذکر کیا انہوں نے ایک لیکچر میں خبردار کیا کہ گجرات میں سومناتھ کے مندر کے بارے میں تاریخ لکھنے والوں کو واقعات کی صرف سفید وسیاہ نفی اور اثبات میں تعبیر نہیں کرنی چاہئے۔

ڈاکٹر تھاپر نے کہا کہ سومنات کے مندر پر 1026 میں محمود غزنوی نے حملہ کیا تھا۔ اس مندر کی تاریخ لکھنے کیلئے پانچ مختلف اور متضاد ذرائع سے حاصل واقعات کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ ان میں ترکی اور فارسی ادب، جین مت کے بیانات، سنسکرت ریکارڈز، برطانوی عہد کی تحریریں اور مندر کی تاریخ کے بارے میں قومی مواد شامل ہے۔ ہر ذریعہ نے اپنے مفاد کے مطابق قصہ بیان کیا ہے۔ اس طرح ان میں سے کسی ایک پر مکمل انحصار کر کے نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا۔ انہوں نے برطانوی مورخوں کی تحریروں کے اس نظریئے کو بھی چیلنج کیا ہے کہ مندر پر غزنوی کے حملہ کے باعث دونوں مذاہب کے ماننے والوں میں گہرا اختلاف پیدا ہوا۔ اگر ان حملوں سے ہندو

برادری بہت زیادہ پریشان ہوتی تو واقعہ کے دوصدی بعد مندر کی کمیٹی ایک مسلمان تاجر کو مسجد کی تعمیر کیلئے مندر کی زمین کا ٹکرا وقف نہ کرتی اور نہ صرف زمین کا ٹکڑا دیا گیا بلکہ مسجد کی تعمیر کیلئے دوسری ہر قسم کی امداد بھی فراہم کی گئی اوران عطیات کا تحریری ریکارڈ بھی موجود ہے۔

اور تو اور ریکارڈ بتاتا ہے کہ اورنگزیب نے بعض ہندو مندر گرائے ہیں تو کئی دوسرے مندروں کو جاگیریں بھی دی ہیں بنارس میں ایک شومندر گرایا گیا (گیانو پی مسجد بنائی گئی) تو اسی شہر میں ایک دوسرے شیومندر جنگم بدی شومندر کو جاگیر بھی دی گئی۔انہوں نے فرمان جاری کئے جن کے تحت گواہاٹی تک مندروں کو ایسی ہی سرکاری امداد دی گئی ۔ ہمارے آج کے حکمرانوں کی طرح ہمارے قرون وسطیٰ کے حکمرانوں نے بھی متضاد صورتحال اور سیاسی مجبوریوں کے تحت کئی کام کئے۔اس قسم کے افعال کوان حکمرانوں کی ہندوؤں اور بت پرستی سے نفرت سے منسوب نہیں کیا جانا چاہئے۔ تاریخ کا اس طرح کا سیاہ وسفید قسم کا مطالعہ نوآبادیاتی دور سے دونوں برادریوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑا نقصان پہنچانے کا باعث بنا ہے۔

حیدرآباد کے مورخ ضیاء الدین شکیب نے ورندراون میں کرشنا داموراور گووندا دیوااور دوسرے مندروں میں تحقیق کے دوران ان کے تہہ خانوں میں قرآن کے صدیوں پرانے نسخے دیکھےاور مغلوں کی انتظامی (سرکاری) دستاویزات بھی جو بابر کےاس زمانے کے طرز کتابت میں لکھے گئے اور بعد میں یہ اسلوب کتابت ترک کر دیا گیا۔ڈاکٹر ضیاء الدین نے کہا کہ اس انداز کتابت میں شاید یہی چندایک نسخے رہ گئے ہیں۔ان مندروں سے جوسرکاری دستاویزات برآمد ہوئی ہیں وہ درنداون میں مندروں کومغلوں کی طرف سے دی جانے والی امداداورزمین کے بارے میں ہیں۔ان تہہ خانوں میں ہندوؤں کے مقدس صحیفوں، رامائن اور مہابھارت کے بعض نادر مخطوطے بھی دستیاب ہیں۔صدیوں کے متولیوں یا مہنتوں نے مسلمانوں کے صحیفوں کو بڑے احترام سے رکھا اور وہ اچھی حالت میں ہیں۔ یہ شکیب کے تاثرات ہیں۔ شکیب کا کہنا ہے کہ مندروں کے پروہتوں کے کہنے کے مطابق تقسیم کے موقع پر بہت سے مسلمانوں نے بہت سی دستاویز اور یہ صحیفے ان کے پاس محفوظ سمجھ کر رکھ دیئے تھے۔ یہ اسلامی میراث ان مسلمانوں نے پجاریوں کو دی تھیں جو ہجرت کرر ہے تھے مگر ہم انہی سیاسی ضرورتوں کی خاطر آج تاریخ کو غلط استعمال کرر ہے ہیں۔ ہندوستان کے بعض سیاستدانوں کے ہاتھوں

تاریخ ایک طاقتور سیاسی ہتھیار بن گئی ہے اور انسانی جذبات کو بڑا فروختہ کرنے کیلئے تاریخ مذہب کی طرح طاقتور حربہ بن گئی ہے۔ رام جنم بھومی اور بابری مسجد گزشتہ ایک عشرے سے اس ملک میں بہت بڑا نزاعی مسئلہ بن گئی ہے اور ابھی تک اس کا کوئی حل نہیں نکلا۔ اس کی وجہ سے دونوں مذاہب والوں کے جذبات بھڑکائے گئے بی جے پی تاریخ کو سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کر کے ہی اقتدار میں آتی ہے چنانچہ اب یو پی میں ہونے والے الیکشنوں کے حوالے سے اس تنازع کا زوردار طریقے سے احیا کیا جارہا ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ پڑھا لکھا درمیانہ طبقہ ان جذبات میں بہہ جاتا ہے اور مخصوص وجوہ کی بنا پر سیاسی جماعتوں کو ان جذبات سے کھیلنے میں مدد دیتا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم اس انتہائی غلط طور پر استعمال ہونے والے مسئلے کو جذبات کی بجائے عقل وفراست کے ساتھ حل کریں۔ سنگھ پریوار خصوصاً وشوا ہندو پریشد اور آر ایس ایس کا مفاد اس میں ہے کہ اس تنازع کو نہ صرف سیاسی مقاصد کیلئے زندہ رکھا جائے بلکہ مذہبی احیا کیلئے طاقتور حربے کے طور پر بھی استعمال کیا جائے۔ مذہبی احیا کا فائدہ وشوا ہندو پریشد کے سادھوؤں اور سیاسی لیڈروں کو یوں ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے ایک طاقتور طبقے پر اپنی گرفت بڑی مضبوط رکھتے ہیں اور انہیں اس صورت میں بے انتہا مالی وسائل حاصل ہوتے ہیں۔ اس مذہبی جنون کے پس پردہ صرف جنون ہی نہیں بڑے زردار مفادات بھی ہیں۔

اس کا جتنا فائدہ وشوا ہندو پریشد کو ہوتا ہے اتنا ہی قوم کو نقصان ہوتا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہندوستانی عوام کا ہے کہ کیا انہیں قومی مفاد عزیز ہے یا چند مذہبی جنونیوں کے مفاد پیارے ہیں۔ عدلیہ کو بھی اس بارے میں جلد ہی فیصلہ دے کر اپنا کردار ادا کرنا چاہئے اس قدر عدالتی تاخیر کے باعث ملک کو کس قدر مصیبت میں رہنا پڑے گا سوال ایک فرد کا نہیں پوری قوم کا ہے جو اس کی قیمت ادا کر رہی ہے کہا جاتا ہے کہ شاید عدالتی فیصلے کے ذریعے بھی معاملہ نہیں نمٹ سکے گا کیونکہ اگر یہ وشو ہندو پریشد کیخلاف ہوا تو وہ اسے مسترد کر دے گا اس خدشہ کے پیش نظر ضروری ہے کہ کچھ انصاف پسند ہندو اور مسلمان آگے آئیں اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول کے تحت اس پیچیدہ مسئلہ کو حل کریں اس ضمن میں بہت سی تجاویز سامنے آچکی ہیں مگر ایک دیانتدارانہ مکالمہ کے ذریعے ہی اس کا قابل قبول حل نکالا جانا چاہئے تاکہ قوم کو عذاب سے بچایا جائے اور اصل ملکی مسائل پر توجہ دی جاسکے۔

MashalBooks.org

15۔فروری2001ء

کثیرالوجودیت اور فرقہ واریت

قوم سازی اور تعمیر نو دو مختلف عمل ہیں۔ دونوں بڑے مشکل اور گنجلک ہیں خصوصاً تعمیر قوم۔قوم سازی کا عمل عموماً خارجی عوامل کے خلاف جدوجہد کے زمانے کی شے ہے جبکہ تعمیر قوم اندرونی عوامل کیخلاف جدوجہد کا نام ہے۔ برطانیہ کے عہد اقتدار میں ہندوستان ایک قوم سے زیادہ ایک انتظامی اکائی تھا۔ برطانیہ نے ہندوستان کو ایک قوم کے بجائے ایک نوآبادی تصور کیا۔ یہی بڑا سبب تھا کہ مختلف النوع عناصر تلک گاندھی، نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل جیسی کرشمہ ساز قیادت میں ایک قوم بننے کے آرزومند ہوئے اور اس طرح برطانوی حاکمیت کو چیلنج کیا۔ ہم نے یہ مرحلہ کامیابی سے طے کیا۔لیکن قوم سازی کے مرحلہ میں کوئی چیلنج نہیں تھا پھر فرقہ وارانہ اختلافات ظاہر ہوئے اور اس جدوجہد میں دوقومی نظریہ بھی سامنے آیا اور پھر ہم فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم ہوگئے۔ ہم سب میں بہت سوں نے سوچا کہ اگر قوم سازی میں یہ قیمت بھی ادا کرنی پڑے تو ادا کی جائے اور ہم نے یہ قیمت ادا کی۔ اس وقت ہمارا بڑا مقصد برطانوی حاکمیت سے آزادی حاصل کرنا تھا وہ ہم نے حاصل کرلی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تقسیم سے بچا جاسکتا تھا بشرطیکہ ہم صبر اور تحمل سے کام لیتے مگر اب تو یہ نکتہ صرف بحث کیلئے رہ گیا ہے باقی سب کچھ تاریخ ہے۔

اگرچہ آزادی کے بعد پاکستان مذہبی ریاست بن گیا مگر ہم نے اپنا سیکولر نقطۂ نظر نہیں چھوڑا اور بڑی دانش اور عزم کے ساتھ سیکولر نظام سیاست کا انتخاب کیا۔ واضح رہے کہ تقسیم کی وجہ سے ہمارا تنوع کم نہیں ہوا۔ ہماری مسلمانوں کی بمشکل پچاس فیصد آبادی پاکستان گئی باقی ہندوستان میں رہی۔ انہیں ہندوستان کی سیکولر سیاست پر بڑا اعتماد تھا۔ آج بعض اندازوں کے مطابق ہندوستان میں پاکستان کے مقابلے میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اس طرح اگر کبھی جائز بھی تھا تو اب اس کا دوقومی نظریہ باطل ہوجاتا ہے۔ اس سے پہلے بنگلہ دیش کے وجود سے اس نظریہ پر زد پڑی۔

قیام پاکستان کے باوجود ہمارے تنوع بدستور رہے اور اس حیرت زدہ کرنے والے تنوع کا بہترین تخلیقی جواب سیکولر جمہوریت ہی تھی لیکن سیکولر جمہوریت تنوع کیلئے زیادہ تر ایک تصوراتی

لنگر رہی، فلسفہ عمل کم رہی۔ ہمارے بہت سے چیلنج یہیں سے پھوٹتے ہیں۔تعمیر قوم کے دوران مخالف مفادات ابھر کر آئے جو ہماری سیکولر جمہوریت کیلئے سنگین چیلنج تھے۔

پہلا بڑا چیلنج اپنے اکثریت ہونے کے گمان کا تھا۔ نہرو کو ہمیشہ یہ دھڑ کا لگا رہا۔ آزادی کے بعد نہرو ہی قومی تعمیر کے عمل کی قیادت کر رہے تھے۔ وہ اقتدار میں اقلیتوں سمیت سبھی کو ان کا جائز حصہ دینا چاہتے تھے۔ یہ دو قومی نظریئے کا بہترین جواب تھا کیونکہ اقتدار میں جائز حصہ نہ ملنے کے خوف سے ہی دو قومی نظریہ پیدا ہوتا تھا۔ نہرو اس صورتحال سے بخوبی واقف تھے اس لئے ان کے نزدیک سیکولر جمہوریت کا تصور یہ تھا کہ قومی تعمیر کے عمل میں اقلیتوں کے ساتھ برابر انصاف ہو۔

تاہم مسلمان فرقہ واریت کی طرح ہندو فرقہ واریت بھی سیکولر جمہوریت سے خوش نہ تھی اور اس نے اس میں رخنے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اسلامی پاکستان کی طرح وہ ہندو راشٹر بنانا چاہتے تھے جس میں اقلیتوں کی حیثیت ثانوی ہو آر ایس ایس نے کثرت الوجودیت کو مسترد کر دیا یکسانیت کو اختیار کر لیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بھی دو قومی نظریئے کے باعث پیدا ہوئی سو قومی تعمیر کے مرحلے میں ہمارے دو مختلف اور متضاد سیاسی عمل جاری ہیں جو متنوع یعنی الگ الگ عناصر کو جوڑ کر ترقیاتی امور اور سول سوسائٹی کی تعمیر کے اندرونی چیلنج کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔

یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ فرقہ واریت نہ صرف کثیر الوجودیت کی نفی ہے بلکہ جدیدیت سول سوسائٹی کا تصور اور سیاسی آزادیوں کے بھی خلاف ہے اگر کسی ایک کے نزدیک سیاسی عمل یا فکر کا بنیادی نکتہ اسلام ہے تو دوسرے کیلئے سیاسی نظام کی بنیاد دھرم ہے۔ ان میں جدید سیاسی عمل پر گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں۔ دھرم کی بالادستی ان کی سیاست کا جوہر ہے اور اگر سیاست کی اصل صرف مذہب یا دھرم ہے تو پھر مذہب کے منکرین کی تو گنجائش ہی کوئی نہیں۔

یوں قومی تعمیر کے عمل کے وقت یہ تمام اندرونی چیلنج سامنے آ گئے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ چیلنج سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں۔ رام جنم بھومی سیاست نہ تو کوئی استثنائی معاملہ ہے نہ یہ اتفاقاً پیدا ہوئی ہے یہ ہمارے آئین میں وضع کئے گئے سیکولر جمہوری نظام کے خلاف مربوط اور مستقبل تبلیغ کا نتیجہ ہے۔ اس سے جدید سیکولر سیاسی نظام کو جو خطرہ لاحق ہے سیکولر طاقتوں کو اس کا مقابلہ سنجیدگی سے کرنا چاہئے۔ ہندوستان کو اسی انتہائی سنگین چیلنج

MashalBooks.org

کا مقابلہ درپیش ہے یہ تو ہمارے سیاسی فلسفہ کی بنیاد کی ہی مکمل نفی ہے۔ ہمارا تنوع ہی ہماری سب سے زیادہ قیمتی میراث ہے۔ ہمارا یہ تنوع ہی ہماری جمہوریت کا دل ہے اس تنوع کا احترام نہ کریں تو آزادی بے معنی بن جاتی ہے بنیاد پرستی اور کٹڑ پن مغربی ایشیاء کے سارے ملکوں خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں زیادہ مضبوط ہوتا جارہا ہے کٹھ ملائیت بالادست ہورہی ہے میری رائے میں ہندوستان کو برطانیہ سے آزاد کرانے والے چیلنج کی طرح یہ بھی بہت سنگین چیلنج ہے جس طور انگریز کے خلاف ہمارے رہنماؤں نے پوری قوم کو جگا دیا تھا اسی صورت ایک بار قوم کو حرکت میں لانے کی ضرورت ہے۔

برطانوی راج کیخلاف عوام کو حرکت میں لانا نسبتاً آسان تھا۔ تاہم اندرونی دشمنوں کے مقابلے میں یہ بیداری بہت زیادہ مشکل ہے۔ برطانوی راج کیخلاف جذبات واضح تھے مگر بنیاد پرستی اور مذہبی جنونیت کے خلاف ویسے جذبات نہیں حالانکہ یہ دونوں ہماری سیکولر جمہوریت اور جمہوری آزادی کی سیاست کو اندر سے کھارہے ہیں۔ اس لئے میں تو اس چیلنج کو سامراجی حکومت کیخلاف جدوجہد والے چیلنج سے بڑا سمجھتا ہوں۔

ساری کی ساری پارٹیاں پوری طاقت اور ایمان کے ساتھ سیکولر جمہوریت کا دفاع کرنے کیلئے تیار نہیں صرف بائیں بازو کی جماعتوں کا معاملہ مختلف ہے مگر وہ پورے ہندوستان میں موجود ہی نہیں کہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے آگے آئیں۔ ہوا میں چاروں طرف تشدد ہی تشدد ہے۔ ہماری کثرت الوجودیت اور رنگارنگی خطرے میں ہے آر ایس ایس کے سربراہ نے تو ہندوؤں کو اسلحہ حاصل کرنے کی ہدایت کردی ہے اس طرح کوشش کی جارہی ہے کہ خود اکثریت کو عدم تحفظ کا احساس دلایا جائے۔

ہماری سیکولر طاقتوں کو ہماری کثرت الوجودیت اور تنوع کو مضبوط کرکے اس چیلنج کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یکتائیت ہمارے اتحاد کی دشمن ہے اور تو اور قرون وسطیٰ میں بھی ایس یکتائیت کا وجود نہ تھا جیسی یکتائیت اس زمانے میں پیدا کی جارہی ہے ہمارا کلچر کثرت الوجودی ہے اور ہم نے ہر شعبے میں ایک دوسرے کو بہت متاثر کیا ہے ہماری بہت سی ایسی آبادیاں ہیں جنہیں نہ مسلم کیا جاسکتا نہ ہندو مخلوط مذاہب مانتے ہیں انتھروپالوجیکل سروے آف انڈیا کی پیپل آف انڈیا (ہندوستان کے لوگ) کے نام سے شائع کردہ کتاب کے مطابق کوئی 87 برادریاں ایسی ہیں جو ہندومت اور سکھ مت کو مانتی ہیں 116 ایسی جو ہندومت اور عیسائیت سے وابستہ ہیں 35

ایسی ہیں جو ہندومت اور اسلام کی پیروکار ہیں 94 ایسی برادریاں ہیں جو عیسائیت اور قبائلی مذاہب میں ایمان رکھتی ہیں۔

ذات پات کا نقشہ اس سے کم دلچسپ نہیں مسلمانوں میں بارہ ایسی برادریاں ہیں جو خود کو برہمن کہتی ہیں 24 ایسی جو کشتری کہلاتی ہیں 6 ویش ہیں 11 شودر عیسائیوں میں بھی ذات پات کا ایسا ہی نقشہ ہے 8 برہمن ہیں اور 48 شودر۔

یہی برادریوں اور ذاتوں کی کثرت تعمیر قوم کے حوالے سے ہندوستان کو انتہائی دلچسپ مگر مشکل بنا دیتی ہیں۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں میں خالص پسند اپنی اپنی برادری کو پوتر کرتے رہتے ہیں۔ مگر وہ شاید ہی کبھی کامیاب ہوں۔ تاریخ کو مختلف برادریوں میں افتراق پیدا کرنے کیلئے دوبارہ لکھنے کی کوشش کی جارہی ہے تاریخ کو اس نہج پر دوبارہ لکھنے کا مقصد یہی ہے کہ ایک جھوٹے شعور کے ذریعے لوگوں میں تفریق پیدا کی جائے۔

آزادی سے پہلے اس نوعیت کی صف آرائی کا نتیجہ تقسیم کی شکل میں آیا اب تقسیم کا سوال تو نہیں مگر یہ صف آرائی کشیدگی پیدا کرتی ہے جو فرقہ وارانہ تشدد کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے تشدد کا ہر دور مختلف برادریوں میں مزید صف آرائی پیدا کرتا ہے اور یہ صف آرائی مختلف برادریوں کا ووٹ حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے اس اندرونی چیلنج کا مقابلہ صرف اس اتحاد سے ہوسکتا ہے جو متحدہ ثقافت اور مشترکہ تاریخی رشتوں کو مضبوط کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

مشترکہ تاریخی رشتوں اور متحدہ یا مشترکہ ثقافت کے شعور کے بغیر لوگوں میں قومی روح نہیں پھونکی جاسکتی۔ دراصل مذہب کبھی بھی قوم یا کلچر کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ سیکولر سیاست کیلئے مشترکہ مذہبی رشتوں کے بجائے مشترکہ ثقافتی اور تاریخی رشتے زیادہ کارآمد اور پائیدار ہوتے ہیں ایک مذہبی برادری سیاسی برادری سے الگ ہوتی ہے۔ قوم ایک ایسی برادری ہے جو تہہ در تہہ وجود رکھتی ہے۔ اس کی بہت سی تہیں ہیں۔ سیاسی، سماجی تاریخی اور ثقافتی۔ اس بنا پر بہت سے لوگ اب بھی سوچتے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم کوئی اچھا سیاسی فیصلہ نہ تھا۔ مذہبی اختلافات کے باوجود ہمارے مشترکہ ثقافتی اور تاریخی رشتے بہت زیادہ مضبوط ہیں اور انہی وجوہ کی بنا پر دو عظیم اسلامی مفکروں مولانا حسین مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستانی مسلمانوں کو مذہبی نیشنلزم کے بارے میں خبردار کردیا تھا۔

مگر ہماری سیاست کا راہنما اصول اور فلسفہ سیکولرازم ہو تو یہی مذہبی خصوصیت کا مؤثر توڑ

بھی ہوسکتا ہے اور جب فرقہ ورانہ طاقتیں اقتدار سنبھالتی ہیں تبھی مذہبی خصوصیت سر اٹھاتی ہے۔بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ آج یہی کچھ ہمارے ملک میں ہورہا ہے یہ سیکولر طاقتوں کی کمزوری ہے جوفرقہ واریت کی شہ زوری بن گئی ہے؟

(15۔نومبر2001ء)

گجرات میں سب کچھ نہیں کھوگیا

گجرات کے بارے میں کسی کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں یہ سچ ہے کہ گجرات کے قتل عام نے دل توڑ کر رکھ دیا ہے۔اس بدقسمت صوبے میں تشدد ابھی تک جاری ہے اور سنگھ پریوار مسلم اور عیسائی اقلیتوں کیخلاف اب بھی نفرت پھیلاتا چلا جارہا ہے۔ان اقلیتوں کے خلاف زہر پھیلانے کیلئے ہزاروں کی تعداد میں پمفلٹ تقسیم کئے جارہے ہیں۔

اس قسم کا ایک پمفلٹ شمالی گجرات کے شہر کلول میں تقسیم ہوا ایشین ایج کے کہنے کے مطابق اس پمفلٹ کے ذریعے ہندوؤں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو گراٹے سکھائیں انہیں عیسائیوں کے سکولوں سے دور رکھیں اور ان فلموں کا مکمل بائیکاٹ کریں جن میں مسلمان فلمی ستارے کام کرتے ہیں۔

گجراتی زبان میں اس قسم کے ایک اور پمفلٹ میں مسلمانوں پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ ہندوؤں کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں میں بے چینی پھیلاتے ہیں اور شراب کے غیر قانونی ڈھابے چلاتے ہیں اس پمفلٹ میں ان کاروباری اداروں اور دکانوں کے بائیکاٹ کا بھی کہا گیا ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں حصہ دار ہیں انہیں پہچانو انہیں باقی جہاں سے الگ کردو ان کی دکانوں سے کوئی شے نہ خریداری کی جائے بالواسطہ طور پر فائدہ مسلمان حصہ دار کو بھی ہورہا ہے۔مزید کہا گیا ہے اگر آپ ان کی دکانوں سے مال خریدنا بند کردیں گے تو پھر ہندو حصہ داروں کو بھی سبق ملے گا اور وہ مسلمان حصہ داروں سے الگ ہوجائیں گے۔

پمفلٹ میں عیسائیوں کے تعلیمی اداروں پر بھی حملہ کیا گیا ہے۔تم اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دلانے کی خاطر انہیں عیسائی سکولوں میں بھیجتے ہو اور اس پر فخر محسوس کرتے ہو لیکن یہی تمہاری زندگی کی سب سے بڑی بھول ہے۔ ہندو مذہب کو بہکا دینے کیلئے ان سکولوں میں

چھوٹے بچوں کے ذہنوں میں عیسایت بسانا شروع کر دیا جاتا ہے۔ نشانہ بنائی جانے والی برادری کے خلاف اس نوعیت کے پراپیگنڈے سے تو نہرو جیسا آدمی بھی ایک آدھ سبق سیکھ لیتا۔ آج گجرات میں اس قسم کے ایک نہیں سینکڑوں پمفلٹ تقسیم ہو رہے ہیں مگر گجرات میں صرف سنگھ پریوار ہی سب کچھ نہیں ہے وہاں لاکھوں ایسے ہندو ہیں جن کے دلوں میں مسلمانوں کیلئے خیر سگالی کا جذبہ ہے اور وہاں کئی مسلمان ہیں جن کے دلوں میں ہندوؤں کے بارے میں کوئی وسوسہ کوئی کم نیتی نہیں اور حقیقت یہ بھی ہے کہ جب سنگھ پریوار والے مسلمانوں کیخلاف یہ زہریلا لٹریچر تقسیم کر رہے ہیں ایک مسلمان فساد سے بری طرح متاثر ہونے کے باوجود ہندووں کا صحیفہ گیتا گا تا رہتا ہے۔

وڈوڈرا کے رہنے والے اسحاق چپن والا گاندھی کے پیروکار ہیں پکے مسلمان ہیں اور گیتا کے نسخے تقسیم کرتے رہتے ہیں وہ کہتے ہیں جو کچھ ایک ماہ پہلے ہوا اسے فرقہ وارانہ فساد نہیں یہ تو لوگوں کے ذہنوں میں مسلمانوں کے بارے میں زہر پھیلانے کی سازش تھی۔ سیکولرازم والے جنگ ہار گئے ہیں چپن والا کی فیکٹری فسادات کے دوران جلا دی گئی مگر اس سے دل برداشتہ ہو کر انہوں نے گیتا کے نسخے تقسیم کرنا نہیں چھوڑے۔ وہ بڑے عرصہ سے یہ کام کر رہے ہیں اور اب بھی یہ گیتا کے بلا معاوضہ نسخے تقسیم کرتے ہیں چپن والا کا تعلق تحریک سرو دیا سے ہے اور دوسری این جی او کے ساتھ مل کر انہوں نے شانتی تحریک شروع کر رکھی ہے۔

چپن والا نے جس کو سازش کہا ہے وہ قتل عام ہے جو آر ایس ایس کے نظریات کا حصہ ہے چپن والا نے کہا کہ 1947ء سے آر ایس ایس کے پرچارک شہروں سے دیہات میں جاتے ہیں اور اپنے نظریات کے پرچار کرتے ہیں انہوں نے لوگوں کے دلوں میں زہر بھر دیا ہے اور گودھرا جیسے واقعات ان کیلئے چقماق (چنگاری) کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ایک دم ان کے تبصرے کے مطابق آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

اگرچہ تیں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ایک فیکٹری چپن والا کی بھی جلا دی گئی تھی مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری وہ کہتے ہیں میں گاندھی کا پیروکار ہوں اور میرا ایمان عفو اور درگزر پر ہے۔ مسلمان ان سے اس سے ناراض ہیں کہ وہ گیتا کے نسخے تقسیم کرتے ہیں اور وہ اسے ہندوؤں کی طرفداری سمجھتے ہیں لیکن چپن والا ان سب باتوں سے بے خوف گیتا کے نسخے تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ احمد آباد میں شاہ عالم کی درگاہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک اور مرکز ہے۔ شہر

MashalBooks.org

میں انتہائی فتنہ فساد کے باوجود اس درگاہ پر مسلمان اور ہندو آتے رہے۔ یہ درگاہ چھ سو سال پرانی ہے اس درگاہ کے بالکل سامنے سادھو نرسنگھ بھگت کی یادگار ہے کہا جاتا ہے کہ نرسنگھ بھگت نے ایک بار شاہ عالم سے کہا تھا کہ ہماری دوستی ایسی ہونی چاہئے کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ایک مثال بن جائے۔ یہ سن کر شاہ عالم نے اپنے مریدوں سے کہا کہ جو کوئی ان کی درگاہ پر آئے وہ بھگت کی یاد میں بھی ایک دیا جلا کر جائے۔

آج دونوں مذہب والے ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے ہیں مگر جو کوئی بھی درگاہ پر جاتا ہے وہ بھگت کی سمادھی پر دیا ضرور جلاتا ہے۔ مہاجرین کے کیمپ میں پناہ لینے والی ایک خاتون زینت بی بی نے کہا کہ ہم دشوا ہندو پریشد کی وجہ سے بے گھر ہو کر یہاں پڑے ہیں مگر ہندو بھگت کے یاد میں تو ہم برسوں سے چراغ جلاتے آئے ہیں۔ کیمپ میں موجود اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ سمادھی پر چراغ جلانے کی مذہبی حیثیت ہے اور ہم پر جو بھی ظلم و ستم ٹوٹے اس کے باوجود ہم یہ چراغ جلاتے رہیں گے۔

گجرات کے شہر بھروچ بھی فساد گزیدہ ہے بہت حساس ہے جب گجرات جل رہا تھا اور مذہب کے نام پر لوگوں کا قتل عام ہو رہا تھا اس وقت سیوا کا ایک مسلمان خاندان اور ہندو خاندان نربدا دریا کے کنارے امن و امان کے ساتھ اکٹھے رہ رہے تھے اور انہوں نے دوستی کی شمع جلا رکھی تھی۔

محمد گھنڈ براؤ اور رامن لال نرائن داس بالی خاندان گزشتہ 44 سال سے اکٹھے رہ رہے ہیں ان کا صحن بھی اکٹھا اور باورچی خانہ بھی اکٹھا ہے ان کے بچے بھی ایک ساتھ پل کر بڑے ہوئے تمام بچوں کو دونوں مذہبوں کے اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے اچھی عادات سکھائی گئیں اور بچے بھی اس بحران میں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑتے رامن لال کی بیوی نرمیلا پٹیل نے کہا میری بڑی بیٹی کا کنیادان محمد بھائی نے کیا تھا میرے بیٹے امیت کا نام انہوں نے رکھا ہم نے محمد بھائی اور تمنا بہن کی بیٹیوں یاسمین اور سیما کے نام رکھے۔

اسی طرح محمد بھائی نے کہا رامن لال اور میں اس وقت سے اکٹھے رہ رہے ہیں جب ہم کنوارے تھے اور اچھے دنوں کے لیے محنت کر رہے تھے۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم شادی کے بعد بھی اپنے خاندانوں کے ساتھ اسی چھت تلے اکٹھے رہیں گے محمد بھائی کی پانچ بیٹیاں ہیں جبکہ رامن لال کے تین بچے ہیں جب محمد بھائی اور ممتاز بہن حج کرنے گئے تو ان کی بیٹیاں

رامن لال کے پاس رہیں رامن لال کا کہنا ہے کہ میرا ایمان میرے دل میں ہے میں اونچی ذات کا ہندو ہوں مگر مذہب مجھے ماہ جبیں، زینت، یاسمین، سیما اور مہناز سے پیار کرنے سے نہیں روکتا اور نرملا بہن کا کہنا ہے جس طرح میں اپنے بچوں کی ماں ہوں اسی طرح ان پانچ بیٹیوں کی بھی ماں ہوں۔

احمد آباد میں رام اجم نگر نام کی کچی بستی میں دونوں مذہبوں کے رہائشیوں نے محبت اور اتحاد کا شعلہ اس وقت بھی بلند رکھا جب کہ باقی سارا شہر فرقہ وارانہ آگ میں جل رہا تھا یہ لوگ روز کا کام معمول کے مطابق کرتے شہر میں چار بار فسادات ہوئے مگر چاروں بار اس محلے میں جہاں دونوں مذہبوں کے لوگوں کی آبادی برابر ہے امن سکون اور بھائی چارہ ہے اس بستی میں ایک طرف ہنومان دیوتا کا مندر ہے اور اس کے پہلو میں درگاہ ہے دونوں مذہبوں سے وابستہ لوگوں کے اتحاد کی علامت۔

باہمی محبت اور اعتماد کا جذبہ اس بستی کے بیس ہزار باشندوں کے دلوں میں ہے احمد آباد میں بھی فرقہ وارانہ ژالہ باری ہوئی رام رحیم نگر اس سے محفوظ رہا۔ پیار علی کپاڈیا رام رحیم نگر جھیڈ ا داس منڈل کے صدر ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہاں ہمارا مذہب انسانیت ہے کوئی کسی دوسرے کے ایمان اور عقیدے کے بارے میں متشدد نہیں اس نگر کی میں سیکولر فضا نے ایک قریبی مسجد میں تین سو پناہ گزینوں کی حسن سلوک سے واپس اپنے گھروں میں جانے پر مجبور کر دیا۔ اس نگر کے لوگوں نے اپنے وسائل کے ساتھ ان فساد زدگان کی ضروریات کو پورا کیا امدادی کاموں کی رابطہ کی انچارج تاج بانو سید نے کہا کہ ہم نے انہیں خوراک اور پناہ فراہم کی۔

اس نگر کے لوگوں کا اصل دشمن افلاس ہے مگر یہ ہندو اور مسلمان کی ہم وجودیت کی بہترین مثال ہے۔ یہاں کے لوگوں کو مندر مسجد کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں رام رحیم نگر پر یہ فرقہ وارانہ افتاد کبھی نہیں پڑی نہ وہ اس عذاب سے گزرا ہے۔1973ء سے ایک مقامی کمیٹی (منڈل) نے اس علاقے میں فرقہ وارانہ اتحاد قائم رکھا اور لوگوں کیلئے امن۔ اس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے 27 ممبر ہیں جو محلے کے معاملات آپس میں طے کرتے ہیں۔

ضلع سبر کنتھا میں ایک گاؤں ہلول ہے اس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر انہوں نے ہمیشہ اتحاد کا پرچم سربلند کیا۔ مسلمان کی آبادی 11000 کے قریب ہے جو سنی شیعہ دیوبندی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں میں ونیو، براہمن، دلت اور دربرئیں گاؤں والے اس پر

متفق ہے کہ کوئی بھی اس گاؤں میں فرقہ واریت کے جراثیم لے کر نہیں آئے گا راتوں کو 15 سے لے کر 20 افراد پر مشتمل لوگوں کا گروہ پہرہ دیتا ہے کہ کوئی باہر سے آ کر اس گاؤں کے امن چین کو نہ لوٹ لے جائے۔

یہاں گیتا بہن اور برسنہ راٹھور جیسے افراد کا ذکر بھی ضروری ہے گیتا بہن نے اپنی مسلم دوست کو بچانے کیلئے اپنی جان دیدی۔ فسادیوں نے اس کے عباس کو تار تار کر کے اسے قتل کر دیا۔ ویر سینہ راٹھور نے ہندوتوا وادیوں کی طرف سے دھمکیوں کے باوجود اپنی جان خطرے میں ڈال کر کچھ مسلمان گھرانوں کی زندگی بچالی۔ ہم دونوں کو سلام کرتے ہیں۔ فساد زدہ گجرات کے صوبے میں فسادات کے دوران فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ایسی ہی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اس لئے ثابت ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت فطری نہیں ووٹوں کے حصول کیلئے طاقتور مفاد پرست طبقوں نے خود پیدا کی ہے یہ لوگ خون کے دریا بہا کر ان میں سے ووٹوں کی مچھلیاں پکڑنا چاہتے ہیں اگر عام ہندو اور مسلمان اتحاد اور امن قائم رکھنے پر تل جائیں تو یہ مقصد حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں صرف نیت اور مضبوط قوت ارادی کی ضرورت ہے۔

1992ء 1993ء، میں باقی بمبئی اگر فسادات کی آگ میں جل رہا تھا تو متعدد علاقے پر امن رہے بھونڈی کا علاقہ فرقہ وارانہ لحاظ سے بڑا احساس ہے مگر اب کے لوگوں نے پر امن رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ بڑے کٹڑ فرقہ پرست بھی یہاں کے امن و سکون کو پریشان نہ کر سکے۔ جو کچھ گجرات میں ہوا ہے اس سے عام لوگوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ فسادات والے لوگ عوام کے اتحاد کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں لوگوں کو ان کی یہ کوشش ناکام بنانے کیلئے لنگر لنگوٹ کس لینے چاہئیں۔ نہرو نے ایک بار بالکل صحیح کہا تھا کہ ہندوستان کو کمیونزم اشتراکیت سے نہیں کمیونلزم فرقہ واریت سے خطرہ ہے۔ سب سے زیادہ حب الوطنی کے دعوے کرنے والے سنگھ پریوار کو خبر ہو کہ ہندوستان کی اندرونی حفاظت کے بغیر بیرونی حفاظت کی ضمانت نہیں دی جاسکتی اور اندرونی حفاظت کو سنگھ پریوار ہی برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔

(15۔ مئی 2002ء)

گجرات کا قتل عام اور سیکولرازم پر اثرات

گجرات کے قتل عام کی وجہ سے سیکولرازم کے ریاستی نظریہ پر بہت گہرے اثرات پڑے ہیں۔اس قتل عام میں گجرات میں نریندر مودی کی حکومت پر خود ملوث ہونے کا الزام ہے۔ ملک دوقومی نظریہ کی بنیاد پر تقسیم ہوگیا تھا مگر اس کے باوجود آئین بنانے والوں نے سیکولرازم کو اختیار کیا تقسیم کے علم برادروں کی طرف سے فرقہ وارانہ فسادات اور قتل وغارت ہوئی فرقہ وارانہ تقسیم اور فسادات کے باوجود ہماری قیادت کا سیکولرازم پر ایمان نہیں ڈولا اور سیکولرازم پر آئین کی بنیاد رکھ دی گئی۔تاہم تقسیم یا غیر تقسیم دونوں صورتوں میں آر ایس ایس اور جن سنگھ اور ان کے ہم نظریہ اداروں یا افراد نے سیکولرازم کو اچھا نہیں سمجھا۔ ہندوتوا کے نظریہ کے خالق وی ڈی ساورکر نے خود 1938ء میں دو راشٹروں کا نظریہ پیش کیا تھا اور ہندو مہا سبھا کے اجلاس میں اور جناح کے دوقومی نظریئے (1940ء سے پہلے پیش کیا تھا۔

سنگھ پریواران دنوں اس کا یہ نام نہیں تھا۔) کی طرف سے زبردست مخالفت کے باوجود مہاتما گاندھی جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کی قیادت میں کانگرس نے ہندوستان کیلئے سیکولرازم کے سیاسی فلسفہ کو اختیار کیا تھا۔ یہ بہت بڑا دلیرانہ اقدام تھا جو اب تک ہمارے اتحاد اور سالمیت کیلئے ضمانت بنا رہا۔

پاکستان 1971ء میں دو ٹکڑے ہوگیا اور اسلامی اتحاد کا تصور اسے ٹوٹنے سے نہ بچا سکا۔ ہندوستان میں اختلافی رنگ اور تنوع بہت زیادہ تھا مگر ہماری سیکولرازم سے سیاسی وابستگی کے طفیل وہ آج بھی متحد ہے۔سنگھ کے پراپیگنڈا،فرقہ وارانہ بنیادوں پر ملک کی تقسیم اور برطانوی عہد سے میراث میں ملے۔ باغی ورثے نے ہمارے سیکولرازم سے کئے عہد وفا کیلئے بڑی مشکلات پیدا کیں۔نہرو کو توقع تھی کہ فرقہ وارانہ تشدد جلدی ختم ہوجائے گا اور آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سیاسی استحکام ہوگا۔ان کے خیال میں فرقہ وارانہ مسئلے کا آخری حل تقسیم تھی مگر فرقہ وارانہ فسادات وقتاً فوقتاً پھوٹتے رہے جو ہمارے ملک کے سیکولرازم کیلئے دھچکے پر دھچکا ثابت ہوتے رہے۔

گجرات میں جو فرقہ وارانہ قتل عام ہوا وہ آزاد ہندوستان میں فرقہ واری کی بدترین انتہا ہے۔پہلی بار صوبے کی انتظامی مشینری بھی راہ راست قتل وغارت گری میں ملوث ہوئی۔صوبے کے وزیراعلیٰ نریندر موری نے کہا کہ سابرامتی ایکسپریس کے ساتھ گودھرا ریلوے سٹیشن پر جو

آتش زنی ہوئی یہ فساد اس کا فطری ردعمل تھا مگر وہ دوسری طرف یہ نہ دیکھ سکے کہ بے گناہ لوگوں کو بے رحمی سے قتل کیا جا رہا ہے اور عورتوں کی عصمت دری کی جا رہی ہے اور تو اور 1984ء میں سکھوں کے قتل عام میں بھی صوبے کی مشینری گجرات کی سرکار کی طرح براہ راست ملوث نہ تھی۔

گجرات کے قتل عام نے ہماری ساری قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور ہماری سول سوسائٹی نے اس کے بارے میں سخت ردعمل کا اظہار کیا ہے اب تو ادیب، صحافی، مصور، اور شاعر آہستہ آہستہ اٹھ رہے ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔

پارلیمینٹ میں مخالف جماعتوں کانگرس کمیونسٹ (سی پی آئی اور سی پی ایم) اور سوشلسٹ پارٹی نے پارلیمان کے اندر اور پارلیمان کے باہر سنگھ پریوار کی طاقتوں کی مخالفت بھی کی اور انہیں بے نقاب بھی کیا۔ ان پارٹیوں میں سے اکثر بعض نازک موقعوں پر سیکولرازم کے سوال پر ڈگمگا گئیں مگر دونوں کمیونسٹ پارٹیوں کی سیکولرازم اور فرقہ واریت کے بارے میں پالیسی ہمیشہ ایک ہی رہی۔ گجرات کے قتل عام کے باعث کانگرس کو بھی جھٹکا لگا ہے اور اس کے اندر کچھ احساس جاگا ہے کانگرس خیالی یا تصوری طور پر تو سیکولرازم سے دور نہیں ہوئی مگر عملی طور پر وہ کئی بار اس مسئلے پر ڈگمگائی ہے۔ کانگرسی لیڈروں میں سے نہرو کو سیکولرازم سے سب سے زیادہ پاس وفا رہا اندرا گاندھی بھی شروع میں بہتر سیکولر رنگ میں ابھری تھیں مگر ایمرجنسی کے بعد بدلنے لگیں اور ایک وقت میں یعنی اسی کی دہائی کے شروع میں ہندوتوا کے ساتھ ہو گئیں۔ انہوں نے پنجاب میں سکھ سیاست کو بھی فرقہ وارانہ پٹڑی پر چڑھا دیا۔ پھر خود ہی اس کے نشانہ بنیں اور سکھ باڈی گارڈ کے ہاتھوں قتل ہو گئیں۔

راجیو گاندھی کا کسی بھی شے سے کوئی عہد وفا نہیں تھا اندرا گاندھی تو نہرو خاندان کے سیکولر ماحول میں پیدا ہوئیں اور تربیت پائی راجیو کو تو یہ تربیت بھی نہیں ملی تھی وہ شاید ہی ہندوستانی سیاست کی نازک پیچیدگیاں سمجھ پائے تھے۔ انہوں نے اپنے فائدے کیلئے مسلمان اور ہندو بنیاد پرستی کی حوصلہ افزائی کی مگر مقدر ناکامی۔ انہوں نے شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ بدل دیا اور مسلم ویمنز (آن ڈائیورس) ایکٹ منظور کر کے سیکولرازم کو ضرب لگائی۔ وہ تو 1989ء میں عام انتخابات کے موقع پر رام جنم بھومی مندر کا سنگ بنیاد رکھنے بھی پہنچ گئے۔ اس طرح وہ مسلمانوں کی حمایت سے محروم ہو گئے اور الیکشن بھی ہار گئے کانگرس آج تک اس کاری ضرب

سے نہیں سنبھل سکی۔

یوں اہل ہندوستان کی نظر میں کانگرس کی سیکولر والی ساری شناخت مٹ گئی۔ وہ یو پی میں اقلیتوں کی حمایت سے محروم ہوئی ایک کے بعد ایک ہزیمت پھر کچھ دوسرے صوبوں میں بھی یہی ہوا۔ گجرات کے قتل عام نے کانگرس کو بھی دھچکا لگایا ہے اور اب اپنی سیکولر شناخت پر زور دے رہی ہے۔ پارلیمینٹ میں حزب اختلاف کی لیڈر کی حیثیت سے سونیا گاندھی گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام پر بی جے پی کی سرکردگی میں قائم این ڈی پی کی حکومت کے خلاف مؤثر طور پر لڑی نہیں۔

سونیا گاندھی کی کم از کم اتنی بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ فرقہ وارانہ قوتوں سے بڑی جنگ کے بغیر اور ہندوستان کی سیاست میں سے فرقہ وارانہ زہر نکالے جانے کے بغیر کانگرس اقتدار میں نہیں آ سکے گی بلکہ ہندوستان کے اتحاد اور سلامتی کو بھی شدید خطرہ ہے۔ انہوں نے فرقہ وارانہ امن کے فروغ کیلئے ایک تربیت یافتہ تنظیم بنانے کی بھی باتیں کی ہیں مگر اس کے بارے میں ان کا تصور زیادہ واضح نہیں انہوں نے اس ضمن میں فساد زدگان کی دیکھ بھال کرنے اور فساد زدہ علاقوں میں قانونی رضا کار بھیجنے کا تذکرہ کیا۔

فرقہ واریت کیخلاف لڑائی کوئی آسان کام نہیں ہے سنگھ پریوار نے درمیانے ہندو طبقے کو فرقہ پرست بنا دیا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ سیکولر سیاست کا حلقۂ اثر تنگ ہوتا گیا ہے۔ آر ایس ایس کے پرچارک مذہبی جوش و جذبے میں ساتھ سارا سال کام کرتے اور فرقہ وارانہ جرائم پھیلاتے ہیں۔ اب آر ای ایس بڑے دعوے سے کہہ سکتی ہے کہ اس کے پاس اتنے ہزار پرچارک ہیں ان کی بڑے سلیقے سے تربیت کی جاتی ہے اور انہیں معاشی طور پر آسودہ رکھا جاتا ہے۔ آر ایس ایس کی قیادت اس مقصد کیلئے ہندو بزنس کمپنیوں سے ہر سال بہت بڑا فنڈز اکٹھا کرتی ہے۔

سیکولر طاقتیں اس قسم کی کسی فورس کی دعویدار نہیں۔ جب سونیا گاندھی نے اس کا اعلان کیا تھا تب بھی تصور کوئی واضح نہیں تھا ایک بار کانگرس سیوا دل قائم کیا گیا تھا مگر اس نے مشنری جذبے کے ساتھ کوئی بھی کام نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ آل انڈیا کانگرس کے سالانہ اجلاس کے انعقاد میں مدد دیا کرتا تھا۔ کانگرس سیوا دل اب کوئی مؤثر تنظیم نہیں رہی ایک مرتبہ سوشلسٹوں نے بھی راشٹرا سیوا دل قائم کیا تھا ہر چند جواب بھی مہاراشٹر کے بعض حصوں میں علامتی طور پر

موجود رہے مگر یہ بھی ختم ہوکر تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔صرف آر ایس ایس کے کارکنوں میں آج بھی وہی جوش و جذبہ ہے جو اس کے قیام کے وقت تھا اور اپنے مقصد سے لگن میں کمی نہیں ہوئی وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوا ہے۔

آج اس سوال پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کی شدید ضرورت آن پڑی ہے کہ آر ایس ایس کیسے اب بھی مذہبی منافرت کی سیاست سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے جبکہ باقی تمام سیکولر جماعتیں اور تنظیمیں چند دن بھی اپنے مقصد کی خاطر کھڑی نہیں رہ سکیں۔کیا مذہبی تعصب سیکولر مقاصد کے مقابلے میں جذبات کو زیادہ اپیل کرتا ہے؟ لگتا تو یوں ہی ہے لیکن مذہبی تشدد اور تعصب ملک اور انسانیت پر بڑی تباہی لاتا ہے اور ہم نے گجرات میں ہی نہیں پورے ملک میں اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

ابھی وقت ہے سیکولر جماعتیں صورتحال کا دیانتداری سے جائزہ لیں اور ایسے اقدامات کریں جو ہندوستان کو ایسی تباہیوں سے بچاسکیں جیسی کہ گجرات میں آئی ہیں۔سیکولر جماعتوں کو یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ سیکولرازم کو صرف اقلیتی ووٹ حاصل کرنے کیلئے استعمال کیا جائے ورنہ ایسی صورت میں وہ گہری دلدل میں پھنس جائیں گی۔ بدقسمتی سے نہرو کے بعد پارٹیوں خصوصاً کانگرس کیلئے سیکولرازم صرف اقلیتوں کے ووٹ حاصل کرنے کا حربہ بن کر رہ گیا۔اس کے ارکان اچھے وقت میں بھی سیکولرازم کے وفادار نہ تھے۔ چنانچہ جب سیکولرازم کو صرف اقلیتوں کے ووٹ حاصل کرنے کیلئے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا تو کانگرس پر الزام لگا کہ وہ اقلیتوں کو خوش کر رہی ہے۔ یہ الزام سیاسی تھا اور بی جے پی نے اس لئے لگایا تھا کہ وہ ہندو درمیانے طبقے کے ووٹروں کی توجہ لے سکے۔

لیکن کانگریس اس قسم کے غیر منطقی بے معنی الزامات کا جواب بھی نہ دے سکی کیونکہ یہ خود سیکولرازم سے مخلص نہ تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو وزیر اعظم نرسیما راؤ کے کانگرسی عہد حکومت میں بابری مسجد اس انداز میں نہ گرائی جاتی کہ کسی کو کوئی سزا تک نہ ملتی۔ یوں کانگرس میں جو تھوڑا بہت سیکولرازم رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔کانگرس تمام اقلیتوں سے کٹ گئی اور اس کے بعد الیکشن ہار گئی۔

اگرچہ کانگرس کو اب احساس ہوگیا ہے کہ اس نے سیکولرازم کے بارے میں سنجیدگی سے کام نہیں لیا اور اس کے برے اثرات ہوئے ہیں مگر اب اس کیلئے سیکولرازم سے نہرو جیسی

وابستگی کی صورت پیدا کرنا بڑا مشکل ہے۔ مشکل یہ ہے کہ متبادل بھی کوئی نہیں اس لئے کانگرس کے لیڈروں کو سیکولرازم کو زیادہ سنجیدگی سے اپنانا چاہئے اور اسے صرف ووٹ حاصل کرنے کے ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ تنوع میں اتحاد سیکولرازم کے بغیر قائم نہیں رکھا جاسکتا اور تنوع میں اتحاد گاندھی نہرو اور آزاد جیسے قائدین کا نعرہ ہی نہیں تھا سیاسی فلسفہ بھی تھا اور سیکولرازم کا قلب بھی۔ ہندوستان کا معاشرہ بہت ہی متنوع اور رنگ برنگا ہے۔ ایسی سوسائٹی سیکولرازم کے سیمنٹ کے بغیر بچ نہیں سکتی۔

سیکولرازم کا مفہوم یہ ہے کہ مذہب کے مقابلے میں شہریت اور شہری مقدم ہیں اور اگرچہ آئین میں شہریت ہی مذہب پر مقدم ہے مگر ہمارا معاشرہ مسلسل تگ و دو سے فرقہ وارانہ بنادیا گیا ہے۔ اس لئے ابھی تک اس مشکل کو آسان نہیں بنایا جاسکا۔ ہمارا تعلیمی نظام فرقہ وارانہ جراثیم کا کاٹا ہوا ہے۔ ہماری نصابی کتابوں میں اقلیتوں کے مذاہب اسلام اور عیسائیت کو ہوا بنایا گیا ہے اور تاریخ کو فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے اس لئے تعلیمی نظام کو سیکولر بنانے پر سب سے زیادہ توجہ دی جانی چاہئے۔

ہمیں آج ایک جیتی جاگتی سوسائٹی بنانے کیلئے سیکولرازم کی ضرورت ہے الیکشن جیتنے کے لئے نہیں۔ سیاسی جماعتوں کو ایسا سیاسی کلچر تشکیل دینا چاہئے جس میں رواداری اور انسانی اقدار کیلئے احترام ہو۔ آج ہمارا کلچر ذات پات اور فرقہ واریت میں تر بتر ہو گیا ہے۔ خصوصاً گجرات کے بعد۔ ہمیں ایک ایسے نئے سیاسی کلچر کی ضرورت تسلیم کر لینی چاہئے جو سیکولر اور انسانیت پسند ہو۔

15۔ جون 2002ء

MashalBooks.org

بی جے پی سنگھ پریوار اور اقلیتیں

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد میں ذرائع ابلاغ صورتوں، شبیہوں اور تخیلات کو پیش کرنے میں خاص کردار کے حامل ہیں۔ جو کچھ ذرائع ابلاغ، مطبوعہ یا بصری ذریعے سے پیش کرتے ہیں لوگ اسے سچ سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ بہت ہی کم ایسے قاری یا ناظرین ہیں جو ذرائع ابلاغ کے ذریعے آنے والی ہر شے کو تنقیدی نظر سے پرکھتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ذرائع ابلاغ (میڈیا) آج کے جمہوری دور میں سب سے بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اکثر اوقات تو یہ خود مقصد ہو جاتا ہے۔ یہ رائے سازی کا وسیلہ ہے۔ اس لئے صورت یا مثال سازی پیش کرنے میں اس کا کردار بہت محتاط ہونا چاہئے مگر بدقسمتی سے اکثر معاملات میں اس کا رویہ ایسا نہیں ہے۔ اگر مطبوعات کی طرف جائیں تو بہت کم اخبار ایسے ہیں جو مثبت اور تعمیری نقطۂ نظر سے وسیع مطالعے کے بعد اقلیتوں کے بارے میں سب کچھ کہتے ہوں۔

اگرچہ انگریزی اخبار زیادہ محتاط ہیں پھر بھی جب اقلیتوں سے متعلق اہم واقعات کی رپورٹنگ کرتے ہیں تو تحقیق کی بجائے رواردی میں کام لیتے ہیں۔ مقامی زبانوں کے اخبار (چند کو چھوڑ کر) بہت ناقص ہیں۔ کوئی احتیاط نہیں کرتے اور اکثر اوقات اقلیتوں کے بارے میں متعصّبانہ رپورٹنگ ہوتی ہے۔ ایک اور قسم بھی ہے۔ فرقہ پرستی کے بھونپو مثلاً ''سامنا'' جو اقلیتوں کی مسخ شدہ تصویر اور بھی کراہت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسی پر پرورش پاتا ہے۔ شمالی، وسطی اور مغربی ہندوستان سے شائع ہونے والے ہندی، مراٹھی اور گجراتی اخبار ہیں جو اقلیتی نقطۂ نظر سے حقیقتاً بہت بدترین مجرم ہیں۔ وہ اپنی رپورٹنگ یا دوسرے فیچروں میں اقلیتوں کے خلاف بڑے بے ڈھنگے انداز میں تعصّبات کا اظہار کرتے ہیں۔

MashalBooks.org

مراٹھی میں سامنا شیوسینا کا ترجمان ہے۔ اقلیتوں عیسائیوں خصوصاً مسلمانوں کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز زبان استعمال کرتا ہے۔ ممبئی کے فساد کے دنوں میں اس اخبار نے مسلمانوں کو پاکستان کے حامی اور ہندوستان کے غدار کہا اور مسلمانوں کیخلاف انتہائی اشتعال انگیز کئی اداریے لکھے' یہ مہم اتنی مخالفانہ اور مکروہ تھی کہ مہاراشٹر کے سابق چیف سیکرٹری جے بی ڈی سوزا نے عوامی اخبار کے حوالے سے ممبئی ہائی کورٹ میں رٹ دائر کردی کہ اس اخبار کے ایڈیٹر کو کریمنل پروسیجر ایکٹ کے تحت سزا دی جائے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مہاراشٹر میں اخبار روزانہ لاکھوں کی تعداد میں پڑھا جاتا ہے اور وہ لاکھوں لوگوں کی رائے بنانے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے اور تو اور پولیس والے اسے بڑی باقاعدگی سے پڑھتے ہیں اور جو کچھ سامنا میں چھپا ہوتا ہے اس کے حوالے سے اقلیتوں کے بارے میں اپنی رائے وضع کرتے ہیں اور کوئی بعید نہیں کہ سامنا کی طرح ان کا بھی اقلیتوں کے بارے میں یہی نقطۂ نظر ہو۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ سامنا کی کوئی استثنائی صورت نہیں' مقامی زبانوں کے باقی اخباروں کا بھی یہی حال ہے ہاں سامنا کی زبان زیادہ کڑوی اور کھردری ہے۔ ان اخباروں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ہر اقلیت کو ایک ہی طرح دیکھتے ہیں اور اقلیت کے بارے میں ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ کوئی بہت مربوط قسم کی برادری ہے۔ ایک سوشل اینتھرا پولوجسٹ یا کوئی بھی دیدہ ور لکھنے والا صاف ضمیر شخص جانتا ہے کہ مسلمان' عیسائی' سکھ یا بدھ ایسی مربوط برادریاں نہیں ہیں۔ دوسروں کی طرح یہ اقلیتیں بھی آپس میں مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں فرقہ وارانہ' لسانی اور ثقافتی فرق ہے اور ان کا سیاسی رویوں میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔

مثلاً انتہائی معقول اور پڑھے لکھے محقق سمجھتے ہیں کہ سب مسلمانوں نے 1947ء میں پاکستان کی حمایت کی تھی۔ یہ انتہائی قابل اعتراض مفروضہ ہے۔ اخبارات میں بھی اکثر یہی بات لکھی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بھی اس مسئلے پر دو صفوں میں بٹ گئے تھے۔ تقسیم کے منصوبے کی زیادہ تر حمایت یوپی اور بہار کے مسلمانوں کے بالائی اور درمیانی طبقے نے کی تھی' یہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ ان دونوں صوبوں میں بھی بالائی اور درمیانے طبقے کی ایک بڑی تعداد نے جنہیں نیشنلسٹ مسلمان کہا جاتا تھا زور شور سے تقسیم کی مخالفت کی۔ ان صوبوں میں نچلی ذات اور نیچی کلاس کے لوگوں' انصاریوں اور دوسروں نے جنہیں پاکستان میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا تقسیم کی مخالفت کی۔ انصاری بڑے منظم بھی تھے اور سیاسی شعور

سے بہرہ ور بھی۔ انہوں نے احتجاجی مظاہروں کے ذریعے تقسیم کی مخالفت کی۔ مولانا حسین احمد مدنی کی سرکردگی میں بہت سے نامور علمائے اسلام نے تقسیم کی مخالفت کی تھی اور اس مخالفت کا جواز اسلامی تعلیمات کے حوالے سے دیا تھا۔ ہمارے اخباروں میں ان باتوں کا شائد ہی کبھی ذکر آتا ہو۔ 80 کی دہائی میں جب فرقہ وارانہ تصادم عروج پر تھے۔ ذرائع ابلاغ تمام مسلمانوں کو پاکستان کے حامی سمجھتے بلکہ انہیں اب بھی پاکستان کے وفادار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

دوسری بدنام مثال کرکٹ کی ہے۔ جب پاکستان جیت جاتا ہے تو کچھ مسلمان ان کی جیت پر خوشی مناتے ہیں مگر ذرائع ابلاغ اس کو اس طرح پیش کرتے ہیں گویا سبھی مسلمان خوشیاں منا رہے ہیں۔ جس کرکٹ میچ کو ذرائع ابلاغ بہت کانٹے دار اور بڑا بنا کر پیش کرتے ہیں وہی میچ نہ صرف دو ملکوں کے درمیان ایک مقدس جنگ بن جاتا ہے بلکہ ذرائع ابلاغ کا ایک حصہ اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ بنا دیتا ہے اور یہ سب کچھ جانتے بوجھتے کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی ٹیم میں محمد اظہر الدین بھی ہے۔

اقلیتوں کو ایک سے ایک القابات دیئے جاتے ہیں کٹھ ملا کٹر اور بنیاد پرست اور چند افراد کی حرکت کو پوری برادری کی حرکت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی ایک مسلم عالم مسلمانوں کے نام کوئی اپیل جاری کرتا ہے تو اسے اپیل کی بجائے فتویٰ بنا کر پیش کریں گے کہ فتویٰ سب مسلمانوں پر لازم ہوتا ہے۔ ان میں سے شائد ہی کوئی یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر ایک معروف عالم بھی کوئی فتویٰ جاری کر دے تو وہ سب مسلمانوں پر لازم نہیں ہوتا۔ اسلام میں پروہت یا ملا کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی طرح ایک سیاسی اپیل کو بطور فتویٰ پیش کرنا بڑی غیر ذمہ داری کا کام ہے۔

شاہ بانو کے معاملہ میں تحریک کو سیکولر اخباروں سمیت ہندوستانی ذرائع ابلاغ میں پیش کیا گیا کہ یہ صرف مسلمان ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ ان کے حقوق سے انکاری ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر مضمون پر مضمون چھاپے گئے۔ پھر اچانک قومی پریس مسلمان خواتین کے حقوق کا چیمپئن بن گیا۔ سچ ہے کہ بعض قدامت پسند سکہ بند قسم کے مسلمانوں خصوصاً مسلمان قیادت نے رجعت پسندانہ مؤقف اختیار کر لیا۔ قیادت کا مسئلہ اسلام کی سربلندی نہیں تھا بلکہ یہ کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو بڑا لیڈر اور اسلام کا

بڑا ترجمان ثابت کیا جائے اور ذرائع ابلاغ میں معاملے کا یہی پہلو سامنے نہیں آیا۔ ہاں بہت سے روشن خیال مسلمان بھی تھے جو بنیاد پرست مسلمانوں کے خلاف تھے۔ان کا مؤقف کم ہی آیا۔اس زمانے میں ذرائع ابلاغ خصوصاً علاقائی اخبارات نے مسلمانوں کی بڑی ٹھکائی کی۔ اسلام میں عورتوں کے بارے میں اس سے بھی زیادہ ترقی پسندانہ تعلیمات ہیں مگر عورتوں کی رائے پر مردوں کے غلبہ کے باعث ان تعلیمات پر عمل نہیں ہوتا۔ یہ پہلو کہ اسلام میں تمام مذاہب یا قانونی نظاموں کے مقابلے میں عورت کو برتر مقام دیا گیا ہے اخباروں میں چھپنے والے تبصروں میں اس کا ذکر نہیں آیا۔

اس ضمن میں ایک اور مثال بابری مسجد رام جنم بھومی تنازع کی ہے۔ بلاشبہ بعض مسلمان رہنما موقع سے پورا پورا ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں مگر ذرائع ابلاغ جس طور پر معاملہ پیش کر رہا تھا وہ ان لیڈروں سے بھی دو ہاتھ آگے کا تھا۔ مقامی زبانوں کے اخباروں نے ہمیشہ یہ تاثر دیا کہ یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ بابر نے مندر گرایا اور اس پر مسجد بنا دی اور اب وقت آ گیا ہے کہ ہندو اپنی بے عزتی کا بدلہ لیں۔ مسجد کو ہٹا کر وہاں مندر تعمیر کریں۔ علاقائی اخبار خصوصاً ہندی اخباروں نے استہزائیہ انداز میں بار بار لکھا ہے کہ عجب بات ہے کہ ہندو اپنے ہی ملک میں مندر تعمیر نہیں کر سکتے۔ 1990ء میں جب یو پی کے وزیر اعلیٰ ملایم سنگھ یادیو نے کارسیوکوں کو ایودھیا تک نہیں پہنچنے دیا تھا تو یو پی کے بڑے ہندی اخبار نے انتہائی بڑھا چڑھا کر یہ خبر چھاپی اور کہا گیا کہ گولی چلنے سے سینکڑوں افراد مارے گئے اور یہ سب کچھ جھوٹ تھا اور نیشنل پریس کمیشن نے ایودھیا کے بارے میں غلط خبریں چھاپنے پر ان اخباروں کو سرزنش بھی کی تھی۔

اخبارات مناسب حد تک ہندوستانی مسلمانوں کے مثبت معاملات اور صفات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے بارے میں ایک مختلف (نا گوار سا) تاثر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کرنل وحید الدین نے کارگل کے محاذ پر لڑتے ہوئے جان قربان کردی۔ اس کی ماں نے کہا مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے جس نے ملک پر جان قربان کردی' کاش میرے زیادہ بیٹے ہوتے تو میں ان کو بھی ملک کی راہ میں قربان کر دیتی۔ یہ خبر اردو اور انگریزی اخباروں نے بھی نہیں چھاپی' میں نے یہ خبر ایک اردو اخبار انقلاب میں پڑھی۔ دی ایشین ایج نے خبر تو چھاپی مگر مناسب جگہ نہیں دی۔

سیکولرازم کے پاسدار اور اقلیتوں سے ہمدردی رکھنے والے اخباروں کے پاس ایسے رپورٹر

MashalBooks.org

اور تبصرہ نگار بھی نہیں جنہیں اقلیتی امور میں مہارت حاصل ہو اور اقلیتوں کے بارے میں بھرپور معلومات رکھتے ہوں۔ یہ سیکولر تبصرہ نگار بھی عموماً سب اقلیتوں کے ساتھ ایک سا سلوک کرتے ہیں اور ان کے مختلف مذہبی اور سیاسی پس منظر اور زاویوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب پنجاب میں خالصتان کی تحریک چل رہی تھی بہت سے اخباروں نے ایسے لکھا جیسے سارے ہی سکھ خالصتان کی حمایت کر رہے ہوں۔ جن سکھوں نے پنجاب میں انسانی حقوق کی کھلم کھلی خلاف ورزی کی شکایت کی تو ان پر بھی خالصتان سے ہمدردی رکھنے کا شبہ کیا گیا۔ لیکن اگر ایک طائرانہ نظر پنجاب کے اس مسئلے پر ڈالیں تو ظاہر ہوگا کہ سکھوں کی بہت بڑی آبادی جن میں خاص طور پر مذہبی سکھ شامل تھے کھلم کھلا اور مکمل طور پر خالصتان کے خلاف تھے۔ صرف جاٹ سکھوں کا ایک حصہ انتہا پسند تحریک کی حمایت اس لئے کر رہا تھا کہ ان کی سیاسی اور معاشی امنگوں کو کچلا جا رہا تھا۔ یہ بالکل تقسیم کے معاملے سے ملتا جلتا معاملہ تھا جس کی اقلیتی صوبوں کے بالائی طبقہ کے مسلمانوں نے اس لئے حمایت کی کہ ان کی معاشی اور سیاسی امنگوں کو آزاد ہندوستان میں ہندو اکثریت پورا نہیں ہونے دے گی۔ مذہبی تعصب نہیں بلکہ یہ خوف تھا جس نے انہیں تقسیم کی حمایت کی تحریک دی۔

حال ہی میں سنگھ پریوار نے عیسائی اقلیت پر حملے کئے یہ جھگڑا مذہب کی تبدیلی پر تھا۔ ذرائع ابلاغ خصوصاً شمال اور مغرب کے مقامی زبانوں کے اخباروں نے بھی عیسائیت کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا اور یہاں تک لکھ دیا کہ جیسے ہندوستان میں ہر عیسائی غیر عیسائیوں (ہندوؤں) کی تبدیلی مذہب کے لئے کام کر رہا اور تو اور بعض نے تو مدر ٹریسا کو بھی نہیں چھوڑا اور لکھا کہ وہ زبردستی لوگوں کو عیسائی بنا رہی تھیں۔ میں نے پورے ہندوستان میں بہت سے عیسائی حضرات سے بات چیت کی جو تبدیلی مذہب کے خلاف ہیں لیکن اخبار سب عیسائیوں کے کھاتے میں تبدیلی مذہب ہی کے گناہ ڈال رہے ہیں۔ وہ تبدیلی مذہب کی بجائے مکالمہ کے حامی ہیں۔ آج ہم جس شے کو بین المذاہبی مکالمہ کہتے ہیں اسے آج کے ہندوستان میں عیسائی تنظیموں نے ہی مقبول بنایا۔ اکبر نے قرون وسطیٰ میں اس مکالمے کا آغاز کیا تھا مگر پھر یہ روایت ختم ہوگئی بعض مسیحی تنظیموں نے اسے دوبارہ رواج دیا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط ہے کہ عیسائی تبدیلی مذہب کا کام بڑے زور و شور سے کر رہے ہیں۔ اخباروں نے تو نمایاں انداز میں لکھا کہ لوگوں کا مذہب تبدیل کرانے کے لئے عیسائی جبر بھی کرتے' فراڈ بھی اور لالچ بھی دیتے ہیں۔ تمام عیسائیوں کو مذہب

تبدیل کرانے کے پر جوش کارکن کہنا غلط ہے۔ مذہبی طرز فکر رکھنے والے سیاستدان اقلیتوں کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ اخباروں کے ایک حصے کی طرف سے یوں نمایاں کر کے چھاپا جاتا ہے جیسے یہی اور یہی سچ ہے۔

جب وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل نے ڈنگز میں عیسائی چرچوں اور ان کے کاروبار اور جائیدادوں پر حملے شروع کیے تو پھر گجراتی کے بڑے بڑے اخباروں نے عیسائیوں کے خلاف مخاصمانہ خبریں چھاپیں اور کھل کر مضامین لکھے۔ نہ صرف مضمون بلکہ خبریں بھی متعصّبانہ تھیں۔ فسادات کے دوران بھی مقامی زبانوں کے پرچوں نے مسلمانوں کے بارے میں خبروں میں بڑی رنگ آمیزی کی اور افواہوں کو اس طرح چھاپا گیا جیسے وہ تصدیق شدہ سچ ہو۔ احمد آباد میں بعض فسادات خصوصاً 1969ء اور 1985ء میں جنگل کی آگ کی طرح بھڑکے اس لئے کہ بعض گجراتی اخباروں نے افواہوں کو اس طرح شہ سرخیوں کے ساتھ چھاپا جیسے وہ سب کا سب سچ ہے۔ اگلے روز اندرونی صفحے پر ایک کارنر میں ان کی چھوٹی سی تردید چھاپ دی گئی جبکہ جو تباہی ہونی تھی ہو چکی تھی۔

ہر مذہبی اقلیت میں ہر قسم کے لوگ ہیں، آزاد خیال، سیکولر، جنونی یا مذہب اور بنیاد پرست، مگر سارے کے سارے نہ آزاد خیال ہوتے ہیں نہ سارے کے سارے بنیاد پرست مگر جب ان میں سے کچھ زیادہ باتیں کرنے والے متعصّبانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں تو اس کے لئے ساری برادری کو ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کے آزاد خیالی کی آواز کو اکثر دبا دیا جاتا ہے یا بہت ہی کم جگہ دی جاتی ہے اور پھر مسلمانوں کی اس ساری اکثریت کو بنیاد پرست یا جنونی کہنا شروع کر دیا جاتا جو بے شمار وجوہات کی بنا پر بے زبان ہے۔

ایک اور پہلو بھی گہری توجہ چاہتا ہے۔ قوم کی تعمیر میں اقلیتوں نے جو مثبت حصہ ڈالا ہے اور ڈال رہی ہیں ان کی نشر و اشاعت کی کوئی خاص کوشش ہی نہیں کی گئی۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے جدوجہد آزادی کی خاطر اپنی زندگیوں کی قربانی دی۔ خان عبدالغفار خان کی سربراہی میں پٹھانوں نے جو قربانیاں دیں انہیں کون فراموش کر سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے کئی قوم پرست مسلمانوں نے بے بہا قربانیاں دیں۔ ان کا ذکر اذکار ہمارے ذرائع ابلاغ میں شائد ہی کبھی آتا ہے۔ سیاست، عمرانیات، تحقیق، تعلیم غرضیکہ زندگی کے بے شمار شعبوں

MashalBooks.org

میں مسلمان اہم حصہ ڈال رہے ہیں مگر ان کا ذکر بھی کبھی بمشکل ہی ہوا۔ عمرانی علوم کے بعض نامور عالموں میں سے پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر مشیر الحسن، پروفیسر امتیاز احمد اور بہت سے دوسرے جن کے نام گنوانا ناممکن ہے، ان سب سے کئی متنازعہ مسائل پر سیکولر اور لبرل مؤقف اختیار کیا اور اپنے اپنے شعبوں میں قابل ذکر اضافہ کیا مگر ذرائع ابلاغ میں ان کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔

قوم کی تعمیر میں سکھوں اور عیسائیوں نے بھی بڑا اہم حصہ ڈالا ہے۔ عیسائیوں نے تو شعبہ تعلیم میں بہت بڑا کردار ادا کیا اگر ان کے تعلیمی ادارے نہ ہوتے تو ہزاروں ہندوستانی تعلیم کی ان بلندیوں تک پہنچنے سے محروم رہتے جہاں وہ پہنچے اور نام کمایا۔ لیکن جب کسی سیاستدان نے ان کے بارے میں تبدیلی مذہب کا تنازع کھڑا کیا تو ذرائع ابلاغ کے ایک حصے نے کچھ اس طرح تصویر کشی کی گویا اس ملک میں عیسائی صرف اور صرف مذہب تبدیلی کرانے کا کام کررہے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ہندوستان کی تمام برادریاں قومی تعمیر کے عمل میں شریک ہیں۔ اس کام پر کسی ایک برادری یا ذات کی اجارہ داری نہیں ہے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اکثر اوقات صورتحال کو رواں پس نظر میں دیکھنے کی بجائے ایک جامد ڈھانچے میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ نئی نئی صورت حال کے حوالے سے ہر اقلیت کے رویے میں تبدیلی آتی ہے۔ مثال کے طور پر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے پاکستان کے بارے میں رویے میں زمین آسمان جیسی تبدیلی آئی ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے میں پاکستان میں جو سیاسی تبدیلیاں آئی ہیں ان کی وجہ سے یہ رویے تبدیل ہوئے ہیں۔ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے کا زیادہ جوش خروش پایا جاتا ہے اور انہیں احساس ہوگیا ہے کہ اگر انہیں اپنے حالات کو بہتر بنانا ہے تو پھر تعلیم حاصل کرنا پڑے گی اور اگر آج وہ اس دوڑ میں پیچھے ہیں تو اس کی بڑی وجہ نئی تعلیم کی مخالفت نہیں بلکہ ان کی غربت ہے۔ روز بروز حقیقتیں تبدیل ہورہی ہیں اور ان تبدیلیوں کو اکثریت اور اقلیتیں دونوں جذب کررہی ہیں۔ اس سے ذرائع ابلاغ کو نہیں چاہئے کہ وہ اقلیتوں کو ایک جامد ڈھانچے میں رکھ کر دیکھیں۔

یہاں یہ ذکر بھی کردینا چاہئے کہ بہت سے اخبار رسالے اقلیتوں سے ہمدردی بھی رکھتے

ہیں اوران بڑی دلیری کے ساتھ ان کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں دی ہندو' دی ٹائمز آف انڈیا' دی سٹیٹسمین اور دی ٹیلی گراف کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح کچھ اور پرچے بھی ہیں۔ مقامی زبانوں کے اخباروں کے ایک حصے نے بھی ہمیشہ اس ضمن میں مثبت کردار ادا کیا ہے اور انہی اخباروں کی وجہ سے ہندوستان کی صحافت قابل فخر بنتی ہے۔

(31- جولائی 1999ء)

ہندوستان' اقلیتیں اور اکیسویں صدی

ہندستان دنیا کے بڑے جمہوری ممالک میں سے ایک ہی نہیں بلکہ اس ملک میں بڑی بڑی اقلیتیں بھی ہیں اور اس ضمن میں بھی اس کو انفرادیت حاصل ہے۔ صرف مسلمان ہی آبادی کا بارہ فیصد ہیں اور ان کی گنتی بارہ کروڑ ہے اگر ہم دوسری اقلیتوں کو بھی شامل کریں تو تعداد پندرہ کروڑ تک پہنچ جاتی ہے اور یہ کوئی معمولی تعداد نہیں ہے۔ یوں ہندوستان شروع دن سے ہی ایک کثیرالوجودی جمہوری ملک ہے۔ ہندوستان صحیح معنوں میں کثیرالوجودی ملک آج نہیں بنا یہ تو مدتوں سے کثیرالوجودی چلا آ رہا ہے۔ درحقیقت کثیرالوجودیت اس کا قابل فخر اثاثہ ہے۔ ایک طرف اگر کثیرالوجودیت آج کی سیکولر جدید قوم کیلئے قابل فخر معاملہ ہے تو دوسری طرف گمبھیر مسائل بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں۔

ایک صحیح جمہوریت نہ صرف افراد کے حقوق کی ضمانت دیتی ہے بلکہ ایک اقلیت کو بھی برادری ہی سمجھتی ہے۔ ہمارے آئین کی دفعہ 25 سے 30 تک میں بجا طور پر ان حقوق کو منضبط کر دیا گیا ہے جو اقلیتوں کو مذہبی اور ثقافتی میدانوں میں حاصل ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انہی حقوق کی وجہ سے ہندوستان لفظاً نہیں' حقیتاً بھی اور قانوناً بھی ایک صحیح جمہوری اور کثیرالوجودی ملک بنتا ہے۔ ان آئینی دفعات کے تحت اقلیتیں نہ صرف اپنے مذہب کو ماننے' اس کے مطابق عبادت کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے بلکہ اپنی منشا کے مطابق ادارے بنانے کیلئے بھی آزاد ہیں۔ یہ ایسے شاندار حقوق ہیں کہ جن پر آج دنیا کی کوئی بھی جدید قوم فخر کر سکتی ہے۔ ان حقوق کو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کی منظوری کے فوراً بعد 1950ء میں ہندوستان کے آئین میں شامل کر لیا گیا تھا۔

ہاں نیک ارادوں اور ان کی عملی تعبیر میں بہت بڑا فاصلہ رہا۔ آئین میں ان بنیادی حقوق

کوشامل کرنے کے باوجود اقلیتوں کو مسلسل بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تب سے اہم مسئلہ خصوصاً مسلمان اقلیت کا مسئلہ تحفظ تھا۔ اس ضمن میں بجا طور پر یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ عدم تحفظ تو تقسیم ہند کی وجہ سے پیدا ہوا۔ تقسیم کی وجہ سے اکثریت کے ذہن میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور جن مسلمانوں نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ان کو اس کیلئے قیمت بھی ادا کرنی پڑی، ہر چند وہ تقسیم کے ذمہ دار نہیں تھے۔ یہ دعویٰ بے دلیل نہ ہوگا کہ اگر اقلیتوں کے بارے میں یہی حقوق پہلے آئین میں شامل کر لئے جاتے یعنی آئین اگر 1947ء سے پہلے بنالیا جاتا تو وہ بہت سے مسلمان جو مسلم لیگ کے پروپیگنڈہ کے شکار ہوئے وہ تقسیم کو اتنی آسانی سے سیاسی مسائل کا حل نہ سمجھتے اور یوں یوپی اور بہار کے جن بہت سے مسلمانوں نے تقسیم کے منصوبے کو تسلیم کرلیا تھا، پاکستان بننے پر محسوس کیا کہ وہ تو دور پنجاب اور بنگال میں بنا ہے، اس کی سرحدیں تو ان کے صوبوں سے ہی دور ہیں۔ تقسیم دراصل مذہبی بنیادوں پر علیحدگی پسندی کی بنا پر کم اور زیادہ تر اقلیت کے دل میں اکثریت کے بارے میں پیدا ہونے والے خدشات کی بنا پر ہوئی تھی۔ پاکستان ہندوستان کے بالائی مسلم طبقوں کی اتنی ضرورت نہیں تھا مگر مسلم لیگ کے پروپیگنڈے نے جو بے اعتمادی پیدا کی اس کا نتیجہ تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق کی آئینی ضمانتیں دے دی جاتیں مگر یہ کام ہی وقت پر نہیں ہوا۔

جمہوریت میں ایک اقلیت کے بہت سے اور پیچیدہ مسائل ہوتے ہیں مگر اصولوں کی بنا پر ان کو حل کیا جاسکتا ہے۔ تقسیم سے پہلے کانگریسی قیادت کا ایک حصہ ان اصولوں کو مانتا تھا مگر ایک دوسرا حصہ جو اپنے رویے کی وجہ سے اکثریتی حصہ تھا وہ اقلیتوں کو برابر کے حقوق دینے کیلئے تیار نہ تھا جس کی وجہ سے بداعتمادی کی فضا پیدا ہوئی اور اس طرح علیحدگی پسند قوتیں مضبوط ہوئیں۔

اقلیتوں کے مسائل صرف باہمی مفاہمت اور اعتماد وایمان کی فضا میں ہی حل ہوسکتے ہیں اور اگر یہ باہمی اعتماد بحال کرلیا جاتا تو تقسیم کے بعد ہونے والی قتل وغارت سے بڑی حد تک بچا جاسکتا تھا اور تو اور آئین بن جانے کے بعد بھی اقلیتوں کے بارے میں بہت سے مسائل موجود رہتے، چنانچہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اگر چہ وہ سارے کے سارے تقسیم کے ذمہ دار نہ تھے مگر وہ سب تقسیم کی چکی کے پاٹوں میں پسنے لگے۔ ہندوؤں میں سے متعصب عناصر نے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے بارے میں جارحانہ پروپیگنڈا شروع کردیا۔ ان کی ملک

سے وفاداری کو مشکوک سمجھا گیا' ان پر پاکستان کے حامی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ آج یہ شکوک و شبہات یقیناً بہت کم ہو گئے ہیں مگر اب بھی بعض حلقوں میں بدستور موجود ہیں۔ فرقہ وارانہ پروپیگنڈہ میں مسلمانوں کی وفاداری ایک بڑا موضوع بن گیا۔ واضح رہے کہ ہندوستان کے لوگوں کے لئے بھی ایک قومی ریاست یا ملک بنانے کا پہلا تجربہ تھا۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے لوگ رجواڑوں میں رہتے تھے اور انہیں ہی اپنا ملک یا وطن کہتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ریاست کے حکمران کے وفادار ہوتے۔ دونوں نے اپنے اس وطن کی حفاظت کیلئے جان کی قربانی بھی دی۔ اس لئے ایک برادری یا دوسری برادری (ہندو یا مسلم) کی وفاداری کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

تاہم آزادی کے بعد دو الگ الگ قومی ریاستیں ہندوستان اور پاکستان بن گئیں تو ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا میں وفاداری کا بہت بڑا سوال پیدا ہوا۔ بہت سے فسادات میں ایک ہی نعرہ لگتا تھا۔ مسلمان جاؤ پاکستان یا مسلمان جاؤ قبرستان' یہاں پر بھی کہہ دینا چاہئے کہ 1947ء میں دو الگ الگ ملکوں کے وجود میں آنے کے بعد سب سے زیادہ پریشان ہندوستان کے مسلمان ہوئے۔ بعض واقعی یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اس لئے ان کا اصلی وطن وہی ہے مگر ایسی سوچ رکھنے والے مسلمانوں کو اس وقت شدید صدمہ ہوا جب 1971ء میں پاکستان دولخت ہوا' اس طرح ان کے فکر میں بھی تبدیلی آئی۔ پھر جب پاکستان میں مہاجروں کا مسئلہ پیدا ہوا (یعنی ہندوستان کے خاص علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے پاکستانی) تو اس کا اثر بھی ہندوستان مسلمانوں کی سوچ پر پڑا۔ پاکستان میں مہاجروں کو اجنبی ہی نہیں سمجھا جاتا تھا انہیں لسانی اقلیت بھی بنا دیا گیا تھا' یہی نہیں شیعہ مسلمانوں کو بھی طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے بھی خود کو اقلیت سمجھنا شروع کر دیا۔ ان وجوہ کے باعث اب پاکستان کو محض مسلمانوں کا وطن نہیں سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان کے واقعات کے باعث یہ فسوں سازی بھی ختم ہو گئی۔

مگر پھر بھی بداعتمادی جاری رہی۔ اسی کی رہائی میں اس بداعتماد نے قوم پرستی کا رنگ اختیار کرنے کی بجائے مذہبی رنگ چڑھا لیا۔ ایک طرف شاہ بانو کیس کا جھگڑا تھا دوسری طرف رام جنم بھومی کا تنازع' مسلمان قیادت اپنے مذہب کے مقابلے میں سیکولرازم اور نیشنل ازم کی روح کی دھجیاں اڑا رہی تھی۔ سیکولر نظام حکومت کے تحت رہتے ہوئے مسلمانوں پر واجب ہے

کہ وہ بعض مسائل پر نظر ثانی کریں اور معاشرتی مسائل کے بارے میں مذہبی احکام کو حتمی اور نا قابل تبدیل سمجھنا چھوڑ دیں۔ ماضی میں بھی علماء نے اپنے زمانے اور اپنے معاشرتی مسائل کے حوالے سے قرآن کی تعلیم کو پیش کیا تھا۔

وہ ہندو جو بابری مسجد کو گرا کر رام مندر بنانا چاہتے ہیں' انہیں خیال کرنا چاہئے کہ ایک جدید ریاست کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جہاں اگر اکثریتی رویوں پر زور دیا جائے تو وہ ملک کو مضبوط کرنے کی بجائے کمزور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آج ایک جدید قومی ریاست کو ایک آئین اور سیکولر قوانین کے ذریعے ہی چلایا جا سکتا ہے۔ اگر اکثریت اپنے رویوں کو لاگو کرنے پر اصرار کرے گی تو جمہوری طرز حکومت کو سخت مسائل کا سامنا کرنا ہوگا۔ اکثریتی طرز فکر پر اصرار سے قوم پرستی (نیشنل ازم) کی روح کو بھی نقصان پہنچے گا۔ اگر اقلیتیں خود کو مکمل طور پر محفوظ نہ سمجھیں تو جدید جمہوریت چل ہی نہیں سکتی یہ تحفظ فراہم کرنا جمہوری حکمرانی اور ثقافت کا حصہ ہے۔

بیسویں صدی کے عین آخر میں اب عیسائی اقلیت پر حملے شروع ہو گئے ہیں اور انہوں نے خود کو غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ مسلمانوں پر تو یہ الزام تھا کہ وہ ملک سے وفادار نہیں' عیسائیوں پر یہ الزام ہے کہ وہ ہندوستانیوں کا مذہب تبدیل کر کے انہیں عیسائی بنا رہے ہیں' اگر تبدیلی مذہب دباؤ یا لالچ یا فراڈ کے ذریعے کرایا جائے تو وہ غلط ہے ورنہ آئین مذہبی تبلیغ اور تبدیلی مذہب کی اجازت دیتا ہے۔ مذہب تبدیل کرنے کا حق بھی بنیادی حقوق میں شامل ہے۔ اگر کسی کا مذہب فراڈ دباؤ کے تحت تبدیل کروایا جائے تو وہ آئین کا نہیں قانون کا مسئلہ ہے اور اسے قانونی طور پر حل کرنا چاہئے۔ مگر یہاں تو سب کے سب عیسائیوں پر ایسے حملہ کیا گیا ہے جیسے سارے کے سارے تبدیلی مذہب پر لگے ہوئے ہیں اور تبدیلی مذہب پر پابندی لگانے کا مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے۔ یہ مطالبہ اس لئے جائز نہیں کیونکہ یہ آئینی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

ہم اس قسم کے دل و دماغ کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اکیسویں صدی تو جمہوریت اور انسانی حقوق کی صدی ہے۔ اگرچہ یہ زمانہ نوآبادیات کا تھا مگر جمہوریت نے انیسویں صدی میں جڑ پکڑنا شروع کی' تاہم انیسویں صدی میں جمہوریت کے بیج بوئے گئے جو بیسویں صدی میں اس وقت پھوٹنا شروع ہوئے جب ایک کے بعد دوسری نوآبادی

نے آزادی حاصل کرنا شروع کی۔ لیکن یہ درخت پوری طرح ثمر بار اگلی صدی (اکیسویں صدی) میں ہوں گے۔ تیسری دنیا کے بعض سابق نوآبادیاتی ممالک میں اس صدی میں جمہوریت کا استحکام تو دور کی بات ہے وہاں ابھی جمہوریت آئی ہی نہیں' تاہم ہندوستان کو اس بات پر فخر ہے کہ یہ اپنے یوم آزادی سے ہی جمہوری ملک بن کر ابھرا ہے۔ اب سوال جمہوریت کے مزید استحکام' سالمیت اور بہتر معیار کا ہے۔ جمہوریت کے معیار کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ اپنی اقلیتوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں کیونکہ اصل جمہوریت میں تو اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ اور باوقار سلوک ہونا چاہئے۔

ہندوستان میں اقلیتوں کو جو مسائل درپیش ہیں وہ مستقل نوعیت کے نہیں عارضی قسم کے ہیں۔ جمہوریت کا معیار اس وقت بہتر ہوگا جب اقلیتوں کو قومی تعمیر میں مثبت اور تخلیقی حصہ لینے کیلئے پورے مواقع فراہم کئے جائیں گے اور اس کیلئے بھی اقلیتوں کو زیادہ مثبت اور تعمیری رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ معاشرے کے تمام طبقوں میں جمہوری ثقافت کا نفوذ ہونا چاہئے۔ کثرت الوجودیت کو تسلیم کیا جائے اور عورتوں کو بھی برابری اور عزت کا پورا پورا احساس ہو۔ ضروری اصلاحات جلدی ہی کرنا پڑیں گی' تاہم کسی پر اس کے لئے جبر نہ کیا جائے کیونکہ یہ سب کچھ جمہوری عمل کے تحت ہونا چاہئے۔ اکیسویں صدی باہمی مکالمہ کی صدی ہوگی۔ جمہوری کلچر' باہمی اعتبار و اعتماد پیدا کرنے کیلئے مکالمے کا کلچر بہت ضروری ہے۔ اکثریت اور اقلیتوں دونوں کو احساس ہونا چاہئے کہ مخاصمت تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور مکالمہ باہمی مفاہمت اور تعمیری رویے کے فروغ کا سبب بنتا ہے۔

اکثریت کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ اقلیتیں جس قدر خود کو محفوظ سمجھیں گی وہ اس قدر ملک کی تعمیر اور خوشحالی میں حصہ ڈالیں گی۔ اقلیتوں کو احساس ہونا چاہئے کہ وہ قومی تعمیر کے عمل میں جس قدر حصہ ڈالیں گے اسی قدر ان کا احترام کیا جائے گا۔ دونوں یعنی اکثریت اور اقلیت مل کر ہی اگلی صدی میں بہتر معیار جمہوریت حاصل کر سکتی ہیں۔

15-دسمبر1999ء

بی جے پی اور گجرات میں اس کی جڑیں

اگرچہ بی جے پی کو پورے ہندوستان میں خصوصاً رام جنم بھومی کے باعث 80 کی دہائی

میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا مگر گجرات میں اسے بڑی جلدی عروج حاصل ہوا اور اس کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بی جے پی نے اس مغربی صوبے میں بڑے مضبوط قدم جما لئے ہیں۔ وہ واحد صوبہ ہے جس میں بی جے پی کے خاندان (پریوار) کے دوسرے رکن وشوا ہندو پریشد، راشٹریہ سیوک سنگھ، بجرنگ دل نہ صرف اپنے نظریے سے مضبوطی سے وابستہ ہیں بلکہ ان کا رویہ بھی جارحانہ ہے۔ یوپی میں تو بی جے پی کو گزشتہ انتخابات میں لوک سبھا کی کئی نشستوں سے محروم ہونا پڑا اور اسے خوف ہے کہ آئندہ ضمنی الیکشن میں شائد اس کی طاقت اور کم ہو جائے مگر گجرات میں اس نے اپنی حیثیت قائم رکھی اور آنے والے دنوں میں بھی اسے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہی نہیں وزیر اعلیٰ کیشو بھائی پٹیل کی حکومت جس انداز سے چل رہی ہے اس سے لگتا ہے کہ گجرات میں اسے کوئی ذرہ سا بھی خطرہ نہیں ہے۔ پھر اس سال جنوری میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں بی جے پی کو 48 میں سے 30 میونسپل کمیٹیوں میں غلبہ حاصل ہو گیا یعنی اسے شہری اور نیم شہری علاقوں میں بھی بالا دستی حاصل ہے۔ لوک سبھا کے گزشتہ انتخابات میں کانگرس کو سخت مار پڑی، اب کے پھر ناکام ہوئی اور لوگوں کا اعتماد حاصل نہ کر سکی۔

بی جے پی نے جو انداز گجرات میں اختیار کر رکھا ہے اس کا اصل نصب العین یہی ہے جسے اس نے دوسرے صوبوں اور مرکز میں خفیہ رکھا ہوا ہے کیونکہ وہاں وہ دوسری پارٹیوں سے اتحاد کے بعد اقتدار میں آئی ہے۔ بی جے پی دعوے کرتی ہے کہ اس نے ہندوتوا والا ایجنڈا ترک کر دیا ہے اور اب اس کا ایجنڈا نیشنل ڈیموکریٹک الائنس کے ساتھ مشترک ہے یوں بی جے پی کا اب یہ کہنا ہے کہ وہ نہ تو ایودھیا میں رام مندر بنانے کا ارادہ رکھتی ہے نہ کامن سول کوڈ نافذ کرنا چاہتی ہے نہ آئین کی دفعہ 370 کو منسوخ کرنا چاہتی ہے جس کے تحت کشمیر کو خاص حیثیت حاصل ہے۔ بی جے پی نے اپنے چنائی اعلان میں واضح کر دیا ہے۔ ''بی جے پی نیشنل ڈیموکریٹک الائنس کے ایجنڈے کے علاوہ اور کوئی الگ ایجنڈا نہیں ہے۔ دراصل اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ (بی جے پی) نے اعلان کیا تھا کہ ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر ان کی حکومت کا ایجنڈا ہے۔ اس بیان پر مرکز میں بی جے پی کی اتحادی جماعتوں ڈی ایم کے، ایم ڈی ایم کے، جنتا دل (یو) اور ترنمل کانگرس نے شدید اعتراض کیا تھا، چنانچہ ان پارٹیوں کے شکوک دور

کرنے کیلئے چنیائی میں یہ اعلان کیا گیا کہ بی جے پی کا ایجنڈا این ڈی اے کے ایجنڈے کے سوا اور کچھ نہیں' اس بیان سے ایک اور معاملہ سے بھی راز کشی تھی۔ پی جے پی کے کچھ ارکان نے پارلیمنٹ میں ذبح گاؤ اور سول کوڈ پر ایک پرائیویٹ بل پیش کیا ہے۔ اس اظہار لاتعلقی کے باوجود بی جے پی کو اپنے سرگرم عناصر کی دلداری بھی کرنا تھی۔

چنیائی میں ایل کے ایڈوانی کو بھی اپنے پختہ سیرت عناصر کے جذبات کو ملحوظ رکھ کر کہنا پڑا کہ بی جے پی اپنے نظریے میں پانی نہیں ڈالی رہی۔ انہوں نے بی جے پی کے امیدواروں اور کارکنوں کو مشورہ دیا کہ وہ عقیدے کے کٹڑ پن کا شکار نہ ہوں اور یہ کہنا غلط ہے کہ بی جے پی اقتدار کی خاطر اپنے نظریے کے بارے میں نرم رو ہوگئی ہے۔ ایڈوانی نے بی جے پی کی نیشنل کونسل کے دوروزہ اجلاس میں الوداعی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پارٹی ملک میں تبدیل ہوتے حالات کے موافق موٴقف وضع کر رہی ہے۔ بی جے پی بہت سی تبدیلیوں سے گزری ہے اور یہ بھی ایک ایسی ہی تبدیلی ہے۔ وقت کے پیش کیئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بی جے پی نے زیادہ زور نیشنلزم اور کردار پر دیا جبکہ ان پر نظریے اور آدرشوں کا غلاف چڑھا دیا۔

کیا بی جے پی واقعی وقت کے چیلنجوں کا مقابلہ کر رہی ہے یا موجودہ حالات میں صرف برسر اقتدار رہنے کیلئے کچھ خاص تدبیریں کر رہی ہے؟ مگر ان دوصورتوں میں بڑا ہی فرق ہے۔ بی جے پی کی حکومت جو کچھ گجرات میں کر رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے ایڈوانی کی یہ بات قابل اعتبار نہیں لگتی کہ بی جے پی وقت کے چیلنج کا جواب دے رہی ہے بلکہ لگتا ہے کہ بی جے پی اپنا اصل نظریہ چھوڑے بغیر موجود حالات میں خود کو ڈھال رہی ہے۔ بی جے پی کو جہاں دوسری سیکولر پارٹیوں سے مل کر حکومت کرنا ہوتی ہے وہاں بی جے پی کا روپ بڑا متوازن ہوتا ہے مگر جہاں یہ تن تنہا حکمران ہے وہاں اس کا چہرہ بڑا کرخت ہے۔ اگر بی جے پی کی یہ بات واقعی صحیح ہے کہ اس کا کوئی اپنا ایجنڈا نہیں صرف این ڈی اے والا ہی اس کا ایجنڈا ہے تو پھر گجرات جیسے صوبوں میں جہاں یہ برسر اقتدار ہے اس کا رویہ کیوں بدل جاتا ہے؟ کیا اس کا مطلب ہے کہ اس کی حکمرانی کے دو معیار ہیں۔ ایک این ڈی اے والا اور دوسرا اس کا اپنا۔ بات یہی یقینی لگتی ہے۔

یہ دیکھیں کہ بی جے پی کی حکومت گجرات میں کیا کرتی رہی ہے؟ 25 دسمبر 1998ء سے

ڈانگز میں عیسائیوں پر حملے شروع ہوئے۔ وشوا ہندو پریشد عیسائیوں پر حملے کر رہی تھی مگر اس بارے میں سرکاری مشینری اور قانون خاموش تماشائی بنا رہا۔ پھر پریشد اور ہندو ایکتا منچ کو گجرات سرکار نے ضلع سورت کے ڈانگز کے عیسائی علاقے میں رام مندر بنانے کی اجازت دے دی۔ اس سے پیشتر گجرات کی حکومت نے یقین دلایا تھا کہ وہ عیسائی علاقے کے پاس کسی مندر کی تعمیر کی اجازت نہیں دے گی۔ یہ زمین ایک ایسے ہندو سے وقف کرائی گئی جو پہلے ہندو سے عیسائی بنا پھر ہندو بن گیا۔

حکومت گجرات نے ایک سرکاری چٹھی کے ذریعے سرکاری ملازموں کو راشٹریہ سیوک سنگھ کا رکن بننے کی اجازت دے دی۔ یہ اعلان جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے 3 جنوری 2000ء کو جاری کی گئی گشتی چٹھی میں کیا گیا ہے۔ (مرکزی حکومت کی طرف سے اجازت ملنے کے بعد) معاملے پر غور کرتے ہوئے صوبائی حکومت نے راشٹریہ سیوک سنگھ کا نام ان تنظیموں کی فہرست سے فارغ کر دیا جن پر پابندی لگی ہوئی ہے۔ سرکاری سرکلر 89-6-5 میں ان ممنوع تنظیموں کے نام درج تھے۔ یوں سرکاری ملازم اب آر ایس ایس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کیلئے آزاد ہیں۔ انسان یہ سوچ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ گجرات کی انتظامیہ کی غیر جانبداری اور راست روی کا کیا بنے گا۔ پہلے ہی انتظامیہ سیاسی آقاؤں کے زیر اثر ہوتی ہے اور اب وہ حکومت کے ایک نظریاتی شعبے میں بھی داخل ہو گئی ہے کہ سرکاری سول ملازموں اور سیاسی حکمرانوں میں امتیاز تک کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اگر پولیس افسر آر ایس ایس میں شامل ہو جاتے ہیں تو کیا فرقہ وارانہ فسادات کو روکتے وقت غیر جانبداری کی معمولی سی جھلک بھی دکھا سکیں گے؟ چنانچہ جو لوگ فرقہ وارانہ امن و آشتی کے لئے کام کر رہے ہیں ان میں اس نئے اجازت نامے کے بارے میں بڑی تشویش پائی جاتی ہے۔

قدرتی بات ہے کہ آر ایس ایس والے گجرات حکومت کے اس اقدام سے بڑے خوش ہیں اور اب وہ چاہتے ہیں کہ مرکزی حکومت بھی گجرات کی پیروی کرے۔ آر ایس ایس گجرات میں سنکلپ مشیر کی سطح سے مرکزی حکومت کو گجرات کی پیروی کرنے کیلئے کہا گیا ہے اور یہ بھی کہ وہ بھی سرکاری ملازموں کو آر ایس ایس میں شامل ہونے کی اجازت دے دے۔ اگر بی جے پی مرکز میں حکومت بنائے رکھنے کے لئے دوسری بائیس پارٹیوں کے مرہون احسان نہ ہوتی تو یہ کب کی آر ایس ایس کو ممنون احسان کر چکی ہوتی۔ بہر طور بات یہ بھی ہے کہ گجرات کی

حکومت نے بھی مرکز کی وزارت داخلہ سے اجازت لے کر آر ایس ایس پر سے پابندی ہٹائی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس اقدام کے باوجود مرکز میں بی جے پی کی اتحادی جماعتیں ایک طرف سیکولرازم کی قسمیں کھاتی ہیں دوسری طرف کسی نے بھی وزارت داخلہ کی طرف سے اجازت دینے کے سوال پر اشارتاً بھی انگلی نہیں اٹھائی۔ اب وشوا ہندو پریشد والوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ سرکاری ملازموں (مرکزی) کو آر ایس ایس میں شامل ہونے کی اجازت دی جائے۔

اب اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ گجرات کا صوبہ ہندوستان کے صنعتی اعتبار سے انتہائی ترقی یافتہ صوبوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں بی جے پی کی اس قدر نشو ونما کیسے ہوئی؟ کیا صنعتی ترقی کے بعد سول سائٹی کچھ سیکولر نہیں ہو جاتی ہے۔ یہ مفروضہ دراصل بہت سے دائیں بازو کے دانشوروں کا تھا۔ یہ بات بھی ہے کہ ایک وقت میں گجرات میں فرقہ وارانہ صلح وآشتی کے عظیم علمبردار مہاتما گاندھی بھی پیدا ہوئے مگر آج اسی صوبہ میں فرقہ پرستی نے گڑھ بنالیا ہے۔ جہاں تک سماجی ماحول کا تعلق ہے یہ سیدھے خط کی طرح حرکت نہیں کرتا۔ اکثر اوقات یہ پیچدار نقشہ بناتا ہے۔ یوں ہمیں گجرات میں آزادی سے لیکر اب تک کے حالات میں بی جے پی کی اس حیرت انگیز توسیع وترقی کی وجوہ جاننا پڑیں گی۔

یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ ایک زمانے میں گجرات میں انتہائی سخت جاگیردارانہ معاشرہ تھا۔ چند عشرے پہلے تک اس علاقے خصوصاً سوراشٹرا میں بہت سے والیان ریاست اور شہزادے تھے۔ اس علاقے میں بی جے پی آج بھی بہت مضبوط ہے مگر قبائلی علاقے میں بہت ہی کمزور ہے۔ اس لئے سنگھ پریوار کے کارکن سب سے مضبوط قبائلی علاقے ڈانگز پر حملے کرتے ہیں۔ گجرات میں بی جے پی کا پھلنا پھولنا کوئی اچانک یا حادثاتی بات نہیں ہے۔ جن سنگھ (1980ء سے پہلے بی جے پی کا یہی نام تھا) 1952ء میں قائم ہوا اور اسی زمانے سے یہ گجرات میں اپنی جگہ بناتا چلا گیا۔ ساٹھ کی دہائی کے آخر میں اس نے اپنی گرفت مضبوط کرلی پھر 1969ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں جن سنگھ کا مقصد اندرا گاندھی کی حکومت کو کمزور کرتا تھا کیونکہ یہ حکومت اپنے سیکولر نعروں وغیرہ کے ذریعے اقلیتوں کی بہروریاں حاصل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ جن سنگھ کو یہ سب کچھ ناپسند تھا اس لئے وہ اندرا حکومت کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔

کانگرس نے بہت دیر تک گجرات میں بلاشرکت حکومت کی مگر پھر کئی اسباب کے باعث اس کا زوال شروع ہو گیا۔1968ء میں پہلی تقسیم کانگرس میں ہوئی۔ مرار جی دیسائی کانگریس (او) میں تھے جب گجرات کی حکومت پر ان کا قبضہ ہوا۔1969ء میں جب فسادات ہوئے اس وقت ہتیندر دیسائی کا جو مرار جی کا پروردہ تھا وزیر اعلیٰ تھا۔ کانگرس میں تقسیم کے باعث اس کی بہت سی قوت ضائع ہو گئی۔ جب ستر کی دہائی کے شروع میں اندرا کانگرس دوبارہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی تو جلدی ہی پھر مصائب میں گھر گئی۔ جے پرکاش نرائن نے رشوت ستانی کے خلاف اپنی مہم کا آغاز صوبہ گجرات سے کیا۔ کہا جاتا ہے کہ چمن بھائی پٹیل سب سے زیادہ راشی مشہور تھا۔ اس لئے عوام کی رائے کے دباؤ کے باعث اسے مستعفی ہونا پڑا۔ آر ایس ایس اور جن سنگھ نے در پردہ اس تحریک میں بڑا حصہ لیا اور پھر اس اعزاز کا دعویٰ بھی کیا۔ جن سنگھ کے منہ کو اس وقت تک اقتدار کا مزہ نہیں لگا تھا اس لئے وہ بدعنوانی کے خلاف ہر تحریک میں سرگرم ہوتا۔ رشوت ستانی کے خلاف اس تحریک نے جن سنگھ کو مضبوط کیا۔ اسے آر ایس ایس والوں نے بھی بڑی مدد دی۔

فروری 1985ء میں سولنکی نے گجرات اسمبلی کا الیکشن دو تہائی اکثریت سے جیتا۔ یہ الیکشن گھام فارمولا کے تحت جیتا گیا۔ سولنکی نے کھتری، ہری جن، آدی واسی اور مسلم فارمولا بنایا۔ ان کے لئے نشستیں ریزرو کیں۔ گجرات کے پٹیل ذات کے لوگ سیاسی اور معاشی طور پر بہت ہی مضبوط ہیں۔ انہوں نے ذات پات اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر فسادات کرا دیئے اور ڈیڑھ سال کے عرصہ میں سولنکی کی حکومت کو گرانے میں کامیاب ہو گئے۔1969ء کے بعد 1989ء میں احمد آباد میں خوفناک فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جو ڈیڑھ سال تک جاری رہے۔ چنانچہ سولنکی حکومت کی ناکامی کے بعد گجرات میں کانگرس کی کمر ٹوٹ گئی۔ کانگرس پس ماندہ اور اقلیتی طبقوں کی حمایت بھی کھو بیٹھی، دوسری طرف پٹیلوں نے مختلف اقلیتوں اور طبقوں کے لئے حصے نامزد کرنے کے خلاف تحریک چلا دی۔ خود سولنکی حکومت نے یہ نامزدگی ختم کر دی۔ سولنکی کی اس ابن الوقتی سے کانگرس کو ایسی ضرب لگی کہ یہ اب تک سنبھل نہیں سکی۔ بی جے پی نے سولنکی حکومت کو گرانے میں کردار ادا کیا اور اپنی پوزیشن پکی کر لی۔ یہ اور پھلی پھولی۔ سولنکی کے بعد گجرات میں کانگرس کے پاس کوئی قدآور لیڈر ہی نہیں رہا تھا۔ ووٹروں میں اس کی ساری کشش ختم ہو گئی اور اسے کمزور اور بدعنوان پارٹی سمجھا جانے لگا۔

MashalBooks.org

بی جے پی نے خود کو ذرا بہتر اور مختلف قسم کی پارٹی کے طور پر پیش کیا اور موجود خلا کو پر بھی کیا۔ بی جے پی کے مضبوط ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ جنتا دل کا دعویٰ تھا کہ وہ معاشرے کے کمزور حصوں، دلت، پس ماندہ ہندوؤں اور اقلیتوں کی آواز ہے۔ مگر گجرات میں اس کی قیادت بدقسمتی سے چمن بھائی پٹیل کو دے دی گئی جسے انتہائی بدعنوان قرار دے کر وزارت اعلیٰ سے پہلے ہی ہٹایا گیا تھا، چنانچہ جنتا دل عوام کی نظر میں بچا ہی نہیں، گجرات میں اس کی جڑ لگ ہی نہیں سکی۔ یو پی میں تو دلت نے کانشی رام جیسا لیڈر پیدا کیا۔ مگر گجرات کے دلت نے کانشی جیسا لیڈر پیدا نہیں کیا۔ اس طرح نچلے طبقوں نے ملایم سنگھ یادیو پیدا کیا۔ بدقسمتی سے تمام لوگوں کے سوا تھوڑی بہت کشش بی جے پی میں ہی رہ گئی اور اب تک ان کی وابستگی بی جے پی سے ہی ہے۔ شنکر سنگھ وگھیلا کا تعلق تو پس ماندہ طبقوں سے ہے۔ وہ بی جے پی سے الگ ہوئے اور اپنی پارٹی بنا لی اور پھر کانگرس میں شامل ہو گئے۔ مگر وہ بھی دلت اور دوسرے پس ماندہ لوگوں کو اپنے ساتھ نہ لا سکے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ خود طویل عرصہ تک بی جے پی سے وابستہ رہے دوسرے لوگوں نے یہ دیکھا کہ وہ صرف اقتدار کی خاطر بی جے پی سے الگ ہوئے ہیں نہ کہ دلت پس ماندہ لوگوں اور اقلیتوں کے بھلے کے لئے لڑنے کی خاطر۔

یہ ہیں وہ چند وجوہات جن کی بنا پر بی جے پی گجرات میں بلاشرکت غیرے حکومت کر رہی ہے اور اسے اس وقت تک کوئی خطرہ بھی لاحق نہیں ہوا۔ گجرات میں بی جے پی کی جگہ لینے کے لئے کانگرس کو بڑی ہی محنت کرنا پڑے گی۔ (15- جنوری 2000ء)

بی جے پی اور اس کے 20 سال

ابھی بی جے پی کو وجود میں آئے بیس سال ہی ہوئے ہیں۔ 1980ء میں مرار جی دیسائی کی سرکردگی میں قائم جنتا سرکار کے گرنے کے بعد بی جے پی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ 1979ء میں جنتا حکومت کا خاتمہ بڑا ڈرامائی تھا۔ مادھولیاتے، راج نرائین اور ان جیسے دوسرے سوشلسٹوں نے دو بڑی سیاسی رکنیت (دو جماعتی رکنیت) کا سوال اٹھایا تھا۔ اصل میں جے پرکاش نرائن کی ہدایت پر بہت سی پارٹیوں کانگرس او، لو سوشلسٹ پارٹی اور جن سنگھ کو ملا کر جنتا پارٹی بنائی گئی تھی۔ جن سنگھ پکی فرقہ وارانہ جماعت تھی مگر اندرا کانگرس کو شکست دینے کے لئے کہ نہ صرف دوسری پارٹیوں میں ضم ہونے پر متفق ہو گئی بلکہ سیکولرازم اور گاندھین سوشلزم پر بھی اتفاق کر

گئی۔ یہی نہیں اس نے جے پرکاش نرائن کی ہدایت پر دہلی میں گاندھی جی کی سمادھی پر قسم بھی اٹھائی' عہد بھی کیا۔ یہ اپنے عہد پر کس حد تک کاربند رہی۔ یہ دوسری بات ہے۔ نئی وابستگی اور نئے نظریاتی روپ کی خاطر جن سنگھ کا نام بی جے پی رکھ دیا گیا اور اٹل بہاری واجپائی کو متوازن لیڈر سمجھتے ہوئے اس کا سربراہ بنادیا گیا۔

مگر بی جے پی کا یہ معتدل سا روپ تھوڑی دیر ہی رہا۔ تیزی سے تبدیل ہوتی سیاسی صورتحال نے بی جے پی کو اجازت نہ دی کہ یہ اپنے نئے نظریاتی روپ کو برقرار رکھ سکے۔ چنانچہ اس نے تیزی سے اپنی اصلیت کی طرف لوٹنا شروع کردیا۔ سیاسی میدان میں دم پخت کر دینے والی سیاسی تبدیلیاں آرہی تھیں مگر آر ایس ایس نے اپنی ہیت اور اصلیت تبدیل کرنے سے انکار کردیا اور حقیقت یہی ہے کہ دو جماعتی رکنیت کے سوال کے باعث ہی جنتا پارٹی کی حکومت ٹوٹ گئی۔ آر ایس ایس نے اپنے ان ارکان کو جن سنگھ کے بھی رکن تھے آر ایس ایس کی رکنیت چھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔ اس وقت جن سنگھ کے تمام صف اول کے لوگ عموماً آر ایس ایس کے رکن بھی تھے۔ چنانچہ جب سوشلسٹ ممبر جن سنگھ والوں سے پوچھتے کہ اگر انہوں نے سیکولرازم اور گاندھی والا سوشلزم اختیار کرلیا ہے تو وہ بیک وقت دو جماعتوں (جنتا پارٹی اور آر ایس ایس) کی رکنیت کیسے رکھ سکتے ہیں۔ جن سنگھ والوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ آر ایس ایس نے اپنی من مانی کی اور آر ایس ایس سے انہیں مستعفی ہونے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ آخر میں انہوں نے آر ایس ایس کی رکنیت برقرار رکھی' جنتا پارٹی کی رکنیت چھوڑ دی اس طرح جنتا حکومت ٹوٹ گئی۔

آر ایس ایس بی جے پی کے دائیں بازو پر بدستور اثر انداز رہا۔ بی جے پی نے شروع میں سیکولرازم اور گاندھی والے سوشلزم کو اپنا نظریہ بنائے رکھا مگر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آر ایس ایس کے اس بارے میں بڑے سخت تحفظات تھے' تاہم جن سنگھ کے ارکان نے اس بارے میں عہد کر رکھا تھا اس لئے وہ اسے اتنی جلدی ترک نہیں کرسکتے تھے۔ وہ حالات کی تبدیلی کا انتظار کرتے رہے۔ آر ایس ایس والے اپنے ہندو راشٹر والے نظریے کے بارے میں بہت واضح ذہن رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک سیکولرازم اور سوشلزم دونوں غیر ملکی نظریے ہیں جو ہندوستان کو موافق نہیں۔ آر ایس ایس نے اس معاملہ پر آج تک سمجھوتہ نہیں کیا جبکہ بی جے پی نے مرکزی حکومت میں ایسی متعدد پارٹیوں سے اتحاد بنا رکھا ہے جو سیکولر پارٹیاں ہیں۔

مسز گاندھی مابعد ایمرجنسی 1977ء کا الیکشن ہار گئیں مگر 1980ء میں پھر اقتدار میں آ گئیں۔ اگرچہ انہیں ماقبل ایمرجنسی کے مقابلے میں کم نشستیں ملیں۔ 1977ء میں وہ دیگر وجوہ کے علاوہ اس باعث بھی الیکشن ہار گئیں کہ وہ مسلم ووٹروں سے دور ہوگئی تھیں۔ 1980ء میں مسلمانوں نے پوری طرح ان کا ساتھ نہیں دیا اس لئے 1980ء میں انہیں کم نشستیں ملیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی بجائے ہندوؤں کو اپنی طرف متوجہ کر کے کمی پورا کرنے کیلئے سیاسی پالیسی تبدیلی کر لی۔ یہ بات ان کی انتخابی اور دوسری تقریروں سے بالکل عیاں تھی۔ تامل ناڈو کے ضلع منیا کشی پورم میں جب چندرات لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تو دشوا ہندو پریشد اور آر ایس ایس والے بہت سرگرم ہوگئے۔ سیاسی اہمیت بھی انہیں حاصل ہوگئی تو اندرا گاندھی نے ان کے ساتھ بھی فاصلے کم کرنے کی کوشش کی۔ اندرا نے تو متھرا میں وشوا ہندو پریشد کی طرف سے تعمیر کئے جانے والے بھارت ماتا مندر کا افتتاح کرنے کا بھی فیصلہ کرلیا تھا مگر بعد میں کسی معقول مشورے نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔

اندرا گاندھی کا یہ رویہ بی جے پی کے لئے بڑا چیلنج بن گیا۔ اندرا گاندھی اپنے میدان کے مطابق بازی کھیل رہی تھیں۔ انہوں نے مسئلہ پنجاب کو بھی اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح سب میں فرقہ وارانہ مقابلہ شروع ہوگیا جس سے سیاسی منظر اور بھی سنگین ہوگیا۔ پھر اندرا گاندھی اپنی ہی پالیسیوں کا شکار ہوگئیں۔ بلیو سٹار اپریشن کروایا تو اپنے سکھ باڈی گارڈ کے ہاتھوں قتل ہوگئیں۔ ان کی ''شہادت'' کا لوگوں نے پاس کیا اور قتل کے بعد کے الیکشن میں کانگرس کو دو تہائی اکثریت حاصل ہوگئی۔ 1984ء کے انتخابات میں بی جے پی کو صرف دو نشستیں ملیں۔ اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اٹل بہاری واجپائی کی معتدل پالیسی کام نہیں کرے گی اور سوشلزم اور سیکولرازم بھی کامیابی کا کوئی منتر نہیں ہیں۔ بی جے پی کے اس بحران کے دوران آر ایس ایس نے بھی اپنی بالادستی پر زور دیا۔

اب بی جے پی نے 1980ء میں اختیار کردہ پالیسی کو یک قلم ترک کر کے اپنی اصل فرقہ وارانہ پالیسی اختیار کرلی۔ اٹل بہاری واجپائی کی جگہ لعل کرشن ایڈوانی نے لے لی جنہوں نے جنگ جویانہ رویہ اپنایا اور اصل جن سنگھ والے سیاسی فلسفے پر آ گئے۔ بی جے پی کے بڑے لیڈروں کو یقین تھا کہ راسخ عقیدے والے ہندوؤں کی حمایت حاصل کرلیں گے۔ ایڈوانی کی قیادت میں بی جے پی نے نہرو والے سیکولرازم کے سامنے سوالیہ نشان لگا دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ

نہرو والے سیکولرازم پر نہ صرف مغرب کے اثرات ہیں بلکہ اس کے ذریعے اقلیتوں کی بھی چاپلوسی کی گئی ہے۔ نہرو والے سیکولرازم کو مکمل طور پر رد کرتے ہوئے ایڈوانی نے اپنے "مثبت سیکولرازم" کا نظریہ پیش کر دیا اور مثبت سیکولرازم کی تعریف یہ کی کہ "انصاف سب کے لئے فرق کسی سے نہیں"۔

اسی کی دہائی کے درمیان بی جے پی کو بالائی ذاتوں کے ہندوؤں میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اگر تقسیم سے پہلے کی مسلم لیگ اور تقسیم کے بعد بی جے پی کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو دونوں میں بہت سی مشابہت اور مشترکہ نکات نظر آئیں گے۔ دونوں جماعتوں نے بالائی طبقے کی ضرورت کو پورا کیا۔ مسلم لیگ بھی بالائی طبقوں، مسلم اشراف، زمینداروں ان کے نور نظر، اوپر والی افسر شاہی، پولیس اور فوج کی پارٹی تھی۔ معروف عمرانی ماہر حمزہ علوی نے موخر الذکر کو سیلیریا (تنخواہ دار) طبقہ کا نام دیا ہے۔ اسی طبقہ نے مسلم لیگ کی مکمل حمایت کی اور لیگ نے جواباً ان کی خواہشات کو پورا کیا اور آخر کار انہی طبقوں کی تمناؤں کو پورا کرنے کیلئے پاکستان وجود میں آ گیا۔

بی جے پی بھی درمیانے طبقے کے بالائی حصے کے اونچی ذات کے ہندوؤں کی بہتر معاشی مقام اور اعلیٰ ملازمتوں کی خواہشات کو پورا کرتی ہے۔ مسلم لیگ نے مذہبی نعرے استعمال کئے اور اسی کی روشنی میں اپنا فلسفہ مرتب کیا۔ بی جے پی نے ایل کے ایڈوانی کی سرکردگی میں ہندونواز انداز بھی اختیار کیا اور ان کے نزدیک زیادہ "مراعات یافتہ اقلیتوں" خصوصاً مسلمانوں کے خلاف اوپری ہندو طبقہ کے جذبات بھڑکائے۔ اس طرح زیادہ تر ہندو اشراف بہت خوش ہوئے۔ دریں اثنا بی جے پی نے کوئی بھی موقع ضائع نہیں جانے دیا۔ اس کے لئے رام جنم بھومی اور شاہ بانو تو خداداد موقع ثابت ہوئے۔ ہندوؤں نے انہی سیاسی ضرورتوں اور نئے سیاسی راستوں کی خاطر شاہ بانو کیس کو استعمال کیا۔ بی جے پی نے ہندونواز پرانے گھنگھور بیانوں اور تقریروں کے ذریعے مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس اور گہرا کیا۔ دوسری طرف اسی کی دہائی کے درمیانے سالوں میں بہت سے فسادات ہوگئے۔ چنانچہ مسلم قائدین نے مسلمانوں کے اس عدم تحفظ کے احساس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہندوتوا کے بارے میں بلند بانگ پروپیگنڈہ اور فسادات نے مسلمان عوام کو شدید عدم تحفظ کا شکار بنا دیا۔ اس طرح شمال کی طرف کی مسلم قیادت کے لئے صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا بڑا نادر موقع نکل آیا۔ پھر مسلمان

قیادت نے سیدھا مخاصمانہ رویہ اختیار کیا' بی جے پی نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا۔ بظاہر یہ بڑی بے معنی بات نظر آئے گی مگر بی جے پی نے اپنے پیروکاروں کو باور کرایا کہ اکثریت میں ہونے کے باوجود انہیں جنگ جو اقلیتوں نے محاصرے میں لے رکھا ہے۔ درمیانے طبقے کے بہت سے ہندوؤں نے سنجیدگی سے محاصرے کے نظریے کو قبول کرلیا۔ بی جے پی کے حامی اخبار نویس نے یہاں تک کیا کہ بمبئی کے ایک انگریزی اخبار کو خط لکھا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ پہلے مرحلے پر آئندہ دس سال کے لئے اقلیتوں کو حق رائے دہی سے محروم کردیا جائے۔

شاہ بانو کیس کا احتجاج ختم ہوا تو بی جے پی نے بابری مسجد رام جنم بھومی پر اپنے احتجاج کو تیز تر کردیا۔ ہندو ووٹروں کی زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرنے کیلئے اس جھگڑے کو پوری طرح استعمال کیا گیا۔ چنانچہ بی جے پی نے فصل بھی خوب کاٹی 1984ء میں اسے صرف دو نشستیں ملی تھیں۔ 1989ء میں اسے لوک سبھا میں 89 نشستیں حاصل ہوگئیں۔ یہ درست ہے کہ جنتا دل کے وی پی سنگھ کو کانگرس کی ناکامی مقصود تھی اس لئے جنتا دل نے بی جے پی سے نشستوں کے بارے میں باہمی مفاہمت سے الیکشن لڑا۔ وی پی سنگھ پر کانگرس حکومت کو گرانے کا غلبہ اس قدر تھا کہ انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ ہندوتوا کے سیاسی فلسفے کی پرچارک بی جے پی جیسی پارٹی کے ساتھ نشستوں کی مفاہمت اور مطابقت قائم کررہے ہیں۔

وی پی سنگھ نے 1989ء میں بی جے پی کی مدد سے حکومت بنائی اور 8 اگست 1990ء کو منڈل کمیشن رپورٹ پر عملدرآمد کا اعلان کردیا۔ بی جے پی نے تو اپنی طاقت ہی ہندو ووٹوں' ہندو نواز فلسفہ کی بنا پر بنائی تھی اور منڈل کمیشن ہندوتوا کے لئے ہی بہت بڑا چیلنج ہے۔ بی جے پی نے صورتحال سے نمٹنے کے لئے رام جنم بھومی کی مہم اور تیز کردی۔ ایڈوانی نے اپنی رتھ یاترا کا اعلان کردیا جسے ٹائمز آف انڈیا نے لہو یاترا کہا کیونکہ ملک میں چھوٹے بڑے تین سو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ وی پی سنگھ کے کہنے پر ایڈوانی کو لالو پرشاد یادو کی حکومت نے بہار میں بھی گرفتار کرلیا اس کے نتیجے میں یادو کی حکومت ٹوٹ گئی۔

اپنے قیام سے لے کر اب تک بی جے پی کی تاریخ کا تاریک ترین دن 6 دسمبر 1992ء کا ہے جب بابری مسجد کو گرایا گیا اور جس کے بعد دسمبر 1992ء اور جنوری 1993ء میں ممبئی کے فسادات ہوئے۔ بی جے پی نے نیشنل انٹیگریشن کونسل کو یقین دلایا اور سپریم کورٹ میں حلف

نامہ داخل کیا کہ کارسیوا سے مطلب یہ نہیں کہ مسجد کو گرایا جائے گا اس کے باوجود مسجد کو گرا دیا گیا۔ ہولناک واقعات احتجاجی اور فرقہ وارانہ سیاست کے باعث وقوعہ پذیر ہوئے۔ مگر بی جے پی ہر قیمت پر اقتدار پر قبضہ کرنے پر تلی ہوئی تھی اور اس نے یہی کچھ کیا' البتہ احتجاجی طرز میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی۔

بی جے پی مرکز میں اقتدار میں آ تو گئی مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ اسے ہندوتوا کا نظریہ بھی ترک کرنا پڑا۔ پہلے بھی اس نے سیکولرازم اور گاندھی والے نیشنلزم سے وابستگی کی تھی صرف اقتدار کی خاطر۔ مگر پھر اقتدار کی خاطر اسے بھی چشم زدن میں ترک کر دیا گیا۔ اقتدار کے لئے نظریے اپنانا اور چھوڑنا ہندوستان ایسے کثیر المذاہب والے ملک کی جمہوری سیاست میں جو سکھم کا باعث ہے۔ مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے بڑے قومی رہنماؤں نے مذہبی اکثریت والی صورت کے مقابل ہندوستان کو مضبوط بنانے کی خاطر سیکولرازم اور اس کے سیاسی فلسفے کو اپنایا تھا مگر بی جے پی کا خیال ہے کہ زیادہ مذاہب ہی ہندوستان کی کمزوری ہیں۔ اس نے سیکولرازم کے تصور کو رد کر دیا گیا۔ چنانچہ اب تک ہندوستان ان دو امتیازی اصولوں کے درمیان جھول رہا ہے۔ مگر ایک مستحکم جمہوری نظام کی ضمانت صرف سیکولر اور رواداری کا رویہ ہی دے سکتا ہے۔ فرقہ وارانہ چیلنج کا مقابلہ صرف سیکولر اقدار سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا اتحاد مشترکہ سول کوڈ' آئین کی دفعہ 370 کی منسوخی یا رام مندر کی تعمیر سے مضبوط نہیں ہو سکتا۔ سب مذاہب کے لئے احترام اور قوم کی تعمیر کے لئے متحدہ کوشش ہی ہمارے اتحاد کی ضامن ہو سکتی ہے۔ (31-16 مئی 2000ء)

بی جے پی اور مسلمان

بی جے پی کے ناگپور والے اجلاس میں منتخب کئے گئے نئے صدر بنگارو لکشمن نے بی جے پی کے کارکنوں سے کہا کہ وہ مسلمانوں سے سیاسی رابطے کریں۔ انہوں نے اور بھی بہت کچھ کہا مگر تقریر کے اس حصے کے بارے میں مختلف تبصروں کے لئے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی۔ بے شمار سیاسی مبصروں نے اس پر تبصرہ کیا۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ بیان بی جے پی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کیونکہ اب تک بی جے پی کا اقلیتوں سے مخاصمانہ رویہ رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بنگارو لکشمن نے جو خود دلت ہیں مسلمانوں کو خوش کرنے کی کوشش

کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ وزیراعظم واجپائی کی پسند ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانوں کے حق میں یہ رویہ بھی واجپائی کے اشارے پر ہی اختیار کیا گیا ہو۔ لکشمن نے عہدیداروں کی جو ٹیم بنائی ہے اس میں بھی زیادہ تر واجپائی کے لوگ ہی ہیں' جنہیں آر ایس ایس کا وفادار سمجھا جا سکتا ہے' ان کی تعداد صرف تین ہے۔

کیا یہ متحدہ یا مخلوط سیاست کی مجبوری ہے یا واقعی بی جے پی کے نظریہ سازوں کی صحیح معنوں میں قلب ماہیت ہوگئی ہے؟ بہرطور ہر میدان میں اتنی تیزی سے تبدیلیاں آ رہی ہیں کہ بی جے پی اب اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے بارے میں معاندانہ رویہ رکھ ہی نہیں سکتی اور اگر وہ ایسا کرے بھی تو اسے بڑی مہنگی سیاسی قیمت دینا پڑے گی۔ جن لوگوں کی بی جے پی کی جنگھل دار تاریخ پر نظر ہے۔ انہیں خبر ہے کہ بی جے پی کی سیاسی تاریخ میں کبھی بھی نظریاتی تسلسل نہیں رہا۔ بشیاما پرشاد مکرجی نے ذرا وسیع بنیادوں پر جن سنگھ کی بنیاد رکھی تھی اور انہیں آر ایس ایس کے نظریہ سازوں سے اس بات پر اتفاق نہیں تھا کہ نظریاتی پوتر تا رکھی جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ جمہوریت میں ایسی پوتر تا ممکن نہیں۔ بشیاما پرشاد مکرجی نہرو کے وزیر بھی رہے اور ان کے نظریات آر ایس ایس کی تنگ نظر فرقہ وارانہ سیاست سے مختلف تھے۔

لیکن جن سنگھ اپنے آپ کو آر ایس ایس کی گرفت سے کبھی آزاد نہ کرا سکا۔ اکثر کوئی سر پھرا ہی اس کا صدر بنا اور ان میں سے ایک بلراج مدھوک بھی تھے۔ جب وہ 1967ء میں جن سنگھ کے صدر بنے تو انہوں نے جنگ جویانہ انداز اختیار کرلیا۔ رانچی کے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستانی بنایا جائے جیسے وہ پہلے ہندوستانی نہیں ہیں اور ابھی ابھی سرزمین عرب سے آئے ہیں' تاہم جن سنگھ میں این دیال اپرادھیا قسم کے لوگ بھی تھے جنہوں نے مربوط انسانیت پسندی کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ مسلمان ہمارا خون اور ضمیر ہیں' مگر انہیں بڑے پراسرار طریقے سے دھکا دے کر چلتی ٹرین سے گرایا اور مار دیا گیا۔

پھر ایمرجنسی کے دوران جن سنگھ کے نظریہ سازوں نے ایک بار پھر اپنا رنگ بدلا اور کہا جیل میں جماعت اسلامی کے رہنماؤں سے مل کر ہم مسلمانوں کو بہتر طور پر جان گئے ہیں۔ یہی نہیں آر ایس ایس کے بعض لیڈروں نے بھی اس قسم کے بیانات دیئے۔ یہی نہیں بلکہ جن سنگھ کے لیڈر سوشلسٹوں اور دوسروں کے ساتھ مل کر جنتا پارٹی بنانے پر تیار ہوگئے اور جے پرکاش نرائن کے کہنے پر اپنا فرقہ وارانہ انداز تبدیل کر کے سیکولر بننے کے لئے تیار ہوگئے۔ تب واجپائی

MashalBooks.org

حزب اختلاف کے لیڈر تھے۔ انہوں نے شاہی مسجد کے امام کے ساتھ مل کر مسلمان ووٹروں کو جنتا پارٹی کی حمایت میں ووٹ ڈالنے کی مہم چلائی اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں نے جنتا پارٹی کو ووٹ دیئے۔ بہرطور جنتا پارٹی سے ادغام کے باوجود یہ اپنے آپ کو آر ایس ایس کی جکڑ سے آزاد نہ کرا سکا۔ پھر دو جماعتوں کی رکنیت (آر ایس ایس اور جنتا پارٹی) یا دوہری رکنیت کے تنازع پر جن سنگھ کو نقصان ہوا۔ اس نے جنتا پارٹی سے علیحدگی اختیار کی اور اپنے اصل روپ میں آ گیا۔

پھر اسے شناخت کا بحران پیش آیا۔ اس نے مہاتما گاندھی کی سادھی پر عہد کیا کہ اس کا نظریہ سیکولر اور گاندھی والا سوشلزم ہوگا۔ اس پالیسی کو دوبارہ ترک کر کے دوبارہ فرقہ وارانہ انداز اختیار کرنا بڑا خفت آمیز ہوتا۔ اس لئے اس نے نام بدل کر بھارتیہ جنتا پارٹی کی شکل میں نیا جنم لے لیا اور اٹل بہاری واجپائی سربراہ بن گئے۔ اسی قیادت میں اس نے 1984ء کے پارلیمانی الیکشن لڑے اور شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اس نے صرف دو نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ یعنی بی جے پی کو سیکولرازم اور گاندھی والا سوشلزم راس نہیں آیا۔ اس نے اس لئے جلدی ہی یہ بہروپ بھی اتار پھینکا اور ایل کے ایڈوانی کی قیادت میں فرقہ وارانہ روپ اوڑھ لیا۔ رام جنم بھومی کے مندر کے دروازے کھول کر راجیو گاندھی نے بی جے پی کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر ایک ایسا موضوع یا مسئلہ دے دیا جس کی بی جے پی کو اشد ضرورت تھی۔

یہ سخت گیر فرقہ وارانہ انداز بی جے پی کو بڑا راس آیا اور اس کی وجہ سے پارلیمنٹ میں اس کی نشستیں بڑھتی گئیں حتیٰ کہ تعداد 182 تک جا پہنچی۔ رام جنم بھومی والی مہم کے دوران بی جے پی نے اپنا بنیادی گھیراؤ وسیع کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ دلت اور دوسرے نچلی ذات کے ہندوؤں کو حامی بنائے بغیر وہ کسی صورت میں بھی پارلیمنٹ میں زیادہ نشستیں حاصل نہیں کر سکتی۔ حکومت بنانا تو دور کی بات ہے۔ شروع میں یہ صرف اونچے طبقہ کی آریہ ورت پارٹی تھی۔ مگر اب اس نے دراوڑی اور دوسرے نمبر آریائی لوگوں کو اعتماد میں لینا شروع کیا۔ مگر اسی کی دہائی کے آخر اور نوے کی دہائی کے شروع میں اس نے اپنے دروازے جب نچلی ذات کے ہندوؤں پر بھی کھول دیئے تو اس کا رویہ مسلمانوں کے بارے میں مزید سخت ہوتا گیا۔ دراصل جب اس نے اچھوت ہندوؤں سے اپنا فاصلہ کم کیا تو اس کے ساتھ ہی ''مسلم اچھوتوں'' سے فاصلہ بڑھا لیا۔ اسی مرحلے پر اس پارٹی نے اس بات پر بھی فخر کرنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کے ووٹ اور

ان کی حمایت ناگزیر نہیں ہے اور یہ کہ ہم ان کی حمایت کے بغیر بھی جیت سکتے ہیں۔ اصلاً یہ اشارہ کانگرس کے لئے تھا کہ اسے مسلمانوں کو چاپلوسی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہاں یہی وہ مرحلہ تھا جس پر اس نے ہندوتوا نصب العین وضع کیا اور جسے اس نے بڑے زورشور سے مقبول بنایا۔

تاہم یہ دور بھی کوئی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہا۔ اسے جلدی احساس ہوگیا کہ مذہبی حقوق کو زیادہ دیر تک التوا میں نہیں رکھا جاسکتا اور نہ ہی اصل مسائل کو زیادہ دیر تک ٹالا جاسکتا ہے۔ اپنے ہندوتوا ایجنڈے کے باعث کوئی بھی اس کے قریب نہیں پھٹکا۔ اس نے بہت سی پارٹیوں کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی مگر 1998ء میں یہ صرف 13 دن تک حکمران رہ سکی۔ چنانچہ اب کے اس نے پھر اپنا نظریاتی پینترہ بدل دیا اور ہندوتوا کے بارے میں سخت رویہ نرم کرلیا۔ نیشنل ڈیموکریٹک الائنس (این ڈی اے یا قومی اتحاد) بنایا اور مشترکہ سیاسی لائحہ عمل وضع کیا اور محض اسی مشترکہ ایجنڈے کے سبب یہ اقتدار میں آئی۔

بائیس دوسری جماعتوں کے ساتھ اتحاد کے باوجود بی جے پی شدید قسم کے بحران کا شکار ہے۔ یہ ایک خاص مقام تک تو پہنچ گئی ہے مگر اب اسے مزید نشوونما میں بڑی مشکل کا سامنا ہے۔ ایک گجرات کا صوبہ ایسا ہے جہاں پر یہ کسی کی مدد کے بغیر اقتدار میں ہے اور اسے کسی دوسری سیاسی پارٹی کی طرف سے کوئی چیلنج بھی درپیش نہیں، باقی تمام صوبوں میں اسے شدید مشکلات درپیش ہیں۔ یو پی جیسے صوبوں میں تو یہ جامد سی ہوکر رہ گئی ہے بلکہ وہاں اس کی حمایت میں کمی آرہی ہے۔ یو پی میں اندرونی خرشے بھی تھے اور سنگین خارجی چیلنج بھی۔ اونچی ذات کے ہندو اس سے مایوس ہوکر دوسری پارٹیوں کا رخ کررہے ہیں۔ کلیان سنگھ کی قیادت میں پس ماندہ ذات کے ہندوؤں نے بھی بی جے پی کی حمایت کی تھی، مگر کلیان سنگھ کے پارٹی سے نکالے جانے کے بعد وہ بھی بی جے پی کی طرف سردمہر ہوگئے ہیں۔ بہار میں یہ اور دوسری پارٹیوں کی چھوٹی ساتھی نے اس کے سارے کے سارے حربے بہار پر لالو پرشاد یادو کی گرفت کو کمزور نہیں کرسکے۔

پارلیمنٹ میں سیٹوں کی تعداد اور مسلمانوں کی آبادی کے حوالے سے یو پی اور بہار کے صوبے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں ذات پات کی بنا پر ہندو ووٹ منقسم ہوئے۔ اس لئے اقتدار کی خواہش مند کسی بھی پارٹی کے لئے مسلمانوں کے ووٹوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی

ہے اور اگر ہندوؤں کے حوالے سے کوئی خاص لہر نہ چل رہی ہو تو بی جے پی یہاں ہندوتوا کے حوالے سے اپنے ہندو ووٹ بینک کو بھی پکا نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے اسے دوسرے زمروں میں آنے والے ووٹوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔ بی جے پی میں تسلسل اور ثابت قدمی کبھی بھی نہیں رہی کیونکہ اس کے لئے سب سے زیادہ اہم اقتدار کا حصول ہے۔ بعض دوسری پارٹیاں تو شاید نظریاتی اعتبار سے بڑی پکی رہی ہیں۔ ان کے برعکس یہ کہنا غلط ہوگا کہ بی جے پی کی نظر میں سب سے بلند تر مقام نظریاتی پوترتا کو حاصل ہے۔ انہوں نے ''پارٹی......مگر ذرا مختلف'' کا نعرہ لگایا تو اس لئے کہ جو ووٹر دوسری پارٹیوں سے مایوس ہو چکے ہیں' انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا جائے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اقتدار کی سیاست بدعنوانی' موقع پرستی اور ووٹ بینک کی سیاست کے معاملہ میں جن سنگھ اور بی جے پی دوسری پارٹیوں سے ہرگز مختلف نہیں ہیں۔

بی جے پی نے اقتدار کا مزہ بھی چکھ لیا ہے۔ اس لئے یہ ہر قیمت پر اقتدار میں رہنا چاہتی ہے۔ آج بی جے پی کے پاس بعض اہم وزارتیں اور اختیار ہے جہاں بہت پیسہ ہے' جہاں یہ کلیدی اسامیوں پر اپنے لوگ مقرر کر سکتے ہیں اور اپنی مرضی کے اداروں کو فنڈز سے نواز سکتے ہیں۔ اس بات سے آر ایس ایس بھی بخوبی آگاہ ہے۔ اس لئے وہ سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں میں کلیدی اسامیوں پر اپنے افراد کو مقرر کروا رہا ہے۔ چنانچہ اگر اقتدار مسلمانوں کی دلجوئی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے تو یہ مسلمانوں کو خوشامد سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ اسی کی دہائی میں اس نے بڑے فخر سے کہنا شروع کیا تھا (مسلمان ووٹروں کی حمایت کے بغیر بھی اقتدار حاصل کیا جا سکتا ہے) مگر اسے بخوبی علم ہے کہ اگر اسے پھر اقتدار میں آنا ہے تو مسلمانوں کے ووٹوں کا حصول ناگزیر ہے۔ یہ اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اور اب آر ایس ایس کی منظوری سے بی جے پی دلت اور مسلمانوں دونوں کی منت سماجت کر رہی ہے۔ آر ایس ایس نے کافی سوچ بچار کے بعد لکشمن کے مؤقف کی فوراً حمایت کر دی۔ بی جے پی کے لیڈر یہ بھی جانتے ہیں کہ لکشمن نے مسلمانوں کو بی جے پی میں شامل ہونے کا جو بلاوا دیا ہے وہ زیادہ کارگر نہیں ہوگا۔ بعض کی تعبیر یہ ہے کہ لکشمن کا روئے سخن مسلمانوں کی بجائے آزاد خیال ہندوؤں کی طرف تھا۔ ہو سکتا ہے یہ سچ ہو اور ہو سکتا ہے سچ نہ

ہو مگر دراصل مخلوط سیاست کے اس دور میں بی جے پی اپنے اتحادیوں کے سامنے اپنی پاک دامنی کا مظاہرہ کرنا چاہتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح چند مسلمان بھی پارٹی میں آ جائیں۔ ان دنوں بی جے پی میں کوئی قابل ذکر مسلمان نہیں ہے۔ سکندر بخت مختلف وجوہ کی بنا پر الگ تھلگ ہوگئے۔ مختار نقوی میدان سیاست میں کوئی زیادہ وزنی شخصیت نہیں ہیں۔

آر ایس ایس اور بی جے پی کے دانشور خوب بحث مباحثہ کے بعد ہی کوئی موقف اختیار کرتے ہیں۔ ہر سیاسی موقف پہلے پوری طرح سے پرکھا جاتا ہے پھر اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے بی جے پی کا صدر پارٹی اور اصل جماعت سے اجازت لئے بغیر مسلمانوں کو بی جے پی کی طرف راغب کرنے کے بارے میں اتنا اہم بیان جاری ہی نہیں کرسکتا۔ اس قسم کے بیان کا دوہرا فائدہ بھی ہے۔ اس طرح بی جے پی کے ساتھیوں کو ایک بار پھر باور کرائے گا کہ بی جے پی صرف فرقہ وارانہ جماعت نہیں جو اقلیتیوں کے خلاف ہے بلکہ اس پر یہ تہمت اس کے دشمن لگاتے ہیں۔ ''چنانچہ بی جے پی کی حمایت میں آپ کسی قسم کی خفت محسوس نہ کریں''۔

یوں بی جے پی آر ایس ایس کی منشا اور علم کے مطابق ایک پیچیدہ کھیل کھیل رہی ہے اور اگر چند سیاسی اقتدار کے خواہش مند مسلمان بی جے پی میں شامل ہو بھی جائیں پھر بھی مسلمان عوام تو بی جے پی کی حمایت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور جب تک بی جے پی سنگھ پریوار کی رکن ہے مسلمان اس کی ہرگز حمایت نہیں کریں گے۔ بی جے پی نہ تو اس بندھن سے باہر آ سکتی ہے نہ باہر آنا چاہتی ہے۔ یہ سنگھ والوں کی تال پہ ہی سیاسی ناچ ناچے گی۔ ہندوستان جیسی رنگارنگ جمہوریت میں ہٹ دھرمی اور پوترتا بہت بڑی رکاوٹیں ہیں اور سنگھ پریوار اس سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بڑھوتری میں کوئی سخت رخنہ پڑے۔ بعض مسائل پر لچکدار یا بے لچک رویہ رکھ سکتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ لوگ یہ سمجھیں کہ وہ واقعی اپنے میں لچک رکھتے ہیں۔ چنانچہ بنگارو لکشمن کی طرف سے بی جے پی کے کارکنوں کو مسلمانوں تک رسائی حاصل کرنے کی تلقین اسی مشق کا حصہ ہے۔ سنگھ پریوار کی نظریاتی زرہ بندی اس کے اپنے کارکنوں میں بھی کی گئی ہے۔ پریوار کا سربراہ آر ایس ایس ہے جو نظریاتی پوترتا کا محافظ ہے۔ وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل حقوق کے بارے میں شور ڈالتے ہیں اور عسکری رویہ اختیار کرتے ہیں جبکہ بی جے پی خود کو سیاسی نفاست اور لچک کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس طرح آخرکار لکشمن راجیہ نہیں رام راجیہ کی جے رہے گی۔

MashalBooks.org

(16- ستمبر2000ء)

آر ایس ایس: اقلیتی نقطۂ نظر سے

راشٹریہ سوئیم سیوک سنگھ 1925ء میں یوم وجے دشمی کے موقع پر منفی بنیادوں پر ڈاکٹر ہیڈگیواڑ نے قائم کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان غنڈوں کی دست درازیوں سے بچانے کیلئے نوجوان ہندوؤں کو (جنگی) تربیت دی جائے۔ ان دنوں یہ خیال عام تھا اور بعض پڑھے لکھے لوگ بھی یہی سمجھتے تھے کہ مسلمان جھگڑالو اور غنڈے ہیں جبکہ ہندو بزدل ہیں۔ سنگھ کا رونا تھا کہ ہندوؤں کو بھی بہادر بنایا جائے اور اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے بارے میں اس قسم کی منفی سوچ کے ساتھ سنگھ کی عمر 75 برس ہوگئی ہے۔ جس تنظیم کا وجود ہی ان منفی جذبات کا مرہون منت ہے اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ اس کا اقلیتوں کے بارے میں رویہ صحت مندانہ اور متوازن ہوگا۔

مسلمان، ہندو یا کسی بھی دوسری مذہبی اقلیت کو زبان، ثقافت وغیرہ کے اعتبار سے یکساں یا یک رنگ نہیں سمجھا جا سکتا۔ تمام مذہبی فرقے مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ان کی الگ الگ ثقافتی روایات ہیں اور ان کے اندر بھی گروہ اور فرقے ہیں جو اپنے مقدس صحیفوں کی تعبیر مختلف انداز میں کرتے ہیں۔ آر ایس ایس ان مذہبی اقلیتوں کو یک وجودی یا یک رنگی سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سارے ہندو اور سارے مسلمان ایک ہی انداز میں سوچتے ہیں اور ان کے اپنے اپنے مشترک مفاد ہیں۔ دوسری تمام شہادتوں کی موجودگی میں بھی آر ایس ایس اس موقف سے چمٹا ہوا ہے اور آر ایس ایس اس سلسلے میں تنہا بھی نہیں، ہندو مسلمان سکھ سبھی بنیاد پرست اسی انداز میں سوچتے ہیں۔

ڈاکٹر ہیڈگیواڑ کے جانشین گرو گولواکر تھے جو مسلمانوں اور عیسائیوں کو غیر ملکی سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ (مسلمان اور عیسائی) مہمان کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے، مہمانوں کو یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ واپس اپنے وطن کو جانا چاہئے۔ مفروضہ یہ ہے کہ مسلمان اور عیسائی باہر سے حملہ آور ہوئے اور یہاں حاکم بن بیٹھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر مسلمان اور عیسائی دلت اور پس ماندہ ذات کے ہندو ہی تھے جنہوں نے یہ مذہب قبول کئے۔ انہوں

نے اپنے ہندو آباؤ اجداد سے مفلسی، جہالت، پس ماندگی اور جسم کا رنگ تک ورثے میں پایا اور پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ انہیں زبردستی یا دھوکے سے مسلمان یا عیسائی نہیں بنایا گیا بلکہ وہ اس لئے ان مذاہب کی طرف آئے کہ یہاں ان سے بہتر سلوک ہوا اور انہیں انسانی عزت و وقار دیا گیا۔ انہیں مسجدوں اور گرجوں سے اٹھا کر باہر نہیں پھینکا گیا۔ وہ کم از کم نظریے کی حد تک ان مذہبی فرقوں میں برابر کا مقام حاصل کر سکتے تھے۔

آر ایس ایس کے دانشور اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ہندو تلوار کی مدد سے مسلمان بنائے گئے تھے۔ وہ بعض بکھری پڑی مثالیں اکٹھی کر کے ایک ہی ہلے میں اس قسم کے بیان داغ دیتے ہیں اور یہ طریقہ غیر علمی اور غیر تاریخی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دلت اور اچھوتوں میں سے بہت سوں نے مسلمان صوفیا کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ انہیں ان صوفیا کی سادگی، لگن، بود و باش اور مقامی زبانوں اور ثقافتوں کے بارے میں احترام اچھا لگا۔ بہت سے صوفیا مثلاً راجستھان سے ناگور کے حمید الدین ناگوری تو مکمل ہندو خود بن گئے تھے۔ ایک گائے پال رکھی تھی اور کاشتکار بن کر رہے۔ اجمیری لنگر میں کبھی گوشت نہیں پکایا جاتا، وہ ان ہندوؤں کے احترام میں جو عقیدت کے تحت خواجہ معین الدین اجمیری کی درگاہ پر آتے ہیں بہت سے صوفیوں نے پنجابی، بھوج پوری، مراٹھی، کنڑی، سندھی اور تامل ایسی علاقائی زبانوں میں شاعری کی اور ادب لکھا۔

یہی نہیں ان صوفیا نے تو بغیر کسی جھجک کے مقامی ہندو رسم و رواج کو بھی اختیار کر لیا، کسی صوفی کے عرس کے موقع پر جلوس میں صندل لے کر جانا اور اس سے صوفی کی قبر کو غسل دینا ایک ہندو رسم ہے مگر صوفیوں نے بھی قبول کر لی۔ اسی طرح بے شمار عیسائی چرچوں میں مقامی رسوم کو مذہبی عبادت کا حصہ بنا لیا گیا ہے۔ اس کے باوجود آر ایس ایس کے نظریہ باز اسلام اور عیسائیت کو غیر ملکی مذہب سمجھتے ہیں۔ حال ہی میں آر ایس ایس کے 75 ویں یوم تاسیس کے موقع پر اس کے سربراہ کے ایس سدرشن نے کہا کہ عیسائی چرچوں اور اسلام کو بھارتی رنگ دو، بھارتی بناؤ۔

کیا اسلام اور عیسائیت پہلے ہی ہندوستانی نہیں بنا دیئے گئے؟ جو مثالیں اوپر دی گئی ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ہندوستان اسلام اور ہندوستانی عیسائیت عرب کے اسلام اور یورپ کی عیسائیت سے مختلف ہیں اور یہ دونوں مذہب ہندوستانی مٹی میں مضبوطی

سے گڑے ہوئے ہیں۔ آر ایس ایس کے دانشور اپنے نقطۂ نظر کے ثبوت کے طور پر انڈونیشیا کی مثال دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انڈونیشیا میں ہندو مذہب اور ہندو ثقافت کا بڑا احترام کیا جاتا ہے اور یہ کہ وہ نام بھی ہندوانہ رکھتے ہیں اور رامائن تو ان کی لوک روایت کا حصہ ہے۔ صحیح مگر یہ بھی تو ایک مخصوص مثال ہے' میں کئی بار انڈونیشیا جا چکا ہوں وہاں سارے انڈونیشیا میں تو ایسی صورتحال نہیں۔ یہ کیفیت صرف ان علاقوں خصوصاً جاوا اور سماٹرا میں ہے جو کبھی ہندو اقتدار کے زیرِ نگیں رہے مگر باقی انڈونیشیا میں صورتحال ایسی نہیں ہے۔

خود ہندوستان میں اصل حقیقت وہ نہیں جو یہ نظریاتی دانشور بتاتے اور سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کا اثر مختلف جگہوں پر مختلف ہے کہیں یہ ہندویت کے بالکل قریب آ گیا ہے کہیں یہ خالص اسلام رہ گیا ہے۔ نیم دیہی اور دیہی علاقوں کے مقابلے میں شہروں میں خالص اسلام زیادہ ہے۔ اکثر دیہی علاقوں میں مسلمان مقامی ثقافت میں ڈرے ہوئے ہیں۔ ان کا لباس ہندوؤں جیسا' وہ مقامی بولی بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں بولتے اور تمام مقامی رسم ورواج کی پابندی کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے تو مقامی دیوی دیوتا کی بھی پوجا کرتے ہیں اور مقامی میلوں اور مذہبی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں اور واضح رہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت شہروں میں نہیں دیہات میں رہتی ہے۔ یہ کہنا کہ اسلام کو ہندوستانی بنایا جائے دراصل ان سارے حقائق سے روگردانی کے مترادف ہے۔ اسی کا اطلاق عیسائیوں اور عیسائیت پر بھی ہوتا ہے۔ بہت سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے خاندانی نام بھی ہندوانہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو اصلی نام بھی ہندوؤں جیسا ہوتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں نے تو ہندوستان کی موسیقی' مصوری اور فن تعمیر میں بڑا حصہ ڈالا ہے۔ رحیم اور رس خان ایسے بعض مسلمان شاعروں نے تو کرشن بھگتی کی شاعری کی ہے۔ پر ماوت تو لکھی ہی ایک مسلمان شاعر نے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ اور شاعر امیر خسرو نے ہندی میں دوہے لکھے' جو شمالی ہندوستان کے لوک ادب کا حصہ بن گئے۔ قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں بہت بڑا گویا تان سین مسلمان تھا۔ اس کے عرس کے موقع پر گوالیار میں تمام بڑے بڑے گویے جمع ہوتے ہیں۔ میں اپنے ایک استاد کو جانتا ہوں جو مدھیا پردیش کے تھے۔ دیواس میں' میں نے چند دن ان سے پڑھا۔ انہوں نے چاول کے دانے پر گیتا کا اشلوک لکھا اور بڑے فخر سے دکھایا کرتے تھے۔ میں دیواس کے نواح کے علاقے کے ایک اور مسلمان کو بھی

جانتا ہوں جنہیں رامائن حفظ تھی اور میں نے بچپن میں رامائن کے بارے میں انہی سے کچھ سیکھا تھا' تاہم مثالیں یہی نہیں ایسی بہت سی ہیں۔

اردو کے معروف شاعر اور جدو جہد آزادی کے مجاہد مولانا حسرت مہانی جنم اشٹمی کے موقع پر کرشن مہاراج کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ورنداون (برندابن) جایا کرتے تھے۔ ان کے اور ان کی بیگم کے دل میں مہاراج کرشن کا بڑا احترام تھا۔ فرنگی محل لکھنو کے بعض علماء نے بھی اس کی اجازت دے دی تھی۔ بعض صوفیا کا خیال ہے کہ اللہ نے ساری قوموں اور قبائل میں اپنے پیغمبر بھیجے تھے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس نے ہندوستان جیسے عظیم ملک میں اپنے پیغمبر نہ بھیجے ہوں۔ مظہر جان جاناں جیسے صوفیا کا خیال تھا کہ رام اور کرشن خدا کے پیغمبر تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے سجادہ نشین خواجہ حسن نظامی نے بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں رام اور کرشن کو اللہ کے پیغمبر بتایا گیا ہے۔

شاہجہان کا نامزد ولی عہد داراشکوہ ہندوازم کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے سنسکرت سیکھی' کچھ اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ کتاب کا نام سراکبر رکھا۔ اس نے ایک اور کتاب مجمع البحرین لکھی جس میں ہندومت اور اسلام کا تقابل کیا اور نتیجہ نکالا کہ دونوں کی تعلیم تقریباً ایک جیسی ہے۔

بہت سے مسلمان عالموں نے مہابھارت اور رامائن کا عربی اور فارسی میں ترجمہ کیا اور کہا جاتا ہے کہ ایسے ستر سے زائد ترجمے ہیں۔ ان کی کتابت کی گئی اور قرآن حکیم کی طرح خوبصورت جلد بندی بھی کی گئی اور جب تک ان کی فہرست مضامین پر نظر نہ ڈالی جاتی یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا کہ قرآن کون سا ہے اور یہ تراجم کون سے ہیں۔ اب ہندوستان کے مسلمانوں کو مزید ہندوستانی بنانے کے لئے کون سی کسر رہ گئی ہے؟ کیا آر ایس ایس چاہتی ہے کہ انہیں ہندوستانی نہیں ہندو بنایا جائے؟ اس کی نظر میں صرف ایک سچا مذہبی ہندو ہی سچا ہندوستانی ہوسکتا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان کو (مسلمانوں کو) چاہئے کہ وہ سر بسر اپنے مذہب کو اس قدر تبدیل کرلیں کہ اس کی شناخت تک ختم ہو جائے مگر قدرتی بات ہے کہ یہ صورتحال کسی کو بھی منظور نہیں۔

آر ایس ایس مشترکہ یا متحدہ سیکولر قوم پرستی کے تصور کو بھی مسترد کرتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہندو مذہب پر اٹھایا گیا آر ایس ایس کہتا ہے کہ ہندومت اسلام کے مقابلے میں زیادہ روادار

ہے لیکن آر ایس ایس متحدہ سیکولر نیشنلزم کو مسترد کر دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمان دینی عالموں کو نسبتاً غیر روادار سمجھا جاتا ہے مگر وہ جناح صاحب کے دو قومی نظریے کو رد کرتے اور متحدہ سیکولر قوم پرستی کے تصور کو قبول کرتے ہیں۔ دراصل نظریہ ہی غلط ہے کہ ہندومت زیادہ کھلا مذہب ہے اور اسلام نسبتاً بند مذہب ہے۔ بعض ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ تنگ نظر ہیں اور بعض مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ کوتاہ نظر ہیں۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ مسلمان صوفی بڑے روادار اور آزاد منش تھے۔ آر ایس ایس مارکہ ہندو دوسرے عقائد کو برداشت ہی نہیں کرتے اور کبھی کرتے بھی ہیں تو بالکل اپنے ڈھب سے۔

آر ایس ایس سیاست کو بھی ہندو اور وہ بھی برہمنی مارکہ ہندو بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ہر شے کا آغاز ویدوں سے کرتے ہیں اور خاتمہ بھی ویدوں پر ہی کرتے ہیں۔ آج کل اس قسم کا مؤقف یا عقیدہ بھی ایک حقیقت ہے جسے تسلیم کیا جانا چاہئے۔ ہمیں مذہب کو یک پہلو یا یک رنگ نہیں سمجھنا چاہئے اور مذہب معاملہ ہے اعتماد کا نہ کہ زبردستی ٹھونسنے کا' اوپر سے جو بھی شے ٹھونسی جاتی ہے وہ پاک پوتر نہیں بن جاتی اور نہ ہی اس کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا جاتا ہے۔

جدید جمہوری سیکولر سوسائٹی تمام شہریوں کے لئے مکمل مذہبی آزادی کا تقاضا کرتی ہے اور کسی بھی مذہب کو سیاسی فوقیت نہیں دیتی۔ آر ایس ایس ضمیر کی آزادی کے تصور کو سر بسر مسترد کر دیتا ہے اور ہندوستان کے شہریوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ ہندو مذہب اور ہندو کلچر اختیار کریں یا اسلام اور مسیحیت کی ہندو شکل و صورت۔ آر ایس ایس جن مذاہب کو دیسی (ہندوستانی) اور جن مذاہب کو بدیسی قرار دیتا ہے اس کی یہ تعریف سمجھ میں نہیں آتی۔ ہندوستان کے تمام شہری اپنے ضمیر کے مطابق جو مذہب چاہیں اختیار کرنے میں آزاد ہیں' یہ ان کا بنیادی حق ہے۔ حب الوطنی پر کسی بھی مذہبی برادری کی اجارہ داری قائم نہیں کی جا سکتی خواہ یہ برادری اکثریت میں ہو یا اقلیت میں۔ اسی طرح کسی گروہ کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ حب الوطنی کے ایک خاص سانچے پر اصرار کرے۔ یہ راستہ فاشزم کو جاتا ہے اور جب تک کسی شہری کے خلاف عدالت میں ملک دشمنی کا الزام ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک سارے شہری محب وطن سمجھے جانے چاہئیں۔

ہندوستان ایسے جمہوری سیکولر ملک میں ہر کسی کو اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی آزادی

ہوتی ہے کسی کو بھی اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک شخص اپنی مرضی کا جو مذہب ہندومت' اسلام یا عیسائیت جو بھی چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ آر ایس ایس کہتا ہے کہ صرف وہ مذہب اختیار کرنے کی آزادی ہے جو ہندوستانی ہیں۔ مثلاً بدھ مت' جین مت یا سکھ مت۔ اس قسم کے رویے معاشرے میں مناقشات پیدا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے عیسائیت کو قبول کرنے کے خلاف جو مہم چلائی گئی اس کی وجہ سے ہندوستان میں سخت فرقہ وارانہ تنازع پیدا ہوا۔ ایسی مہم کے خلاف اور کیا کہیں بس اتنا ہی کہ یہ غیر آئینی ہے اور ہندوستانی شہریوں کے بنیادی حقوق کے بالکل خلاف۔

آر ایس ایس کو اپنی تنظیم (ڈسپلن) پر بڑا فخر ہے۔ ڈسپلن کی ضرورت ہے مگر یہ تو ایک مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور زیادہ بنیادی سوال یہ ہے کہ ڈسپلن کس مقصد کے لئے اور کن افراد کے لئے۔ نازیوں نے بھی تو بڑا سخت ڈسپلن لاگو کیا تھا مگر وہ جرمن معاشرے کے مفاد میں نہیں تھا نتیجہ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی تباہی بھی ہوئی اور سبکی بھی۔ جو ڈسپلن' کسی شخص یا اجتماع کی آزادی چھین لے اور اوپر سے نافذ کیا جائے وہ آخر کار صرف چند افراد کے ٹولے کے مفادات کی پاسبانی کرتا ہے۔ اپنے مزاج میں ڈسپلن جمہوری ہونا چاہئے جو ضمیر کی آزادی کا پورا پورا احترام کرے۔ اس لئے بذات خود ڈسپلن کی بجائے جمہوریت اور جمہوری قدریں زیادہ اہم ہیں۔

آر ایس ایس میں ایک قسم کا انقلاب ہی لایا جائے تبھی یہ اقلیتوں کے لئے قابل قبول ہو سکے گا۔ اس کو یہ نظریہ ترک کرنا پڑے گا کہ مذہبی اقلیتوں کو ہندو رنگ میں رنگا جائے۔ یہ قطعی غیر جمہوری بات ہے۔ اسے اسلام اور مسیحت کو برابر کا احترام دینا چاہئے۔ اسے یہ نظریہ بھی ترک کرنا پڑے گا کہ یہ مذہب بدیسی ہیں' غیر ہندوستانی ہیں اور ہندوستانی مذاہب کے مقابلے میں کم تر درجہ کے مالک ہیں۔ اسلام اور عیسائیت دونوں صدیوں سے ہندوستان میں موجود ہیں اور انہوں نے ہندوستانی ثقافت اور مذہبی افکار و علوم میں بہت بڑا حصہ بھی ڈالا ہے اور اصل بات تو یہ ہے کہ ہندو افکار پر اسلام کے اثرات کے باعث سکھ مت اور آریہ سماج کی تحریک پیدا ہوئی۔

آر ایس ایس کے پاس بڑے مالی اور افرادی وسائل ہیں اور یہ صرف اس صورت میں ہندوستان کی خدمت کر سکتا ہے جب اپنے بنیادی نظریہ میں تبدیلی لائے۔ اس طرح یہ قوم سازی

میں بڑا کردار ادا کر سکتا ہے اور ہندوستان کو ایک عظیم ملک بنا سکتا ہے جبکہ وہ بڑا ملک ہے۔

(30-اپریل2001ء)

ہندوتوا' نیشنلزم اور تشدد

ہندوتوا کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور دیر ساورکر کے افکار کی روشنی میں اس کی تعریف' وضاحت اور تشریح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ویر ساورکر نے ہی پہلی بار ہندوتوا کی اصلاح استعمال کی تھی۔ ہندوتوا اور ہندومت میں فرق ہے۔ ہندومت ایک مذہب ہے جبکہ ہندوتوا ایک سیاسی نظریہ یا اصول ہے جو اقلیتوں کے مقابلے میں ہندو اکثریت کے منفرد احساسات کو پیش کرتا ہے۔اس کا ہندومت سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ ہندومت مذہب ہے جبکہ ہندوتوا سیاسی نظریہ ہے۔ان دونوں میں کچھ مشترکہ خصوصیات بھی ہو سکتی ہیں مگر ان میں فرق بہت زیادہ ہے۔ ہندومت روادار ہے ہندوتوا انتہائی تنگ نظر۔ ہندومت آفاقی ہے' ہندوتوا تنگ قوم پرستی پر محدود' ہندومت انسانیت کی قدروں کا امین ہے جبکہ ہندوتوا سیاسی ہندو اشرافیہ یا بالائی طبقے کے مفادات کی ترجمان۔ یہ ہیں ہندومت اور ہندوتوا میں اہم فرق جن کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے۔

اسلام' عیسائیت اور ہندومت میں کوئی جھگڑا کوئی تصادم نہیں ہے جبکہ نہ صرف اسلام اور عیسائیت اور ہندوتوا میں تصادم ہے خود ہندومت اور ہندوتوا میں بھی تنازع موجود ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ہندومت والے ہندوتوا کے مسلک کو بھی قبول کر لیں گے۔اسی طرح مخصوص مفادات کی بنا پر محدود گروہوں نے مذہبی بنیاد پر جو سیاسی مسلک بنا رکھے ہیں وہ ان کے اپنے اپنے مذاہب سے بھی متصادم ہیں۔ مذہب تو سیاسی لحاظ سے غیر جانبدار ہوتا ہے اور اپنے پیروکاروں کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔مگر جب مذہب کو سیاسی طور پر استعمال کیا جائے تو استعمال کرنے والے عموماً دائیں بازو کے ہوتے ہیں جیسا کہ ہندوتوا والے ہیں۔

بدھ مت' عیسائیت اور اسلام کے مقابلے میں ہندومت جغرافیائی طور پر جنوبی ایشیا تک محدود ہے۔ یہ یہاں سے باہر گیا بھی تو زیادہ سے زیادہ مشرق بعید میں انڈونیشیا اور کمبوڈیا وغیرہ تک۔اسے اس لئے فروغ حاصل نہ ہوا کہ اس کی بنیاد ذاتوں وغیرہ پر ہے اور اس میں ذات پات کے نظام کو بڑے مربوط طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں ہندومت کی بنیادی صفات' علاقہ اور ذات پات کا نظام ہیں اس لئے اس علاقے سے باہر

اس میں پھیلنے کی صلاحیت ہی کم تھی۔

دوسرے مذاہب اپنی جنم بھومی سے نکل کر دور دور تک پھیل گئے جبکہ ان کے مقابلے میں ہندومت میں بہت زیادہ دور علاقے سے وابستگی پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس میں علاقائی احساسات بکثرت ہیں۔ چنانچہ ہندومت دوسرے مذاہب کو بھی اپنے علاقائی احساسات سے دیکھتا ہے۔ آر ایس ایس کے نظریے کے مطابق ہندوتوا کا ایک اور اظہار ہے۔ اسلام اور عیسائیت غیر ملکی ہیں اور ان کے لئے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

یوں آر ایس ایس یا ہندوتوا کے نظریات میں قوم پرستی کا فطری اظہار ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے ہندوستان کے حوالے سے نیشنلزم دراصل مغربی سیاسی نظریہ میں سے ہی پیدا ہوا۔ انڈین نیشنل کانگرس نے اسے ہندوستانی صورتحال کے مطابق اختیار کرلیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ مغربی نظریہ کی ہو بہو نقالی نہیں اس کا مقامی رنگ بھی ہے اور اس کا اطلاق ہندوستان کی کثیر المذہبی اور کثیر السانی سیاسی صورتحال پر کیا گیا۔ یورپ میں مذہب ایک تھا' زبان ایک تھی اور ثقافتی پس منظر بھی یکساں تھا مگر قوم پرستی علاقائی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان ملغوبہ تھا مختلف مذاہب' زبانوں اور ثقافتوں کا اس میں سے ایک قوم بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ لازمی بات ہے کہ قوم ہونے کا احساس نیچے سے نہیں ابھرا بلکہ سیاسی نظریے کے طور پر اوپر سے لاگو کیا گیا۔

اس طرح قوم پرستی نے مذہبی رنگ بھی اختیار کیا۔ لامحالہ یہ احساس ایک مذہب اور ایک علاقے سے شدید وفاداری اور اکثریت کے سبب پیدا ہوا اور پھر جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں علیحدگی کا ایک احساس بھی (ردعمل کے طور پر) پیدا ہوا۔ یہاں ہی ایک وضاحت کرنا چاہوں گا کہ اسلام اور علیحدگی پسندی کو ایک ہی پلڑے میں رکھنا جائز نہیں۔ جس طرح ہم نے اوپر کہا ہے کہ ہندوتوا کو ہندومت کے برابر درجہ نہیں دیا جا سکتا اسی طرح اسلام کو بھی علیحدگی پسندی کے مماثل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ چنانچہ اسی بنا پر سربرآوردہ مسلمان عالموں نے تحریک پاکستان میں کوئی حصہ نہیں لیا اور انہوں نے دو قومی نظریے کو علیحدگی پسند سیاست گری کی پیداوار اور غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے اسے مسترد کردیا۔

اگرچہ برطانیہ کی تقسیم کرو اور حکومت کرو والی پالیسی نے بھی ایک کردار ادا کیا' تاہم مذہبی قوم پرستی مقامی حالات کی پیداوار تھی۔ تحریک جدوجہد آزادی کے دوران دونوں مذہبی

دھڑوں کے ممتاز طبقوں نے اپنے اپنے دھڑے کو استعمال کیا۔ آخری نتیجہ ملک کی تقسیم کی صورت میں نکلا۔ اصل الزام تو اوپر کے صاحب اقتدار طبقے کی تکڑم بازی پر آتا ہے، تاہم عموماً اسے مذہبی تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تقسیم کے باعث ہندوتوا اور آر ایس ایس کے نظریے کو تقویت ملی۔ جن سنگھ پچاس کی دہائی کے شروع میں وجود میں آیا اور یہ آر ایس ایس کے فلسفے کا سیاسی اظہار تھا۔ اس نے اپنے سیاسی مفادات کا جواز فراہم کرنے کے لئے ہندومت اور اس کی علاقائی وابستگی یا علاقائیت پر بے انتہا زور دیا۔ چنانچہ علاقائی قوم پرستی جن سنگھ والوں کا طرہ امتیاز بن گئی۔ یہ بات نہیں کہ علاقائی قوم پرستی اپنی ذات میں قابل اعتراض ہے۔ علاقائی قوم پرستی تو آج کے بسرعت تبدیل ہوتے ہوئے منظر نامہ میں کہ جس میں عالمگیریت بھی شامل ہے اور جس میں ملکی حدود کمزور کی جارہی ہیں ایک معنی رکھتی ہے۔ مگر جس قسم کی انتہائی شکل ہندوتوا والوں نے پیش کی وہ تو شاؤنزم بن جاتا ہے۔ ہندوستانی معاشرہ میں بہت سے مذاہب اور نسلیں موجود ہیں، اس میں اس قسم کی قوم پرستی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہے اور بے شمار مذہبی اور نسلی برادریوں میں کشیدگی پیدا کرتی ہے۔

آج ہندوتوا کی قوتوں کی نمائندگی بی جے پی کے بڑے پکے سرگرم عناصر کے علاوہ سنگھ پریوار کے آر ایس ایس، بجرنگ دل اور وشوا ہندو پریشد کرتے ہیں۔ اقتدار میں آنے کے بعد سنگھ پریوار کا رویہ بہت زیادہ جارحانہ ہو گیا ہے اور اقلیتوں نے خود کو غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں پر بھی حملے بڑھ گئے ہیں۔

آر ایس ایس کے نظریہ ساز اسلام اور عیسائیت کے بارے میں مسلسل یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پر اجنبی ہیں۔ علیحدگی پسند اور متشدد ہیں۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان مذاہب کے پیروکار ہندوستان کے مقابلے میں ان ملکوں کے زیادہ وفادار ہیں جہاں یہ مذہب پیدا ہوئے۔ اگرچہ اس قسم کے بیانات ایک دلیل کی بھی مار نہیں لیکن اونچی ذات کے ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد اس پر یقین رکھتی ہے اور تو اور ساری عمر لندن میں گزارنے والا مصنف وی ایس نیپال بھی اس قسم کے متعصّبانہ تاثرات کو اپنے ہاں جگہ دیتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہندوستان کی فتح پر نسلی قتل عام ہوا اور ہندوؤں کی بھری پری تہذیب برباد ہوئی۔ اس کی نظر میں یہ کہنا کہ مسلمان اور ہندو دونوں نے ہندوستان میں

بقائے باہمی کی طرح وقت گزارا جھوٹ اور مکر ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ یہ رویہ تاریخ کی تقسیم کی بنا پر نہیں اپنے متعصّبانہ جذبات کے سائے پر انداز ہونے کی صورت ہے۔ یہ بھی انتہا درجے کی نام نہاد سادہ لوحی ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہاں تشدد نہیں ہوتا تھا' نسلی قتل عام تو دور کی بات ہے دوسرے لفظوں میں مسلمانوں سے پہلے کا ہندوستانی معاشرہ مثالی تھا۔ یوں کالنگا سمیت تشدد کے تمام واقعات سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے۔

بہر طور دانش دوروں میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ بدقسمتی سے سارے ہی مذاہب میں اس قسم کے رویے رواج پا رہے ہیں۔ جب ہمارے اپنے مذہب کا ذکر آتا ہے تو ہم آنکھیں موند لیتے ہیں لیکن دوسرے مذاہب کا معاملہ ہو تو اسے سینگوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ آج کل دراصل ہماری مذہبی یا نسلی شناخت تو بذات خود ہے ہی نہیں۔ ہماری شناخت ہمارے حوالے سے نہیں دوسروں کے حوالے سے ہوتی ہے۔ جو دوسروں کی منافرت پر مبنی ہوتی ہے۔ اپنے مذہب' زبان' ثقافت کے بارے میں ہمارے صحیح جذبات کے حوالے سے نہیں ہوتی۔ اس قسم کے مخاصمانہ رویوں کے باعث ہم فوراً ہی سیاسی پروپیگنڈہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہماری قومی سالمیت اور اتحاد کو ایک اور خطرہ بھی لگا ہوا ہے۔ ہندوتوا وادی نہ صرف مسلمانوں سے پہلے کے زمانے کے تشدد کو بھول جاتے ہیں بلکہ شاستروں کے حوالے سے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندو مذہب عدم تشدد اور رواداری کا مذہب ہے اور یہی اس کی روایت ہے۔ بدقسمتی سے وہ شاستروں کے اقتباسات درج کرتے وقت خود شدید قسم کی عدم رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جس قدر گفتگو وہ عدم تشدد پر کرتے ہیں اس سے بھی زیادہ تشدد وہ مسلمانوں اور عیسائیوں پر کرتے ہیں۔

ہندو روایات اور تاریخ میں عدم تشدد کی عظمتیں ثابت کرنے والے ہندوتوا وادیوں نے ہی عدم تشدد کے پیغمبر مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا تھا۔ مہاتما گاندھی ہندوستانی معاشرے کے اندرونی حال کے ترجمان تھے۔ ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی کبھی ایسی ضرورت نہ تھی جیسی آج کے ہندوستان کے عدم رواداری معاشرے کی ضرورت ہے۔ جدید ہندوستان میں سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے ان کے قد کا کوئی رہنما نہیں ہوا۔ مگر مہاتما گاندھی کو ہم سے محض لفظی خراج عقیدت کے اور کچھ حاصل نہ ہوا' نہ ہم نے ان سے کچھ حاصل کیا۔ میں یہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ہندوستان کو غیر متشدد اور جدید بنانے کیلئے مہاتما گاندھی کے سوا اور کوئی ہماری رہنمائی نہیں کر سکتا۔ ان کی

ضرورت، اہمیت مرنے کے بعد بھی اتنی ہے جتنی ان کی زندگی میں تھی۔

ہندوتوا کے نظریات کے ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ مسلمان اور عیسائی مجموعی طور پر انہیں مشکوک اور مشتبہ جانتے ہیں۔ ہندوستان میں تمام کے تمام مسلمان حتیٰ کہ پاکستان میں بھی سارے مسلمان جہادی نہیں ہیں۔ ہندوستان میں سارے کے سارے عیسائی حتیٰ کہ عیسائی اکثریت والے ممالک میں بھی دوسروں کو عیسائی بنانے کی حمایت نہیں کرتے۔ مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں میں بھی فرق ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر برادری میں اپنے مذہبی، معاشرتی اور سیاسی میلانات کے حوالے سے فرق ہے۔ چنانچہ مجموعی طور پر ہندوستان کی ہر برادری پر ''تنوع میں اتحاد'' کا قول پورا اترتا ہے۔ یہ تنوع قانون قدرت کی طرح قانون حیات بھی ہے۔

ہندوتوا وادیوں کو جاننا چاہئے کہ وہ اپنے علاقائی تعصب کی انتہائی شکل پر جس قدر زور دیتے ہیں، وہ اسی قدر ہندوستان کے سیاسی اتحاد کو کمزور کرتے ہیں۔ اس اتحاد کو یوں مضبوط کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف برادریوں کی مذہبی اور ثقافتی خودمختاری کا سچے دل سے احترام کیا جائے۔ ہم اس رنگا رنگی کا جس قدر احترام کریں گے، اسی قدر ہندوستان کا اتحاد مضبوط ہوگا مگر ہندوتوا واریوں کو ہندوستان کے اتحاد سے زیادہ عزیز ممتاز ہندو طبقوں کے مفادات ہیں۔

(31-اگست 2001ء)

بی جے پی کی شکست......فرقہ واریت کی شکست

حال میں یوپی، اترانچل اور پنجاب میں بی جے پی کو جو خوفناک شکست ہوئی ہے وہ دراصل فرقہ واردیت کی شکست ہے۔ بی جے پی عرصہ سے دوغلی بازی کھیل رہی تھی۔ ہندوستانی عوام کے سامنے تو وہ سیکولر نقاب میں آتی مگر اپنے اصل پکے اور سرگرم لوگوں میں اپنا فرقہ وارانہ چہرا کھلا رکھتی مگر لوگوں کو ہمیشہ بیوقوف بنانا، دھوکہ دینا ممکن نہیں۔ وزیراعظم اے بی واجپائی سمیت اس کے رہنماؤں نے کہا کہ اس (این ڈی اے) کے ایجنڈے میں رام جنم بھومی کی تعمیر شامل نہیں مگر جیسے ہی الیکشنوں کا اعلان ہوتا ہے اس کا دوسرا چہرا وشوا ہندو پریشد، بجرنگ دل کی صورت میں طلوع ہو جاتا ہے۔ سنگھ پریوار کے یہ کل پرزے ہندوتوا کو مطمئن کرنے کے لئے رام مندر کی ایک خاص تاریخ سے تعمیر کی دھمکیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔

اب اس جھوٹی چال سے بھی پردہ اٹھ چکا ہے۔

ہاں وشوا ہندو پریشد اور بعض انتہا پسند پکے لوگ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ اس کی شکست کا سبب یہ ہے کہ اس نے ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر کا وعدہ پورا نہیں کیا۔ ان کا دعویٰ کہ اگر بی جے پی نے رام مندر کی تعمیر کا مسئلہ اٹھایا ہوتا تو یہ الیکشن جیت لیتی لیکن حقائق سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ ہر قسم کے سروے اور تجربے ثابت کرتے ہیں کہ لوگ رام مندر کے مسئلہ سے اکتا چکے ہیں۔ وہ مندوروں اور مسجدوں کے مقابلے میں ترقیاتی کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ بی جے پی کو محض اس لئے شکست ہوئی کہ اس نے لوگوں کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔

بی جے پی ہر محاذ پر ناکام ہوئی اس کا نعرہ تھا ''بھے' بھوک' بھرشٹا چار سے کمتی''، یعنی خوف' بھوک اور بدعنوانی سے نجات' مگر یہ نعرہ بھی فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔ بی جے پی نے ان تینوں صوبوں گجرات' یوپی' اترانچل میں بے انتہا بدعنوانی کی اور پنجاب میں یہ اکالیوں سے مل کر بدعنوانی کرتی رہی۔ اسمبلی بلکہ کابینہ میں بھی جرائم پیشہ منتخب ہو کر آئے تھے۔ وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل نے گجرات میں مذہبی اقلیتوں' مسلمانوں اور عیسائیوں پر بار بار حملے کئے حالانکہ وہ پہلے ہی مسلسل خوف میں زندگی گزار رہے تھے۔ یوپی میں چونکہ دوسری جماعتوں سے مل کر حکومت کر رہے تھے۔ اس لئے وہاں اقلیتوں پر ہاتھ ہلکا رکھا۔ بی جے پی کے حامی گجرات کو ہندوتوا کی لیبارٹری کہتے ہیں۔

گجرات میں اقلیتیں ہر وقت حملہ ہو جانے کے خوف سے ہی زندگی گزارتی ہیں۔ عیسائیوں پر حملوں کا آغاز بھی گجرات میں ڈانگ سے ہوا' گجرات ہی کے مختلف حصوں میں چرچ گرائے گئے اور بائیبل کے نسخے جلائے گئے۔ تو یہ تھا بی جے پی کا نعرہ کہ وہ لوگوں کو خوف سے نجات دلائے گی۔ بی جے پی نے جب کانگرس کی بدعنوانیوں کے خلاف مہم شروع کی تھی تو اپنے بارے میں کہا تھا کہ ''یہ پارٹی ہے ذرا مختلف قسم کی''، لیکن اس کی حکومت' کانگرسی حکومت سے بھی زیادہ بدعنوان نکلی۔

ان سطور کے محرر نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ سیاسی نظام کو فرقہ واریت کا رنگ دینے سے جمہوریت نہیں چلائی جا سکتی۔ جمہوریت کی بنیاد تو ہوتی ہی سیکولر اصولوں پر ہے' جمہوریت میں اولیں اہمیت شہریت کو حاصل ہے' مذہب کو نہیں۔ مگر ہندوستان میں بی جے پی اور دوسرے ممالک میں اسلامی پارٹیاں شہریت کی بجائے مذہب کو بنیادی اہمیت دینے کی

MashalBooks.org

کوشش کرتی ہیں۔صرف ایک سیکولر جمہوریت میں ہی لوگوں کو مذہب' ذات' عقیدہ سے بالاتر ہوکر بنیادی حقوق کی ضمانت دی جاتی ہے۔

اگر چہ وزیراعظم واجپائی کوایل کے ایڈوانی جیسے عقابی ہندوؤں کے مقابلے میں معتدل اورمتوازن لیڈر کہاجاتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ بھی اس قسم کی (فرقہ وارانہ) سیاست سے بلندتر نہیں۔واجپائی نے اپنی انتخابی مہم میں یہاں تک کہہ دیا کہ انہیں مسلمان ووٹروں کی پرواہ نہیں اور اگر مسلمان ان کی پارٹی کو ووٹ نہیں دیتے پھر بھی بی جے پی ہی جیتے گی۔اس پر بڑا شورشرابہ ہوااور ملائم سنگھ نے توان کا استعفیٰ طلب کرلیا۔پارٹی کے کرتا دھرتا نے اس نقصان کی تلافی کی کوشش کی اورواجپائی نے اپنے بیان کی ایسی وضاحت جاری کی جیسی کہ سیاستدان جاری کیا کرتے ہیں کہ اخباروں نے ان کی تقریر کی غلط رپورٹنگ کی ہے۔

لیکن حقیقت یہی ہے کہ واجپائی نے کہا تھا کہ بی جے پی مسلمان ووٹروں کے بغیر بھی جیت جائے گی۔ بلاشبہ یہ بات انہوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں کہی۔انہیں الیکشن سے پہلے کے انتخابی جائزوں کے نتائج بھی موصول ہور ہے تھے' جن میں بتایا گیا تھا کہ بی جے پی ہار رہی ہے اومسلمان یا تو ملائم سنگھ یادیو کی سماج وادی پارٹی کو یا مایاوتی کی بی ایس پی کو ووٹ دیں گے۔ یوپی کے ساٹھ سے زائد صوبائی حلقوں میں مسلمانوں کے ووٹوں کی بڑی اہمیت ہے۔ یہاں کوئی بھی پارٹی مسلمانوں کی حمایت کے بغیر نہیں جیت سکتی اور ساٹھ نشستیں کوئی معمولی تعداد نہیں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بی جے پی کے لیڈروں نے اس قسم کا بیان پہلی بار نہیں دیا۔ 1991ء کے یوپی کے اور1999ء میں مرکز کے انتخابات میں بی جے پی کے لیڈروں نے کہا تھا کہ بی جے پی نے ثابت کردیا ہے کہ وہ مسلمان ووٹ کے بغیر بھی جیت سکتی ہے۔واجپائی نے پھراسی ترنگ میں بات کردی۔لگتا ہے کہ بی جے پی کے اندرایک خواہش ہے کہ وہ کسی طرح مسلمان ووٹروں کی حمایت کے بغیر جیت جائیں اور پھراقلیتوں کے بارے میں اپنے جمہوری اورآئینی فرائض سے ہی فارغ ہوجائیں۔اسی بات پرفرقہ وارانہ سیاست کی بنیادرکھی گئی ہے۔ آرایس ایس کی ہندوراشٹرا آخرمحض ایک نعرہ تونہیں ہے۔ یہ ان کی دلی خواہش ہےاوران کی سیاسی منطق کی بنیاد بھی۔ ضیاءالحق نے بھی پاکستان میں جداگانہ طریقہ انتخاب رائج کرکے عیسائیوں اور ہندوؤں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

MashalBooks.org

واجپائی بھی مختلف جگہوں اور مختلف مواقع پر مختلف راگ پیش کرتے ہیں۔ پہلے انہوں نے امریکہ کے سٹیٹن آئی لینڈ میں وشواہندو پریشد کے سادھوؤں کے ہجوم میں کہا ''آر ایس ایس میری روح ہے''۔ مگر جب ہندوستان واپس آئے تو اس بیان سے منحرف ہو کر مؤقف بدل لیا۔ اپنے حلقے کے ہندوتوا والوں کو خوش کرنے کیلئے کہا کہ رام مندر کی تعمیر وترقی جذبات کی عکاس ہے' مگر جب حزب اختلاف نے زوردار حملہ کیا تو انہوں نے کیرالا میں سیر وتفریح کرتے ہوئے کہا ایودھیا کاشی متھرا اور دوسری جگہوں پر صورت کو جوں کا توں رہنے دو نہ چھیڑو' اور مزید کہا ''حکومت خاموش تماشائی نہیں بنی رہے گی۔ تاخیری حربے استعمال کرو' جیسا کہ بدقسمتی سے آٹھ سال پہلے کیا گیا تھا۔

بی جے پی یا کوئی بھی فرقہ وارانہ جماعت مذہبی جذبات ابھارتی ہے اور انہی پر اپنی سیاست کی بنیاد رکھتی ہے۔ مجبوری این ڈی اے کی ہے کہ مرکز میں بی جے پی کی سرکردگی میں اسی کی حکومت بنی ہوئی ہے۔ اس لئے مرکز میں متوازن سیکولر رویہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے مگر جب انتخاب جیتنے کا سوال آتا ہے تو یہ فرقہ وارانہ چہرہ لے کر عوام کے پاس جاتی ہے اور لوگوں کے مذہبی جذبات پر پورا بھروسہ کرتی ہے۔ بی جے پی کی حکومت یوپی اور دوسرے صوبوں میں بھی اچھی کارکردگی نہ دکھا سکی اور جیسے ہی یوپی میں انتخابات کرانے کا اعلان ہوا تو اس نے کئی جذباتی اقدامات کا اعلان کر دیا۔ سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا پر پابندی لگا دی' تشدد کا مقابلہ کرنے کے لئے حزب اختلاف کی سخت مخالفت کے باوجود پوٹو کا قانون بنایا اور وشواہندو پریشد اور بجرنگ دل کے حوالے سے رام مندر کا مسئلہ اٹھا دیا۔

مگر جب نتیجہ آیا تو پتہ چلا کہ کسی بھی دوا نے کام نہیں کیا۔ بی جے پی اپنے طور پر یوپی میں نشستیں بھی نہ لے سکی۔ سب سے بڑی پارٹی ملائم سنگھ یادیو کی جس نے 148 سیٹیں جیتیں اس کے بعد مایاوتی کی بہوجن سماج وادی پارٹی جسے 94 نشستیں حاصل ہوئیں جو مؤثر اضافہ ہے۔ جب بی جے پی رام جنم بھومی کے حوالے سے پہلی بار برسراقتدار آئی تھی تب سے اب تک یہ اس کی بدترین انتخابی کارکردگی ہے۔ یہی نہیں جب واجپائی کو ہار جانے کا احساس ہوا تو انہوں نے یوپی اور پنجاب میں اپنی تقریروں میں مقامی مسائل کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ سرحدی دراندازی اور 13 دسمبر کو پارلیمنٹ بلڈنگ پر حملہ جیسے جذباتی مسائل پر زیادہ زور صرف کر رہے تھے۔

MashalBooks.org

یو پی کے انتخابات کی وجہ سے واجپائی حکومت نے پاکستان سے سارے رابطے ریل، بس اور فضائی توڑ دیئے تاکہ جذباتی جنونیت پیدا کی جائے۔ جنوبی ایشیا میں امن کا انحصار پاکستان اور ہندوستان کے درمیان امن پر ہے۔ ان دونوں ملکوں میں دوستی اور یگانگت پیدا کرنے کیلئے بڑا ضروری ہے کہ عوام کا عوام سے رابطہ رہے، تاہم اب پتہ نہیں کب تک یہی صورتحال رہے اور کب یہ رابطے دوبارہ بحال ہوں۔ اس میں پاکستانی حکمران بھی ذمہ دار ہیں، بہرطور وہ ایک دوسرا قصہ ہے۔

بی جے پی کو اب یہ سبق سیکھ لینا چاہئے کہ اس کی فرقہ واریت اور مذہب کی سیاست سودمند ثابت نہیں ہوگی۔ لوگوں کے بنیادی مسائل، ترقی، افلاس، بیروزگاری اور سر چھپانے کیلئے چھت جیسے مسائل پر توجہ دینا ہوگی۔ لوگ مندر مسجد کے جھگڑے پر زیادہ دیر ووٹ نہیں دیتے رہیں گے۔ یو پی کی شکست بی جے پی کے لئے نوشتہ دیوار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ ہندوتوا وادیوں کو چین نہیں آئے گا۔ وہ دباؤ ڈالیں گے۔ وہ دلیل دیں گے کہ اس نے مندر کی تعمیر کا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اس نے اسے ہار ہوئی ضروری ہے کہ مندر کے بارے میں مہم تیز تر کی جائے۔

دیکھیں اور انتظار کریں۔ نہیں خیر یو پی میں کون حکومت بنائے گا۔ اگر ملائم سنگھ حکومت بنا لیتے ہیں تو بی جے پی والے ملائم سنگھ کو نکو بنانے کیلئے مندر کی مہم تیز کر سکتے ہیں یا یہ اپنے اندر کے سخت گیر عناصر کے دباؤ کے تحت بی جے پی کی قیادت پھر یہ مہم تیز کر کے ملک میں پھر آگ لگا دے گی؟ گجرات کے انتخابات اگلے گیارہ ماہ میں ہونے والے ہیں۔ گجرات کے حالات بی جے پی کے لئے کچھ زیادہ اچھے نہیں۔ گزشتہ سال مختلف دھڑوں میں بٹی ہوئی کمزور کانگرس کے باوجود بی جے پی کو پنچائتوں کے انتخاب میں بڑی مات ہوئی۔ گجرات کے ضمنی صوبائی انتخابات میں بھی ہاری اور یو پی میں جنرل اسمبلی کا انتخاب بھی ہارا۔ گجرات کے وزیراعلیٰ نریندر مودی نے دو اور نشستیں بھی کانگرس سے ہاری ہیں۔

یہ بی جے پی کے مصائب کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے ہاتھ سے سب سے بڑا یو پی کا صوبہ نکل گیا اور توقع ہے کہ "ہندوتوا کی لیبارٹری" گجرات میں بھی اسے مشکل مقامات سے گزرنا ہوگا۔ بی جے پی کی بقا کے لئے گجرات کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس لئے وہ ہندوتوا کا پتہ گجرات

میں بڑے زور وشور سے استعمال کرے گی۔ بدقسمتی سے سیکولر طاقتیں بے انتہا ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہیں؛ جبکہ ملک کے مستقبل کا انحصار سیکولر جمہوریت کو مضبوط کرنے پر ہے۔

یو پی کے انتخاب کے نتائج کا اثر فوری طور پر مرکز کی این ڈی اے کی حکومت پر غالبًا نہ پڑے مگر ان میں دراڑیں جلد ہی پڑنا شروع ہو جائیں گی۔ بی جے پی کے اندر واجپائی کی قیادت کے بارے میں کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ انہیں شک ہے کہ اب واجپائی کوئی اچھی کارکردگی نہیں دکھا سکیں گے ان کی چمک دمک سبھی کم ہوگئی اور جنگ جو (عقاب) بالادستی حاصل کرلیں گے اور اگر سیکولر طاقتیں مہاراشٹر کی طرح آپس میں ہی لڑتی رہیں تو پھر فائدہ فرقہ پرست سخت گیروں کا ہوگا۔

(15-مارچ2002ء)

اقلیتیں۔ آر ایس ایس کے رحم وکرم پر نہیں!

حال ہی میں آر ایس ایس نے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ ان کی سلامتی دراصل اکثریتی فرقے کی خیرسگالی کی مرہون منت ہے۔ آر ایس ایس کی طرف سے اس قسم کے بیانات اقلیتوں میں خیرسگالی کا جذبہ پیدا نہیں کرتے۔ یہ دراصل درپردہ دھمکی ہوتے ہیں۔ چنانچہ آر ایس ایس نے یہ جو قرارداد اپنے بنگلور کے اجلاس میں منظور کی ہے اس کی مذمت عیسائیوں سمیت تمام اقلیتوں اور سیکولر عناصر کے رہنماؤں نے کی ہے۔

دراصل تمام برادریوں کی ایک دوسرے سے خیرسگالی ہے۔ ملک کی سلامتی اور حفاظت کا انحصار مختلف فرقوں کے درمیان اعتماد پر ہے؛ تاہم کوئی اکثریتی؛ اقلیتی فرقہ یہ اصرار نہیں کرسکتا کہ اس کا تحفظ دوسرے فرقہ کی خیرسگالی کا مرہون منت ہے۔ ہندوستانی آئین کے مطابق تمام افراد اور برادریوں کے حقوق برابر ہیں۔ ہر مسلمان کے بھی اتنے ہی حقوق ہیں جتنے ایک ہندو کے ہیں۔ آئین کے ماہرین کے مطابق یہ حقوق آئین سازوں کی دریادلی کے باعث حاصل نہیں ہوئے بلکہ یہ حقوق وراثت میں ملے ہیں...... یعنی افراد کو بطور انسان ورثے میں ملے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ جب دنیا بھر میں مذہبی اور ثقافتی کثرت الوجودیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے آر ایس ایس اس کو مسترد کر رہی ہے اور رجعت یا پیچھے کی طرف سفر کر رہی ہے۔ مغرب

میں بیسویں صدی کے شروع تک کثیر الوجودیت نہیں تھی پھر جب سابقہ نوآبادیات سے وہاں مغربی ممالک کی طرف ہجرت شروع ہوئی تو پھر انہوں (مغربی ممالک) نے بھی ثقافتی اور مذہبی کثرت الوجودیت کو تسلیم کرنا شروع کیا۔ مغرب کے آئینی ماہرین اور نظریہ سازوں نے نہ صرف مذہبی اور ثقافتی کثرت الوجودیت کو ماننا شروع کیا بلکہ انہیں برابر کے حقوق بھی دیئے۔ آر ایس ایس کے نظریہ سازوں کو خبر ہو کہ جو ہندوستانی باشندے برطانیہ' امریکہ یا کینیڈا میں رہتے ہیں وہ ان ممالک کی اکثریت کے جذبہ خیر سگالی یا رحم و کرم کے بعد انہیں جو حقوق حاصل ہوئے ہیں ان کے زور پر رہ رہے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو جو آئینی حقوق حاصل ہیں وہ کسی دوسری برادری کے رحم و کرم یا جذبہ خیر سگالی کے محتاج نہیں۔ یہ اس لفظ کے پورے مفہوم کے ساتھ حتمی حقوق ہیں۔ آئین ساز نہرو' امبیدکر' مولانا آزاد' سردار پٹیل اور دوسرے رہنما جدید آئینی نظریوں اور موروثی انسانی حقوق سے پوری طرح آگاہ تھے اور اسی کے مطابق انہوں نے آئین تشکیل دیا تھا۔ آئین بنانے والے ثقافت یا مذہب کے بارے میں کٹر متعصب نہ تھے کہ حقوق یا تحفظ اور سلامتی کو کسی اور کی خیر سگالی سے مشروط کر دیتے۔

آر ایس ایس ہندوستانی کلچر کی بات کرتا ہے مگر اس حقیقت سے باخبر نہیں کہ ہندوستان ہمیشہ سے کئی مذاہب اور ثقافتوں کا گھر رہا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ مغرب نے تو یہ کثرت الوجودیت اب آ کر قبول کی ہے۔ ہندوستان میں تو صدیوں سے یہی کثرت ادیان و ثقافت رہی ہے۔ یہ کثرت ادیان صرف باہر سے آنے والے مذاہب یہودیت' عیسائیت اور اسلام کے سبب نہیں جیسا کہ آر ایس ایس والے سمجھتے ہیں بلکہ خود ہندوستان کے اندر بھی ثقافتی اور مذہبی کثرت الوجودیت ہمیشہ رہی ہے۔ دراصل اس ملک میں کبھی بھی واحد مذہب اور واحد ثقافت نہیں رہی۔ ہندوستان کی پوری تاریخ میں کبھی بھی یک رنگ مذہب یا یک ثقافت نہیں رہی۔

ابھی تو یہ مسئلہ بھی طے نہیں ہوا کہ ہندو کون ہے اور اکثریتی گروہ کون سا ہے؟ اٹھارہویں صدی تک ہندو کا لفظ شائد ہی مذہبی معنوں میں استعمال ہوا ہو۔ برطانوی حکمرانوں نے ہندو کا لفظ یکساں مذہبی معنوں میں استعمال کرنا شروع کیا۔ 1872ء کی پہلی مردم شماری میں' مردم شماری کے کمشنر نے ہندوستان کی آبادی کو مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کر دیا۔ ہندو' مسلم'

کرسچین، سکھ، پارسی۔ دوسرے کمشنروں کو مذہبی معنوں میں لفظ ہندو کے استعمال اور تعریف میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ جہاں تک ہندو کے تصور پر بحث کا تعلق ہے رپورٹ میں انتہائی دلچسپ باتیں لکھی گئی ہیں۔ اسے ہندو کی تعریف کرنے میں بہت دقت پیش آئی۔

لفظ ہندو کا مذہبی معنوں میں استعمال برطانوی حکمرانوں کے سبب ہوا جو ہندوستان کو مذہبی بنیادوں پر مختلف گروہوں میں مخاصمت پیدا کر کے اپنی حکمرانی کو آسان بنانا چاہتے تھے۔ ہندوستان کے لوگوں کی مذہبی حوالے سے شناخت نہیں تھی۔ وہ تھی ذات، زبان اور علاقائیت۔ یہی بڑی شناختیں تھیں، مذہب نہیں تھا۔ پھر مذہبی شناختوں میں کوئی ہم آہنگی بھی نہ تھی۔ ہر مذہب کئی فرقوں میں تقسیم ہے۔ چنانچہ مختلف برادریوں کی شناخت کی اپنی اپنی بنیادیں تھیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ قرون وسطیٰ کی جاگیردارانہ سیاست میں مذہب کوئی اہم عنصر شمار نہیں ہوتا تھا۔ اس کو اہمیت نوآبادیاتی عہد میں دی گئی۔ اس لئے کہ زمین یا طبقے کے مقابلے میں نفاق پیدا کرنے کے لئے مذہبوں میں جذباتی طور پر بڑی گنجائش تھی۔ اسی نوآبادیاتی عہد میں ہی مذہبی اکثریت اور مذہبی اقلیت کا تصور اہم بن گیا۔

مذہب کی بنیاد پر نفاق ڈالنے کے اس تصور کی کاٹ ہمارے جنگ آزادی کے مجاہدوں اور کانگرسی لیڈروں نے سیکولرازم سے کی۔ چنانچہ اتحاد اور یک جہتی کی واحد ضمانت سیکولرازم ہی دیتا تھا۔ مگر اس سے ایک طرف آر ایس ایس دوسری طرف مسلم لیگ والے خوش نہیں ہوئے۔

دونوں نے سیکولرازم کو مسترد کر دیا۔ آر ایس ایس کو تب بھی سیکولرازم اچھا نہیں لگا تھا اور وہ اب بھی اس سے ناخوش ہے۔ انہوں نے بارہا اسے ''مغربی تصور'' قرار دے کر مسترد کیا کہ یہ ہندوستانی مذہب اور ثقافت سے ہم آہنگ نہیں۔

اصل بات تو یہ ہے سنگھ پریوار نے ہمیشہ سیکولرازم کو برا قرار دیا ہے۔ بی جے پی نے کہنا شروع کیا تھا کہ سیکولرازم کا نہرو ماڈل نقلی سیکولرازم تھا اور یہ کہہ کہ اس کا تمسخر اڑایا کہ اس کے ذریعے اقلیتوں کی چاپلوسی کی گئی۔ اسی کی پوری دہائی میں بی جے پی نے نہرو کے سیکولرازم کی مخالفت کی مگر جب 1977ء میں وہ جنتا پارٹی میں مدغم ہو رہے تھے بی جے پی نے سیکولرازم اور گاندھی والا سوشلزم قبول کر لیا اور مہاتما گاندھی کی سمادھی پر اس کا حلف بھی اٹھایا۔ چونکہ بی جے پی والے جنتا پارٹی کی مدد سے اقتدار میں آنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے سیکولرازم کو چون و چرا کے بغیر قبول کر لیا مگر جب اقتدار سے باہر ہوئے اور جنتا پارٹی سے الگ ہو گئے تو

انہوں نے سیکولرازم پر حملے شروع کر دیئے۔ کیا یہ سیدھی سادی موقع پرستی نہیں؟ اور واضح رہے کہ سنگھ پریوار آر ایس ایس سے ہدایات آنے کے بعد ہی کوئی اگلا قدم اٹھاتا ہے۔

آر ایس ایس والے نہرو والے سیکولرازم کو مسترد کرتے ہیں حالانکہ آئین میں بھی اسی سیکولرازم کو جگہ دی گئی ہے۔ آر ایس ایس کہتا ہے کہ ہندو اکثریت میں ہیں' ان میں ہم آہنگی ہے اور اقلیت اس اکثریت کے رحم و کرم پر ہیں۔ دراصل یہ تصور ہی بالکل غیر جمہوری ہے۔ مذہبی اکثریت اور مذہبی اقلیت کا سیاسی اکثریت اور سیاسی اقلیت سے کوئی علاقہ ہی نہیں۔ اسی بنا پر تو ہم نے جداگانہ انتخاب کو بڑے زور کے ساتھ مسترد کر دیا تھا۔ مذہبی اقلیت کو آئین میں ایک آدھ تحفظ دیا گیا ہے کہ اس کے مذہب اور مذہبی شناخت کی حفاظت کی جائے گی۔ سیاسی اعتبار سے تو سیاسی اکثریت اور سیاسی اقلیت ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ سیکولر پارٹیوں کو ووٹ دیتے رہے ہیں اور یہی پارٹیاں مرکز اور صوبوں میں سیاسی اکثریت قرار پاتی رہی ہیں۔ مذہبی اعتبار سے تو وہ ایک اقلیت میں ہیں مگر سیاسی اعتبار سے اکثریتی پارٹی کا حصہ ہیں۔

انڈین نیشنل کانگرس نے پورے زور کے ساتھ دو قومی نظریے کو رد کر دیا تھا۔ اسی دو قومی نظریے کی بنا پر ملک تقسیم ہوا۔ دو قومی نظریہ کچھ اس لئے بھی وجود میں آیا کہ آر ایس ایس اور ہندو مہا سبھا نے یہ رویہ اختیار کر لیا تھا کہ مذہبی اقلیتیں مذہبی اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گی۔ یہ معروف حقیقت ہے کہ ویر ساور کر نے جناح سے بہت پہلے 1938ء میں احمد آباد میں ہندو مہا سبھا کے اجلاس میں دو قومی نظریہ پیش کر دیا تھا۔ اب ہم عالمگیریت کے عہد میں داخل ہو گئے ہیں۔ آج کوئی بھی قوم یک مذہبی یا یک ثقافتی نہیں رہی۔ معاشی بنیادوں پر ہجرت کے باعث ساری قومیں مذہبی اور ثقافتی لحاظ سے کثیر الوجودی نہیں رہی ہیں' چنانچہ کثیر الوجودیت کو مابعد جدید عہد کا تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں مذہبی اور ثقافتی اقلیتیں دوسروں کے برابر آئینی حقوق کی مجاز ہیں تو پھر آر ایس ایس کیوں کہتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں اپنے تحفظ کی خاطر ہندوؤں کی خیر سگالی حاصل کریں۔ یہ ہمارے آئین کی روح کے خلاف ہے اور آئین سازوں اور آزادی کے مجاہدوں کے لئے ذلت کا مقام۔

اس قسم کا رویہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوستان میں اور بہت سے دوسروں کے لئے بھی بڑا خطرناک ہے۔ بہت سی دلت تنظیموں کا کہنا ہے کہ وہ ہندو نہیں ہیں۔ امبید کر کے بہت سے

پیروکاروں نے ہندومت ترک کر کے بدھ مت اختیار کرلیا ہے۔عیسائیوں اور مسلمانوں کے بعد کیا وہ بھی ہندوتوا کا نشانہ نہیں بنیں گے؟ اور کون بتائے گا کہ ہندو کون ہے؟ آر ایس ایس والے؟ یہ تو صرف برہمنی ہندومت اور برہمنی ثقافت ویدوں کا مذہب اور ویدوں کی ثقافت کو مانتا ہے۔ ہندومت کو کسی ایک مقدس صحیفہ یا کسی ایک ثقافتی لہر تک محدود کیا جا سکتا ہے؟ جب آپ مذہب کو سیاست سے جوڑ دیتے ہیں تو پھر مذہب میں فرقہ در فرقہ وجود میں آنے لگتا ہے اور ایمان والے یہ نہیں فیصلہ کر پاتے کہ کون سا عقیدہ اور فرقہ مستند ہے۔اس کا فیصلہ سیاستدان کریں گے۔ یہی کچھ پاکستان میں ہو رہا ہے اور جہادی اسلام زیادہ مصدقہ اسلام بنتا جا رہا ہے۔

سچی جمہوریت میں خیر سگالی بھی یک طرفہ یا یک سری نہیں کئی اطراف یا سروں والی ہونی چاہئے۔اگر یہ یک طرفہ ہو تو پھر عدم رواداری بڑھے گی اور اس عدم رواداری پر جمہوری ثقافت کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔تشدد اور عدم رواداری جمہوریت اور جمہوری ثقافت کو تباہ کر دیں گے۔ بدقسمتی سے آج کل ہندوستان میں تشدد اور عدم رواداری میں اس قدر اضافہ ہو رہا ہے کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ گجرات میں نسلی قتل عام کوئی اچانک واقعہ نہیں۔ یہ اقلیتوں کے خلاف برسوں سے ہونے والے نفرت کے پروپیگنڈے کا شاخسانہ ہے۔سنگھ پریوار جو کچھ کر رہا ہے کسی بھی جدید جمہوری ملک کے لئے قابل قبول نہیں۔ یہ بڑے منظم طریقے سے ہندوستان میں کثیرالوجودی احساس اور رواداری کو تباہ کر رہا ہے۔ ہندوستان میں ایسے خوفناک فرقہ وارانہ فسادات کبھی نہیں ہوئے جیسے گجرات میں دیکھے جا رہے ہیں۔

ہندوستان صرف ایٹمی اسلحہ رکھنے سے بڑا ملک نہیں بن سکتا۔ یہ آئینی دفعات پر عملدرآمد کے بعد ہی عظیم بن سکتا ہے۔ یہ ایک کے بعد دوسری اقلیت کے خلاف تنازع کھڑے کر کے خوشحال نہیں ہو سکتا۔ یہ اقلیتوں سمیت سب لوگوں کے دل و دماغ کو تسخیر کر کے عظیم بن سکتا ہے۔

(15-اپریل2002ء)

ہندوستانی مسلمان

ہندوستانی مسلمان اور تعلیم

ہندوستانی مسلمان ہند کی آبادی کا بارہ فیصد ہیں جو ہر اعتبار سے قابل ذکر آبادی ہے کہ تعداد کے لحاظ سے یہ دس کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے اور بجا طور پر کیا جاتا ہے کہ کسی بھی ملک میں مسلمانوں کی تعداد کے حوالے سے ہندوستان کا نمبر انڈونیشیا کے بعد آتا ہے۔ چنانچہ ملک کی مجموعی ترقی کے لئے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی بہتری بہت ضروری ہے۔ اگر کسی بھی ملک کی اتنی بڑی اقلیت ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے' ان پڑھ اور غریب ہو تو وہ ملک کیسے دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ واقعی ترقی کر رہا ہے۔

اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالنے سے پہلے یہ بتانا اہم ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نسلی ثقافتی لسانی اعتبار سے ہم آہنگی یا یک رنگی نہیں پائی جاتی' ان میں فرقہ وارانہ' علاقائی' ثقافتی اور ذات پات کا فرق پایا جاتا ہے۔ اگر ہم مسلمانوں کی مجموعی ماہیت اور حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں تو پھر اس فرق کو بہر صورت ذہن میں رکھنا پڑے گا۔

مثلاً ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں کیرالا کے مسلمانوں میں خواندگی کی شرح زیادہ ہے۔ اس طرح یوپی اور مہاراشٹر کے مسلمانوں کے مقابلے میں کیرالا کے مسلمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی شرح زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر بالائی طبقے کے مسلمانوں کے مقابلے میں دستکار برادریوں مثلاً انصاریوں' قریشیوں اور باغبانوں وغیرہ نے معاشی ترقی زیادہ کی ہے۔ اسی طرح گجرات کے تاجر پیشہ بوہرے' بجن اور کھوجے دوسرے عام مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوشحال ہیں تو ثابت ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے معاملہ کو سمجھنے

کے لئے ان فرقہ وارانہ اور ذات پات کے فرق کو بھی زیرغور لانا پڑے گا۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم اجتماعی طور پر مسلمانوں کی پسماندگی کا ذکر نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجموعی طور پر مسلمانوں میں ناخواندگی اور غربت بہت زیادہ ہے۔ بے شمار شعبوں میں تو وہ اچھوتوں سے پیچھے رہ گئے ہیں خصوصاً مسلم خواتین تو بہت ہی پیچھے رہ گئی ہیں۔ مثلاً خاندان کی صحت سے متعلق قومی سروے (این ایف ایچ ایس) کے حساب سے ہندوستان میں 66 فیصد مسلم خواتین ناخواندہ ہیں۔ ہریانہ میں ناخواندگی کی شرح 98 فیصد ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہریانہ میں زیادہ تر مسلمان میو ہیں اور میو مجموعی طور پر بڑے پسماندہ ہوتے ہیں۔ آسام میں مسلمانوں کی خواندگی کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ وہاں بھی مسلمان عورتوں میں ناخواندگی 74 فیصد ہے۔ صوبہ مغربی بنگال' کرناٹک' دہلی اور مدھیا پردیش میں ناخواندگی کی شرح ساٹھ اور پینسٹھ کے درمیان ہے جبکہ مہاراشٹر' آندھرا پردیش اور گجرات کی 50 سے 55 فیصد تک عورتیں ناخواندہ ہیں۔

مردوں میں خواندگی کی صورت حال نسبتاً بہتر ہے اور شرح خواندگی زیادہ ہے' تاہم بابری مسجد کے انہدام کے بعد صورتحال میں بہتر تبدیلی آ رہی ہے۔ اب مسلمان تعلیم اور معاشی سرگرمیوں کی طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم کے بارے میں بھی ان میں شعور آ گیا ہے اور اب زیادہ مسلمان عورتیں تعلیم کی طرف توجہ دے رہی ہیں۔ شیروانی نے یوپی میں سروے کیا ہے جس کے مطابق ایس ایس سی کے امتحان میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد بڑھ گئی ہے نہ صرف یہ بلکہ ان کی کامیابی کی شرح بھی انیس گنا بڑھ گئی ہے۔ مطلب یہ کہ 1990ء سے پہلے کے زمانے کے مقابلے میں آج کی مسلمانوں لڑکیاں تعلیم پر زیادہ سنجیدگی سے توجہ مرکوز کر رہی ہیں اور لگتا ہے کہ یہ رجحان جاری رہے گا۔ بہت سی مسلمان لڑکیاں تو میرٹ لسٹوں میں بھی بار پا رہی ہیں یعنی پوزیشنیں حاصل کر رہی ہیں۔ مہاراشٹر میں چند روز پہلے ایک امتحان کے نتیجے کا اعلان کیا گیا جس میں تین مسلمان لڑکیوں نے پوزیشن حاصل کی ہے۔

مسلمانوں کی کثیر تعداد کوئی 30 فیصد شہروں میں رہتی ہے اور ان شہری مسلمانوں میں بھی بڑی تعداد نیچی ذات کے دستکاروں اور ہنرمندوں کی ہے جو نام نہاد بالائی طبقہ کے مسلمانوں کے مقابلے بھی زیادہ تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ متعدد کاریگر خود اپنا کاروبار چلانے لگے ہیں اور اس طرح اپنی پیشہ وارانہ مہارت کے طفیل ترقی کر رہے ہیں۔

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ کاریگری یا مہارت بھی ابتدائی اور روایتی قسم کی ہے اور اس قسم کا مال تو تیار کر لیتے ہیں مگر اسے منڈی میں احسن طریق تک لے جانے سے ابھی معذور ہیں، آج کی عالمگیریت میں روایتی مہارت کے ذریعے معاشی خوشحالی حاصل کرنا تو دور کی بات ہے اس کی بقا بھی خطرے میں ہے۔ اس لئے ان مسلمان کاریگروں کو نئے کاموں کی مہارت حاصل کرنی چاہئے۔ یہ بہت ہی ضروری ہے اور یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی یا شاہراہ اطلاعات کس قدر ضروری ہے۔

مگر جہاں ابتدائی تعلیم اور خواندگی بھی نہ ہو وہاں اطلاعاتی ٹیکنالوجی سے استفادہ اور اپنی مہارت کو جدید بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر بھی آج کی مارکیٹ کی گرم بازاری میں اپنی مہارت کو جدید بنانا لازمی ہو گیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ نہ صرف خواندگی بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی جائے۔ آج مسئلہ یہ نہیں کہ لوگوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا شعور نہیں ہے۔ شعور ہے مگر معاشی وسائل کی بڑی تنگی ہے۔ تعلیمی پسماندگی، معاشی پسماندگی اور معاشی پسماندگی تعلیمی پسماندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ یوں یہ ایک منحوس سا چکر بن گیا ہے۔

مسلمانوں میں نہ صرف مستقبل میں جھانکنے والی سیاسی قیادت کی کمی ہے بلکہ ایسی سماجی اور ثقافتی قیادت کا بھی فقدان ہے جو ہمہ وقت مسلمانوں کی معاشی اور معاشی ترقی کے لئے کمربستہ ہو۔ اگرچہ بہت سے مسلمانوں کے پاس غربت کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے کے وسائل نہیں ہیں مگر اندرونی اور بیرونی طور پر برادری کے وسائل تو موجود ہیں۔ اندرونی طور پر وقف املاک میں نااہل ملازمین اور منتظمین کے باعث سخت بدانتظامی ہے بلکہ بدعنوان سیاستدانوں نے تو بعض املاک کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر دی ہیں۔ بوہروں کے وقف کی املاک کی لاکھوں ڈالر آمدنی ہے مگر اس پر صرف سیدنا محمد برہان الدین خاندان کا کنٹرول ہے۔ راجستھان، مدھیا پردیش اور دوسرے صوبوں میں بوہروں کے بڑے بڑے وقف ہیں مگر مجاور خاندان نے وقف بورڈوں کے ساتھ مل کر بہت دھاندلی کر رکھی ہے۔ معمولی کرایوں پر یہ املاک حاصل کر رکھی ہیں۔ ان پر وقف بورڈ کے کنٹرول اور نگرانی سے بھی استثناء حاصل کر لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وقف بورڈ کو بھاری نقصان ہو رہا ہے۔

دہلی میں بہت سی قیمتی املاک بدعنوان حکام کے ساتھ مل کر پانچ ستاروں والے ہوٹلوں کو کوڑیوں کے مول دے دی گئی ہیں۔ اگر ان وقف املاک کا انتظام وانصرام دیانتدارانہ ہو جائے

تو اسی سے اتنی زیادہ آمدنی ہوسکتی ہے کہ تعلیمی ادارے بھی قائم ہوسکتے ہیں اور تربیتی کالج بھی۔ ایک مثال صوبہ کرناٹک کے مقام گلبرگہ شریف میں قائم کی گئی ہے جہاں درگاہ سے ہونے والی آمدنی سے انتظامیہ نے تعلیمی ادارے قائم کردیئے ہیں۔ اجمیر میں حضرت معین الدین چشتی کی درگاہ کی آمدنی سے ایسے بہت سے کام کرنے کی زیادہ گنجائش ہے اگر ترو پاتھی مندر کے متولی اس آمدنی سے ایک یونیورسٹی چلا سکتے ہیں تو پھر اجمیر شریف کی درگاہ کے متولی ایسا کیوں نہیں کرسکتے؟ یہ چند مثالیں ہیں ہندوستان میں درگاہوں سے ہونے والی آمدنی بہت بڑا اندرونی وسیلہ ہے جو مسلمانوں کے مفاد کے لئے کام کرسکتا ہے۔

بیرونی وسائل میں سے اسلامی ترقیاتی بینک ہے جہاں سے خاصی بڑی مدد مل سکتی ہے بشرطیکہ تعلیمی اداروں اور وظائف کے بارے میں مناسب منصوبے اس کو بھیجے جائیں۔ مگر یہاں تو ایسی سوچ ہی نہیں، اس لئے اس قسم کی کوئی پیش قدمی ہی نہیں ہوئی۔ بعض مسلمان ممالک سیکولر تعلیم کے مقابلے میں مذہبی تعلیم وتربیت کے لئے تعلیمی اداروں کو مدد دینے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، چنانچہ ان ممالک کی مدد سے بہت بڑی تعداد میں ایسے مدرسے قائم کئے جا چکے ہیں۔ اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ دراصل سیکولر تعلیم و تربیت کے زیادہ ادارے قائم کئے جانے چاہئیں اگر انہی کاریگروں کی روایتی مہارت اور کاروباری امور کو جدید تقاضوں کے مطابق ترقی دی جائے اور اس کام کے لئے پالی ٹیکنیک قائم کئے جائیں تو مسلمان کاریگروں میں معاشی خوشحالی آئے گی جو مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے بھی کام آئے گی۔

آئی سی ایس سے لے کر سب سے نیچے چوتھے درجے تک کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی بہت کم ہے۔ اس کی بھی کئی وجوہ ہیں، ان میں مسلمانوں کے خلاف تعصب صرف ایک وجہ ہے۔ دوسری وجہ تعلیم وتربیت کی کمی ہے، مسلمان نوجوانوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ انہیں ملازمت دی ہی نہیں جائے گی۔ اس لئے درخواست دینے کی ضرورت ہی کیا ہے اور کیا ضرورت ہے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کی، چنانچہ ان نوجوانوں میں یہ تحریک پیدا کرنے کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کانشی رام سیاست میں داخل ہونے سے پہلے دلت لوگوں کو اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے تیار کرتے تھے اور ان کے لئے ٹریننگ کیمپ لگایا کرتے تھے، ان کا حوصلہ بڑھایا کرتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد نے بھی اسی قسم کے

کام کا آغاز یونیورسٹی کے اندر کیا کہ مسلمان طالبعلموں کو آئی اے ایس کے امتحان کے لئے تیار کیا جائے مگر ان کے دوسرے ساتھیوں نے اس قسم کے جوش و جذبہ کا مظاہرہ نہیں کیا' تاہم ایسے بہت سے مراکز کی شدید ضرورت ہے۔

مقابلے کی اس دنیا میں بقا کی خاطر پورے عزم صمیم کے ساتھ بہت محنت کرنا پڑے گی۔ مسلمان قیادت خصوصاً سیاسی قیادت عام شکایت کرتی رہتی ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم ہے مگر یہ شکایت دراصل مسلمانوں کے بارے میں حقیقی فکر سے پیدا نہیں ہوئی' صرف سیاست بازی کی مظہر ہے۔ اس قسم کی شکایات دراصل صرف سیاسی فائدہ اٹھانے کی خاطر کی جاتی ہیں۔ تعلیم اور تربیت عام کرنے کی سچی لگن کا فقدان ہوتا ہے اور سرمایہ بھی نہیں ہوتا کہ اس قسم کی سہولتیں فراہم کر کے مسلمان کی مقابلے کی صلاحیتوں کو فروغ دیا جائے۔

مسلمان دستکاروں اور چھوٹے تاجروں کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا۔ مرکز اور صوبوں کی حکومتوں نے اقلیتوں کے لئے کئی سکیموں کا اعلان کر رکھا ہے مگر کوئی ایسا وسیلہ نہیں جو مسلمانوں میں ان سکیموں کے بارے میں پوری معلومات فراہم کر سکے۔ حالانکہ ضرورت مندوں میں یہ اطلاعات وسیع پیمانے پر پہنچانے کی ضرورت ہے۔ پھر ہمارے ہاں تو زکوٰۃ جیسا انتہائی مفید ادارہ بھی ہے اور ہر مسلمان پر زکوٰۃ ادا کرنا فرض بھی ہے۔ اگر ہر صوبے میں معروف دیانتدار لوگوں پر مشتمل زکوٰۃ بورڈ بنا دیئے جائیں تو پھر مسلمانوں کے نچلے طبقے کے کمزور مالی حالات والے لوگوں کو مالی مدد دی جا سکتی ہے۔ اسلام نے معاشرے کے غریب طبقوں کی امداد بھی سود سے کرنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ مسلم دانشور اور عالمان دین اس ضمن میں بڑی لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں مگر ان اداروں کو ٹھوس شکل دینے کیلئے کرتے کچھ بھی نہیں۔ اگر زکوٰۃ فنڈ سے سود سے پاک امداد باہمی والے بینک قائم کئے جائیں تو ان کے ذریعے ضرورت مند کاریگروں اور چھوٹے تاجروں کی مالی ضرورت پوری کر کے پسماندہ مسلمانوں کی بہتری کے لئے بہت کام ہو سکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان قائدین اور دانشوروں کے خیال و فکر میں سماجی ضرورتوں کے بارے میں مستقبل کی واضح صورت پیدا ہو اور مسلمان عوام سے وفا کا پاس سچا

MashalBooks.org

ہو۔اس بات کی صورت پذیری کے لئے ہر صوبے میں غیر جانبدار اور غیر سیاسی مسلمانوں کے فلسفہ فکر و خیال قائم کئے جائیں۔ یہ حلقے مقامی مسائل کو حل کرنے کی تدابیر کریں۔ صرف چھاتی پیٹنے اور ہر وقت در شکایت کھولنے والے کلچر سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔اس بات کا احساس جس قدر جلدی ہوگا' مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کیلئے اتنا ہی اچھا ہوگا۔

(15-جولائی1999ء)

مسلمان اور تعلیم

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے بچوں خصوصاً لڑکیوں کو سکول بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ البتہ انہیں مذہبی تعلیم کی فکر رہتی ہے۔اس لئے زیادہ سے زیادہ مدرسے کھولنے پر توجہ دیتے ہیں۔ ستر کی دہائی کے شروع میں بہت سے علاقوں خصوصاً وسطی اور شمالی ہندوستان میں متعدد مدارس کھلنے پر اس رجحان کو مزید تقویت ملی۔ ہوا یوں کہ عرب ممالک میں تیل کی وجہ سے انقلاب آ گیا۔انہوں نے غریب مسلم ممالک اور مذہبی تعلیم اور دوسرے کاموں کے لئے امداد دینا شروع کردی۔ ہندوستان کے بہت سے علماء بھی مدرسے قائم کرنے اور موجودہ مدرسوں میں توسیع کرنے کیلئے امداد لینے میں کامیاب ہوگئے۔ بلاشک یہ بات درست ہے کہ ستر کی دہائی اور اس کے بعد کے زمانے میں ہندوستان میں بہت سے مدرسے قائم کئے گئے۔

لیکن مدرسوں کی تعداد میں اضافہ کی اور وجوہات بھی ہیں اور ان سے باخبر ہونا ضروری ہے۔اس کی صرف ایک ہی وجہ نہ سمجھی جائے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ پہلے تو ہم ہندوستان کے مسلمانوں میں مدرسوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کی روایت پر روشنی ڈالیں گے۔سب سے اولین بات یہ ہے کہ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے عہد میں یہ مدرسے اعلیٰ علمی ادارے تھے۔علم کا مرکز تھے' ان مدرسوں کے ذریعے مذہبی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور بنیادی علوم کی بھی جنہیں علوم عقلیہ کہا جاتا' ان مدرسوں کی سرپرستی بادشاہ' نواب اور جاگیردار کیا کرتے تھے' چنانچہ اب جسے درس نظامیہ کہا جاتا ہے وہ دینی اور دنیاوی علوم کا امتزاج ہے۔

مغلیہ عہد کے زوال اور انگریز راج کی آمد کے بعد اعلیٰ علوم کے یہ مرکز روبہ زوال ہونے لگے ان کے وسائل ایسے نہ رہے کہ ان کی ترقی ہو اور ان کے ذریعے نئے علوم کی تدریس ہو۔اس کے بعد محلے کی سطح پر چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہونے لگے جن کے اخراجات محلے

داروں کے چندے سے پورے ہونے لگے۔ یہاں صرف ابتدائی مذہبی تعلیم دی جایا کرتی۔ مغلوں کے خاتمے کے بعد جو سب سے بڑا مذہبی مدرسہ یا مرکز قائم ہوا وہ یو پی میں دیو بند کا ادارہ تھا۔ یہ ادارہ مولانا قاسم احمد نانوتوی اور ان کے ساتھیوں نے قائم کیا تھا۔ ابتدا ایک چھوٹی سی کوشش تھی اور یہ کوشش 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انیسویں صدی میں کی گئی۔

یہ مدرسہ اس وقت وجود میں آیا جب مسلمان بحران میں گرفتار تھے' فرنگیوں کا عتاب برداشت کر رہے' برطانیہ کے خلاف اگلے مورچے میں علماء جدوجہد کر رہے تھے اور یہ سب کچھ کانگرس کے وجود میں آنے سے بہت پہلے ہوا' اس ادارے نے دوقومی نظریے اور ملک کی تقسیم کی شدید مخالفت کی۔ مولانا محمود الحسن کی سربراہی میں ان علماء نے جدید تعلیم کی مخالفت اس لئے نہیں کی کہ یہ جدید اور سیکولر ہے' بلکہ اس لئے کہ یہ نظام تعلیم برطانوی سامراجی نظام کا حصہ ہے۔

دوسری طرف سرسید نے علی گڑھ میں جدید تعلیم کے ادارے ایم اے او کالج کی بنیاد رکھ دی جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کہلایا اور دیکھا جائے تو ایک طرح سے یہ دونوں ادارے ایک دوسرے کو کاٹنے کی بجائے ایک دوسرے کے معاون بنے ہوئے تھے۔ اس انتہائی بحرانی دور میں دراصل دونوں قسم کی تعلیم کے نظام کی ضرورت تھی۔ اسی زمانے میں مسلمانوں پر اپنی شناخت کے حوالے سے بھی ایک بحران آیا ہوا تھا۔ اسی بحرانی دور میں صرف جدید سیکولر تعلیم مسلمانوں کے لئے ناکافی تھی۔ مسلمان اشرافیہ کے لئے اپنے زوال کی نئی صورتحال سے سمجھوتہ بہت مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت علماء نے سیکولر اشرافیہ کے مقابلے میں برطانیہ کو نکالنے کی جدوجہد میں بڑا کردار ادا کیا۔ مسلمانوں کی سیکولر اشرافیہ اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے انگریزوں سے سمجھوتہ چاہتی تھی۔

ان دنوں علماء کو مسلمانوں کی مذہبی شناخت کے بارے میں بھی بڑی تشویش تھی۔ چنانچہ ان کی سرپرستی میں مذہبی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں میں جو زیادہ تر نچلی ذاتوں میں سے تھے سخت غربت تھی۔ جدید سیکولر تعلیم ان کی مذہبی شناخت میں مددگار نہ تھی۔ دوسرے غربت کی وجہ سے ان میں اس تعلیم کے حصول کی مالی سکت بھی نہ تھی۔ سماجیات کے بہت سے ماہرین کا کہنا ہے کہ آزادی سے پہلے مسلمان یا تو جاگیردار تھے یا بالکل ہی غریب لوگ۔ اس طرح یا تو انتہائی امیر (زیادہ جاگیردار طبقہ) یا بہت ہی غریب گویا درمیانی

طبقہ بہت ہی کمزور تھا۔علماء مدرسوں کے ذریعے مفت تعلیم دیتے تھے۔اس لئے وہ غریبوں کی ضرورت پوری کرتے تھے اور کئی مدرسے تو طلباء کی خوراک اور رہائش کے بھی ذمہ دار تھے۔

تقسیم کے فوراً بعد کا زمانہ بھی مسلمانوں کے لئے بڑا مشکل تھا۔ پڑھے لکھے امراء اور درمیانی طبقہ کے لوگ پاکستان کی سرسبز چراگاہوں کو ہجرت کر گئے۔ پیچھے ناخواندہ غریب مسلمان رہ گئے چنانچہ ایک بار پھر یہی مدرسے ان کی مدد کو آئے اور ان کی نفسیاتی اور فکری ضرورتوں کو پورا کرنے لگے۔حکومت ہند اتنے پرائمری سکول نہ کھول سکی کہ غریبوں کی ضرورت کو پورا کرتے چونکہ مسلمان سب سے زیادہ غریب تھے ان کے لئے مدرسوں کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں بچا اور جو کسی نہ کسی طرح سرکاری سکولوں میں داخل بھی ہو گئے ان میں سے بھی اکثریت مالی مجبوریوں کے باعث پرائمری سے پہلے ہی سکول چھوڑ گئی کیونکہ ان کے والدین کی ضرورت تھی کہ روزگار کمانے میں ان کے مددگار ثابت ہوں' تاہم پرائمری سکول چھوڑنے کے باوجود اوقات کار کے باعث ان کے لئے صبح یا شام کے بعد مدرسوں سے تعلیم حاصل کرنا ممکن ہوتا۔

ان تمام وجوہات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں میں سیکولر تعلیم کم کیوں ہے اور مدرسوں کا نظام کیوں فروغ پا رہا ہے۔تعلیم کے باعث آنے والے انقلاب کے بعد علماء کو بھی اپنے مدرسوں کے فروغ کا امکان نظر آیا تو بہت سے مدرسے کھلنے لگے۔ان میں اعلیٰ تعلیم کے مدارس بھی تھے' انہی مدرسوں نے آزادی کے بعد بڑھتی ہوئی مسلم آبادی کی تعلیمی ضرورتوں کو بھی پورا کیا اب لڑکیوں کو پرائمری اور اوپر کی سطح پر مذہبی تعلیم دی جانے لگی۔ مہاراشٹر کے شہر' گاؤں اور دوسرے مقامات پر لڑکیوں کے لئے بھی باقاعدہ پڑھائی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

مدرسوں کی تعلیم کے متعلق جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے باوجود میں جدید سیکولر تعلیم کے بارے میں بات کرنا چاہوں گا۔ یہ تاثر زائل کرنا ضروری ہے کہ مسلمان بالارادہ جدید سیکولر تعلیم سے درگزر کر کے صرف مدرسوں سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تاثرات نہ صرف غیر حقیقی ہیں بلکہ فرقہ وارانہ رویوں کے حوالے سے بڑے خطرناک بھی ہیں۔ مدرسوں کو بنیاد پرستی کا مرکز سمجھا جاتا ہے اور ان دنوں انہیں آئی ایس آئی کی سرگرمیوں کا مرکز بھی گردانا جانے لگا ہے۔اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض سیاسی چالبازی ہے۔انتہائی افسوسناک بیان ایڈوانی کا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ مدرسوں کی تعلیم دراصل سکیورٹی رسک (ملک کی سلامتی

کے لئے خطرہ) ہیں۔ یہ تو ایڈوانی صاحب اور ان کی سراغ رساں ایجنسی کو ہی علم ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ چند ایک کالی بھیڑیں ہوں مگر اس قسم کی بے سروپا بیانات بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور اس طرح ایک پورے طبقے یا فرقے کو مردود قرار دے دیا جاتا ہے۔ جو مدرسے اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں' ان کو باقی مدرسوں سے الگ کر کے قانون کے مطابق ان کے خلاف کارروائی کی جانی چاہئے۔

مدرسہ تعلیم کے علاوہ مسلمانوں میں سیکولر تعلیم کے حصول کا رجحان بھی بڑھ گیا ہے۔ اب تک مذہب کی وجہ پر نہیں بلکہ سماجی' معاشی اسباب نے مسلمان لڑکیوں کو جدید تعلیم سے دور رکھا مگر آج کل مسلمانوں کے درمیانے طبقے میں اضافہ کے باعث جدید تعلیم حاصل کرنے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس سال بمبئی یونیورسٹی میں نوشین خان نے بی ایس سی میں اول پوزیشن حاصل کی ہے۔ بہار سے ایک اور مسلم لڑکی نے آئی اے ایس کے امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ 1981ء کے ایک سروے کے مطابق اب گریجوایٹ مسلمانوں کی شرح اعشاریہ چار (.4) فیصد ہے۔ دوسری برادریوں کے مقابلے میں اگرچہ یہ تعداد مایوس کن ہے مگر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی صورت حال بہتری کی طرف مائل ہے۔

یوپی میں شیروانی کے کئے گئے سروے کے مطابق اول درجے میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے والی مسلمان لڑکیوں کی شرح تیرہ گناہ زیادہ ہوگئی ہے۔ بے شک مجموعی شرح اونچی نہیں مگر تیرہ گنا ہو جانا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ نصرت اور احمد رشید شیروانی کے اسی سروے کے مطابق یوپی کے مختلف کالجوں میں مسلمان لڑکیوں کی کامیابی کی شرح میں بڑا اضافہ ہوا ہے اور مجموعی طور پر پورے ہندوستان میں مسلمان کالجوں خصوصاً لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ بڑا حوصلہ افزا رجحان ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد نے مسلمانوں میں جدید سیکولر تعلیم کے فروغ کو زندگی کا مشن بنا لیا ہے۔ انہوں نے شمالی ہندوستان کے متعدد شہروں اور قصبوں میں تعلیمی کارواں کے نام سے جلوس نکالے ہیں' جن کے ذریعے مسلمانوں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر اس کارواں کا خاصا اثر پڑا ہے۔ بنے بنائے مفروضوں اور تاثرات اور زمینی حقیقت حال میں بڑا فرق ہے۔ یک رنگ مفروضات تو جامد و ساکت رہتے ہیں مگر سر میدان تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ اس

وقت تک سماجی، معاشی اور تعلیمی اشارات کے اعتبار سے مسلمان اب بھی بہت پسماندہ ہیں، تاہم مسلمانوں کے افق پر ابھرنے والے درمیانی طبقے میں احساس بڑھ رہا ہے کہ اطلاعات کی ٹیکنالوجی کے اس عہد میں مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھنا چاہئے۔ ہندوستان کے مسلمان صنعتکاروں میں سب سے زیادہ سربرآوردہ عظیم پریم جی ہیں جنہوں نے اعلان کیا ہے کہ ان کی فاؤنڈیشن ہر برس ساٹھ ہزار نوجوانوں کو تعلیم دلائے گی اور یہ بھی کہا کہ اپنے بچوں کو دینے کیلئے سب سے بہترین تحفہ تعلیم ہی ہے۔

وزیراعظم راؤ کے زمانے میں مرکزی حکومت نے مسلمانوں کی تعلیم اور دوسری ضرورتیں پوا کرنے کیلئے مولانا آزاد فاؤنڈیشن کو پانچ سو کروڑ دینے کا اعلان کیا تھا، تاہم حکومت نے اس میں سے صرف ایک سو کروڑ (ایک ارب) روپیہ دیا ہے۔ مہاراشٹر میں کانگرس پارٹی نے اپنے انتخابی منشور میں مسلمانوں کو ایک ارب روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر اس نے اب تک صرف پانچ کروڑ روپے دیئے ہیں۔ اگر حکومت اپنا وعدہ پورا کرے تو مسلمانوں میں شرح خواندگی بڑی حد تک بڑھ سکتا ہے۔ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کا بڑا سبب مذہب یا کمزور قوت ارادی نہیں غربت ہے۔ عظیم پریم جی کی طرح بڑے مسلمان صنعتکار ہندوستان میں نہیں ہیں جو اس ضمن میں مددگار ثابت ہوں حالانکہ اب مسلمانوں میں تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ بھی ہے مگر وسائل کوئی نہیں۔ دوسری طرف مدرسوں میں بھی جدید تعلیم دینے کا رجحان بڑھ رہا ہے لیکن یہاں بھی وسائل کی کمی راستہ روکے ہوئے ہے۔ بہرطور بعض مدرسوں کے نصاب میں جدید سائنسی علوم کی تدریس بھی شامل کرلی گئی ہے۔

(15-اگست2000ء)

سماجی اصلاحات اور سیاسی دشواریاں

حال ہی میں بمبئی ایئرپورٹ پر مجھ پر حملہ کیا گیا اور اسی سے آئندہ ہزاری میں سماجی اصلاحات کی تحریک اور اس کی کامیابی کے امکانات کے بارے میں کچھ بنیادی سوالات پیدا ہوئے ہیں۔ اگر کسی کو سماجی طور پر تبدیلی مقصود ہے تو پھر اسے یہاں کے سیاسی عمل اور جمہوری معیار اور اس کے مثبت پہلوؤں پر خوف غور وفکر کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی جمہوریت اور بعض بنیادی آزادیوں مثلاً آزادی اظہار کے اصل مقاصد کی بھی وضاحت کرنا

ہوگی۔ اہم سوال یہ ہے کہ ہماری جمہوریت میں اظہار کی آزادی کا حق آخر کس کے کام آتا ہے۔ اسے ایک متعین یا واضح رخ دینے کیلئے ہمارے جمہوری نظام کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا بہت ہی ضروری ہے۔

یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں کہ آج کے مقابلے میں انیسویں صدی میں سماجی اصلاحات لانا زیادہ آسان تھا۔ راجہ رام موہن رائے آخر کار ستی کی رسم ختم کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر آج ستی کو ایک بار پھر تقدس اور عظمت دی جا رہی ہے۔ دیورالا (راجستھان) میں جب ایک بیوہ ستی ہوئی تو اس جگہ کی حفاظت کے لئے راجپوت نوجوان تلواریں سونت کر آ گئے اور انہوں نے اسے اپنے وقار اور شناخت کا مسئلہ بنا لیا۔ ستی کا دوسرا واقعہ کانپور کے قریب ایک گاؤں میں ہوا جہاں ستی کی رسم کو عظیم بنانے کیلئے وہاں پر مندر بنانے کو کوشش کی گئی۔ گوالیار کی راج ماتا وجے راؤ سندھیا سمیت بی جے پی کے مختلف رہنماؤں نے علی الاعلان ستی کی رسم کو جائز قرار دیا۔ گزشتہ دنوں فلم واٹر کی وارانسی کے قریب سنگھ پریوار نے شوٹنگ نہیں ہونے دی۔ ان کا کہنا ہے کہ فلم والے جو کچھ شوٹ کرنا چاہتے تھے وہ بیواؤں سے متعلق ہندو روایات کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔ دراصل فلم میں یہ دکھانا مقصود تھا کہ یہاں بیواؤں کے حالات کیا ہیں اور ان سے کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔

سرسید نے قرآن کریم کی ایک عقلی تفسیر لکھی۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ سرسید اپنے انداز میں اسلام کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جدید سائنس قرآن کی تعلیمات کے خلاف نہیں۔ انہوں نے کہا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ فطرت اللہ کا عمل ہے۔ اس لئے اللہ کا کلام اور اللہ کا عمل متضاد نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے عقل پسندی یا عقلیت کو صحیح ثابت کرنے کیلئے قرآن کی بے شمار آیات کی مثالیں دیں۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔ یہ سچ ہے کہ ان کے عہد کے قدامت پسندوں نے ان کی مخالفت کی مگر اس مخالفت کے باوجود انہوں نے نئی قسم کی تفسیر لکھنے کا کام جاری رکھا اور یہ کام نہ صرف ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے بلکہ اس میں اس عہد کی روح عصر بھی منعکس ہے۔ آج ایسے جرأت مند ناشروں کی کمی ہے جو سرسید کی تفسیر القرآن چھاپے مگر خدا بخش لائبریری کے ایک بے باک ڈائریکٹر عابد رضا بیدار نے بعض مسلمان عالموں کے استفادہ کے لئے کچھ برس پہلے اسے

محدود تعداد میں چھاپ دیا۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع میں مولوی ممتاز علی، محسن الملک، جسٹس امیر علی، مولوی چراغ علی اور ان جیسے کئی دوسرے روشن خیال مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی فکر کو ایک نئی جہت دی۔ یہی معاملہ ہندوؤں کا ہے۔ متعدد ہندو دانش وروں اور اصلاح کاروں نے ان مذہبی اور سماجی روایات کو تبدیل کرنے پر زور دیا جو تبدیل شدہ حالات میں مسئلہ بنتی جا رہی تھیں۔ ان کے افکار کا ہم پر بھی مثبت اثر ہوا، انہیں بھی قدامت پسندوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے اپنی آرا کا کھل کر اظہار کیا اور یہی نہیں انہوں نے قانونی اعتبار سے متعدد تبدیلیاں لانے میں کامیابی بھی حاصل کی۔ شاردا ایکٹ سماجی اصلاحات کی تحریک ہی کا نتیجہ تھا۔

تحریک آزادی کے دنوں میں ان دو دھڑوں میں بحث مباحثہ ہوتا رہتا تھا جن میں سے ایک کی ترجیح یہ تھی کہ پہلے سامراجی حکومت سے آزادی حاصل کی جائے جبکہ دوسرے کا کہنا تھا کہ اصلاحات کے ذریعے سماجی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ مہاتما گاندھی عجب نادر شخصیت تھے جنہوں نے دونوں کو متحد کرنے کی کوشش کی یعنی آزادی اور سماجی اصلاحات ساتھ ساتھ۔ انہوں نے ہری جن (ہریجن) جیسا اخبار جاری کیا جس کے ذریعے وہ سماجی اصلاحات کا پرچار کرتے۔ دوسری طرف جواہر لال نہرو جیسے لیڈر تھے جو آزادی حاصل کرنے کی جلدی میں تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ ایک بار اقتدار میں آ گئے تو سماجی تبدیلیوں کا عمل تیز کر دیں گے مگر ہوا ایسا نہیں۔

آج یوں لگتا ہے کہ سماجی اصلاحات اور تبدیلیوں کی کوشش کو ناکام بنانے کیلئے قدامت پسند اور مخصوص مفادات والے مقتدر طبقے ہی جمہوری آزادیوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ نہرو کا خیال تھا کہ سوسائٹی میں سماجی تبدیلی لانے اور اسے سیکولر بنانے میں سیاست بڑی کارگر ثابت ہوگی مگر اتنے سالوں میں جو کچھ ہوا ہے اس کے الٹ ہوا۔ آج سیاست مفاد پرستوں اور قدامت پسندوں کی لونڈی بنی ہوئی ہے۔ یہی وہ طاقتیں ہیں جو ترقی پسندانہ اقدامات اور آزاد خیال تحریکوں کو ناکام بنانے کیلئے جمہوری آزادیوں کو استعمال کرتے ہیں اور اس صورتحال کا واضح ثبوت رام جنم بھومی کی تحریک اور شاہ بانو کیس ہیں۔ یہ دونوں معاملات ایک طویل عرصہ تک ہماری سیاست کے محور بنے رہے اور ہر صورت جو تشویش کا باعث بنے۔ ہماری سیاسی

جمہوریت کو آزاد خیال اور ترقی پسند سماجی تحریکوں کو بلا استثنا دبانے کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مذہبی' ثقافتی اور سماجی عدم رواداری بڑھتی جا رہی ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس عدم برداشت کو فروغ بھی' چند سیاستدانوں کو چھوڑ کر باقی سبھی سیاستدانوں نے دیا ہے اور دے رہے ہیں۔

بوہروں کی اصلاحی تحریک بھی اسی نوعیت کی سیاست کا شکار ہے۔ سیاستدان کانگرس کا ہو' جنتا دل یا بی جے پی یا شیو سینا کا ان سبھی نے بوہرا املائیت کی ہی حمایت کی ہے اور آنکھیں بند کر کے کبھی انہوں نے یہ تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کی کہ معاملہ ہے کیا اور یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ ووٹ حاصل کئے جائیں یا پیسے کی لالچ میں۔ بوہروں کے مذہبی سربراہ اس صورتحال سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جب 13 فروری کو بمبئی کے ایئر پورٹ پر مجھ پر اتنے سارے مسافروں اور پولیس والوں کی موجودگی میں حملہ کیا گیا تو سربراہ نے یہ مؤقف اختیار کر لیا کہ میں نے ان پر حملہ کیا تھا اور ان کی بے عزتی کی تھی۔ سیاستدانوں نے فوراً ان کے مؤقف کی توثیق کر دی اور میری مذمت کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے لگے۔ نہ صرف مسلمان لیڈروں نے سیدنا کے مؤقف کو برحق مانا بلکہ بی جے پی کے لیڈروں نے بھی یہی کیا اور ان کے دو ارکان اسمبلی سیدنا اور ان کے وفد کے ساتھ مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ سے ملنے بھی گئے۔ ان ارکان اسمبلی اور وفد کے ارکان نے مطالبہ کیا کہ مجھے گرفتار کیا جائے۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ہوا کیا تھا اور میرا مؤقف کیا ہے۔ مدھیا پردیش کے وزیر اعلیٰ نے بھی فوراً سیدنا پر حملہ کرنے کے الزام میں میری مذمت کی حالانکہ میں مدھیا پردیش کے ڈائریکٹر جنرل پولیس کی دعوت پر بھوپال میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے موضوع پر پولیس ورکشاپ کرنے گیا تھا اور وہاں سے واپس آ رہا تھا کہ مجھ پر حملہ کیا گیا۔ ان سیاستدانوں کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ سیدنا جہاں کہیں جاتے ہیں ان کے سینکڑوں پیروکاران کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی ان پر حملہ کرنے یا گالی دینے کی جرأت ہی کیسے کرے گا کہ وہ تو ان کے پاس تک نہیں پھٹک سکتا۔ اگر میں نے انہیں گالی دی ہوتی تو ان کے پیروکار مجھ پر جھپٹ پڑتے اور قتل کر دیتے۔ بہر حال میں کسی بھی صورت میں ان کے قریب جا ہی نہیں سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں' ان کے قریب جانا تو دور کی بات ہے میں تو کسی بوہرہ محلے سے نہیں گزر سکتا۔

سوال یہ ہے کہ یہ بوہرا اصلاح پسند مطالبہ کیا کر رہے ہیں؟ ان کے مطالبات بہت سادہ

ہیں کہ سیدنا بوہروں کے سیکولر معاملات میں مداخلت نہ کریں اور صرف مذہبی اور روحانی معاملات تک رہیں۔ وہ برادری سے جو سات ٹیکسوں کی صورت میں بھاری رقم وصول (اور اکثر زبردستی) کرتے ہیں' اس کا برادری کو حساب دیا کریں اور آئین کے تحت جو حقوق بوہروں کو حاصل ہیں وہ غصب نہ کریں اور چندہ ادا نہ کرنے کی بنا پر بوہروں کی نہ شادیاں روکیں نہ ان کے دفنانے پر پابندی لگائیں۔ آج کل بوہرہ برادری میں مذہبی تحکم ایسا سخت ہے کہ سربراہ کو تو چھوڑیں عام مذہبی پیشوا سے کوئی سوال کرنے والے کا فوری طور پر برادری میں حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کے لئے بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے اور جس شخص کا حقہ پانی بند کیا جاتا ہے اس کی مذہبی' سماجی' ثقافتی اور خاندانی زندگی پوری طرح برباد کر دی جاتی ہے۔ برادری میں ان اصلاح پسندوں کے لئے چپکے چپکے بڑی ہمدردی بھی پائی جاتی ہے مگر قطع تعلق کے خلاف کوئی مرد یا عورت زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

بوہرہ سربراہ ایک لمحے کے نوٹس پر ہزاروں بوہروں کو اکٹھا کر سکتا ہے۔ اس لئے سیاستدان فوراً ان کی حمایت شروع کر دیتے ہیں۔ صرف ایک دن کے نوٹس پر ہندوستان کے اندر اور بیرون ملک ہزاروں بوہروں نے میرے خلاف احتجاج کیا چونکہ بوہرہ سربراہ اپنے پیروکاروں کو ذرا سا بھی آزادانہ سوچنے کی اجازت نہیں دیتے اس لئے پوری برادری ہر وقت ان کی آواز پر لبیک کہنے کیلئے تیار ہوتی ہے۔ ہماری آج کی جمہوریت میں جو شخص بے سمجھ انسانوں کے ہجوم پر حاوی ہے وہ اقتدار میں آ سکتا ہے۔ یہ مذہبی رہنما اور سیاستدان آزادانہ سوچ اور انفرادی وقار کی مکمل طور پر حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آزادانہ سوچ رکھنا بدنظمی کے برابر ہے۔ وہ مکمل تابعداری چاہتے ہیں اور ایسے لوگ جو سربسجود لوگوں پر کنٹرول رکھتے ہیں وہی ہماری سیاسی جمہوریت میں زیادہ فائدے میں رہتے ہیں۔

اچھی جمہوریت کی پہلی ضرورت تو ہوتے ہی ایسے لوگ ہیں جو عزت نفس' خودداری اور آزادانہ سوچ سے متصف ہوں۔ اندھی پیروی تو جمہوریت کی نفی ہے اور پھر ہمیں باعلم لوگوں کی ضرورت ہے نہ کہ ایسے لوگ جو آپ کی مدح سرائی کرتے رہیں اور اس کا انحصار ہمارے سکولوں اور کالجوں میں دی جانے والی تعلیم کے معیار پر ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تعلیمی معیار بہت ہی گرا ہوا ہے۔ قدامت پسندوں اور فرقہ پرستوں نے ہمارے تعلیمی نظام پر گرفت بڑی مضبوط کر لی ہے اور اب یہ نظام زیادہ تر بند دماغ کے مذہبی سر پھرے پیدا کر رہے ہیں۔

MashalBooks.org

انتہائی افسوسناک بات ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام جو انسانیت دوست اور آفاقی نظریہ رکھنے والے لوگ پیدا کرتے ہیں' ناکام ہوگیا ہے جو کثرت الوجودی جمہوریت کا انتہائی ہم لازمہ ہیں۔

ہر سیاستداں کی خواہش ہے کہ وہ کسی ایک برادری یا ذات کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرے۔ اس لئے برادری کو کنٹرول کرنے والے طاقت ور مگر چھوٹے جتھے کو رجھانے کی کوشش میں وہ ان کے مطالبات کی حمایت کرتا ہے۔ خواہ یہ مطالبات سماجی اور ثقافتی اعتبار سے اس برادری کو پس ماندگی کا شکار ہی بناتے ہوں۔ ان کا واحد مقصد ہے کسی بھی طرح سے ان کو یہ ووٹ حاصل ہو جائیں۔ اس طرح ہماری جمہوریت ترقی پسند رخ اختیار کرنے کی بجائے ایک طرح سے باجگزار ہوگئی ہے۔ ایسی جمہوریت کبھی بھی لوگوں کو وسیع النظری اور آزاد ترقی پسندانہ انداز اختیار کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ یہ جمہوریت صرف رجعت پسندانہ اور ماضی پرستانہ رویوں کی حوصلہ افزائی کرے گی جو نفرت' عدم رواداری اور جنون کی آگ بھڑکاتی رہے گی۔

(15-مارچ 2000ء)

مسلمان' جدیدیت اور تبدیلی

عموماً یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اسلام تبدیلی کے خلاف ہے اور جدیدیت کو مسترد کرتا ہے۔ اس قسم کا نقطۂ نظر رکھنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ دراصل مسلمانوں میں یہ بحث انیسویں صدی سے چل رہی ہے یعنی جب نوآبادیاتی تجربہ شروع ہوا۔ تاہم رجحان یہی ہے کہ اسلام کو جامد قسم کی شے دکھایا جائے اور اس کے لئے بڑے سادہ سے مفروضے گھڑ لئے جاتے ہیں مگر جو لوگ جانتے ہیں انہیں خبر ہے کہ معاملہ جس قدر آسان سمجھا جاتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ بحث میں مذہبی بنیادوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور ماحول یا عہد کے سماجی پہلوؤں کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ بعض صرف مذہبی پہلوؤں کو ہی اہمیت دیتے ہیں جبکہ دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ بہتر افہام وتفہیم کے لئے اس مذہبی فضا کو سماجی پس منظر میں جانچنا چاہئے۔

یوں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ایک نہیں اسلام کئی ہیں۔ ہر معاشرہ جو مختلف قسم کی

اسلامی روایات بناتا ہے وہ اسلام نہیں ہوتا۔ جدیدیت بھی اسی طرح یک رنگ بنادی گئی ہے۔ جدیدیت کو بھی عقلی پس منظر کی بجائے سماجی حوالے سے سمجھا جانا چاہئے۔ اس طرح ایک جدیدیت نہیں کئی جدیدیتیں ہیں اور پھر جو لوگ جدیدیت کے لئے کام کرتے ہیں وہ بھی چند چیزوں کو لے لیتے ہیں اور ان کا سارا زور انہی پر صرف ہو جاتا ہے۔ اس کا انحصار بھی اس بات پر کہ ان کے اپنے معاشرے میں کیا شے رد کی جارہی ہے اور کسے قبولیت حاصل ہے' یہاں مناسب ہوگا کہ کچھ مثالیں دی جائیں۔

انیسویں صدی کے بہت بڑے اصلاح پسند سرسید اپنی طرز کے جدیدیت کے نقیب تھے۔ انہوں نے انیسویں صدی کے ہندوستان کے مسلمانوں میں جدیدیت کے فروغ کیلئے بے تکان کام کیا۔ انہوں نے سائنس کی اہمیت پر زور دیا اور قرآن کی تفسیر یہ دکھانے کے لئے کی کہ قرآن سائنس کے فروغ کے خلاف نہیں ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں ایک بڑا مقبول مقولہ بھی دیا ''اللہ کا لفظ (قرآن) اللہ کے کام (فطرت جس کا مطالعہ سائنسی علوم کرتے ہیں) سے متضاد نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے جدید تعلیم کی اہمیت پر بھی زور دیا اور اس کے فروغ کے لئے ایک ادارہ بھی قائم کیا' تاہم انہوں نے خواتین کے بارے میں سماجی اصلاحات کو رد کر دیا۔ جب ان کے ایک مداح اور ساتھی مولوی ممتاز علی نے کتاب خواتین کے حقوق (حقوق نسواں) لکھی تو سرسید نے نہ صرف انہیں اس کی اشاعت روکنے کا مشورہ دیا بلکہ ان کے نظریات کی بھی مخالفت کی۔ سرسید نے مسلمانوں کو یہ نصیحت بھی کی وہ سیاست سے الگ تھلگ رہیں حالانکہ جدید جمہوری حقوق حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ سیاست ہی ہے۔ سرسید کا سارا زور جدید تعلیم اور موزوں تفہیم قرآن پر تھا۔ سرسید کی جدیدیت میں خواتین کے حقوق کے فروغ کی گنجائش نہ تھی (یہ مسئلہ بحث طلب ہے کہ آیا وہ حقوق نسواں کے خلاف تھے یا نہیں)

اس کے برعکس مولوی ممتاز علی سرسید کے ہم عصر بھی تھے اور ان کے رفیق کار بھی۔ وہ خواتین کے حقوق کیلئے سرگرم رہے۔ ان کے نزدیک عورتوں کو حقوق دیئے بغیر نہ جدیدیت مکمل ہوتی ہے نہ اسلام' جس انتھک طریقے سے سرسید نے جدید تعلیم کے فروغ کے لیے کام کیا اتنی ہی دلجمعی کے ساتھ مولوی ممتاز علی نے عورتوں کے حقوق کے لئے سرگرمی دکھائی اور ہر چند دونوں جدیدیت کے علمبردار تھے مگر جدیدیت کے بارے میں ان کے تصورات مختلف تھے۔ سرسید کے نزدیک مسلمان معاشرے میں جدیدیت کے لئے عورتوں کے حقوق کی کوئی اہمیت

ہی نہ تھی جبکہ جدید تعلیم کی بہت اہمیت تھی۔ دوسری طرف مولوی ممتاز علی کے نزدیک عورت کو بااختیار بنانا اسے اس کے حقوق دلانا جدیدیت کا ایک اہم حصہ تھا۔

بہت سے مسلمان عالم نہ صرف اسلام کے حوالے سے جدیدیت کو رد کرتے ہیں وہ اسلام میں کثرت الوجودیت سے بھی انکاری ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام ایک وحدت یا یک رنگی کا مظہر ہے اور کثرت الوجودیت کی بات کرنا گویا خلاف اسلام ہے۔ کثرت الوجودیت قبول کرنے والے کو کافر بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ عالم لوگ معاشرے کو کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک ایک مرکزی حیثیت صرف دین کو حاصل ہے' باقی سب کچھ ثانوی ہے۔ معاشرے کو مذہبی سانچے یا تصور میں ڈھلنا چاہیئے اور معاشرے کا مذہب پر کوئی بھی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ سماجی کثرت الوجودیت کو آنکھیں بند کر کے رد کر دینا چاہیئے۔ ان کے نزدیک اسلام صرف اسلام ہے اور اس کا ڈھانچہ یک سنگی یا یک رنگی ہے۔ اس طرح انسان ہندوستانی اسلام' ملیشیائی' ایران یا انڈونیشی اسلام کی بات نہیں کر سکتا۔ تمام مقامی روایات ناخالص ہیں' ان کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن ایسے عالمان دین بھی ہیں جو مقامی روایات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور مقامی رسم و رواج (عادات) کی اہمیت کو مانتے ہیں۔ مثلاً شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ اگر عربوں کے سماجی رسم و رواج غیر عرب اقوام اور ثقافتوں پر گرانبار ثابت ہوں تو پھر انہیں عالمی اصولوں کے مطابق تبدیل کر کے کسی بھی قوم کے رسم و رواج کے مطابق اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ بڑے ترقی پسند اصول پیش کرتے ہیں۔ اپنی شاہکار کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔ ''اوامر و نواہی کے بارے میں قانون سازی کا بہترین اور آسان معیار یا مثال یہ ہے کہ ان لوگوں کے اس وقت کے رسم و رواج کو سامنے رکھا جائے جن میں رسول کی بعثت ہوئی۔ یہ واضح رہے کہ یہ قوانین اتنے کڑے نہیں کہ مستقبل کی نسلوں کے لئے مشکلات پیدا کریں''۔

شاہ ولی اللہ ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کے عظیم مذہبی دانشور تھے جو مقامی سماجی حقائق اور معاشرتی ضرورتوں کے حوالے سے اسلام میں کثرت الوجودیت کے امکان کو مانتے ہیں۔ مختلف معاشروں میں مختلف قسم کی روایات ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کے لوگوں کے فکر و عمل میں ضم ہو جاتی ہیں۔ جدیدیت میں حقوق کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جبکہ دینی علم فرائض عائد کرنے تک محدود ہے اور حقوق کو مسترد کر دیتا ہے۔ اس

طرح روایتی اسلام فرائض تو عائد کرتا ہے اور حقوق کا تصور مسترد کر دیتا ہے۔ علماء اور عالم اسلام کے بعض روایت پسند سیاسی رہنما حقوق کی بات مسترد کر دیتے ہیں۔ مثلاً ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد ایک بیان میں کہیں کہ انسانی حقوق ایک مغربی تصور ہے جو مشرقی معاشروں کے لئے غیر ہے تو بہت سے علماء اس مسئلے پر فوراً اس کی حمایت کر دیں گے۔

ایران کے ایک سربرآوردہ ادیب عبدالکریم سروش نے ایمسٹرڈم کے ایک مذاکرے ''اسلام اور دنیائے جدید'' میں نکتہ پیش کیا کہ ایران میں عالمان دین صرف فرائض کی بات کرتے ہیں اور لوگوں کو حقوق دینے کیلئے تیار نہیں۔ وہ اسلام کی تعبیر سمیت تمام حقوق اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ولائت فقہ (قانون کی حاکمیت) کے تصور کے مطابق آئت اللہ خمینی بھی تمام تر اختیارات فقہ (قانون) اپنی ذات تک محدود رکھتے ہیں اور ان کے جانشین آیت اللہ خمینائی بھی اسی مقام کے دعویدار ہیں اور تمام حقوق یا حاکمیت فقہ (قانون ساز) میں مرکوز کرتے ہیں۔ گویا کسی بھی صورت میں لوگوں کے کوئی حقوق نہیں' اگر عوام کے منتخب کردہ نمائندگان بھی کوئی قانون بناتے ہیں اس کی منظوری بھی غیر منتخب شدہ فقیہہ کی محتاج ہوگی۔

ان کے مقابلے میں بعض جدید مسلمان دانشور عوام کے منتخب نمائندگان کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ قانون بنائیں اور ضروری ترامیم اور تبدیلیاں بھی کرنے کے مجاز ہیں۔ معروف شاعر اور مفکر ڈاکٹر محمد اقبال نے بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں اسلام میں اجتہاد پر مضمون لکھا تھا اور کہا تھا کہ اجتہاد متحرک اور تبدیلی کا حصول ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ قانون سازی آزادانہ رائے اور فیصلے کے مطابق ہو۔ ان کے کہنے کے مطابق عوام کے منتخب نمائندگان کی اسمبلی کی حیثیت اجماع (عوام کا اجتماعی اتفاق) کی ہے اس لئے اس ادارے کی طرف سے بنایا گیا کوئی بھی قانون جائز ہوگا۔

واضح رہے کہ علامہ اقبال نے یہ مضمون اپنے عہد کے متعدد سربرآوردہ علماء سے صلاح مشورے کے بعد بڑی احتیاط سے لکھا تھا انہیں یہ مضمون لکھنے میں چار سال لگے تھے اور یہ ان کی کتاب ''اسلام میں مذہبی افکار کی تشکیل نو'' میں شامل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک دلچسپ مشاہدہ بھی کیا تھا جو یہاں دہرانے کے قابل ہے۔ ''اس (معاشرے) کے پاس کچھ ابدی اصول ہونے لازمی ہیں جن سے اجتماعی زندگی کو منظم کیا جائے۔ ابدی اس لئے کہ ہر دم بدلتی دنیا میں ہمارے پاس ایک مضبوط بنیادی سہارا موجود ہو۔ مگر جب انہی دائمی اصولوں کے

باعث ممکنہ تبدیلیوں کو ہی قبول نہ کیا جائے جبکہ قرآن کے مطابق یہ تبدیلی اللہ کی ایک بڑی نشانی ہے' تو ایسی صورت میں یہ اصول فطرت کے مطابق ہونے والی لازمی تبدیلیوں کو بھی غیر متحرک بنا دیتے ہیں۔ سیاسی اور معاشرتی علوم میں یورپ کی ناکامی اول الذکر اصول کی مثال ہے اور اسلام کو غیر متحرک رکھنا موخر الذکر اصول کی مثال ہے۔ اب اسلام کو متحرک رکھنے کا کیا اصول ہے؟ اسے اجتہاد کہا جاتا ہے۔''

اقبال نے تحریک اور جدیدیت کا مسئلہ کمال جامعیت کے ساتھ متذکرہ بالا پیرے میں بیان کر دیا ہے۔ کچھ عالمان دین کو احساس ہی نہیں کہ یہ چند اصول ابدی اور ناقابل تبدیل ہیں مگر ان کا اطلاق ابدی اور مستقل نہیں۔ جسے ایک جاگیردارانہ معاشرے میں عدل کہا جاتا ہے (عدل بھی ابدی اصول ہے) وہ ایک جمہوری معاشرے میں عدل نہ ہوگا۔ جاگیردارانہ معاشرہ دراصل مطلق العنان ہوتا ہے اور ایسے معاشرے میں صرف فرائض کا وظیفہ ہی قابل قبول ہوسکتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں جمہوری معاشرہ کھلا اور آزاد ہوتا ہے جس میں مرکزی حاکمیت نہیں ہوتی بلکہ عوام کو سیاسی اقتدار میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے حقوق کا موضوع ہی قابل قبول ہوتا ہے۔ کسی جمہوری معاشرے میں حقوق کے بغیر فرائض کی بات کرنا ناانصافی سمجھا جاتا ہے۔

یوں اصولوں کی ابدیت قبول کرتے ہوئے بھی ان اصولوں کے اطلاق میں ممکنہ تبدیلیوں سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ آج کی اسلامی دنیا میں سینکڑوں لوگ تبدیلی کی بات کر رہے ہیں۔ یہ سمجھنا بہت بڑی نادانی ہوگی کہ عالم اسلام مکمل طور پر جامد اور غیر متحرک ہے۔ تبدیلی کا عمل جاری ہے کہیں تیز کہیں آہستہ کیونکہ اجتہاد کا انحصار اس ملک کے حالات پر ہوتا ہے۔ اس عمل کے واضح آثار نظر آتے ہیں۔ آج کی دنیا میں کوئی بھی معاشرہ جامد نہیں ہو سکتا' تاہم تبدیلی کے عمل دراصل بہت پیچیدہ ہیں۔ اس کا براہ راست تعلق اس معاشرہ کے حالات سے ہوتا ہے۔ اسلام میں مردوں اور عورتوں سے انصاف کے حوالے سے بڑے واضح احکامات ہیں مگر یہ انصاف جاگیردارانہ معاشرہ میں قائم نہیں ہوسکتا تھا جس میں اسلام پھیل رہا تھا۔ آج بھی عالم اسلام کے جاگیردارانہ معاشرہ میں جمہوریت کی طرف سفر مکمل نہیں ہوا یہ منزل ابھی بہت دور ہے اس لئے عوام کے خصوصاً خواتین کو ان کے حقوق دینے کا سارا عمل نامکمل ہے۔ مرد و زن میں انصاف کا مسئلہ بھی انتہائی حساس مسئلہ ہے اور ہوسکتا

ہے کہ دوسری معاشرتی تبدیلیاں تو آسانی سے قبول کر لی جائیں مگر خواتین کو ان کے حقوق دینے' انہیں اقتدار یا طاقت دینے کا مرحلہ مشکل ترین ہوگا۔

ڈاکٹر اقبال نے اتاترک کے عہد میں ترکی میں مرد و زن کے قوانین کے بارے میں کی جانے والی تبدیلیوں کا خیر مقدم کیا تھا اور وہ ترکی کے ایک بڑے شاعر اور سماجی علوم کے ماہر ضیا گوکلپ کے بھی بڑے مداح تھے جو مرد و زن کو انصاف دینے کے زبردست حامی تھے' تاہم اقبال نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان میں جس قسم کے حالات ہیں ان میں شائد یہ تبدیلیاں (ترکی والی) قبول نہ کی جائیں۔ اس معاملے میں اقبال کی پیش بینی بے مثال ہے۔

(15- جون2000ء)

الگ مسلم پارٹی کی ضرورت نہیں

جامع مسجد دہلی کے حال ہی میں مقرر کئے گئے شاہی امام سید احمد بخاری نے اعلان کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی الگ جماعت بنائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ وہ براہ راست اس مسلم پارٹی کی تشکیل میں حصہ لیں گے اور اس کا نصب العین یہ ہوگا کہ مسلمانوں' غریبوں اور مظلوموں اور اقلیتوں کے گم شدہ حقوق حاصل کئے جائیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ پارٹی کی تشکیل پر خاص توجہ دیں گے۔ وہ اس سال نومبر یا جنوری 2001ء میں رمضان کے مہینے میں مسلمان رہنماؤں کا اجلاس بلائیں گے۔

امام صاحب نے آل پارٹیز حریت کانفرنس کے رہنماؤں سے رابطہ کیا اور حریت کانفرنس کے چیئرمین میرواعظ نے فوراً جواب دیا اور بخاری صاحب کے جلسہ میں شامل ہونے کی حامی بھر لی۔ شاہی امام نے ایک اخبار والے کو بتایا ''ہم نے جناح کو لیڈر نہیں مانا تھا' ہم صرف جواہر لال نہرو' اندرا گاندھی' وی پی سنگھ اور دوسروں کو لیڈر مانتے رہے مگر ہمیں ان سے صرف خالی نعرے اور کھوکھلے دعوے ملے' اس بنا پر ہم اپنی سیاسی جماعت بنانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔''

اس صورتحال کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ دلیل بھی بڑی خطرناک ہے۔ بعض

MashalBooks.org

سیاسی لیڈر تو اقتدار حاصل کرنے کے لئے اقلیتوں کے مسائل کے بارے میں خالی خولی وعدے کرتے ہیں۔ احمد بخاری صاحب کے اپنے والد اور اس زمانے کے جامع مسجد کے شاہی امام سید عبداللہ بخاری بھی اس بات پر بڑے بدنام ہوئے کہ انہوں نے مسائل کو جذباتی طور پر استعمال کرتے ہوئے اپنا سیاسی اثر ورسوخ بنایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہی امام اور ان جیسے دوسرے مسلمان لیڈروں نے اس زمانے میں جذباتی تحریر وتقریر اور انتہائی جذباتی مسائل کے حوالے سے جو رویہ اختیار کیا وہ مسلمانوں پر تباہی لے کر آیا۔ یہی وجہ تھی کہ خود ان لیڈروں کی حیثیت ہی کم سے کم تر ہوتی گئی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا اور بہت سے مسلمان دانشوروں کا بھی یہی خیال ہے کہ عبداللہ بخاری کے جذباتی بیانات کے باعث ہی سنگھ پریوار اتنا مضبوط ہوا کہ اسے بابری مسجد کے انہدام کی بھی جرأت حاصل ہوگئی۔

اقلیتوں کے ان نام نہاد معزز لیڈروں کی عوام میں کوئی حیثیت یا مقام نہیں، انہیں عوام کی حمایت بھی حاصل نہیں، بعض انتہائی جذباتی مواقع پر، یہ لیڈر لوگوں کی جائز شکایات کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ انیسویں صدی سے لے کر آج تک کی تاریخ ایسے ہی واقعات اور مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ بے سہارا محروم اور استحصال زدہ اقلیتوں کو یہ لوگ جذباتی مسائل پر استعمال کرتے ہیں اور یہ اقلیتیں بدقسمتی سے بڑی غریب اور ناخواندہ بھی ہیں۔ اس لئے وہ بھی بہت جذباتی ہوتی ہیں۔ یہ پس ماندگی جتنی دلت کی ہے اتنی ہی مسلمانوں کی بھی ہے۔ دلت کے رہنما بھی جذباتی بیانات دیتے ہیں اور بڑے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

جناح صاحب کی بھی اس ضمن میں ایک اچھی مثال ہے۔ مسٹر جناح خود بہت پڑھے لکھے ہوشیار رہنما تھے چنانچہ انہوں نے یا تو اپنی سیاست کے لئے یا مسلمانوں کے طبقہ اشرافیہ کے مفادات کی خاطر غریب مسلمانوں کے مسائل کو استعمال کیا اور اشرافیہ کے لئے ہی پاکستان بنایا۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے پاکستان کے قیام سے ان کا کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بلکہ آج پاکستان میں ان کو پہلے سے بھی زیادہ مسائل کا سامنا ہے۔ جناح صاحب نے ''سب مسلم متحد ہو جائیں'' کا نعرہ لگایا مگر عملاً اس نعرے کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں کو پہلے دو حصوں میں تقسیم کرایا اور پھر تین ممالک میں مسلمانوں کو تقسیم کر دیا گیا۔

MashalBooks.org

چنانچہ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کیلئے مزید مشکلات پیدا کردیں جن پر ابھی تک وہ قابو نہیں پا سکے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک طرف علیحدگی کی سیاست دوسری طرف جذبات کا بلند بانگ اظہار کوئی بھی مسئلہ حل نہیں کرتا بلکہ یہ رویہ موجود مسائل کو زیادہ گمبھیر بنا دیتا ہے۔

کثرت الوجود معاشروں میں جیسا کہ ہندوستان کا ہے علیحدگی سے کوئی بھی قائل نہیں ہوتا۔ یہاں ہم اس بات پر بھی زور دینا چاہیں گے کہ علیحدگی کا مذہب سے کوئی بھی تعلق نہیں جبکہ بہت سے دانشور لکھتے ہیں کہ تعلق ہے مثلاً آج بھی بہت سے عالم فاضل اسلام کو تخلیق پاکستان کا ذمہ دار سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب کی سیاست اور مسلمان اشرافیہ ملک کی تقسیم کی ذمہ دار ہے اگر جناح صاحب زیادہ سیانے اور زیادہ سنجیدہ ہوتے تو ایک الگ ملک کا مطالبہ کرنے کی بجائے وہ اقلیتوں کے لئے زیادہ اختیارات اور حقوق پر سودا کر سکتے تھے مگر بعض سیاسی مطالبات ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں سامنے لاتے وقت تو زیادہ پریشانی نہیں ہوتی مگر پھر وہ اپنے زور پر خود سیاستدانوں کے کنٹرول سے باہر ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ موجودہ حالات میں اگر مسلمانوں کی الگ سیاسی جماعت بنائی جائے تو اس کی وجہ سے ملک کی مزید تقسیم کا کوئی خدشہ نہیں۔ ہندوستان میں اب مسلم اشرافیہ رہی ہی نہیں اور غریب اور استحصال زدہ مسلمان عوام کو اپنی الگ قوم بنانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ دوسرے ہندوستان کے مسلمان پہلے ہی تقسیم کی بھاری قیمت ادا کر چکے ہیں۔اس لئے وہ حالات خواہ کوئی بھی رخ اختیار کریں اس قسم کے حل کو پسند نہیں کریں گے۔ یوپی اور بہار کے مسلمانوں نے 1947ء میں یہ سمجھا تھا کہ ان کے مسائل کا حل پاکستان ہے مگر اب وہ بھی پچھتا رہے ہیں اور ایم کیو ایم کے لیڈر الطاف حسین نے تخلیق پاکستان کو ایک غلطی قرار دیا ہے اگرچہ اس وقت اس قسم (علیحدگی وغیرہ) کا کوئی خطرہ نہیں پھر بھی ایک الگ مسلم جماعت کا قیام مسائل کا حل نہیں ہے۔نئی جماعت کا قیام بھی انتہائی نامناسب ہے۔

ہندوستان کثرت کا ملک ہے جس میں انتہا درجے کی رنگا رنگی ہے اور اس کی طاقت کا راز بھی یہی تنوع اور کثرت الوجودیت ہے۔مغربی ممالک بڑی حد تک یک رنگی والے ہیں مگر اب ان میں دوسرے رنگ اور دوسری صورتیں آ رہی ہیں اور انہوں نے ثقافتی اور مذہبی کثرت الوجودیت کو قبول کرلیا ہے۔ایسے معاشرے میں ہر مذہبی اقلیت یا نسلی گروہ اپنے مسائل کی خاطر اپنی الگ پارٹی بنالے تو اس سے تو پورا سیاسی سسٹم دھماکے سے اڑ جائے گا اور

پیچھے صرف انتشار اور خلفشار رہ جائے گا۔ ہم ہندوستان میں کچھ کچھ ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہیں۔ مرکز میں موجود مخلوط حکومت میں 23 پارٹیاں شامل ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ہندوستان اتنی کثرت الوجودیت کے باعث دو جماعتی نظام نہیں چلا سکتا مگر اس کی سیاسی صحت کے لئے چھوٹی چھوٹی اتنی زیادہ سیاسی پارٹیاں بھی تشویشناک ہیں۔

ہمارے سیاسی فلسفے کی بنیاد سیکولرازم اور پلورلزم (کثرت الوجودیت) پر استوار ہے۔ اس لئے مذہبی بنیادوں پر تشکیل پانے والی جماعتوں خواہ وہ ہندوتوا پارٹیاں ہی کیوں نہ ہوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہئے۔ ایسی جماعتیں ہمارے مسائل حل کرنے کی بجائے انہیں اور پیچدار اور مشکل بنا دیں گی۔ اگر اقلیتیں مذہبی بنیاد پر پارٹی بنائیں گی تو اس سے اکثریت کو بھی مذہبی بنیاد پر جماعتیں بنانے کا جواز مل جائے گا' حالانکہ آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ سنگھ پریوار کی جارحانہ سیاست ہے۔ اس کی تشکیل کے باعث ہمارے سیکولرازم کو بڑا ضعف پہنچا ہے۔ اقلیتیں اس کا بھگتان بھگت رہی ہیں۔ ایسے حالات میں اگر سب سے بڑی اقلیت کے لیڈر مذہبی بنیاد پر ایک الگ سیاسی جماعت بنا لیتے ہیں تو یہ کاروائی بہت خوفناک تباہی لائے گی۔ دراصل سنگھ پریوار تو مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف نفرت کی سیاست پر زندہ ہے اوا گر ایک مسلم جماعت بنائی جاتی ہے تو نفرت کی سیاست کو پر لگ جائیں گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کے حقیقی معنوں میں کوئی مسائل ہیں ہی نہیں' وہ تو ہیں۔ لیکن ان کے حل کے لئے ایک نئی سیاسی پارٹی کھڑا کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ نئی پارٹی سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مسائل تو حل نہیں ہوں گے مگر کچھ بد دیانت رہنماؤں کو ان مسائل کے حوالے سے طاقت کے حصول میں تو مدد مل جائے گی۔ اقلیتوں کے رہنماؤں کی آج تک کی کارکردگی اس کا بہترین ثبوت ہے۔ مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہوئے' تاہم اس ضمن میں صرف سیاسی پارٹیاں ہی نہیں خود مسلمان لیڈروں پر بھی الزام آتا ہے۔ یہ نام نہاد اقلیتی لیڈر دراصل اپنے ذاتی مسائل حل کرنے کے لئے مسلمانوں کے مسائل کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سابق شاہی امام بخاری کا ریکارڈ تو بہت ہی ناپسندیدہ ہے۔ ان کی تمام کی تمام تحریک مسلمانوں کے نام پر دراصل ایک ذاتی مقصد کے حصول کے لئے تھی اور اس کے سبب ہونے والے ہندو مسلم فسادات میں بعض مسلمانوں کو جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ اب ان کے صاحبزادے مسلمانوں کے مطالبات اور شکایات سے فائدہ اٹھانے کے

لئے مسلمانوں کے سیاسی افق پر طلوع ہونا چاہتے ہیں۔

آج یہ فرض کر لینا کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے مفادات ایک ہی قسم کے ہیں اور یہ کہ وہ سارے یک رنگ ہیں بہت بڑی غلطی ہے۔ مسلم لیگ نے بھی تقسیم سے پہلے یہ غلط مفروضہ گھڑ لیا تھا۔ خود مسلمانوں کے اندر مذہبی اختلافات ہیں' پھر علاقائی اور ثقافتی اختلافات ہیں' اگر احمد بخاری ایک مسلم جماعت بناتے ہیں تو یہ شمال و مرکز کے مسلمانوں کی جماعت ہوگی چنانچہ جنوبی ہندوستان کے مسلمان خصوصی کیرالہ اور تامل ناڈو کے مسلمان سردمہری کا مظاہرہ کریں گے اور تو اور شمال مشرق میں آسام اور منی پور کے مسلمان بھی اسی طرح اس سے لاتعلق رہیں گے۔ جموں و کشمیر کے مسلمانوں کے اپنے مخصوص مسائل ہیں۔ کشمیری مسلمانوں کی بطور کشمیری شناخت بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی ان کی مذہبی شناخت جو ان حقائق سے چشم پوشی کرتا ہے وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے تو پھر بخاری صاحب کی پارٹی کن مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کرے گی؟

اگر احمد بخاری صاحب واقعی مسلمانوں کے مسائل کا حل چاہتے ہیں تو پھر انہیں جناح صاحب کی بجائے سرسید کا کردار ادا کرنا چاہئے۔ آج مسلمان ہندوستان میں خصوصاً شمال میں بہت غریب اور ناخواندہ ہیں۔ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے سرکار نے کچھ تعلیمی اور معاشی سکیمیں بنا رکھی ہیں۔ حکومت کے افسر نہیں چاہتے کہ ان سکیموں پر عملدرآمد ہو' اس کی بھی کئی وجوہات ہیں جن میں بدعنوانی' سستی اور تعصب شامل ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سکیمیں مسلمانوں کی ضروریات کو پورا بھی نہ کر سکتی ہوں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ غریب اور ناخواندہ مسلمانوں کو ان سکیموں سے باخبر کیا جائے اور پھر سیاسی جماعتوں اور اسمبلی کے ارکان کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ ان سکیموں کے بجٹ میں اضافہ کرے۔ یہ بھی تسلیم کہ یہ آسان کام نہیں ہے مگر ایک نئی سیاسی پارٹی بنانے سے یقیناً بہت بہتر ہے۔ اس قسم کی جماعت کی تشکیل اگر با آسانی ہو بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ فائدہ ہوگا کہ کچھ لوگ پارلیمنٹ میں پہنچ جائیں گے یا کچھ مسلمان لیڈروں کو وزارت کی گدی مل جائے گی مگر مسلم عوام کو کیا ملے گا؟ وہ تو بے یار و مددگار ہی رہیں گے۔

مسلمانوں کی ضرورت یہ ہے کہ سماجی اور معاشی میدان میں سرگرم ہوں۔ تعلیم کے فروغ پر توجہ دیں روزگار نکالیں اور سیاسی میدان میں مرکزی جماعتوں اور مرکز سے لگی بائیں بازو کی جماعتوں سے رشتہ جوڑیں۔ یہ درست ہے کہ مرکز میں رہنے والی جماعتوں کا ریکارڈ کوئی ایسا قابل فخر نہیں مگر جو مسلمان ان جماعتوں سے سلسلہ جنبانی کرتے ہیں ان کا ریکارڈ بھی کوئی ان سے اچھا نہیں۔ ان لیڈروں کو ان جماعتوں سے دوستی کے لئے اس انداز سے گفتگو کرنی چاہئے کہ مسلم عوام کا مفاد مقدم اور اپنا ذاتی مفاد موٴخر رہے۔ یقیناً اس سے بہت فرق پڑے گا۔ سیکولر ازم سے پاس وفاداری اور اقلیتوں کے جائز حقوق کے لئے تگ و دو کی جائے تو اسی جمہوری نظام میں بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

(15-دسمبر2000ء)

شناخت اور بقا کا مسئلہ

پیغمبر اسلام کی زندگی میں ہی اسلام برصغیر میں داخل ہو گیا تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام محمد بن قاسم کی یلغار کے ساتھ یہاں آیا۔ نوجوان محمد بن قاسم کو امیہ عہد خلافت میں ساتویں صدی کے دوسرے نصف میں عراق کے گورنر یوسف بن حجاج نے جرنیل بنا کر بھیجا تھا۔ مگر یہ سچ نہیں ہے۔ اسلام عرب تاجروں کے ذریعے ہندوستان کے مغربی ساحلوں سے کیرالہ کے راستے بڑے پرامن طور پر ہندوستان میں آیا۔ کیرالا میں ایک علاقے کا نام مالابار ہے۔ دراصل یہ لفظ مابار کی ہندوستانی شکل ہے جس کا عربی میں مطلب ہے راستہ' چونکہ عرب تاجر اکثر اس علاقے سے آتے تھے اس لئے اس کا یہی نام پڑ گیا۔ عرب لوگ زمانہ قبل از اسلام سے ہندوستان کے ساتھ کاروبار کر رہے تھے۔ پھر رسول اکرم کی تعلیمات کے سبب مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے کیرالہ میں مقامی عورتوں سے شادی کی اور ان سے ہونے والی اولاد مختلف علاقوں میں پھیل گئی۔ بعد میں انہی عرب تاجروں کے ساتھ صوفی لوگ بھی آئے جن کے ہاتھوں پر بہت سے زیادہ تر نچلی ذات کے مقامی لوگوں نے اسلام قبول کیا تو ہندوستان میں اسلام کے داخلے کا اصل دروازہ یہ تھا۔

جہاں تک ہندوستان کے شمالی علاقے کا تعلق ہے وہاں اسلام محمد بن قاسم کے حملے کے ساتھ آیا اور مسلمانوں اور ہندوؤں میں یہی داخلہ تلخ اور متنازعہ مسئلہ بن گیا۔ محمد بن قاسم کے

حملے کے بعد کئی اور حملے ہوئے جن میں شہاب الدین غوری اور محمود غزنوی کے حملے شامل ہیں۔ محمود غزنوی نے سومنات کا مندر گرا دیا جو اونچی ذات کے ہندوؤں کے دل و دماغ میں آج بھی کھٹکتا ہے۔ یہ واقعہ تاریخ میں خاصی تفصیل سے دیا گیا ہے جس پر دونوں برادریوں میں مخاصمت اور مخالفت بڑھتی رہتی ہے۔ ایسے واقعات کو اصل اور مناسب پس منظر میں بھی نہیں ڈالا جاتا ہے' تاہم یہ مخاصمانہ نمود و نمائش انیسویں صدی کے نوآبادیاتی دور میں شروع کی گئی تھی۔ یہ بھی سچ نہیں ہے کہ مسلمان حکمران ہندوؤں سے نفرت کرتے تھے اور اپنے سارے عہد حکمرانی میں ہندوؤں کی تذلیل کرتے رہے۔ یہ کہانیاں ہی بعد میں بنائی گئیں۔ مسلمان اور ہندو حکمرانوں میں معاہدے اور دوستیاں بھی تھیں اور اقتدار کے جھگڑے میں لڑائیاں اور دشمنیاں بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے ہندوؤں نے ہندوستان کے مقامی حکمرانوں سے نمٹنے اور حساب کتاب برابر رکھنے کے لئے خود بابر کو حملہ کرنے کیلئے بلایا' چنانچہ ایک مسلمان خاندان دوسرے مسلم خاندان سے لڑ گیا۔ جب پہلے مغل حاکم بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا ہندوستان میں ابراہیم لودھی کی حکومت تھی۔ راجپوت خاندان بھی لودھی سے دو' دو ہاتھ کرنے کے اہل نہیں تھے' اس لئے انہوں نے بھی بابر کو حملے کی دعوت دی۔ یہی بابر ہماری نصابی کتابوں میں حملہ آور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ہندوستان پر حملہ کرنے کی بنا پر اس کی مذمت بھی بہت کی جاتی ہے۔ قرون وسطیٰ کی یہ تاریخ عصر حاضر کی سیاسی ضرورتوں کے مطابق بنائی بگاڑی جاتی ہے۔ ان کتابوں میں دسویں صدی سے انیسویں صدی کے شروع تک کے زمانے کو ''مسلم عہد'' کہا جاتا ہے۔ اور اس سے پہلے کے زمانے کو ہندو عہد کا نام دیا گیا ہے۔ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ مذہب کی بنا پر ان تاریخی زمانوں کی حد بندی نہیں کی جا سکتی کیونکہ اقتدار کی خاطر تو لڑائیاں ایک ہی مذہب سے وابستہ حکمرانوں کے درمیان بھی چھڑی رہتی تھیں۔ مسلمان مسلمانوں کے خلاف لڑتے تھے اور ہندو حکمران ہندوؤں کے ساتھ۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ نہ تو مسلمان یکرنگ تھے اور نہ ہی ہندو' دونوں برادریاں افقی اور عمودی طور پر بٹی ہوئی تھیں۔ قرون وسطیٰ کے معاشرے ذات پات اور طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کی رسائی اور تعلق اوپر والے طبقے سے ہرگز نہ تھا۔ ہندوؤں اور

مسلمانوں کے اوپر والے طبقوں میں تو زیادہ ہم آہنگی نہ تھی مگر نیچے عوامی سطح پر دونوں فرقوں میں زیادہ یگانگت' قربت اور بھائی چارہ تھا۔ عوامی سطح پر ہندو و مسلم دونوں برادریوں میں رسم ورواج میں بڑی مماثلت تھی لیکن یہ باتیں تاریخ لکھنے وقت خصوصاً میٹرک سے نیچے کی کتابوں میں بالکل نظرانداز کر دی جاتی ہیں' چنانچہ دونوں برادریوں میں فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ نفرت کی افزائش کا منبع یہی تاریخی کتابیں بن گئی ہیں۔

انگریزوں نے تاریخ اس طرح سے لکھی اور پڑھائی کہ دونوں برادریوں میں رخنہ اندازی جاری رہے تاکہ وہ کہیں اکٹھے ہو کر ہمارے اقتدار کے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔ انہوں نے معصومیت میں یا بالارادہ طور پر دونوں برادریوں کو یک رنگ اور واحد بنایا جیسے ان دونوں کے مقاصد اور مفاد مشترک ہیں۔ برادری کے آپس کے اختلافات کو بھی نظرانداز کر دیا گیا۔ انڈین نیشنل کانگرس تو جدوجہد آزادی کرنے والوں کی چھتری تھی۔ اس نے بڑی دانشمندی سے اپنی سیاسی فلاسفی سیکولرازم کو بنایا جو اس کی سیاست کی بنیاد بھی ہے چنانچہ کانگرس کے سبب دونوں برادریوں کے طبقہ اشرافیہ کو اکٹھے ہو کر آزادی کے لئے کام کرنے کا موقع بھی فراہم ہو گیا' یہ طبقہ اور بھی قریب آیا جب مہاتما گاندھی سیاست میں آئے۔ انہوں نے عوام کو بھی سیاست میں کھینچ لیا اور انہی کے مسائل اور مطالبات کے حوالے سے انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلق مضبوط بنانے کیلئے مذہبی مسائل پر بھی یکجہتی کا اظہار کیا۔ مثلاً دوسری جنگ عظیم کے بعد جب انگریز ترکی کی خلافت کو توڑنا چاہتا تھا اور ہندوستان میں تحریک خلافت چلی' مہاتما گاندھی نے اس کی حمایت کی۔ عوام نے مہاتما گاندھی کے اس مؤقف کو سراہا اور ان کے حامی ہو گئے۔ روایتی علمائے کرام بھی اس مسئلہ پر مہاتما جی کے ساتھ ہو گئے اور انڈین نیشنل کانگرس اور اس کے متحدہ سیکولر نیشنل ازم کے حامی بن گئے۔

بہرطور تحریک خلافت کے فوراً بعد اقتدار میں حصہ کے حوالے سے ہندوؤں کے ایک حلقے اور مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کو طے کرنے کے لئے موتی لال نہرو کمیٹی بنائی گئی مگر ذہنی طور پر اپنے اپنے مذہبی دھڑے کی طرف رجحان ہونے کے باعث اس کمیٹی کی سفارشات کو زور و شور سے رد کر دیا گیا' رپورٹ بیکار گئی۔ تیسری دہائی کے شروع میں تین گول میز کانفرنسیں ہوئیں۔ مگر فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی تسلی بخش حل وضع نہ ہو سکا۔ 1937ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اتحاد کی آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ الیکشن کے بعد

MashalBooks.org

کانگرس نے (یوپی) وزارت میں مردِ مسلمان مسلم لیگی وزیر لینے سے انکار کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ مسلم لیگ مسلم نشستوں پر بھی اکثریت حاصل نہیں کر سکی۔ اس پر بعد میں پاکستان کے خالق محمد علی جناح بہت ہی ناراض ہوئے اور عہد کیا کہ وہ کانگرس کو سبق سکھائیں گے۔ انہوں نے اب دوقومی نظریے کا بیج بویا یعنی ہندوستان کی تقسیم کا نقشہ بنایا۔ غلط یا صحیح یہ تقسیم ہندوستان میں دونوں برادریوں کے درمیان مخاصمت کی وجہ بن گئی۔ بالائی طبقے کے ہندوؤں نے تقسیم کے مسئلے پر مسلمانوں کو کبھی بھی نہیں بخشا۔

تاہم تقسیم کا الزام سارے مسلمانوں پر لگانا بھی غلط ہوگا۔ ہندوستان کے مسلمان اس مسئلہ پر بھی منقسم تھے۔ نچلے طبقے کے مسلمانوں کو پاکستان بنانے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا کیونکہ ان کے نزدیک اس نئے ملک سے فائدہ بالائی طبقے کے مسلمان ہی اٹھائیں گے۔ نچلے طبقے کے مسلمانوں کے ایک حصے نے مومن کانفرنس کے تحت اس دوقومی نظریے کے خلاف مظاہرہ بھی کیا تھا جو لاہور کی قرارداد (1940ء) کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ مسلمان علماء نے بھی بڑے زور و شور سے اس کی مخالفت کی اور کانگرس کے متحدہ نیشنلزم کی حمایت کا اعلان کیا اور مذہبی بنیادوں پر بھی اس کا جواز پیش کیا۔ چنانچہ واضح ہوا کہ سارے مسلمان تقسیم نہیں چاہتے تھے کہ دوقومی نظریے پر اتفاق کرتے تھے اور نہ یہ نظریہ اسلام پر مبنی سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ نظریہ اوپر کے مسلمان طبقے کے سیاسی مفادات پر مبنی ہے۔ ایک جید عالم دین بہت بڑے دینی مدرسے دارالعلوم دیوبند کے سربراہ مولانا حسین احمد مدنی نے بڑھ چڑھ کر اس نظریے کی مخالفت کی اور متحدہ قومیت اور اسلام کے نام سے ایک کتاب بھی اس کے خلاف لکھی۔ انہوں نے اس نقطۂ نظر سے پورے ہندوستان کا طوفانی دورہ کیا کہ لوگوں کو جناح اور ان کے دوقومی نظریے سے بچایا جا سکے۔ یہ واضح ثبوت اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ تخلیق پاکستان کا سخت مخالف تھا۔ مگر سیاسی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیں کہ ہندوستان کے سارے کے سارے مسلمانوں کو تقسیم ہند کے جرم کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اور ہندوستان کے مسلمان اس کی قیمت بھی ادا کر رہے ہیں۔

تقسیم ہوئی تو دونوں ملکوں میں قتل عام ہوا۔ دس لاکھ سے زیادہ آدمی مارے گئے' اس بے کہیں زیادہ بے گھر ہوئے اور اپنی جڑوں سے کٹ گئے۔ پاکستان میں حکمران طبقے میں جاگیردار' فوجی اور سول افسر شامل رہے۔ عوام کو اس میں کوئی حصہ نہیں ملا۔ پاکستان کی اسلامی

MashalBooks.org

بنیاد کا دعویٰ ہی بیکار گیا اور یہ 1971ء میں دو ٹکڑے ہو گیا۔ بنگالی مسلمان علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے بنگلہ دیش بنا لیا۔ پاکستان کے حکمران طبقوں نے زیڈ اے بھٹو کی سربراہی میں بنگالیوں کو اقتدار میں شریک کار بنانے سے انکار کر دیا اور ان کی خواہشات کو دبانے کے لئے وہاں فوج بھیج دی۔ پاکستان مسلمانوں کے بالائی طبقے کی خواہشات کے مطابق جس انداز میں بنایا گیا تھا اسی انداز میں قیام پاکستان کے بعد عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لئے وقتاً فوقتاً ہندوستان کے خلاف نفرت کی مہم چلاتا رہا۔ آج پاکستان کو شدید قسم کے نسلی اور فرقہ وارانہ چیلنج درپیش ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا رہا ہے کہ تقسیم سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور بھی سنگین ہو گیا۔ ہندوستان میں غریب مسلمانوں کو قیام پاکستان کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ پاکستان کے باعث بالائی طبقہ کے ہندوؤں کے دل و دماغ میں مسلمانوں کے لئے نفرت پیدا ہوئی۔ یہ ہندو مسلم بالائی طبقہ کے مفادات اور غریب مسلمانوں کے مفادات میں بھی تفریق نہیں کر سکتے۔ بالائی طبقہ تھا جس نے پاکستان بنایا۔ غریب طبقہ تو تقسیم کے باعث معقوب ہوا۔ بہت سے فرقہ وارانہ فسادات میں نعرہ لگایا جاتا ہے۔ ''مسلمان جاؤ پاکستان یا قبرستان''۔

یوں تقسیم سے نہ تو پاکستان کے مسلمانوں کے مسائل حل ہوئے نہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے۔ اس کے برعکس تقسیم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ہندوستان' پاکستان اور بنگلہ دیش۔ تقسیم کا مدعا یہ بتایا گیا تھا کہ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک اپنا ملک بنایا جائے گا۔ (ہوم لینڈ) مگر غریب مسلم عوام ان تینوں ملکوں میں غربت' بیروزگاری' ناخواندگی کا شکار ہیں۔ اگر کسی کو قیام پاکستان سے کچھ فائدہ ہوا بھی تو وہ مسلمانوں کا اوپر کا طبقہ تھا جس نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کے لئے ایک ہوم لینڈ بنایا۔

ہندوستان کی آزادی کے فوراً بعد یعنی پہلے دن سے ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو تحفظ اور اپنی شناخت کا مسئلہ درپیش ہے۔ تقسیم کے بعد پہلے فسادات نے ہی انہیں خوفزدہ اور غیر محفوظ کر دیا۔ جیسے ہزاروں ہندو پاکستان میں مارے گئے ویسے ہی ہزاروں مسلمان ہندوستان میں مارے گئے۔ آزادی دونوں مذہبوں کے ماننے والوں کے لئے آفتیں لے کر آئی۔ ہندوستان کے مسلمان بہت ہی پریشان خیال تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔ وا عتماد کی حس سے بھی محروم ہو گئے۔ یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قد کاٹھ کی شخصیت

تھی جس نے ان کے دل میں اعتماد پیدا کیا اور انہیں ہندوستان میں اسلامی میراث کے بارے میں فخر کرنا سکھایا۔ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر مولانا آزاد نے جو تقریر کی وہ مسلمانوں کے زخموں پر مرہم ثابت ہوئی۔ مسیحائی بھی ہوئی لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کو تقسیم کے بعد مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

آئین کے ذریعے اعلان کیا گیا ہے کہ نسلی رنگ، مذہب سے بالاتر سب شہری برابر ہیں۔ دفعہ 25 سے 30 تک، ان کے ذریعے اقلیتوں کو خاص مذہبی اور ثقافتی حقوق دیئے گئے۔ دفعہ 25 کے مطابق نظام عام، اخلاقیات اور صحت اور اس حصہ کی دوسری دفعات سے مشروط تمام لوگوں کو ضمیر کی آزادی حاصل ہے۔ مذہب اپنانے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کی آزادی ہے۔ اس دفعہ کے تحت سکھوں کو کرپان تک لے کر چلنے کی آزادی ہے۔ ''گویا کرپان لے کر چلنا سکھ مذہب کا حصہ سمجھا جائے گا۔''

آرٹیکل 29 اور 30 کے تحت اقلیتوں کے ثقافتی اور تعلیمی حقوق بھی بہت اہم ہیں۔ آرٹیکل 29 کے مطابق (1) ہندوستان میں اس کے کسی بھی حصہ میں رہنے والے کچھ لوگوں کی زبان، رسم و رواج یا کلچر مختلف ہوگا تو انہیں اس کے تحفظ کا حق حاصل ہوگا۔ (2) سرکار کی طرف سے چلائے جانے والے یا سرکار سے فنڈ لینے والے تعلیمی ادارے سب، مذہب، نسل، ذات، زبان یا ان میں سے کسی ایک کی بنا پر کسی شہری کو داخلے سے انکار نہیں کیا جائے گا۔

آرٹیکل 30 کی بھی بنیادی اہمیت ہے۔ (1) مذہب یا زبان کے حوالے سے اقلیتوں کو اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا حق حاصل ہوگا۔ (2) ریاست گرانٹ دیتے وقت یہ تمیز ملحوظ نہیں رکھے گی کہ اس کا انتظام مذہب یا زبان کی بنا پر کسی اقلیت سے ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مذہب زبان یا کلچر کی بنا پر اقلیتوں کی شناخت، مذہب اور مذہبی عبادات پر عمل اور تحفظ کے سلسلے میں آئین کی یہ دفعات بنیادی اہمیت کی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں اور بدھوں کی نظر میں آئین کی ان دفعات کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ مسلمان سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہیں، اس لئے ان کے لئے یہ دفعات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ مسلمانوں نے آرٹیکل 25 کے تحت شرعی قوانین کا دفاع بھی کیا ہے اور انہیں تحفظ بھی دیا ہے۔ (اس موضوع پر ہم ذرا تفصیل سے آگے چل کر بات کریں گے)

آرٹیکل 25 مذہب اختیار کرنے، عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت دیتا ہے، تاہم بڑے بڑے نامور قانون دانوں میں اس بات پر اختلاف ہے کہ آیا دفعہ 25 کے تحت ریاست ذاتی قوانین (شرعی قوانین) کو باقاعدہ بنانے یا اس زمرے میں قانون بنانے کی مجاز ہے کہ نہیں۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ریاست شرعی قوانین میں مداخلت نہیں کرسکتی۔

آرٹیکل 29 اور 30 اقلیتوں کی زبانوں اور ثقافتوں کے تحفظ سے متعلق ہیں اور بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہندو فرقہ پرست اکثر ان دفعات پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں ختم کردینا چاہئے مگر آئین کو تبدیل کرنے کیلئے تین چوتھائی اکثریت کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہندوتوا والے ابھی اس قابل نہیں ہوئے کہ ان اہم دفعات کو مٹا سکیں۔ مگر عملاً کئی بار ان دفعات کی خلاف ورزی ہوئی ہے اور بعض اوقات سنگین صورتیں بھی پیدا ہوئی ہیں، تاہم یہ ایک بالکل ہی دوسرا قصہ ہے۔

ہندوستانی آئین میں ان دفعات کے شامل کئے جانے کے بعد ہندوستان میں آزادی کے بعد رہنے والے مسلمانوں میں اعتماد پیدا ہوا مگر ہندوستان سے ان کی وفاداری اکثریتی برادری خصوصاً شمالی ہندوستان میں شبہ کی نظر سے دیکھی گئی۔ جیسا پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ کسی بھی مذہبی اقلیت کو یک رنگ سمجھنا سماجی اور سیاسی اعتبار سے غلط ہوگا مگر انگریز کے زمانے سے ہندو اور مسلمان دو ایسے سیاسی زمرے بن گئے ہیں جیسے وہ سیاسی، مذہبی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے بھی یک رنگ ہیں مگر جیسا کہ دوقومی نظریے کے ذریعے ظاہر ہوا کہ کسی اقلیت میں مذہب کے اشتراک کے باوجود سیاسی یک رنگی یا ایک مؤقف نہیں ہوسکتا نہ ہی اس طرح ثقافتی ہم آہنگی اشتراک ہوسکتا ہے۔ شمالی اور وسطی ہند کے مسلمان اردو بولنے کی وجہ سے جنوبی ہند کے ان مسلمانوں سے بالکل مختلف ہیں جو اپنے علاقے کی زبانیں بولتے ہیں۔ ان کی اپنی سیاسی ترجیحات اور حدود دیا مجبوریاں ہیں۔

جنوبی ہند کے مسلمان شروع سے ہی پاکستان کے بارے میں لاتعلق سے تھے۔ انہوں نے شمالی ہند کے اردو بولنے والے مسلمانوں جیسے جوش و خروش کے ساتھ تقسیم کی حمایت نہیں کی۔ برطانوی عہد سے ہی فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تشدد اردو بولنے والے شمالی ہند میں ہی مرکوز رہا۔ حتیٰ کہ تقسیم کے بعد بھی جنوبی ہند فرقہ وارانہ تشدد سے زیادہ تر پاک ہی رہا اور یہ

MashalBooks.org

سلسلہ 80 کی دہائی کے شروع تک رہا۔ جنوب میں 80 کی دہائی میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے۔ تب تک حیدرآباد دکن کو چھوڑ کر شاید ہی کہیں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہوں۔ حیدرآباد اردو بولنے والے مسلمانوں کا نظام کے عہد میں ایک بڑا مرکز تھا۔ البتہ 80 کی دہائی کے بعد جنوبی ہند خصوصاً تامل ناڈو میں صورتحال خراب ہوتی گئی۔

فرقہ وارانہ تشدد

پچاس کی دہائی میں شمالی ہند میں فرقہ وارانہ حالات نسبتاً بہتر رہے کیونکہ زیادہ تر دھیان صوبوں کی لسانی بنیادوں پر از سر نو تشکیل پر تھا۔ ہندوستان کے کچھ علاقوں خصوصاً گجرات اور مہاراشٹر میں اس بات پر فسادات ہوئے کہ بمبئی کو گجرات میں شامل کیا جائے یا مہاراشٹر میں؛ تاہم نہ ختم ہونے والا فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ساٹھ کی دہائی کے شروع سے آغاز ہوا۔ بڑے بڑے فسادات میں 1962ء میں جبل پور کا فساد جس نے سارے ملک کو ہلا کر رکھ دیا اور خود وزیراعظم پنڈت نہرو بھی اڑ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ملک کی تقسیم سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اس لئے انہیں اس وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد کی توقع نہ تھی۔ ان کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تشدد تو یہاں پھر بھی موجود تھا اور مسلسل موجود تھا کیونکہ تقسیم سے بعض لوگوں کے فرقہ وارانہ انداز نظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بلکہ تقسیم کی وجہ سے معاملہ اور سنگین ہو گیا تھا۔

بہرطور نہرو کا عہد وفا سیکولرازم سے تھا۔ جبل پور کے واقعات نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے چین کے حملے اور جبل پور کے فسادات کے بعد قومی اتحاد کی کونسل بنائی مگر بدقسمتی سے یہ کونسل صرف کاغذ تک محدود رہی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سیکولر اقدار کے فروغ کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ بہت سے کانگرس والے بھی دل سے تو مذہبی ہی تھے اور ان کی نہرو کی طرح سیکولرازم سے وابستگی پکی نہ تھی۔ بہت سے کانگریسی لیڈروں کے بارے میں مشہور تھا کہ ہندو فرقہ پرستوں سے بڑی ہمدردی رکھتے تھے۔ وہ نہرو کی اندرونی اور بیرونی دونوں پالیسیوں کے خلاف تھے۔ بیرونی پالیسی یعنی غیر جانبداری کی پالیسی؛ جبل پور کے فسادات کے بعد مسلمانوں کا کانگرس اور سیکولرازم دونوں سے اعتماد اٹھ گیا۔

MashalBooks.org

کانگرس کی سیکولرازم سے وابستگی کی بنا پر اقلیتیں کانگرس کی حامی بن گئی تھیں اور ہزاروں ہندوستانی مسلمانوں نے جدوجہد آزادی میں اس لئے کانگرس کا ساتھ دیا تھا کہ کانگرس نے خود کو سیکولر فلسفہ سے وابستہ کرلیا تھا۔ بہرطور ہندوستان میں سیکولرازم اس طرح مذہب کا مخالف نہیں تھا جیسا کہ روس میں تھا۔ ہندوستانی سیکولرازم کی طرف سے ہر مذہب کو مکمل آزادی کی ضمانت دی گئی تھی اور سیکولرازم کے اسی تصور کے باعث مسلمانوں کو یقین تھا کہ اسلام ہندوستان میں آزاد ہے مگر جب بڑے بڑے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان کا اعتماد اٹھتا گیا۔ خود پنڈت نہرو کے عہد حکمرانی میں بھی بہت سے فسادات ہوئے مگر ان کی موت کے بعد تو صورت حال اور سنگین ہوتی چلی گئی۔

1964ء میں نہرو کی موت کے بعد سیاست میں بہت بڑا خلا پیدا ہوا مگر ہندوستانی جمہوریت اتنی جاندار ثابت ہوئی کہ اس نے اس بحران پر قابو پالیا۔ لال بہادر شاستری وزیراعظم بنے، مگر زیادہ دیر زندہ نہ رہے اور 1965ء کی پاکستان ہندوستان جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند پر دستخط کرتے ہوئے دل کے دورے کے باعث مر گئے۔ اس کے بعد اندرا گاندھی وزیراعظم بنیں۔ انہوں نے اقلیتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ملک میں سیکولر طاقتوں کو مضبوط کیا۔ جبل پور کے فسادات کے بعد اقلیتیں بہت غیر محفوظ محسوس کر رہی تھیں مگر اندرا گاندھی ان کے اعتماد بڑھانے میں کامیاب ہوگئیں۔

مگر اندرا گاندھی کو کانگرس کے اندر اور باہر سے بہت سے بڑے چیلنج درپیش ہوئے۔ کانگرس کے بڑوں نے اندرا کی مخالفت کی، کانگرس میں دراڑیں پڑیں اور اندرا گاندھی والا دھڑا حکومت کرنے لگا۔ اندرا گاندھی کو ہٹانے کی خاطر سارے مخالف اکٹھے ہوئے اور انہوں نے 1969ء میں صوبہ گجرات میں فرقہ وارانہ فسادات کرانے کی سازش کی۔ تب گجرات میں اندرا کا مخالف کانگرسی دھڑا حکمران تھا۔ احمد آباد کے فسادات صوبے کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل گئے اور جبل پور کے فسادات سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوئے۔ دائیں بازو کے ہندوؤں کی جماعت جن سنگھ کھلے عام مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہی تھی اور ان کی ہندوستان سے وفاداری کو مشکوک قرار دے رہی تھی۔ جن سنگھ نے ہندوستانی مسلمانوں کو ''ہندوستانی'' بنانے کے لئے ایک قرارداد منظور کی، جیسے کہ وہ ہندوستانی تھے ہی نہیں۔ ان دنوں

جن سنگھ کے صدر بلراج مدھوک تھے؛ جن کے بارے میں مشہور تھا کہ انتہا پسند ہیں۔ اخباروں نے اس قرارداد کو بہت اچھالا اور ٹائمز آف انڈیا جیسے اخبار نے اپنے اداریئے میں اس قرارداد کی حمایت کی۔

ہندوستانی مسلمان خود کو بہت ہی غیر محفوظ سمجھ رہے تھے اور انہیں اپنی بقا کا دھڑکا لگ گیا تھا۔ اس دم بخت کر دینے والے حالات میں احمد آباد کا خوفناک فساد ہوا جس میں ہزاروں مسلمانوں کی جان گئی۔ 1970ء میں اتنے ہی شدید فسادات بھونڈی میں ہوئے۔ ساٹھ کی دہائی کے آخر میں مہاراشٹر میں ایک اور فرقہ پرست تنظیم شیوسینا کھڑی ہوگئی تھی اور خیال کیا جاتا ہے کہ بمبئی کے بعض معروف بزرگ کانگرسی رہنماؤں کا اس تنظیم کے پیچھے ہاتھ تھا۔ یہ کانگرس والے دراصل بائیں طرف مائل نہرو رویے کے بڑی دیر سے شاکی تھے چنانچہ انہوں نے ایک مراٹھی کٹڑ پنتھی بال ٹھاکرے کی حمایت شروع کر دی۔ اس شعلہ بیان نے مہاراشٹر کے نوجوانوں کے دلوں میں علاقائی اور فرقہ وارانہ جذبات بھر دیئے۔ بال ٹھاکرے کمیونسٹوں کا بھی بڑا سخت مخالف تھا اور اسی کی شہ پر شیوسینا کے رضا کار نے سرکردہ کمیونسٹ لیڈر کرشنا دیسائی کو قتل کر دیا تھا۔

1970ء کے بھونڈی کے فسادات کی آگ بھی شیوسینا نے ہی بھڑکائی تھی۔ بھونڈی بمبئی شہر سے چالیس میل کے فاصلے پر کپڑے کی کھڈیوں کا بڑا مرکز ہے اور ان کے زیادہ مالک مسلمان ہیں۔ یہ رپورٹ کیا گیا ہے کہ اس فساد میں چار سو افراد مارے گئے جن میں زیادہ مسلمان تھے۔ مگر پولیس کے یکطرفہ رویے نے مسلمانوں کو اور بھی غیر محفوظ اور مایوس کر دیا۔ تمام فسادات کے دوران پولیس کھلے عام تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوؤں کا ساتھ دیتی رہی؛ تاہم یہ بھی ہے کہ سارے ہندوؤں نے نہیں کچھ نے فرقہ وارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے مسلمانوں سے متعصبانہ سلوک کیا۔ غالباً ہندوؤں کی اکثریت یا تو غیر جانبدار رہی یا اس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا یا اپنی برادری کے اندر فرقہ پرستوں کا مقابلہ کیا۔ مہاراشٹر میں شیوسینا کی حمایت فرقہ پرست عناصر نے کی یا ان کانگریسوں نے جنہیں اندرا گاندھی سے شکایات تھیں۔

1972ء اور 1977ء کے درمیان کا عرصہ نسبتاً پرامن تھا۔ مخصوص وجوہ کی بنا پر کوئی بڑے فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے۔ اس عرصے میں ہی سابق مشرقی پاکستان میں آزادی کی جنگ شروع ہوئی اور بھارتی فوج کی موثر مداخلت کے باعث مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ ان

MashalBooks.org

دنوں پوری قوم کی توجہ ادھر ہی مرکوز تھی۔ اندرا گاندھی کا مقام بھی لوگوں کی نظر میں بہت بلند ہو گیا اور وہ ہندوستانی سیاست کی بہت بڑی ہیروئن بن کر ابھریں۔ مگر یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہی اور جلدی ہی حزب مخالف اس کے خلاف سرگرم ہوتی گئی۔ ہندوستانی سیاست میں سوشلسٹ رہنما کی حیثیت سے جے پرکاش نرائن کا بڑا مرتبہ ہے۔ انہوں نے بدعنوانیوں کے الزام میں اندرا گاندھی کے خلاف تحریک شروع کر دی اور اندرا گاندھی کا سیاسی قد کاٹھ چھوٹا ہوتا گیا۔ الٰہ آباد ہائیکورٹ میں وہ ایک الیکشن پٹیشن بھی ہار گئیں اور انہیں اسمبلی کی نشست سے محروم ہونا پڑا۔ 1975ء میں انہوں نے ایمرجنسی نافذ کر دی اور حزب مخالف کے جے پرکاش نرائن سمیت متعدد رہنما گرفتار کر لئے۔ جن سنگھ اور آر ایس ایس کے بھی بہت سے لیڈر گرفتار کئے گئے اور یوں ایک طرح مکمل سیاسی خلا پیدا ہو گیا اور فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے والا کوئی بھی باقی نہ بچا۔

ایمرجنسی 1977ء میں اٹھالی گئی اور اس کے بعد کے انتخابات میں اندرا گاندھی اور ان کی پارٹی بری طرح ہار گئی اور نوزائدہ پارٹی جنتا پارٹی نے حکومت بنائی۔ جن سنگھ والے بھی اس حکومت کا حصہ تھے۔ جن سنگھ نے بظاہر انہی فرقہ وارانہ سوچ سے کنارہ کر لیا اور گاندھی جی کی سمادھی پر جا کر حلف لیا کہ وہ سیکولر پارٹی ہے اور گاندھین سوشلزم کی ترجمانی کرے گی۔ اندرا گاندھی کی ایمرجنسی کے دوران جو نام نہاد قسم کی تطہیر اور تجاوزات وغیرہ کے سلسلے میں مہم چلائی گئی تھی اس میں مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا۔ اس لئے انہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ جن سنگھ جنتا پارٹی کا حصہ ہے۔ جنتا پارٹی کو ووٹ دیا۔ مسلمانوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں پہلی اور آخری بار جن سنگھ کو ووٹ دیا۔ انہیں توقع تھی کہ جن سنگھ مسلمانوں کے اس اقدام کا اپنے عمل سے خیر مقدم کرے گا۔ مگر انہیں بڑی جلدی مایوس ہونا پڑا۔ 1978ء کے بعد فسادات کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ شمال میں بڑے بڑے فسادات جمشید پور، علی گڑھ اور وارانا سی میں ہوئے اور بہت سی معصوم جانیں تلف ہوئیں۔

آر ایس ایس والے ہندو فرقہ وارانہ طاقتوں کی نظریاتی رہنمائی کرتے ہیں۔ انہیں جن سنگھ کی طرف سے فرقہ واریت کو چھوڑ کر سیکولرازم اختیار کرنے پر بڑا غصہ آیا کیونکہ ان کے نزدیک سیکولرازم ہندوؤں کے خلاف ہے۔ چنانچہ آر ایس ایس کے بڑوں نے جن سنگھ والوں کو مجبور کیا کہ وہ آر ایس ایس کی رکنیت ترک نہ کریں۔ اس وقت جن سنگھ کے سب بڑے

بڑے لیڈر آر ایس ایس کے بھی رکن تھے۔ جنتا پارٹی کی دو جماعتوں کی رکنیت یعنی دوہری سیاسی رکنیت کے بارے میں سوشلسٹ لیڈر راج نرائن نے سوال اٹھادیا اور جنتا پارٹی سے ملحق جن سنگھ کے لیڈروں سے مطالبہ کیا کہ آر ایس ایس چھوڑ دیں۔ مگر آر ایس ایس نے اپنے ارکان کو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ آر ایس ایس سے مستعفی نہ ہوں اور ساتھ ہی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کیلئے اس نے علی گڑھ، وارانا سی، جمشید پور وغیرہ میں بہت سے فرقہ وارانہ فسادات کروادیئے۔ 1979ء میں اسی سوال پر جنتا پارٹی میں نفاق پڑا اور اس کی حکومت ٹوٹ گئی۔ اس کی جگہ جن سنگھ نے لی، وہ بھی چند مہینے چل سکی، 1980ء کے انتخابات میں اندرا گاندھی کو ووٹ تو نسبتاً کم پڑے مگر وہ پھر اقتدار میں آ گئیں۔

جنتا پارٹی سے علیحدگی کے بعد جن سنگھ نے نیا نام اختیار کیا اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے نام سے سیکولرازم اور گاندھی کے سوشلزم والا معتدل پروگرام رکھا۔ ان مقاصد سے سچی وابستگی دکھانے کے لئے اس نے نسبتاً معتدل مزاج کے اٹل بہاری واجپائی کو صدر بنالیا مگر یہ تدبیر سازی بھی جلدی ہی بیکار ثابت ہوئی کیونکہ اندرا گاندھی نے مسلمان ووٹوں کے نقصان کو پورا کرنے کے لئے در پردہ ہندو فرقہ واریت کی طرف جھکاؤ دکھا کر ہندو ووٹروں کو حامی بنانا شروع کیا۔ بی جے پی کی گاڑی اب ڈول گئی اور یہ اپنے ہی طبقے سے محروم ہونے لگی۔ اندرا گاندھی ان کے لئے بڑا خطرہ بن گئیں اور 1984ء کے انتخابات میں وہ اس بری طرح سے ہاری کہ پارلیمنٹ میں اسے صرف دو سیٹیں حاصل ہوئیں، چنانچہ بی جے پی نے اپنی سیاسی بنیاد کو قائم، مضبوط اور وسیع کرنے کے لئے نئی تدبیر سازی کی۔

بی جے پی نے ایک بار پھر اپنا پرانا جارحانہ فرقہ وارانہ موقف اختیار کرلیا۔ واجپائی کی جگہ ایل کے ایڈوانی کو پارٹی کا صدر بنایا گیا جو ہندوتوا سے بڑا گہرا میلان رکھتے ہیں۔ کانگرس کی نرم قسم کی فرقہ واریت کے مقابلے میں اسی کی دہائی کے شروع سے نئی قسم کی ہندو فرقہ واریت اختیار کرلی اور نہرو کے سیکولرازم کو بھی چیلنج کرنا شروع کردیا۔ اب سرعام یہ مباحثہ شروع ہوگیا کہ کیا نہرو والا سیکولرازم ہندوستان سے لگا بھی کھاتا ہے یا نہیں کیونکہ یہ تو مغربی تصور ہے۔ ایل کے ایڈوانی کی سرکردگی میں بی جے پی نے یہاں تک کہہ دیا کہ نہرو کے سیکولرازم کا مطلب مسلمانوں کی خوشامد ہے اور اس ضمن میں بی جے پی صرف ایک مثال دے سکی اور وہ مسلمانوں کا شرعی قانون تھا جس کے تحت مسلمانوں کو چار شادیوں کی اجازت تھی

جبکہ ہندوؤں کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ ہندو صرف ایک بیوی رکھ سکتا ہے۔ بی جے پی نے کہا کہ کانگرس کی طرف سے مسلمانوں کی خوشامد کے لئے یہ قانون بنایا گیا ہے اور بی جے پی کی یہ دلیل درمیانے طبقے کے ہندوؤں کو بڑی بھلی لگی۔

بی جے پی نے بڑے جارحانہ انداز میں یہ پروپیگنڈہ بھی کیا کہ مسلمان خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہیں کرتے۔ اس لئے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور 2050 تک مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں سے بڑھ جائے گی اور ہندوستان بھی پاکستان کا حصہ بن جائے گا۔ وشوا ہندو پریشد سنگھ پریوار کا حصہ ہے (جس میں آر ایس ایس، پریشد اور بجرنگ دل شامل ہیں اور بی جے پی بھی اس سنگھ پریوار یا بھگوا پوش خاندان میں شامل ہے) اس نے اس معاملے پر بڑا جارحانہ فرقہ وارانہ مؤقف اختیار کیا۔ اس نے پورے ہندوستان میں ایسے پمفلٹ تقسیم کئے جس میں ایک ہندو کو ایک بیوی اور دو بچوں کے ساتھ دکھایا گیا اور اس کے مقابل ایک مسلمان کو چار بیویوں اور بے شمار بچوں کے ساتھ دکھایا گیا اور اس کے نیچے یہ عنوان دیا۔ ہم پانچ، ہم پچیس۔ پھر ینک شپرم (تامل ناڈو) میں 1981ء میں نیچ ذات کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تو پریشد نے اسلام لانے کے خلاف اسی طرح کی جارحانہ تحریک شروع کر دی جیسی آج کل عیسائیت قبول کرنے کے خلاف چلائی جا رہی ہے۔

ان وجوہ کے باعث ملک بھر میں صورت حال، سخت فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر گئی اور فسادات کی تعداد اور شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ قدرتی بات تھی کہ مسلمانوں نے پھر غیر محفوظ محسوس کرنا شروع کر دیا اور انہیں لگا کہ ان کی اسلامی شناخت خطرے میں ہے بلاشبہ ہندوستان میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے لئے سیکولرازم بہت بڑا سہارا رہا ہے۔ اگر سیکولرازم خطرے میں پڑتا ہے تو اقلیتیں تو خود کو غیر محفوظ سمجھیں گی۔ نہرو والے سیکولرازم پر بھگوے خاندان کے حملوں اور وشوا ہندو پریشد کی تبدیلی مذہب کے خلاف مہم اور مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ کے افسانہ سے نہ صرف ہندوستان کا سیکولرازم کمزور ہوا بلکہ مسلمانوں پر سیاسی حبس بھی وارد ہو گیا۔ اسی قسم کے حالات میں سپریم کورٹ نے ایک مسلم طلاق یافتہ کے نان نفقہ کا فیصلہ دے دیا جو شاہ بانو کیس کے نام سے معروف ہے۔

عدالت نے شاہ بانو کے اس مؤقف کو مان لیا کہ طلاق کے بعد وہ صرف عدت تک ہی نان نفقے کی حقدار نہیں تا حیات اس کا یہ حق بنتا ہے۔ یہ فیصلہ 1985ء میں سنایا گیا۔ اسے بھی

MashalBooks.org

ہندوستان میں اسلام اور مسلم شناخت پر ایک حملہ تصور کیا گیا۔ مختلف سیاسی جماعتوں اور مذہبی مکاتب سے وابستہ مسلمانوں نے متفقہ طور پر سپریم کورٹ کی مخالفت کی اور اسے بدلوانے کے لئے ایک جارحانہ مہم شروع کر دی۔ فرقہ وارانہ صورتحال پہلے ہی خراب تھی' اس فیصلہ اور مہم سے اور خراب ہونے لگی اور دونوں مذہبی برادریوں میں مخاصمت میں اضافہ کا باعث بنی۔

یہ حالات تھے جب بی جے پی نے بابری مسجد کو گرانے اور اس کی جگہ رام مندر تعمیر کرنے کی نئی مہم شروع کر دی۔ اگرچہ اس دعوے کا جواز کوئی نہیں تھا مگر بی جے پی نے دعویٰ کیا کہ مغل حکمران بابر نے رام جنم بھومی مندر کو گرا کر اس جگہ پر مسجد تعمیر کی تھی جس کا نام بابر مسجد پڑ گیا۔ اس لئے اب جبکہ ہندو حکمران ہیں تو انہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مسجد کو گرا کر رام کے نام پر پھر مندر تعمیر کریں اور اس طرح ایک تاریخی انتقام لیں۔ بی جے پی اور درمیانے طبقے کے ہندوؤں کو یہ بات بہت اچھی لگی' مگر اب تک بی جے پی جو نچلے طبقے کے ہندوؤں میں زیادہ بار نہیں پا سکی تھی رام کے نام پر درمیانے اور نچلے پس ماندہ طبقے کے ہندوؤں میں مقبولیت حاصل کرنے لگی۔

بابری مسجد' رام جنم بھومی تحریک نہ صرف بے جواز تھی یہ ہندوستانی سیکولرازم پر سیدھا حملہ بھی تھی۔ مسلمان ڈرے کہ شائد ہندوستان میں یہ سیکولرازم کے خاتمے کا آغاز ہے اور سنگھ پریوار ایک ایک کر کے ہندوستان میں تمام تاریخی مساجد کو منہدم کر دے گا اور یہ کہ آئینی تحفظات اور ضمانتیں تو بس کاغذی ہیں۔ سنگھ پریوار نے اس قسم کی تین سو مسجدوں کی فہرست تیار کی جو مسلمانوں کو ڈرانے کے لئے کافی تھی۔ مسلمانوں کی مزید پریشانی کا سبب یہ ہوا کہ راجیو گاندھی کی کانگرسی حکومت نے اس فرقہ وارانہ لہر کو روکنے کیلئے کچھ بھی نہیں کیا۔ نہ صرف یہ راجیو گاندھی نے بابری مسجد کا تالا کھولا اور ہندوؤں کو اجازت دے دی کہ وہ 1948ء میں کسی آر ایس ایس کے جوشیلے کارکن کی طرف سے رکھے گئے رام کے بت کے سامنے پوجا بھی کریں۔ رام جنم بھومی کی اس تحریک کے نتیجے میں ہندوستان کے بے شمار علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے' جن میں ہزاروں بے گناہ افراد جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی مارے گئے۔ 1987ء میں میرٹھ اور 1989ء میں بھاگل پور کے ہولناک فسادات کے باعث مسلمانوں میں سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی۔

6 ستمبر 1992ء کو سنگھ پریوار کے کارسیوکوں (رضا کاروں) نے بابری مسجد گرادی تب

MashalBooks.org

کانگرس کے نرسیما راؤ وزیراعظم تھے۔ بہت سے سیکولر ہندوؤں نے محسوس کیا کہ یہ بہت بڑا المیہ ہے یہ صرف دنگا فساد کے ذریعے ایک مسجد گرانے کی بات ہی نہیں بلکہ یہ کاری ضرب ہندوستان کے سیکولرازم پر بھی پڑی ہے۔ بابری مسجد کے گرائے جانے کے بعد بمبئی' سورت' احمد آباد' کانپور' دہلی اور بے شمار دوسرے شہروں میں فرقہ وارانہ عذاب نازل ہوا جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بمبئی میں 1992ء اور 1993ء کے فسادات شیوسینا نے کرائے جو بال ٹھاکرے کی فاشسٹ فرقہ وارانہ تنظیم ہے اور بال ٹھاکرے نے مسلمانوں کے قتل وخون کا اذن دے دیا۔ بمبئی کے فسادات کا اثر پوری دنیا پر پڑا جہاں ہندوستان کا سیکولر تشخص داغ دار ہوا۔

بابری مسجد کے بعد

رام جنم بھومی کی تحریک کے باعث ہر چند بی جے پی کو بے پناہ سیاسی فائدہ ہوا اور اس نے کوشش کی اور بڑی جماعت کے طور پر اقتدار پر قبضہ بھی کر لیا' تاہم فرقہ وارانہ صورتحال کچھ بہتر ہو گئی۔ آزادی کے بعد اسی کی دہائی فرقہ وارانہ حساب سے انتہائی خطرناک دہائی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد فرقہ واریت کا یہ سب سے بڑا المناک ننگا مظاہرہ تھا۔ دریں اثنا سنگھ پریوار نے اپنا سیاسی دائرہ اثر وسیع کرنے کے لئے ایک کے بعد ایک مذہبی جھگڑا کھڑا کیا اور مذہب کو بری طرح استعمال کیا۔

تاہم جب بی جے پی مخلوط پارٹیوں کی سربراہ کی حیثیت سے مرکز میں برسر اقتدار آ گئی تو اس نے خود مذہبی تنازعات کو ٹھنڈا کرنا شروع کیا۔ یہ امن وامان کو کنٹرول میں رکھنا چاہتی تھی اور مسلمانوں تک بھی یہ پیغام پہنچانا چاہتی تھی کہ وہ صرف بی جے پی کی حکومت میں ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس نے 1999ء کے انتخابی منشور میں کہا کہ اگر اسے اقتدار میں لایا گای تو وہ ہندوستان کو فرقہ وارانہ فسادات سے پاک کر دے گی۔ بی جے پی سے الحاق کرنے والے بعض سیاستدانوں نے یہاں تک کہا کہ ہندوستان کو فسادات سے پاک رکھنے کے لئے بی جے پی کو اقتدار میں رکھا جانا چاہئے۔ اس طرح خود کو سیکولر کہلانے والی جماعتوں نے بی جے پی سے اپنے اتحاد کو جائز ثابت کیا۔

لیکن یہ خام خیالی ہے کہ بی جے پی کو اقتدار حاصل رہا تو وہ سیکولر بن سکتی ہے۔ بی جے پی

MashalBooks.org

ہندوؤں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے فرقہ وارانہ نفرت کو ہوا دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔حکمران جماعت کی حیثیت میں اسے فرقہ وارانہ امن کی ضرورت ہے مگر اس فرقہ وارانہ امن اور فرقہ وارانہ تشدد کی کمی یا خاتمے کا یہ مطلب نہیں کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی آ گئی ہے۔سنگھ پریوار کی نظریاتی بنیاد تو ہے ہی فرقہ وارانہ جذبات کو فروغ دینا۔اگر فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ نظریہ زندہ ہے تو فرقہ وارانہ آگ تو جب ضرورت پڑے بھڑکائی جا سکتی ہے۔بی جے پی بذات خود فرقہ وارانہ پروپیگنڈہ نہیں کر رہی مگر بھگوے بھیس خاندان کے ارکان آر ایس ایس' وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل اس کمی کو پورا کر رہے ہیں۔حال ہی میں عیسائیت پھیلانے پر عیسائی اقلیت زیر عتاب آ گئی ہے۔

فی الحال بی جے پی مسلمانوں کے اتھ ملائمت سے پیش آ رہی ہے۔یہ اندرا گاندھی کی اسی کی دہائی کی شروع کی پالیسی کے الٹ چل رہی ہے۔اندرا گاندھی ہمیشہ اقلیتوں کے ووٹ پر انحصار کرتی تھیں مگر مسلمانوں میں مقبولیت کم ہونے پر انہوں نے اس کا مداوا ہندو نوازی سے کرنے کی کوشش کی تھی۔بی جے پی اب جو ہندوؤں میں اپنی مقبولیت کم ہوتی دیکھ رہی ہے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کیلئے انہیں قریب لا رہی ہے۔گویا جس طرح اندرا گاندھی نے ہندوؤں کے ناز اٹھائے تھے اسی طرح بی جے پی مسلمانوں کی ناز برداری کر رہی ہے۔یہ سیاسی کھیل ہے جو سیاستدان اقتدار میں آنے کے لئے کھیلتے ہیں۔برادری کے لوگوں کو ووٹ بینک سمجھا جاتا ہے یعنی لوگوں کی خاطر سیاست نہیں کی جاتی' صرف لوگوں یعنی ووٹوں کو سیاست کا مقصود بالذات بنالیا جاتا ہے۔

جمہوریت عوام کو مقتدر بنانے کا مؤثر وسیلہ ہے۔مگر عموماً اس کے ذریعے سیاستدانوں کو عوام کی قیمت پر اقتدار میں لایا جاتا ہے۔کانگرس نے مسلمانوں کو ہمیشہ ووٹ بینک کے طور پر استعمال کیا۔کانگرس نے اپنے طویل دور اقتدار میں شاید ہی مسلمانوں کا کوئی ایک نازک مسئلہ حل کیا ہوگا۔ہندوستان میں مسلمان بہت غریب اور پس ماندہ ہیں۔ان کے بڑے بڑے مسئلے تعلیمی اور معاشی نوعیت کے ہیں' مگر حکمران جماعت نے ان شعبوں میں کوئی بھی ٹھوس کارکردگی نہیں دکھائی صرف وعدے کئے گئے۔مسلمان مردوں میں شرح خواندگی بمشکل 35 فیصد ہے اور عورتوں میں تو مایوس کن حد تک یعنی صرف 18 فیصد۔سیاسی اقتدار اور سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کا حصہ مایوس کن ہے۔اگرچہ مسلم آبادی 1991ء کی مردم شمار کے مطابق 12 فیصد سے

زائد ہے اور ہو سکتا ہے' 2001ء میں پندرہ فیصد تک جا پہنچے مگر پارلیمان میں اسے عموماً صرف پانچ فیصد نمائندگی حاصل ہوتی ہے۔ صوبائی اسمبلیوں میں بھی صورتحال کچھ مختلف نہیں۔

سرکاری ملازمتوں میں سب سے نچلے درجے یعنی کلاس تھری اور کلاس فور میں ان کا حصہ 6 سے 7 فیصد سے زیادہ نہیں اور آئی اے ایس اور دوسری اعلیٰ ملازمتوں میں ان کی شرح 3 سے 4 فیصد سے آگے نہیں۔ مختلف ملازمتوں کے لئے اہل مسلمانوں کا ملنا بھی مشکل ہے اور ہمارے سیاسی لیڈروں نے بھی مسلمان عوام میں تعلیم پھیلانے کے لئے بالکل کچھ نہیں کیا۔ انتخاب کے موقع پر بڑے بڑے وعدے کرتے ہیں مگر دوسرے الیکشن تک کچھ بھی نہیں کرتے البتہ پھر وعدے دہرانے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کی شکایات جائز ہیں۔ ہندوستان میں سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود اقتدار میں ان کا شاید ہی کوئی حصہ ہو اور اگر ہے بھی تو وہ خطرناک حد تک کم ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ ہزارہا مسلمانوں نے نہ صرف ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا قربانیاں دیں بلکہ زوروشور سے تشکیل پاکستان کی بھی مخالفت کی۔ ان کا خواب تھا کہ سیکولر ہندوستان میں وہ نہ صرف اپنے مذہب کی آزادانہ پیروی کرسکیں گے بلکہ انہیں اقتدار میں بھی اپنا جائز حصہ ملے گا مگر یوں ہوا نہیں۔ اگرچہ جواہر لال نہرو کا مصمم ارادہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں اقلیتوں کے ساتھ انصاف کیا جائے گا مگر متعدد کانگرسی لیڈر یہ نہیں چاہتے تھے۔ کانگرس میں شامل اکثریت نہرو کے اس خیال سے متفق نہیں تھی اور ہاں تخلیق پاکستان کے باعث بھی ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل ایک حد تک خراب ہوا۔ اس طرح ہندوؤں کے ذہن میں مسلمانوں کے بارے میں مختلف تعصبات راسخ ہوئے اور انہوں یہ سمجھنا شروع کردیا کہ مسلمان ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کے زیادہ وفادار ہیں۔ انہوں نے جو نتائج پہلے اخذ کر رکھے تھے ان کے حق میں کچھ مثالیں بھی انہیں مل گئیں۔

خود مسلمانوں نے بھی سیکولر ہندوستان میں اپنی فلاح وترقی کے لئے کوئی منصوبہ سازی نہیں کی اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ انہوں نے تعلیم اور معاشی معاملات کی بجائے مذہب اور مذہب سے متعلق معاملات پر زیادہ دھیان دیا۔ ان رہنماؤں نے مستقبل کی بجائے ہمیشہ ماضی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے سیاسی جماعتوں' زیادہ تر کانگرس سے جو معاملات بھی کئے وہ مسلم عوام کا مستقبل روشن بنانے کی بجائے ماضی کے ورثے کے تحفظ سے متعلق تھے اور اب آ کر

مسلمانوں پر یہ بات روشن ہو رہی ہے کہ اپنی مسلم شناخت کی بقا کے ساتھ ساتھ انہیں جمہوری سیکولر ہندوستان میں اپنا مقام بھی بنانا ہے' اگرچہ اب بھی زور مدرسے قائم کرنے پر ہے مگر ساتھ ساتھ سیکولر تعلیمی ادارے بھی قائم کئے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں میں یہ احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ ترقی کے لئے لڑکیوں کی تعلیم کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ ایک نیا درمیانی طبقہ بھی آہستہ آہستہ ابھر رہا ہے جو جدید تعلیم کے حصول اور فروغ پر زیادہ سے زیادہ زور دے رہا ہے' نچلی سطحوں سے یہ دباؤ بھی بڑھ رہا ہے کہ عورت کی حیثیت کے بارے میں بعض ضروری تبدیلیاں خصوصاً ہندوستان میں زیر عمل شرعی قوانین میں تبدیلیاں کی جائیں۔

مسلم عوام خصوصاً نچلی ذات کے مسلمانوں میں افلاس بہت ہے' مگر اب وہ بھی ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور اپنے معاشی حالات بہتر بنانے کیلئے سرگرم عمل ہو گئے ہیں مگر راستہ بڑا لمبا ہے اور راستے میں بڑی مشکلات ہیں۔ راستہ پیچیدہ ہے اور بلاشبہ دشوار گزار بھی۔ اب تو بی جے پی کو بھی علم ہو گیا ہے کہ مسلمان کے خلاف شور شرابہ زیادہ نتیجہ خیز نہیں رہا' اس لئے وہ سیاست میں مسلمانوں کی گنجائش نکالنے کے لئے تیار ہے گو یہ کام اس کے لئے ہے مشکل۔ اس کا نظریاتی مرشد آر ایس ایس شائد اسے اس کی اجازت نہ دے بہر طور انحصار اس بات پر ہے کہ بی جے پی کے اعتدال پسندوں کے اس رویے پر ہندو ووٹر کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ اور اس کا امتحان آئندہ انتخابات خصوصاً یو پی میں ہونے والے انتخابات میں ہو جائے گا۔

بی جے پی مسلمانوں کے بارے اس نئی پالیسی کو آگے لے کر چلتی ہے یا نہیں' مسلمانوں کو یہ مان لینا چاہئے کہ انہیں ہندوستانی سیاسی سمندر میں ہی ڈوبنا یا تیرنا ہے اور قرائن یہی بتاتے ہیں کہ مسلم عوام نے بپھرے ہوئے سمندر میں تیرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور اب اس وقت اگرچہ مسلمانوں کا مستقبل روشن نہیں تو اتنا تاریک بھی نہیں۔

(31-مارچ 2001ء)

مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ اور اس کا کردار

آج کی دنیا میں متحرک اور تخلیقی زندگی کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے درمیانہ طبقہ بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے اور کوئی بھی اس کردار کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں درمیانہ طبقہ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بننا شروع ہوا۔ نو آبادیاتی ہندوستان کا یہ نیا طبقہ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔

ہندوستان میں درمیانہ طبقہ بھی مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہوتا رہا' ایک ہندو مڈل کلاس' دوسری مسلم مڈل کلاس یہی دونوں دھڑے فرقہ واریت میں اضافے کا باعث بن گئے' تاہم یہ خیال رہے کہ اس درمیانے طبقے کے ایک حصے نے جدیدیت اور سیکولر اقدار کو فروغ بھی دیا۔ اس طبقے کے بغیر جدیدیت ممکن بھی نہیں تھی۔ اس درمیانے طبقے نے ہی ہماری آزادی کی تحریک کو ایک خاص نظریاتی زاویہ بھی دیا۔ مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو' سبھاش چندر بوس اور جناح اور دوسرے سب کے سب درمیانے طبقے ہی سے آئے تھے۔

ہندو درمیانہ طبقہ تاجروں اور صنعت کاروں کی صفوں سے ابھرا تھا جبکہ مسلم طبقہ جاگیردار طبقے سے نمودار ہوا۔ جاگیردار گھرانوں نے پہلے تو جدید تعلیم کی کچھ مزاحمت کی پھر یہی تعلیم حاصل کرنے لگے اور کچھ قانون اور ایسے دوسرے جدید شعبوں میں آ گئے۔ بعض دوسری سرکاری ملازمتوں کے علاوہ پولیس اور ملٹری سروس میں آئے۔ ہندوؤں کے برعکس ہندوستانی مسلمانوں میں جدید کاروباری طبقہ نہ پیدا ہو سکا۔ بااختیار مسلم طبقہ 1947ء کی تقسیم تک جاگیردار ہی رہا۔ اس وقت تک اور اب بھی مسلمانوں میں کوئی بھی بڑا صنعت کار پیدا نہیں ہوا۔ سوداگری کی ایک روایت تھی مگر سوداگر تھے بہت کم۔ یہاں ہم گجرات کی تین کاروباری برادریوں کا ذکر کر سکتے ہیں۔ کھوجے' بوہرے اور میمن مگر ان سب کو اکٹھا بھی کرتے تو ان کی مالی حیثیت بیس تیس لاکھ روپے سے زائد نہ تھی۔ تامل ناڈو اور کیرالا میں بھی کچھ تجارتی برادریاں تھیں مگر ان کی تعداد تو اور بھی کم تھی۔ یوں نتیجہ یہی نکلے گا کہ مسلمانوں کے بااختیار طبقے میں کاروباری طبقہ نہیں تھا اسی وجہ سے مسلمان جدید تعلیم کے حصول میں بھی پیچھے رہ گئے اور جدید یت میں بھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی دوسری المناک بدقسمتی یہ تھی کہ سو سالہ نوآبادیاتی دور میں جس قدر بھی درمیانہ طبقہ بنا وہ 1947ء میں سرسبز چراگاہوں کی تلاش میں پاکستان منتقل ہو گیا جو پیچھے رہ گئے وہ زیادہ تر نچلے طبقوں کے مسلمان تھے جنہوں نے ہندوستان میں رہنے ہی کو ترجیح دی۔ علماء نے تو پاکستان کی شدید مخالفت کی اور ان میں چند ایک کو چھوڑ کر باقی ہندوستان میں ہی رہے۔ آج اگر مسلم عوام پر علماء کا اثر ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی اکثریت یہاں ہی رہ گئی۔ جدیدیت کے لئے تو صرف درمیانہ طبقہ ہی مؤثر ہوتا ہے۔ اس لئے مضبوط درمیانے طبقے کی غیر موجودگی میں کوئی بھی جدیدیت کی طرف رخ نہیں کر سکتا۔

اب مسلمانوں میں بہت آہستہ آہستہ ایک درمیانہ طبقہ وجود میں آ رہا ہے۔ تقسیم ہند سے

MashalBooks.org

پہلے اور آج کی صورتحال میں بڑا واضح فرق ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ تقسیم سے پہلے مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ جاگیردار طبقے سے ابھرا تھا جسے اشراف کہا جاتا لیکن آزادی کے بعد جو درمیانہ طبقہ ابھرنے لگا ہے وہ نچلی ذات اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جسے کبھی اجلاف کہا جاتا تھا' اب درمیانہ طبقہ انصاریوں (جولاہوں) قریشیوں (انہیں قصاب بھی کہا جاتا ہے) سلاوت (راجپوتانہ کے مستریوں) (مہاراشٹر کے) مالیوں (پھل اور سبزی پیدا کرنے یا کاروبار کرنے والے) سے ابھر رہا ہے۔

تو مسلمانوں کے اس نچلے ذات سے وابستہ لوگ معاشی منظر پر آرہے ہیں اور اپنی اولاد کو سیکولر جدید تعلیم دلا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ انجینئرنگ' میڈیسن' قانون اکاؤنٹینسی اور تعلیم ایسے جدید شعبوں میں آرہے ہیں اب انہی پیشہ وروں پر مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ مشتمل ہے۔ اگرچہ مسلمان درمیانے طبقے کی حیثیت کے بارے میں کوئی اعداد و شمار دستیاب نہیں' تاہم اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ اب بھی کوئی زیادہ مضبوط حیثیت کے مالک نہیں جبکہ ان کے مقابلے میں ہندوؤں کا درمیانہ طبقہ بہت مضبوط ہے۔ ان کا زیادہ تر تعلق اونچی ذات کے ہندوؤں سے ہے اور انہوں نے صنعت اور تجارت میں بڑے میدان مارے ہیں' ان کے بچوں نے بھی آگے بڑھ کر جدید پیشے اختیار کئے ہیں۔ بیوروکریسی فوج یا پولیس زیادہ سرکاری ملازمتوں پر انہی کا قبضہ ہے۔ ان ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ مسلم درمیانے طبقے کا مقابلہ دلت درمیانے طبقے سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بھی بہت کمزور ہے۔

مسلمانوں اور دلت کے درمیانے طبقے کے مقابلے میں ہندو درمیانہ طبقہ زیادہ پا اعتماد اور دور اندیش ہے' وجوہ ظاہر ہیں۔ آج کی عالمگیریت کی لہر میں ہندوؤں کے لئے بہتر مواقع نکلے ہیں۔ روایتی سرکاری ملازمتوں کے معاوضے کے مقابلے میں اعلیٰ مہارت والے عہدوں کا معاوضہ بہت زیادہ ہے۔ مسلمانوں اور دلت کو یہ مواقع میسر نہیں' ان میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جنہیں یہ مہارت اور مواقع میسر ہیں۔ یوں ان دونوں کے لئے جدیدیت اتنی زیادہ فائدہ بخش نہیں جتنی مفید ہندو درمیانے طبقے کے لئے ثابت ہوئی ہے۔

دراصل انیسویں صدی میں مسلمانوں کی صاحب اقتدار کلاس یہی جاگیرداروں کی تھی اور انہیں بھی جدیدیت میں کوئی زیادہ فائدہ نظر نہیں آتا تھا اور پھر وہ تو ہارے ہوئے تھے کیونکہ انگریزوں نے اقتدار انہی سے چھینا تھا۔ سرسید نے مستقبل کے حوالے سے جدید تعلیم کی اہمیت

کو محسوس کیا اور پھر اسے مسلمانوں میں پھیلانے کے لئے زندگی وقف کر دی۔ تقسیم کے بعد مسلمان درمیانہ طبقہ اس وقت اور کمزور ہو گیا جب بہت سے لوگ پاکستان ہجرت کر گئے۔ پس ماندہ ذات کے مسلمانوں نے درمیانہ طبقہ پیدا کرنے میں بہت وقت لیا' اس لئے ان میں جدید تعلیم کی شرح اب بھی بہت کم ہے۔

ایک اور سبب بھی ہے کہ مسلمانوں میں درمیانہ طبقہ پس ماندہ ذات کے مسلمانوں سے ابھر رہا ہے' اس لئے جذبے اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے وہ ہندوؤں کے درمیانے طبقے جتنا جدید نہیں۔ مسلمانوں کے درمیانے طبقے کے مقابلے میں ہندو درمیانے طبقے کا ثقافتی پس منظر بہت ہی مختلف ہے۔ مسلمان تو قدامت پسند مذہبی اور پس ماندہ پس نظر سے آگے آ رہے ہیں' اس لئے مسلمانوں کی پس ماندگی کو اسلام سے منسوب کرنا بالکل غلط ہوگا۔ آج کے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی پس ماندگی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں' کسی گروہ میں مذہب کو پس ماندگی کا نظریاتی ذمہ دار قرار دینا دراصل سماجی ڈھانچے کے بارے میں کم فہمی کی بات ہے۔ ایک وقت میں مسیحیت کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ جدیدیت اور سیکولرازم میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے مگر آج اس کو سیکولرازم اور جمہوریت کے فروغ میں بڑا مددگار گردانا جاتا ہے۔ معاشی اور سماجی تبدیلیاں آئیں تو خود مذہب اور اس کی تعلیمات کی تفہیم اور تعبیر میں بھی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔

یوں مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ مذہب کی بنا پر نہیں بلکہ دوسری وجوہ کی بنا پر مسلم عوام میں جدیدیت لانے کے لئے کوئی قابل ذکر کردار ادا نہیں کر سکا۔ پہلی وجہ تو یہ کہ اس کی عددی حیثیت بہت کمزور ہے۔ دوسرے یہ آیا ہی بڑی پس ماندہ ثقافت میں سے ہے اور تیسرے اس لئے کہ خواتین کا حصہ اس طبقہ میں بہت کم ہے کیونکہ مسلمان عورتوں میں اب بھی تعلیم بہت کم ہے۔ عورتیں مردوں کے مقابلے میں جدیدیت لانے کے لئے زیادہ مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔ چوتھے معاشی شعبہ اور ملازمتوں میں انہیں کوئی صحیح مقام حاصل نہیں ہوا' اس لئے وہ مستقبل کے بارے میں زیادہ پر اعتماد نہیں اور یہی وہ عوامل ہیں جو جدیدیت کی طرف مائل ہونے کا راستہ روکتے ہیں۔

انہی وجوہ کی بنا پر مسلمانوں میں سماجی اصلاحات کا عمل بھی بڑا کمزور ہے۔ جدید اصلاحات اپنانے کے لئے طاقتور اور پر اعتماد درمیانے طبقے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب

خواتین میں تعلیم حاصل کرنے کی شرح بڑھ رہی ہے۔ ان میں بعض خاص اصلاحات کے نفاذ کی ضرورت کا احساس جاگ رہا ہے اور مسلم پرسنل لا بورڈ پر بھی کچھ تبدیلیاں لانے کے لئے دباؤ بڑھ رہا ہے۔ مسلمان عورتوں میں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل ہو رہا ہے مگر نچلے طبقوں میں یعنی غریب اور ان پڑھ مسلمانوں میں یہ عمل نہیں ہو رہا' جیسے جیسے مسلمان درمیانے طبقے میں اضافہ ہوتا جائے گا خاندانی منصوبہ بندی پر عمل بھی بڑھتا جائے گا۔

اقلیتوں کے درمیانے طبقے کو مزید جدید تعلیم دے کر ملازمتوں کے زیادہ مواقع دے کر اور ان میں کاروبار کی بہتر صلاحیت پیدا کرنے کے ذریعے مضبوط بنایا جائے گا تو یہ عمل خود ہندوستانی سماج کے مفاد میں ہوگا مگر بدقسمتی سے عالمگیریت کی تیز رفتاری کے باعث نہ صرف آمدنیوں میں فرق بڑھ رہا ہے۔ اطلاعاتی فرق بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ آدمی (مرد یا عورت) جس قدر غریب ہوگا اس کے لئے جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانا اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا۔ یوں یہ منحوس چکر ہی چلتا رہے گا۔ یہ فرق مسلم درمیانے طبقے کی نشوونما میں بڑا خلا پیدا کر دے گا۔ اس لئے خود ہندوستانی سماج کے حق میں ہے کہ وہ مسلمانوں کے درمیانے طبقے کو بالالتزام، بہتر تعلیمی اور معاشی مواقع فراہم کرتے ہوئے اسے مضبوط کرے۔ مسلمان ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ہیں' اس لئے ملک کے پاس انہیں پس ماندہ رکھنے کی گنجائش ہی کوئی نہیں۔ (31- مئی 2001ء)

پچاس برس آزاد ہندوستان میں......ایک جائزہ

ہندوستان کو آزاد ہوئے پچاس برس سے زائد عرصہ ہوگیا۔ بدقسمتی یہ کہ ہندوستان کی تقسیم اس بات پر ہوئی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کیا ہوں گے اور اقتدار میں ان کا حصہ کتنا ہوگا۔ جناح صاحب اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا ایک الگ ملک بنے گا جس میں انہیں پورے حقوق حاصل ہوں گے اس لئے انہیں مسئلے کا حل یہی نظر آیا کہ مسلمانوں کا ملک بھی الگ بنایا جائے' اس مقصد کے لئے جناح نے دوقومی نظریہ بھی بنالیا۔ یعنی مسلمان اور ہندو الگ الگ قومیں ہیں۔ یہ بھی ہے کہ لالہ لجپت رائے نے پنجاب ٹری بیون میں 1924ء میں ایک مضمون لکھ کر اسی قسم کے نظریات کا اظہار کیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ صرف اور صرف ایک برادری کو ہی پوری قوم سمجھتے اور ملک کو ایک مجموعی طور پر ایک اکائی

نہیں مانتے تھے انہوں نے فوراً یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہر برادری ایک قوم ہے اور اس کا اپنا الگ وطن ہونا چاہئے۔

دراصل ایک برادری کے مفادات کو مجموعی طور پر یکساں مفادات بنانے کی سوچ سے ہی فرقہ وارانہ سوچ کا آغاز ہوا۔ اس لئے کہ نہ تو ہندوؤں اور نہ ہی مسلمانوں کے یکساں مفادات تھے۔ ہر برادری' ذات علاقے' زبان' ثقافت اور طبقے کے لحاظ سے بنی ہوئی تھی اور تو اور سرسید جب تعلیم کی بات کیا کرتے تھے تو ان کا مطلب اشراف کی تعلیم ہوتا تھا نہ کہ اجلاف مسلمانوں کی تعلیم' اس کا مظہر ان کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے مراد آباد میں جولاہوں کے بچوں کے سکول کے افتتاح پر کی تھی۔

اسی طرح جہاں تک سیاسی اور معاشی مفادات کا تعلق تھا' دلت اور سوریاسی (اونچی ذات کے ہندو) میں کوئی اشتراک نہ کیا تھا۔ بابا صاحب امبید کر کو دلت کے حقوق کے لئے بڑی مشکل جنگ لڑنا پڑی۔ دوسری طرف جناح صاحب اونچی ذات اور اونچے طبقے کے مسلمانوں کے مفادات کے لئے لڑ رہے تھے۔ انہوں نے شاید ہی کبھی نچلی ذات کے کاریگروں اور قرضوں کے نیچے دبے مسلمان کسانوں کو لائق توجہ سمجھا۔ چنانچہ جب معروف شاعر اقبال نے پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے پنجاب کے مقروض مسلمان کسانوں کے لئے کچھ کرنے کا کہا تو جناح صاحب نے کمال خاموشی کے ساتھ اقبال کو پنجاب مسلم لیگ کی صدارت سے ہی ہٹا دیا۔

چنانچہ کسی بھی برادری کو خواہ ان کا مشترکہ مذہب کوئی سا بھی ہو یکساں اور یک رنگ نہیں سمجھنا چاہئے۔ مذہبی رشتے اہم ضرور ہیں مگر انتہائی پیچیدہ معاشرتی زندگی میں وہ واحد کھلاڑی نہیں' مگر فرقہ پرست لیڈروں نے ہمیشہ مذہبی اور روحانی معاملات کو اپنے مذہبی زور بیان کے باعث مادی مفادات سے خلط ملط کر دیا۔ مذہبی زور بیان کے ذریعے پاکستان صرف مسلمانوں کے بالائی طبقے اور بااختیار لوگوں کے لئے بنایا گیا تھا مگر اسے نام مسلم وطن کا دیا گیا۔ پاکستان میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت اب بھی غریب ہے' خواندگی کی شرح بہت کم ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے مقابلے میں بھی کم۔

پاکستان بنانے کا ایک سبب یہ بتایا گیا تھا کہ اس طرح فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ تصادم ختم ہو جائے گا اور تو اور کانگرس کی قیادت نے بھی یہی سمجھا کہ

MashalBooks.org

اس طرح فرقہ واری کا مسئلہ حل ہو جائے گا مگر یہ مسئلہ 1947ء کی تقسیم سے لے کر اب تک طے نہیں ہوا۔ پچاس کی دہائی کے کچھ عرصہ چھوڑ کر آزادی کے بعد فسادات در فسادات ہوتے چلے گئے جن میں سے بعض فسادات سے ملک کو دھچکا لگا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اسے ناگوار سمجھا گیا' اس قسم کے فساد کی ایک مثال بابری مسجد کے انہدام کے فوراً بعد کے فسادات ہیں۔

یہی سبب ہے (فرقہ وارانہ کشت وخون) کہ غریب یا ابتر اردو بولنے والے یا تاملی اور ملیالم بولنے والے مسلمان بھی خود کو آزاد ہندوستان میں غیر محفوظ سمجھتے تھے اور اب بھی اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ زوردار ہیں مگر اب ہم بی جے پی' وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل کو دیکھتے ہیں تو وہ زیادہ ہی عدم برداشت اور مذہبی کٹڑ پن کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ آج بھگوا یا گیروے خاندان کا سب سے بڑا مسئلہ ایودھیا کا مندر ہے۔ ایسے جیسے ہندوستان جیسے ملک کا دوسرا کوئی اور مسئلہ ہے ہی نہیں۔ اس بھگوے خاندان میں جس قسم کی عدم رواداری نظر آتی ہے ویسی کہیں اور نظر نہیں آتی یہی لوگ ہیں جو ہندوستان کی کشادہ دلی اور سیکولر سیاست کی بدنامی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

تحفظ کے مسائل سبھی اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں اور عیسائیوں کی انتہائی پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ بی جے پی کا یہ دعویٰ کہ اس کے عہد میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا' حقیقت سے خالی ہے۔ بی جے پی کے عہد اقتدار میں متعدد فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں۔ تازہ تر مثال مارچ 2001ء کے کان پور کے فسادات اور اس میں پی اے سی کے کردار کی ہے جو سراسر فرقہ وارانہ تھا۔ بلاشبہ تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ فسادات پچھلی صدی کی 80 کی دہائی میں کانگرس کے زمانے میں ہوئے مگر اس سے جن سنگھ یا اس کا تازہ اوتار بری الذمہ نہیں ہوتا۔ ان میں سے اکثر فسادات سنگھ پریوار والوں کی باقاعدہ سازش کے باعث ہوئے اور انہوں نے ہی کرائے۔ کانگرس پر یہ الزام یقیناً لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے غیر مستعدی اور ڈھیل دکھائی مگر 80ء کی دہائی کے بڑے بڑے فرقہ وارانہ فسادات کی زیادہ تر ذمہ دار بی جے پی ہے۔

بی جے پی بڑی چالاکی کے ساتھ کانگرس پر الزام لگا رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے ان کی خوشامد کرتی ہے مگر اس طرح وہ اصلاً بالائی طبقہ کے ہندوؤں میں اپنا ووٹ بینک بنا رہی تھی۔ اس کی مندر بنانے کی تحریک صرف اور صرف ہندو ووٹروں کو جیتنے کی ایک مسلسل کوشش تھی اور کم از کم وقتی طور پر وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئی۔ 80 کی دہائی میں بھی بی

جے پی نے گاندھی کی سادھی پر گاندھی کا سوشلزم اور سیکولرازم لانے کی قسم اٹھائی تھی (بلکہ اس سے پہلے 1977ء میں جب یہ جنتا پارٹی میں مدغم ہوگئی تھی) مگر اس نے ہندو ووٹ حاصل کرنے کے لئے فرقہ واریت کے معاملہ کو بڑے جارحانہ انداز سے استعمال کیا۔

80ء کی دہائی کے شروع میں کانگرس اور بی جے پی کے درمیان گویا فرقہ واریت کا مقابلہ شروع ہوگیا جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ مسئلہ اس قدر سنگین ہوگیا کہ آزادی کے بعد ایسی نوبت کبھی نہیں آئی تھی اور بی جے پی اسی شدید فرقہ وارانہ پالیسی کے طفیل مخلوط این ڈی اے کی سربراہ کے طور پر مرکز میں اقتدار میں آ گئی۔ یوں یہ جماعتیں اقلیتوں کی جان کی قیمت پر سیاست کر رہی ہیں۔ یوں اقلیتوں کے لئے اپنے تحفظ کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اسی کی دہائی میں بڑے بڑے فسادات میں تین سو افراد ہلاک ہوئے تھے۔

تحفظ اور سلامتی کے مسئلے کے علاوہ زندہ رہنے اور وجود قائم رکھنے کے اور بھی مسائل ہیں۔ تقسیم کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے ان میں شہروں میں اکثریت کاریگروں، مزدوروں کی تھی اور دیہات میں بے زمین کسانوں اور دوسرے غریب مسلمانوں کی ان میں سے جو امیر اور طاقت ور تھے وہ سرسبز چراگاہوں کی خاطر پاکستان چلے گئے۔ ہندوستان کے ان مسلمانوں میں خواندگی کی شرح تو دلت سے بھی کم تھی اور اب تک ان مسلمانوں کی غریبی دور کرنے کے لئے شاید ہی کچھ کیا گیا ہے۔

آزادی کے بعد کے پچاس بلکہ زیادہ سالوں میں مسلمانوں کی پسماندگی کا مقابلہ صرف دلت سے کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں مذہبی بنیاد پر اعداد و شمار نہیں ملتے مگر 1980ء میں مسلمانوں اور دلت کے بارے میں اندرا گاندھی نے گوپال سنگھ کمیشن مقرر کیا تھا، اس کی رپورٹ سے مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ یہ رپورٹ 1988ء کو مکمل ہوئی۔ کمیشن جو کچھ بھی تقابلی مواد اکٹھا کرے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت دلت سے اچھی نہیں اور کئی معاملات میں تو دلت سے بھی گئی گزری ہے۔

جی او آئی نے جو تجرباتی سروے کیا تھا اس کے اعداد و شمار کے مطابق 66.6 فیصد دلت لوگ کچے مکانوں میں رہتے ہیں جبکہ 65.9 فیصد مسلمان بھی کچے گھروں میں رہتے ہیں۔ 22.6 فیصد دلت لوگوں کو پینے کا صاف پانی میسر ہے مگر مسلمان کے صرف 19.6 فیصد حصے کو ایسا پانی ملتا ہے۔ افلاس کے حساب سے 50 فیصد دلت اور 43 فیصد مسلمان اس زمرے میں

آتے ہیں۔ 60 فیصد دلت اس مفلسی میں گزارا کر سکتے ہیں جب مسلمانوں کی شرح 56 فیصد ہے۔

دلت اور شیڈول قبائل میں خواندگی کی شرح 40 فیصد ہے۔ مسلمان میں 50 فیصد، مسلمان بچوں میں سے 62 فیصد بچے سکول میں داخلہ لیتے ہیں۔ دلت اور شیڈولوں میں شرح بھی اتنی ہے جبکہ اونچی ذات کے ہندو بچوں کی شرح 72 فیصد ہے، مسلمانوں میں میٹریکولیٹ 5.9 فیصد دلت وغیرہ میں 4.9 فیصد اور ہندوؤں میں 8.5 فیصد انتہائی افسوسناک امر تو یہ ہے کہ زیادہ سیکولر جماعتوں نے بھی ووٹ حاصل کرنے کے لئے زبانی کلامی دعوے کئے اور مسلمانوں کو استعمال کیا، عملاً کچھ نہیں کیا۔ یہ سب جماعتیں بلند بانگ دعوؤں میں تو سب سے آگے تھیں مگر عمل کرنے میں بہت پیچھے۔ اس ضمن میں مسلمان لیڈروں کی صورت بھی کوئی بہتر نہیں تھی۔ ان کی لفظی بازی گری مسلمانوں کو باندھ کر رکھ دیتی ہے۔ ان مسلمان رہنماؤں نے اپنی صلاحیتیں پس ماندہ اور غریب مسلمانوں کی معاشی بہتری کی بجائے شرعی قوانین پر سودے بازی میں صرف کیں، بعض نے تو بظاہر شرعی معاملات پر شعلہ افشانی کی مگر ذاتی مقاصد حاصل کئے اور بعض تو اس حد تک گئے کہ انتہا پسندی کی وجہ سے اکثریتی برادری کے فرقہ وار عناصر کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔

آج کرنے کی ضروری بات یہ ہے کہ مسلمان عوام میں یہ شعور بیدار کیا جائے کہ ہندوستان میں کن کن سیکولر اور فرقہ پرست جماعتوں اور خود ان کے اپنے لیڈروں نے انہیں کس قدر استعمال کیا ہے اور اب اپنے لیڈروں کی گرم بازاری کی بجائے وہ کن کن جماعتوں سے سودا بازی کر کے بہتر مستقبل کے لئے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ جمہوریت میں جو تھوڑا بہت مقام اقلیتوں کو ملتا ہے اسے انتہائی چابک دستی سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان دانشور، جہاں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے وہاں وہاں فکر و خیال کی تنظیمیں (تھینک ٹینک) بنا سکتے ہیں، یہی ان دانشوروں کا تخلیقی کردار ہو سکتا ہے۔ پہلی بار ملی کونسل نے یو پی اور ایسے ہی علاقوں میں اس نقطۂ نظر سے سروے کیا ہے کہ بی جے پی کو شکست دینے کے لئے انہیں کس کس کو ووٹ دینا ہے، بہرطور یہ تو مسئلہ کا صرف ایک حصہ ہے۔ مسلمان عوام کی حقیقی بہبود کے لئے ایک اجتماعی اور ملک گیر منصوبہ سازی کی ضرورت ہے۔
یہ بہت محنت طلب کام ہے اور پوری لگن سے اس قسم کا کام کئے بغیر مسلمان عوام کی حالت

کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا اور ہاں صرف یہی کافی نہیں کہ دلت سے سیاسی اتحاد کرلیا جائے بلکہ معاشرے کے دوسرے کمزور حصوں کے ساتھ معاشی اور تعلیمی ترقی کے لئے اتحاد کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کیلئے دلت مسلمانوں اور پس ماندہ حصوں کے دانشوروں کو مل کر اجتماعی تدبیر کرنا ہوگی اور اصل بات یہ ہے کہ نہ تو مسلم سیاسی قیادت اور نہ ہی دلت سیاسی قیادت کو ان کی انتخابی بلند بانگ تقریروں اور ہوس اقتدار کی سیاست سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے صرف مخلص دانشور ہی باقی رہ جاتے ہیں جو یہ کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(28-فروری 2002ء)

مسلمانوں کے متعلق افسانہ سازی اور گجرات کا کشت وخون

صوبہ گجرات میں حالات معمول پر لانے کے سوال پر تبادلہ خیال کرنے کیلئے گجرات سے ایک دوست آئے۔ انہوں نے کہا کہ دوسرے امور کے علاوہ یہ بات بھی صحیح ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی' معاملہ یکطرفہ نہیں ہوسکتا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جب تک مسلمان علیحدگی پسندی کی رٹ نہیں چھوڑیں گے اور ہندوستانیت اور جدید تعلیم کو قبول نہیں کریں گے حالات تبدیل نہیں ہو سکتے اور ہندوؤں کا ذہن مسلمانوں کے خلاف ہی رہے گا۔ میں نے ان سے بڑی تفصیل سے گفتگو کر کے بتایا کہ معاملہ یوں نہیں ہے یہ صرف اور صرف سنگھ پریوار کا پروپیگنڈہ ہے۔ میرے دلائل سننے کے بعد لگتا تھا کہ انہیں میرے مؤقف پر یقین آ گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ افسانہ طرازیوں کے مقابلے میں سچائی کا پرچار کرنا کتنا ضروری ہے۔

میرا ایمان ہے کہ جو لوگ سیکولرازم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر یقین رکھتے ہیں جب تک وہ فرقہ وارانہ چیلنج کا ہمہ وقت سخت مقابلہ نہیں کرتے کچھ نہیں ہوگا۔ آر ایس ایس کم وبیش 77 سال سے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کرتا چلا آیا ہے۔ آر ایس ایس بغیر کسی وقفے کے سارا سارا سال پرچار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں سیکولرازم کو ماننے والوں کو صرف اس وقت ہوش آتا ہے جب اخباروں میں کسی فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں سرخیاں چیخنے لگتی ہیں' کچھ دن رہنے کے بعد یہ لوگ پھر مائل ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک اور فساد ہو جاتا ہے۔

کم ازکم گجرات کے کشت وخون میں جو کچھ ہوا اس کے بعد تو سیکولر طاقتوں کو فرقہ واریت کے مسئلہ کا بڑی سنجیدگی سے مقابلہ کرنا چاہئے تھا اور مستقل بنیادوں پر' ضرورت یہ بھی ہے کہ اس

کام کے لئے تربیت یافتہ جتھے بنائے جائیں۔ آر ایس ایس نے مسلمانوں کے بارے میں جو افسانے مشہور کئے ہیں' حیرت ہے کہ نہ صرف اکثر ہندو بلکہ بعض سیکولر عناصر بھی ان پر یقین لے آئے ہیں۔ میں اس مضمون میں اس قسم کے کچھ افسانوں پر روشنی ڈالوں گا۔

پہلی افترا پردازی یا افسانہ یہ ہے کہ اسلام علیحدگی اور تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ کافروں کے خلاف تشدد کو جائز قرار دیتا ہے اور جیسا کہ ہمارے اپنے وزیراعظم نے کہا' دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان آباد ہیں ان ممالک کو ہر وقت دہشت گردی اور عسکریت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ ظاہر ہے یہ وزیراعظم نہیں آر ایس ایس کا پرچارک بول رہا تھا۔ یہ باتیں آر ایس ایس والے کافی دنوں سے ان کے کان میں ڈھول کی تھاپ پر ڈال رہے تھے جب وہ خود اس تنظیم کے پرچارک تھے۔ شرم کی بات ہے کہ ایک وزیراعظم اپنے ہی ملک کی آبادی کے خلاف اس قسم کے کلمات کہے۔ انہوں نے بعد میں کہا کہ دراصل وہ مسلمانوں کے ایک خاص گروہ کی بات کر رہے تھے' سارے مسلمانوں کی نہیں مگر حقیقتاً وہ سارے مسلمانوں کی مذمت کر رہے تھے۔

مسلمانوں کا ایک گروہ حقیقتاً ایک چھوٹا سا گروہ' علیحدگی پسند ہو سکتا ہے' ہندوؤں سمیت تمام مذہبی برادریوں میں علیحدگی پسند ہوتے ہیں۔ آسام اور اوسوم براہمن یو ایل ایف اے (یونائیٹڈ لبریشن فرنٹ آف آسام) کا حصہ ہیں اور یہ فرنٹ ہندوستان سے آسام کی آزادی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ یہ بھی صرف افسانہ ہے کہ تقسیم ہند سے قبل تمام مسلمان علیحدگی یا تقسیم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ درحقیقت جاگیرداروں اور بالائی طبقہ کے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانے طبقے کا ایک حصہ اعلیٰ سرکاری ملازم اور مسلمان تاجروں کا ایک گروہ اپنے مفادات کی خاطر علیحدگی کا مطالبہ کر رہا تھا اور وہی طبقے تقسیم ہند کے کردار ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کا بھی ایک بالائی طبقہ ہندو مہاسبھا کے زیر اثر تھا۔ ہندو راشٹرا (ہندو دیس) کا مطالبہ کر رہا تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں تسلیم کرتا تھا۔

دیکھا دیکھی سکھ بھی شیر ہو گئے اور انہوں نے خالصتان کا مطالبہ شروع کر دیا تو پھر واجپائی صاحب کس منہ سے سارے مسلمانوں کو علیحدگی پسند اور متشدد قرار دے سکتے ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر سیاسی مقاصد کے تحت یہ بیان دیا جو سنگھ پریوار کے ایجنڈے کا حصہ ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ پاکستان علمائے اسلام کا منصوبہ نہیں تھا' کسی نامور عالم دین نے پاکستان کی

MashalBooks.org

حمایت نہیں کی۔ مولانا حسین احمد مدنی کی سرکردگی میں جمعیت العلمائے ہند نے قرآن و حدیث کے حوالے سے دوقومی نظریے کا بطلان کیا۔ مولانا مدنی نے تو متحدہ قومیت اور اسلام کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی اور جناح صاحب کے ان دلائل کو غلط ثابت کیا کہ اسلام قومیت کی بنیاد ہے۔

پاکستان کو بالائی طبقہ کے مسلمانوں کا پراجیکٹ تھا اس میں مسلمان عوام کو شریک کار ہی نہیں بنایا گیا کیونکہ انہیں اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے پاکستان کی طرف ہجرت نہیں کی اور اسلام یقیناً قیام پاکستان کا ذمہ دار نہیں ہے اور تو اور مولانا مودودی کی بنیاد پرست پارٹی جماعت اسلامی نے بھی پاکستان کی حمایت نہیں کی کیونکہ ان کی نظر میں جناح صاحب پاکستان کو غیر مذہبی سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے۔

سنگھ پریوار نے ایک اور معاملہ جہاد کا بڑا چرچا کیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جہاد کا لفظ لڑائی کے معنی میں ایک بار بھی قرآن شریف میں نہیں آیا اور اس کا قرآن میں مفہوم یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں پھیلاؤ اور برائیوں کو روکو' قرآن میں جنگ کے لئے لفظ قتال آیا ہے۔ جس کا مطلب ہے قتل کرنا یا مارنا' پیغمبر اسلام نے کہا کہ بہترین جہاد ظالم حکمران کے منہ پر کلمہ حق کہنا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض مسلمان حکمرانوں نے فتوحات کے لئے اپنی جنگوں کو حلال یا جائز قرار دینے کے لئے انہیں جہاد کہا۔ مگر اس کا الزام نہ تو اسلام پر اور نہ ہی مسلمانوں پر آتا ہے۔ اس کے لئے تو ان لالچی حکمرانوں کو دوشی قرار دینا چاہئے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اسلام تو امن پر زور دیتا ہے نہ کہ جنگ پر جن معنوں میں جہاد کا لفظ (غلط طور پر) سمجھا جاتا ہے قرآن دفاعی جنگ کی اجازت دیتا ہے جارحانہ جنگ کی ہرگز نہیں۔ یہ مسلمانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ جب دشمن یا مخالف ہار مان لے تو وہ بھی اس پر ہتھیار نہ اٹھائیں نہ ان کا تعاقب کریں اور کسی ایسے فرد کو قتل نہ کریں جو جنگ میں شریک ہی نہیں۔ اسلام کے کسی بھی سنجیدہ طالبعلم کو ان باتوں کا بخوبی علم ہے۔ بنیادی طور پر اسلام امن کا مذہب ہے تاہم دوسرے مذاہب کی طرح بعض مفاد پرستوں نے اسے بھی غلط استعمال کیا۔

ایک اور قصہ دار الحرب اور دار الاسلام کا ہے (جنگ کا مقام اور امن کا مقام) قرآن میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں۔ علمائے کرام نے اس وقت یہ تصورات وضع کئے جب دوسرے ممالک میں لوگوں نے اسلام کو اختیار کرنا شروع کیا۔ ان نومسلموں کو وہاں کے حاکم سزائیں

MashalBooks.org

دیا کرتے تھے' چنانچہ علما نے ایسے ممالک کو دارالحرب قرار دیا مگر اس کے ساتھ ایک اور اصطلاح دارالامان بھی وضع کی جس ملک میں مسلمان تھے تو اقلیت میں مگر انہیں اپنی عبادات اور رسم و رواج کی آزادی حاصل تھی' اسے دارالامان کہا جاتا تھا اور مسلمانوں کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ امن وامان کے ساتھ رہیں۔

اکثر علماء نے ہندوستان کو دارالامان قرار دیا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ امن و آشتی کے ساتھ رہیں۔ انیسویں صدی میں جب انڈین نیشنل کانگرس کھڑی کی گئی مولانا قاسم احمد نانوتوی نے فتویٰ جاری کیا کہ مسلمان کانگرس میں شامل ہو کر ہندو بھائیوں سے مل کر انگریز حکومت کے خلاف جدوجہد کریں۔ انہوں نے ایسے اور بھی فتوے اکٹھے کئے اور نصرت الاحرار (آزادی کے مجاہدین کی امداد یا فتح) کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کر دیئے۔ ثابت ہوا کہ یہ کہنا کہ مسلمان ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے ہیں اور ہندوؤں کو کافر سراسر غلط ہے۔

بہت سے علماء اور صوفیا نے ہندوؤں کو اہل کتاب تسلیم کیا ہے۔ قرآن عیسائیوں اور یہودیوں کو اہل کتاب تسلیم کرتا ہے کیونکہ وہ توریت اور بائیبل کو الہامی کتابیں تسلیم کرتے ہیں۔ بہت سے صوفیا کا (ان میں دہلی کے مظہر جان جاناں بھی شامل ہیں) کہنا ہے کہ ہندوؤں کے وید بھی سچے ہیں۔ اس لئے ہندو بھی اہل کتاب ہیں۔ مظہر جان جاناں کی دلیل یہ تھی کہ اللہ نے قرآن میں کہا ہے کہ میں نے دنیا کی تمام قوموں میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں تو پھر وہ ہندوستان ایسی بڑی قوم کو کیسے بھول سکتا ہے؟

مسلمانوں کے بارے میں ایک اور بہتان یہ ہے کہ وہ سیکولر تعلیم حاصل کرنے سے انکاری ہیں اور اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے صرف مدرسوں میں بھیجتے ہیں جو انہیں کٹر پنتھی بنا دیتے ہیں۔ یہ دلیل منطق کی تاب ہی نہیں لاسکتی۔ درمیانے طبقے کے مسلمانوں میں سے کوئی بھی اپنے بچے کو مدرسے میں نہیں بھیجتا۔ صرف غریب مسلمان ہی سیکولر تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا اس لئے وہ اپنے بچوں کو مدرسے میں بھیجتا ہے۔ سیکولر تعلیم کی کمی کا سبب افلاس ہے مذہب نہیں' مگر یہ قصہ کہ مدرسے کی تعلیم غربت کی وجہ سے نہیں' انتہا پسند مذہبی کردار بنانے کے لئے دی جاتی ہے' بڑا موثر بنا دیا گیا ہے۔ جبکہ درمیانے درجے کے ڈاکٹروں' انجینئروں' اکاؤنٹنٹوں' مینجر وغیرہ کے بچے کبھی ان مدرسوں میں نہیں بھیجے جاتے مگر چونکہ

MashalBooks.org

ہندوستان کے مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ بہت ہی چھوٹا ہے اس لئے مدرسہ کہانی بھی مان لی جاتی ہے اور آج دلت اور مسلمانوں دونوں غربت میں ہم پلہ ہو چکے ہیں۔

مسلمانوں کے معاشی حالات بہتر ہوئے تو ان میں سیکولر تعلیم میں بھی اضافہ ہوگا مگر فرقہ وارانہ تعصّبات اس قدر گہرے اور مضبوط ہیں اور فرقہ وارانہ تشدد اس قدر پھیل چکا ہے کہ جب بھی کوئی مسلمان برادری معاشی طور پر خوشحالی حاصل کرتی ہے اسے تباہ کر دیا جاتا ہے اور پھر یہی لوگ طعنے اور الزام دیتے ہیں کہ مسلمان اپنے بچوں کو مدرسوں میں بھیجتے ہیں۔ درحقیقت یہ فرقہ پرست ہیں جو بار بار مسلمانوں کو قومی دھارے سے الگ کرتے رہتے ہیں جبکہ مسلمان قومی دھارے میں شامل ہونے کے لئے مسلسل تگ ودو کر رہے ہیں۔

اس ضمن میں ایک سوال اصلاحات کا بھی ہے۔ اس کا بھی تعلق مذہبی کٹڑ پن کی بجائے سیکولر تعلیم کے فقدان سے ہے جیسے ہی مسلمانوں میں لبرل سیکولر تعلیم عام ہوگی ان کے لئے مذہبی اصلاحات بھی قابل قبول ہوتی جائیں گی۔ آج پچھلے پچاس سال کے مقابلے میں مسلم عورتوں میں تعلیم کی شرح زیادہ ہے۔ اس لئے ان تعلیم یافتہ عورتوں میں یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے کہ مسلم شرعی قوانین میں ترمیم کی جائے اور تین بار لفظ طلاق کہنے والی بات منسوخ کر دی جائے اور تعدد ازدواج کے بارے میں قانون سازی کی جائے۔ لیکن جب گجرات کی طرح کے قتل عام ہوتے ہیں تو پھر مسلمان کو پیچھے کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور اصلاحات ان کے لئے قابل قبول نہیں رہتیں۔ جان و مال کا جس قدر بہتر تحفظ ہوگا مسلمان سماجی اصلاحات کو اتنی خوش دلی سے قبول کرتے جائیں گے مگر ایک مسلمان کے کہنے کے مطابق جب گھر کو آگ لگی ہو تو صاحب خانہ گھر کی اندرونی آرائش اور سجاوٹ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

فرض کریں سنگھ پریوار کے موقف کے مطابق مسلمان کٹڑ پنتھی ہیں تو کیا اس وجہ سے ان کا قتل عام کر دیا جائے؟ کیا گجرات کے کشت وخون کا اس بنا پر جواز بنتا ہے؟ اگر سنگھ پریوار واقعی مسلمانوں میں سیکولر تعلیم اور اصلاحات کے فروغ کے بارے میں مخلص ہے تو پھر انہیں اس بات کا پورا اہتمام کرنا چاہیئے کہ مسلمان ہندوستان میں اپنے آپ کو پوری طرح محفوظ محسوس کریں، انہیں ملازمتوں، پیشوں اور بزنس میں حصہ دے کر ان کی معاشی فلاح کے لئے مخلصانہ کوششیں کرنی چاہئیں۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ان مسائل پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنا چاہئے اور جدید تعلیم کے حصول اور فروغ، معاشی فلاح اور لبرل اصلاحات کے لئے مخلصانہ کوشش کرنی چاہئے۔ انہیں مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں سکہ بند خیالات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے سیکولرا ور آزاد خیال ہندوؤں کے ساتھ مکالمہ کو فروغ دینا چاہئے۔ فرقہ وارانہ فسادات ہوں یا نہ ہوں اصلاحات ضروری ہیں۔ اس میں برادری کا فائدہ ہے، فکری اصلاحات اور تبدیلی کے بغیر جدید دنیا میں کوئی بھی برادری باقی نہیں رہ سکتی۔

(30- مئی 2002ء)

MashalBooks.org

مسلم خواتین اور شرعی قوانین

مسلم خواتین کا نان ونفقہ: کچھ نئے فیصلے

گزشتہ صدی کی 80ء کی دہائی میں شاہ بانو کے نام کے تنازع سے کون واقف نہیں ہے؟ اس نے تو پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مدھیہ پردیش کے شہر اندور کی ایک بزرگ خاتون شاہ بانو کو ستر سال کی عمر میں ان کے وکیل شوہر نے طلاق دے دی تھی۔ شاہ بانو نے سی پی او کی دفعہ 125 کے تحت نان نفقہ کے لئے مقدمہ دائر کر دیا۔ اس دفعہ کے تحت طلاق دینے والا شوہر ایسی مطلقہ کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہوتا ہے جو بے سہارا ہے اور زندہ رہنے کے لئے اس کے اپنے وسائل نہیں اور تاوقتیکہ کہ وہ دوسری شادی نہیں کر لیتی یا اس کا انتقال نہیں ہو جاتا۔ شاہ بانو کے خاوند نے طلاق کی مدت کے بعد نان نفقہ دینے سے انکار کر دیا۔ خاوند نے کہا کہ شرعی قانون کے مطابق وہ صرف عدت کی مدت تک نان نفقہ کا خرچ دینے کا پابند ہے مگر اس کے بعد نہیں لیکن اندور کی ہائی کورٹ اور بعد میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ سی پی سی کی دفعہ 125 کے تحت خاوند تاحیات شاہ بانو کو نان نفقہ کا خرچہ دینے کا پابند ہے۔ سپریم کورٹ کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ سی پی سی ہندوستان کے ساری شہریوں پر لاگو ہے اس لئے اس ضمن میں شرعی قانون مؤثر نہیں ہوگا۔

مسلمان لیڈر خصوصاً علماء اس فیصلے پر بہت ناراض ہوئے اور سپریم کورٹ کے فیصلے کی ہر صورت میں ڈٹ کر مخالف کی اور کہا کہ یہ شرعی قانون میں دانستہ مداخلت ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ شرعی قانون خدائی حکم ہے اس میں مداخلت نہیں ہو سکتی۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کے حق میں عبداللہ یوسف علی کے قرآن کے انگریزی ترجمہ سے قرآن کی آیت کا حوالہ دیا۔ سپریم

کورٹ نے یہ بھی کہا کہ سی پی سی کی دفعہ 125 کی تصدیق تو خود یہ مقدس کتاب کرتی ہے، تاہم علماء کا موقف یہی رہا کہ سپریم کورٹ کو قرآن کی تعبیر کرنے کا کوئی حق نہیں۔

یہ تنازع وسیع پیمانے پر پھیل گیا۔ مسلمانوں نے سڑکوں پر آ کر سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ آخر کار راجیو گاندھی کی حکومت نے دباؤ کے تحت ہار مان لی اور قانون میں ترمیم کر کے دفعہ 125 کا مسلم خواتین پر اطلاق ختم کر دیا۔ یہ قانون 1986ء میں بنایا گیا۔ ترقی پسند مسلمانوں اور دوسروں نے کہا کہ یہ قانون (ترمیم) مسلم خواتین کے لئے بڑا نقصان دہ ہے۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ سی پی سی کی دفعہ 125 غیر اسلامی نہیں ہے۔ دفعہ 125 کے مقابلے میں یہ قانون صرف ایک بار ادائیگی کی اجازت دیتا ہے۔ مسلم علماء نے بھی دلیل دی کہ آیت 2:241 میں لفظ متع برتا گیا ہے، اس کے تحت ایک ہی بار ادائیگی روا ہے۔

چنانچہ مسلم ویمن ایکٹ کے تحت سی پی سی کی دفعہ کے مطابق مطلقہ کی شادی یا عدت تک نان ونفقہ دینے کی بجائے ایک ہی بار ادائیگی جائز قرار دی گئی۔ مسلم ویمن ایکٹ کے تحت طلاق دیتے وقت خاوند حق مہر ادا (اگر ادا نہیں کیا گیا) کرے گا اور قرآن کے مطابق عدت کی مدت (تین ماہ) کا نان نفقہ کا خرچہ ادا کرے گا۔ اس طرح مطلقہ مسلم عورت طلاق کے وقت بالمقطع رقم وصول کرے گی۔ اس قانون کے تحت سب سے پہلا فیصلہ لکھنؤ کی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مس ریکھا ڈکشٹ نے دیا اور ایک مطلقہ مسلم خاتون کو 80 ہزار روپے دلوائے ساٹھ ہزار روپے بالمقطع اور باقی رقم حق مہر اور عدت کی مدت کے خرچہ کے طور پر جو رقم دی گئی تھی وہ کوئی ایسا کم بھی نہیں تھی مگر لگتا ہے کہ اس سے مسلم خواتین مطمئن نہیں ہوئیں اور دفعہ 125 کے تحت نئے قانون کے برعکس عدالتوں میں بے شمار مقدمے دائر کئے گئے۔

خواتین کی بہت سی تنظیموں نے مسلم ویمن ایکٹ کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا مگر سپریم کورٹ کو ابھی ان درخواستوں پر کارروائی شروع کرنا ہے۔ دریں اثنا بہت سی ہائی کورٹوں نے نان نفقے کے کئی فیصلے کر دیئے۔ کچھ سال پہلے بمبئی ہائی کورٹ نے مسلم ویمن ایکٹ ہی کے تحت ایک مطلقہ خاتون کو تاحیات نان نفقہ کے خرچہ کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ بمبئی ہائی کورٹ کے جج نے قانون کی یہ تعبیر کی کہ مسلم مطلقہ خاتون کو عدت کی مدت کے دوران اتنی رقم مل جانی چاہئے کہ اس سے تاحیات نان نفقہ چل سکے۔

اسی طرح کا نکتہ ہائی کورٹ نے شکیلہ پروین کی درخواست پر اسے عدت کی مدت کے

MashalBooks.org

درمیان اتنی رقم دلا دی جس کے تحت اس کا تاحیات نان ونفقہ چل سکے۔ فیصلہ جج بسودیو پائی گڑھی نے حیدر علی کے خلاف شکیلہ پروین کی درخواست پر سنایا۔ حیدر علی نے مقدمہ لڑا نہیں اور عدالت سے غیر حاضر رہا لیکن ڈسٹرکٹ جج نے حق مہر کی رقم کے علاوہ اسے آٹھ سو روپے ماہانہ کے حساب سے تین ماہ کے 2500 روپے نان ونفقہ کے ضمن میں دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ 1993ء میں دیا گیا۔ مس پروین اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھی اس نے جونیئر عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کردی۔ جج نے مسلم ویمن ایکٹ کی دفعہ تین کی وسیع تعبیر کرتے ہوئے کہا نان ونفقہ کے خرچ کے علاوہ معتدبہ رقم کی یک مشت ادائیگی اس کی خاوند سے عدت کی مدت کے دوران کرائی جائے۔

جسٹس پائی گڑھی نے کہا کہ سپریم کورٹ نے واضح طور پر سی پی سی کی دفعہ 125 کو شرعی قانون پر مقدم قرار دیا ہے جس کی بنا پر 1986ء میں پارلیمنٹ میں یہ قانون سازی لازمی ہوگئی۔ جج نے کہا مسلم مطلقہ خواتین اپنے مستقبل کی ضرورتوں کے حوالے سے نان ونفقہ کی حق دار ہیں اور یہ نان ونفقہ صرف عدت کی مدت تک محدود نہیں۔ ایکٹ مجریہ 1986ء کی دفعہ 3(1)A میں یہ کہا گیا ہے۔ کہ معتدبہ یک مشت رقم اور اتنا نان ونفقہ کا خرچ دیا جائے تاکہ مطلقہ کو طلاق کے بعد جینے کے معقول وسائل حاصل ہوں وہ محتاج نہ بن جائے اور اسے سڑک پر نہ پھینک دیا جائے۔

بمبئی ہائیکورٹ کے فل بنچ نے اسی قسم کا فیصلہ جولائی 2000ء کو سنایا۔ فل بنچ نے یہ بھی کہا کہ مسلمان خاوند کو اپنی مطلقہ بیوی کی عدت کے دوران اتنی بالمقطع رقم اور نان نفقہ کا خرچ ادا کرنا چاہئے کہ وہ اس کی ساری زندگی کے لئے کافی ہو یا اس وقت تک جب تک وہ شادی نہیں کرتی یا مسلم ویمن ایکٹ 1986ء کی دفعات کے تحت مجاز نہیں رہتی، جیسے ہی عدت کی مدت ختم ہوتی ہے خاوند نان نفقے کی ادائیگی کا پابند نہیں رہتا۔ اس لئے عدالت نے کہا کہ اسے اسی مدت کے دوران اسے اتنی معقول رقم ادا کرنی چاہئے کہ اس کی سابقہ بیوی عدت کے بعد کی مدت بھی باآسانی گزار سکے۔ بنچ نے یہ فیصلہ اس بات پر طویل بحث کے بعد دیا کہ کیا مسلم خاتون عدت کے بعد بھی نان ونفقہ لینے کی مجاز ہے کہ نہیں۔ عدالت کو دفعہ 125 سے لے کر 128 (سی پی سی) کے مؤثر ہونے کی حدود کا بھی تعین کرنا تھا۔ عدالت کے سامنے سوال یہ تھا کہ کیا مسلم خاوند مسلم ویمن ایکٹ کی دفعہ 3 اے کے تحت صرف عدت کی مدت کے دوران معقول یکمشت رقم اور

نان ونفقہ کے خرچ کی ادائیگی کا پابند ہے یا یہ دفعہ عدت کے بعد بھی محیط ہے۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ یکمشت رقم کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت دیگر عوامل کو بھی دیکھنا ہوگا مثلاً شادی شدہ زندگی میں خاتون کا معیار زندگی کیا تھا اور اس کے خاوند کی آمدنی کے وسائل کتنے تھے۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ اگر خاوند کے وسائل ایسے نہیں کہ وہ یکمشت ادائیگی کر سکے تو پھر وہ قسطوں میں ادائیگی کی درخواست کر سکتا ہے اور عدالت اسے اقساط میں ادائیگی کی اجازت دینے پر غور کر سکتی ہے۔

تو اب نظریہ آ رہا ہے کہ تمام عدالتیں مسلم ویمن ایکٹ مجریہ 1986ء کی دفعہ 3 اے کی تعبیر میں مسلم مطلقہ خاتون کو نان نفقے کے خرچ کی ادائیگی کا فائدہ عدت کے بعد بھی پہنچا رہی ہیں اور یہی سی پی سی کی دفعہ 125 کی منشا ہے۔ اب دفعہ 125 کے تحت نان نفقہ ماہانہ بنیادوں پر دینے کی بجائے مسلم ویمن ایکٹ مجریہ 1986ء تحت خاوند کو عدت کی مدت کے اندر یکمشت رقم ادا کرنا ہوگی جو عدت کی مدت گزر جانے کے بعد بھی مفید ہو۔ مسلمان علمائے دین شاہ بانو کیس کی تحریک کے دوران بھی اصرار کر رہے تھے کہ قرآن کی آیت 2:241 کے تحت مطلقہ بیک وقت ایک رقم کی مستحق ہے، تاہم رسول کریمؐ کے بعض صحابہ نے اس آیت کی مختلف تعبیریں کی ہیں۔ عبداللہ بن عباس کا مؤقف ہے کہ متع علامتی نہیں معقول ہونا چاہئے۔

اس تعبیر کی روشنی میں کلکتہ اور بمبئی ہائی کورٹوں کے فیصلے بڑی حد تک قرآن کی اس آیت کی روح کے مطابق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے ایسے قوانین کے مقابلے میں یہ قرآن ہی تھا جس نے اتنا عرصہ پہلے مطلقہ کے لئے یہ گنجائش رکھی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ شاہ بانو والی تحریک کے علمائے کرام اس تعبیر کو زیادہ سامنے نہیں لائے بلکہ انہوں نے یہ تاثر دیا گویا وہ عورتوں کے جائز حقوق کے خلاف ہیں۔ شاہ بانو کی تحریک کو دراصل اس پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے کہ جس طرح آج کل عیسائیوں کو اپنے تحفظ کے لالے پڑے ہوئے ہیں، اسی طرح ان دنوں مسلمانوں کو اپنی جان و مال کا شدید خطرہ لاحق تھا، اس عرصے میں بڑے بڑے فسادات ہوئے تھے جن میں سینکڑوں لوگ مارے گئے تھے۔ شاہ بانو تحریک کو بھی اس قدر پذیرائی اس لئے ملی تھی کہ مسلمانوں میں عدم تحفظ کا شدید قسم کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ آج ملک کی دو بڑی ہائی کورٹوں کی طرف سے ان مثالی منصوبوں کے باوجود مسلمان لیڈروں کی طرف سے کوئی احتجاج نظر نہیں آ رہا۔ اگر 1986ء میں مسلمانوں میں بڑے بڑے فسادات کے بعد عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا

MashalBooks.org

نہ ہوتا تو سپریم کورٹ کے فیصلے پر آج ایسا احتجاج نہیں ہونا تھا۔ شاہ بانو تحریک دراصل اس وقت ملک کی سیاسی صورتحال کا ایک ردعمل تھا۔

مسلم خواتین میں ایم ڈبلیو اے مجریہ 1986ء کے باعث یہ خوف پیدا ہوا تھا کہ عدت کی مدت گزرنے کے بعد ان کے نان نفقے کا حق سلب کر لیا گیا ہے۔ مگر عدالتوں کے ان فیصلوں سے انہیں غیر متوقع فائدہ ہوا ہے۔ مسلم لیڈر بھی اب اس قسم کا احتجاج کرتے نظر نہیں آتے جیسا احتجاج انہوں نے 80 کی دہائی کے نصف میں سپریم کورٹ کے فیصلے پر کیا تھا۔ اب مسلمان ٹکراؤ کی ذہنی کیفیت میں نہیں ہیں۔ اب وہ ایسے جذباتی مسائل پر وقت ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں جو انہیں کہیں بھی نہیں پہنچاتے ان کی جگہ وہ بنیادی معاشی اور تعلیمی ضرورتوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ مسلمان خواتین میں بھی اپنے حقوق کے بارے میں آگہی بڑھی ہے۔ اس لئے اب مسلم لیڈر ان فیصلوں کے خلاف اگر احتجاج کریں گے بھی تو کامیاب نہیں ہوں گے۔ اس لئے کہ ان فیصلوں کے لئے مسلمان عورتوں نے ہی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

(31- جولائی 2000ء)

ایران میں خواتین اور شرعی قانون

ایرانی عورتوں نے شروع سے ہی ایرانی انقلاب میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ایران سے پہلے شاہ نے جدید سیکولر قسم کی اصلاحات نافذ کی تھیں نقاب کو متروک قرار دیا تھا اور مغربی لباس پہنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، مگر عورتوں کو نہ تو سیاست میں حصہ لینے کی آزادی تھی نہ وہ سیاسی عہدے پر منتخب ہو سکتی تھیں اس لئے یہ اصلاحات بناوٹی سی لگتی تھیں۔ عورتوں کو کسی بھی شکل میں سیاسی آزادیاں حاصل نہ تھیں یعنی یہ خواتین کی صحیح آزادی کی بجائے صرف مغرب کی نقالی والی بات تھی۔

عورتیں شاہ ایران کے عہد میں بھی گھٹن محسوس کر رہی تھیں۔ اس لئے ستر کی دہائی کے آخر میں وہ بڑے زور وشور سے اسلامی انقلابی تحریک میں شامل ہو گئیں۔ انہوں نے آزادانہ طور پر بغیر کسی دباؤ کے منی سکرٹ کی جگہ چادر اوڑھ لی۔ چادر اوڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شاہ ایران انقلابیوں پر کمیونسٹ ایجنٹ ہونے کا الزام لگا رہے تھے چنانچہ خواتین نے اس طرح (چادر اوڑھ کر) اپنے اسلامی کردار کی شناخت کرائی۔ آیت اللہ خمینی نے بھی خواتین سے وعدہ

کیا تھا کہ انقلاب کے بعد عورتوں کو سیاسی، ثقافتی اور سماجی آزادی دی جائے گی۔

لیکن امام خمینی نے وعدہ پورا نہیں کیا بلکہ ان خواتین پر مزید پابندیاں لگا دی گئیں جس سے عورتوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ چونکہ ان خواتین نے انقلاب لانے میں فعال کردار ادا کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد جاری رکھی۔ انقلاب سے پہلے ایران میں متعدد روزنامے اور رسائل چھپا کرتے تھے۔ ایران میں خواتین کے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے کے دن تو یہی تھے۔ ایک کارکن خاتون افسانہ نجم آبادی نے انقلاب کے بعد کے زمانے کو مشکلات کے دن نمو کے دن کہا۔

خواتین سے متعلق مسائل تیسری دنیا خصوصاً مسلم معاشروں میں بہت ہی حساس اور نازک شمار کئے گئے ہیں۔ خواتین کے ایک ''رسالہ زن روز'' (آج کی عورت) کے اڈیٹوریل میں کہا گیا کہ سامراج پوری طرح آگاہ تھا کہ فرد اور انسانی معاشرہ کی تشکیل و تہذیب میں عورت کا کردار کتنا نازک اور اہم ہوتا ہے۔ وہ مختلف اقوام کو غلام بنانے کے لئے بہترین وسیلہ عورت کو سمجھتا تھا۔ عورتیں غیر شعوری طور پر برسر اقتدار طاقتوں کی ایجنٹ بن کر مقامی ثقافت کو تباہ کرتی ہیں اور اس طرح سامراج کے مقاصد کی بھی تکمیل کرتی ہیں۔

اس اڈیٹوریل میں نتیجہ یہ نکالا گیا کہ ایران کے اسلامی انقلاب کی عظمت اور گہرائی کا صحت مند اثر عالم نسواں پر بھی پڑنا چاہئے اور یہ کہ اسلامی سیاسی عمل کو اس طرح تبدیل کیا جائے کہ جس طبقہ کو پہلے ایک طرف کر دیا گیا تھا یا اسے ثانوی حیثیت دی گئی تھی یا اسے مؤخر کر دیا گیا تھا یا اسے غیر قانونی یا غیر اخلاقی قرار دیا گیا تھا اب وہ پوزیشن حاصل کر لی جو مرکزی اور لازمی ہے، فوری اور مستند، مگر مستند کیا ہے یہ معاملہ ابھی تصفیہ طلب ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مغرب میں رائج طریقہ کے برعکس یہاں عورت کے کردار کو محدود کر دیا جائے؟ اکثر مسلم ممالک میں عورتوں کا یہی کردار مستند سمجھا جاتا ہے، اس کی بہترین مثال افغانستان ہے۔ ایران کے قدامت پسند علماء کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا مگر اسے پوری طرح مانا نہیں گیا اور اس کا مقابلہ کیا گیا۔ افغانستان جیسے ملکوں میں دراصل عورتوں کی کوئی آواز ہی نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ افغانستان کی قبائلی سوسائٹی میں عورتوں نے اسلامی انقلاب لانے میں کوئی کردار ادا ہی نہیں کیا۔

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے ایران میں معاملہ ایسا نہ تھا۔ ایران کے انقلاب میں

MashalBooks.org

عورتوں نے بہت جاندار کردار ادا کیا تھا۔اس لئے انقلاب ایران کے بعد عالم نسواں کے حقوق وغیرہ کے حصول کے لئے جدوجہد کی خاطر سیکولر راستوں سمیت بہت سے راستے کھل گئے۔ اب اسلام' انقلاب اور نسائیت کی نئی وضع قطع ابھر رہی ہے۔ایران میں قدامت پسند مذہبی قیادت کے لئے خواتین کے مطالبات کو نظر انداز کرنا بہت ہی مشکل ہے۔حال ہی میں وہاں تحریک خواتین کو دبانے کی اور کوششیں ہوئی ہیں۔ایران میں اصلاحات کی ایک تحریک بھی چل رہی ہے جو مقبول بھی ہو رہی ہے مگر مذہبی قیادت اسے دبانے کے لئے پورا زور لگا رہی ہے' بالکل اسی طرح خواتین کی تحریک کو بھی مشکل درپیش ہے مگر تحریک کو دبانا اب مذہبی قیادت کے بس کی بات نہیں۔ بہر طور ایران میں شروع سے ہی عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ ان سے دھوکا کیا گیا ہے لیکن انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا' اپنی جدوجہد جاری رکھی اور اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

عورتوں کی طرف سے مزاحمت اور سرتابی کی مثالیں دیتے ہوئے افسانہ نجم آبادی نے بھی کہا ہے کہ ان اعمال کو ردِ انقلاب قرار دیا گیا۔یہ وہ لیبل ہے جس سے یہ عورتیں آسانی سے دبائی گئیں صرف یہی نہیں انقلاب میں حصہ لینے والی عورتوں کو چپ کرا دیا گیا اور حالات کے اس غیر متوقع گردش کے باعث خود انہیں بھی چپ لگ گئی۔فعال مسلم خواتین نے اس اسلامی تحریک کی سیاسی سطح پر حمایت کی اور خود اس کے لئے سرمیدان کئی سرگرمیوں کو منظّم کیا جس نے پرانی حکومت کا تختہ الٹا دیا تھا۔ان میں سے بہت سی خواتین علی شریعتی کے اسلام میں خواتین کی حیثیت کے بارے میں تحریروں سے بہت متاثر تھیں' علی شریعتی نے اسلامی معاشرہ پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا' ان کا زیادہ گہرا اثر یونیورسٹی کی طالبات اور طالب علموں پر تھا اور یہی نوجوان ایران میں اسلامی انقلاب لانے میں بڑے مددگار ثابت ہوئے۔

مگر انقلاب کے بعد کی حکومت نے عورتوں سے بیزاری (زن بیزاری) کی پالیسیاں بنائیں اور انہیں مؤثر بنانے کے لئے اہم اقدامات کئے۔عورتوں کے حقوق کی ایک فعال کارکن مہرانگیز کار نے کہا ایرانی خواتین بہت مشکل امتحانات میں سے گزری ہیں۔گزشتہ دہائی میں انہوں نے ایسی مشکلات کا سامنا کیا جوان کی انفرادی اور سماجی زندگی میں اپنی مثال آپ رہے' مگر عورتیں اس امتحان میں کامیاب ہوگئیں۔انہیں تشہیر کی کوئی امداد حاصل نہ تھی' وہ ایک طرح سے حاشیے سے میدان میں داخل ہوئیں اور عین مرکز میں آ گئیں اور معاشرے میں بھی

MashalBooks.org

انہوں نے اہم مقام حاصل کرلیا ہے۔انہوں نے فرض نبھایا ہے' ذمہ داریاں پوری کی ہیں اور اب وہ اپنے حقوق کی بھیک نہیں مانگتیں بلکہ مطالبہ کرتی ہیں۔

مگر یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان تمام مشکلات کے باوجود ایران کی عورتوں کی حالت بہت سے دوسرے عرب ممالک کی خواتین کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ ایرانی عورتوں نے صرف اپنی جدوجہد کے طفیل معاشرے میں وہ مقام حاصل کرلیا ہے جو دوسرے بہت سے مسلمان ممالک کی خواتین کے لئے قابل رشک بن گیا ہے۔کویت میں خواتین ابھی اپنے ووٹ کے حق کے لئے لڑ رہی ہیں جبکہ ایران میں نہ صرف انہوں نے ووٹ کا حق حاصل کرلیا ہے بلکہ وہ پارلیمنٹ اور ملک کے نائب صدر سمیت انتخابی عہدوں کے لئے الیکشن بھی لڑسکتی ہیں۔

جہاں تک روایتی یا شرعی قوانین کا تعلق ہے۔خواتین نے اپنے لئے دوسری بہت سی مراعات حاصل کرلیں۔آج ایران میں اگر کسی عورت کو بلاقصور طلاق ملے یا خاوند کی بدکرداری کی وجہ سے طلاق ہو تو مطلقہ کو اپنے خاوند سے وہ نصف جائیداد یا اس کے برابر معاوضہ لینے کا حق ہے جو شادی شدہ عرصہ میں بنائی گئی۔دنیا کے کسی دوسرے ملک میں ایسا قانون نہیں بنایا گیا کہ شادی کے موقع پر خاوند بیوی کو مکان بھی دے۔سادات کے زمانے میں اس کی بیوی جہان سادات کے اصرار پر مصر میں ایسا قانون بنایا گیا تھا مگر سادات کے قتل کے بعد الازہر کے قدامت پسند علماء کے دباؤ پر یہ قانون ختم ہوا۔مصر دوسرا اسلامی ملک ہے جس میں عورتوں کے حقوق کی بہتر حفاظت کی گئی ہے۔

ایرانی عورتوں نے ایک اور حق حاصل کرلیا ہے اور وہ ہے مندرجہ ذیل وجوہ کے باعث طلاق کا حق۔

1- اگر خاوند مسلسل چھ ماہ تک بیوی کو نان نفقہ نہ فراہم کرے اور آئندہ بھی اس کی فراہمی ممکن نظر نہ آتی ہو اور اس طور وہ ازدواجی فرائض ادا کرنے کے اہل نہ ہو اور بیوی کے حقوق نہ ادا کرسکتا ہو۔

2- بیوی کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہو اور بیوی کے لئے یہ بدسلوکی نا قابل برداشت ہو تو وہ طلاق لے سکتی ہے

3- اگر خاوند شراب یا دوسری منشیات کا عادی ہے

4- اگر خاوند بغیر کسی معقول وجہ سے مسلسل چھ ماہ سے زائد عرصہ تک بیوی یا گھریلو زندگی کو نظر انداز کرے تو اور

5- اگر پہلی بیوی سے اجازت لئے بغیر دوسری عورت سے شادی کرلے یا پہلی بیوی کے بارے میں رویہ منصفانہ نہ ہو تو

جہاں تک روایتی شرعی قانون کا تعلق ہے اس حوالے سے یہ مراعات یا حقوق دور رس نتائج کے حامل ہیں اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے بہت سے مسلم ممالک کی خواتین کو یہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔ دوسرے مسلمان ملکوں کے حالات کے مدنظر یہ بہت بڑی پیش قدمی ہے اور مزید کہ اگر ایران میں یہ ثابت ہو جائے کہ طلاق کا سبب بیوی کی کوئی حرکت نہیں تو پھر مطلقہ ایرانی عورت گھر داری کے لئے اس تمام عرصے کا معاوضہ طلب کرسکتی ہے جتنے عرصے وہ طلاق دینے والے کی بیوی رہی ہے۔ یہ قانون میں بڑا انقلابی اضافہ ہے۔

ان قانونی دفعات کے سبب ایران میں مردوں کے بعض حقوق اور مراعات محدود ہو جاتی ہیں جو کہ دوسرے مسلم ممالک کے مردوں کو حاصل ہیں ان حقوق کا مطالبہ بہت سے ممالک جن میں یورپی ممالک بھی شامل ہیں خواتین کر رہی ہیں یہ ایران میں ہی ممکن ہو سکتا تھا کیونکہ ساری کی ساری ایرانی قوم ایک تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے لوگ اپنے اپنے حقوق کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں اور یہ جدوجہد ہی لوگوں کو اپنے حقوق کے بارے میں باشعور بناتی ہے

ایران میں خواتین کا پریس (اخبارات، رسالے) بھی خاصا مضبوط ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے عورتوں کی تنظیموں کی طرف سے متعدد رسالے چھپتے ہیں افسانہ نجم آبادی نے کہا:

''مسلمان خواتین میں ابتدائی زمانے کی سرگرمیوں سے ہی یہ شعور پیدا ہوا کہ اسلام میں عورتوں کے حقوق زیادہ واضح اور مضبوط ہیں آج ایران میں عورتوں کی بہت سی تنظیمیں اور رسائل و جرائد ہیں جیسے ندا اور نیم سرکاری رسالہ زنان۔ یہ رسائل ایران میں عورتوں کو شعور دینے میں بہت زیادہ مؤثر ثابت ہو رہے ہیں۔

یہ قلب ماہیت پر اصرار ایران میں ممکن ہے کیونکہ وہاں خواتین میں شرح خواندگی کافی ہے انقلاب کے بعد عورتوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی گئی ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عورتوں کے معیشت میں تبدیلی لانے کیلئے عورتوں کی تعلیم اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خواندگی کی

شرح میں اضافہ سے عورتوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی سوجھ بوجھ بھی بڑھتی ہے۔ انقلابی حکومت کی یہ بہت بڑی دین تھی کہ اس نے عورتوں کی خواندگی پر توجہ دی اور ایران میں عورتوں کی حیثیت میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا ایک سبب یہی خواندگی کا اضافہ ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ ایرانی عورتوں نے اپنے حقوق کیلئے جدوجہد جاری رکھی۔ یہ بھی دراصل مرہون منت ہے خواتین کے اس کردار کا جو انہوں نے انقلاب لانے میں ادا کیا۔ تاہم ابھی ایران میں عورتوں کو حقوق اور حیثیت کے لحاظ سے مرد کے ساتھ برابری کیلئے لمبا سفر کرنا ہے۔ اپنی مسلسل جدوجہد اور شعور میں اضافہ کے سبب ہی یہ مقصد بھی حاصل کر لیں گی۔

(15 ستمبر 2000ء)

عورتوں کے حقوق اور مذہبی قانون کا بورڈ

دوسری خواتین کی طرح مسلم خواتین بھی اپنے حقوق کے بارے میں باخبر ہو رہی ہیں اور ان کے حصول کیلئے اصرار کر رہی ہیں۔ (ہندوستان میں) عام عورتیں خصوصاً مسلمان عورتیں اس لیے مصائب کا شکار ہیں کہ پدرسری معاشرہ انہیں حقوق دینے سے انکاری ہے۔ جتنی زیادہ ناخواندگی ہوگی' اتنی ہی زیادہ بے شعوری۔ اس لیے اسی حساب سے مشکلات اور مصائب بڑھیں گے۔ ہندوستان میں چونکہ مسلمان عورتوں میں ناخواندگی کی شرح بہت زیادہ ہے اس لیے وہ اس حوالے سے بھی اپنے حقوق سے بالکل بے خبر ہیں حالانکہ اسلامی قوانین کے بارے میں ہم نے مسلسل یہ لکھا ہے کہ اسلام مرد وزن میں برابری کا قائل ہے اس لیے اس نے عورت اور مرد کو شادی طلاق جائیداد کی ملکیت وغیرہ میں برابر کے حقوق دیئے ہیں لیکن اسلام کے چھوٹے سے ابتدائی دور کے سوا عورتوں کو کبھی بھی حقوق کی برابری سے متمتع نہیں ہونے دیا گیا۔ علماء اسلام کے ساتھ بڑے مخلص ہوں گے مگر وہ اپنے اپنے دور کی پیداوار تھے اور اپنے نقطۂ نظر سے قرآنی احکامات کی تعبیر کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے عہد کے غالب رویے کے تابع بھی رہے اور عورتوں کے بارے میں مردوں کے اس وقت کے رویے کو بالکل جائز سمجھتے رہے۔

قرون وسطیٰ میں عورتوں کے بارے میں ایک مفروضہ تھا کہ وہ ذہنی یا دماغی طور پر کمزور ہوتی ہیں اس لیے انہیں ذمہ داری کا کوئی کام نہیں سونپنا چاہئے۔ یہ صورتحال بیسویں صدی کے وسط تک رہی۔ جب ایک اپنے رنگ کے جید عالم مولانا اشرف علی تھانوی نے کہا کہ چونکہ

MashalBooks.org

عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں اس لیے انہیں طلاق دینے کا بھی حق حاصل نہیں، یا یہ حق انہیں دیا نہیں جا سکتا۔ حال ہی میں مصر کے صدر حسنی مبارک نے مصری پارلیمنٹ سے قانون منظور کروایا جس کے تحت عورتوں کو خاوندوں کو طلاق و خلع دینے کا اختیار دے دیا گیا۔ مصر کے علماء نے اس زور و شور سے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ عورتیں فیصلہ سازی میں جذبات اور عجلت سے کام لیتی ہیں اور اگر عورتوں کو طلاق کی اجازت دی گئی تو گھریلو زندگی تتر بتر ہو جائے گی۔ علماء کی طرف سے اتنی شدید مخالفت تھی کہ حسنی مبارک کو اس ضمن میں مزید جو کچھ کرنا تھا وہ ترک کر دیا۔

قرآن نے بہت سے اور حقوق بھی خواتین کو دیئے ہیں مگر کچھ مفروضوں کے باعث مسلم عورتوں کو ان سے محروم رکھا گیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں دیتا۔ یہ تمام انسانیت' مرد و زن' سے مخاطب ہوتا ہے اور یہ کہہ کے کہ آپ اہل علم ہیں۔ اور اس بارے میں عورت اور مرد کی تفریق نہیں کرتا۔ ہاں اپنے طور پر فرائض کی ادائیگی کے ضمن میں عورت اور مرد کی تفریق کرتا ہے مگر جہاں تک حقوق کا تعلق ہے وہ کوئی فرق روا نہیں رکھتا اور اگرچہ قرآن میں کہیں ذکر نہیں کہ عورت کا فرض ہے کہ وہ خاوند اور بچوں کا خیال رکھے اور باقی گھر داری بھی کرے مگر اسلام کے حوالے سے جس قدر قانونی لٹریچر وجود میں آیا ہے اس میں صرف اور صرف اس پر زیادہ زور ہے۔ یہ فیصلہ یا مفروضے قرآن سے نہیں موجود سماجی حالات کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے شرعی قوانین بھی بہت سے ایسے ہی مفروضات پر مبنی ہیں اوپر مولانا اشرف علی تھانوی کی مثال دی گئی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ عورتیں ناقص العقل ہیں۔ عورتوں کے اصل مسائل اسی قسم کے مفروضے ہیں۔ حیرت والی بات یہ ہے کہ علماء کے مفروضوں کے برعکس اسلامی شواہد کی موجودگی کے باوجود' ان مفروضوں کو مذہبی تقدس کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور نہ ان میں تبدیلی یا تنسیخ کی گنجائش ہوتی ہے یعنی انہیں مذہبی قوانین کی حیثیت مل جاتی ہے۔ اگر ایک عورت اللہ کی حدود کی پاسداری نہیں کر سکتی تو وہ فدیہ (معاوضہ) ادا کر کے طلاق (علیحدگی) لینے کی حق دار ہے۔ مگر علماء نے اسے بھی خاوند کی مرضی کا پابند کر دیا کیونکہ ان کے نزدیک عورت عجلت میں فیصلہ کر کے خاندانی زندگی کو زیر و زبر کر دے گی۔

آج مسلم عورتیں اپنے یہ قرآن کے دیئے ہوئے حقوق مانگتی ہیں وہ قرآن کی قرون

وسطیٰ کی تعبیروں اور تفسیروں سے خود کو آزاد کرنا چاہتی ہیں مگر مسلم خواتین کے ان مطالبات کی مخالفت شرعی قوانین کا بورڈ ہی کر رہا ہے۔قرآن کے دیئے حقوق سے آگاہ کچھ خواتین نے ان حقوق کی روشنی میں نکاح نامہ کا مسودہ تیار کر کے بورڈ کو دیا۔اسلام میں شادی ایک معاہدہ ہے اس لیے معاہدے کا ایک معیاری مسودہ بھی ہونا لازم ہے اس میں سبھی شرائط وغیرہ شامل ہونی چاہئیں اور شادی کے موقع پر اس پر دستخط کیے جائیں۔شادی سے پہلے ایک عورت کو اپنی شرائط پیش کرنے یا منوانے کا اتنا ہی حق ہے جس قدر ایک مرد کو۔اس طرح ایک عورت یہ شرط لگا سکتی ہے کہ شوہر دوسری شادی نہیں کرے گا۔یا یہ کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرتا ہے۔یہ اور اس قسم کی شرائط اگر ایک معیاری نکاح نامہ میں شامل کر لی جائیں اور کچھ خواتین اور مردوں نے بھی یہی کہا ہے تو پھر شرعی قوانین میں کوئی خاص تبدیلی کیے بغیر وہ مسائل حل ہو سکتے ہیں جو آج کل مسلم خواتین کو درپیش ہیں۔

یہ نکاح نامہ اسلامی قوانین کے عین مطابق ہے اور مولانا اشرف علی تھانوی ایسے علماء نے اسی قسم کا نکاح نامہ بیسویں صدی کی تیس کی دہائی میں تیار کیا تھا مگر مسلم پرنسپل لاء بورڈ والے اس مسودے کو دبا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔یہ مسودہ ایک سال قبل بورڈ کو بھیجا گیا تھا مگر اس سے پہلے بہت سے علماء کو ان کی منظوری کیلئے بھی بھجوایا گیا تھا اور ان علماء نے اسے منظور کر دیا تھا۔اس میں ایسی کوئی شق نہیں جسے غیر اسلامی سمجھا جائے اس کے باوجود بورڈ کے ارکان اس کی منظوری روکے بیٹھے ہیں۔

گزشتہ دنوں خبر تھی کہ بورڈ اکتوبر میں بنگلور میں ہونے والے اجلاس میں اس نکاح نامہ پر غور کرے گا، بعض ذرائع کے مطابق بورڈ کے ارکان میں نکاح نامہ کے مسودے پر اختلافات ہیں۔یہ بھی پتہ چلا تھا کہ بورڈ نے خود ایک نکاح نامہ تیار کیا ہے جو ممبئی کی مسلم خواتین کی طرف سے پیش کیے گئے نکاح نامہ کے مقابلے میں ذرا نرم ہے۔بورڈ نے پانچ ارکان پر مشتمل ایک پینل بنایا جسے یہ مسودہ تیار کرنا تھا۔بورڈ کے ایک ترجمان نے کہا ہے کہ جب یہ معیاری نکاح نامہ لاگو ہو جائے گا اس کے بعد محض تین بار طلاق کہنے سے طلاق نہیں ہوگی اور یہی معاملہ ہے جس کی وجہ سے مسلم خواتین کو اب تک بڑے مسائل درپیش رہے ہیں۔اگر ایک ہی بار تین بار طلاق کہنے والی روایت منسوخ ہو جاتی ہے تو اس سے مسلمان خواتین کو سکھ کا سانس ملے گا۔طلاق کی اس صورت کے بارے میں تمام علماء کا خیال ہے کہ یہ دراصل اصل طلاق کی بگڑی

ہوئی شکل ہے اور خود رسول اکرمؐ نے اس کی مذمت کی مگر ہندوستان میں اب بھی یہی صورت رائج ہے جبکہ دوسرے مسلمان ممالک میں اسے منسوخ کیا جا چکا ہے۔

بتایا گیا ہے کہ بورڈ جس نکاح نامے پر غور کر رہا ہے اس میں طلاق کو مشروط کر دیا گیا ہے اس کے ذریعے بیوی کو خلع کا (طلاق لینے کا) کا حق بھی دیا گیا ہے۔ غالباً اس نکاح نامے کے ذریعے تعداد ازدواج کو بھی ترک کیا گیا ہے۔ تین مرتبہ طلاق والے مسئلے کی طرح تعداد ازدواج والے معاملے سے بھی مسلم خواتین کیلئے بڑے مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن نے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت غیر معمولی حالات میں یا استثنائی صورت میں دی ہے مگر عملاً ان شرائط کو توڑ دیا جاتا ہے۔ بورڈ کو یہ معاملہ بھی اسی صورت طے کرنا چاہئے جس طرح پاکستان سمیت دوسرے ممالک میں لے کیا گیا ہے۔

تین مرتبہ طلاق کی تنسیخ اور تعدد ازدواج کے معالات طے ہو گئے تو پھر مسلم خواتین کو کورٹ کچہری میں کم جانا پڑے گا موجودہ مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ اسلام میں خواتین کے بارے میں دوسرے احکامات بڑے نرم ہیں اور عورت کیلئے پریشانی کا باعث نہیں بنتے۔ تین بار طلاق والے ضابطے پر بھی سارے عالم اسلام میں تو عمل نہیں ہو رہا۔ شیعہ مسلمان تو اس کو مانتے ہی نہیں اور سنی مسلمانوں میں سے اہل حدیث اسے رد کرتے ہیں مگر شیعہ اور اہل حدیث اقلیت میں ہیں اس لیے مسلمان عورتوں کی بھاری اکثریت کو پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔

اگر بورڈ خواہ اپنا ہی مرتب کردہ نکاح نامہ منظور کرے تو یہ عمل بہت بڑی تبدیلی کے مترادف ہوگا۔ بورڈ کے موجودہ صدر مولانا مجاہد القاسمی نسبتاً کشادہ نظر ہیں اور نئے نکاح نامہ کی منظوری کے حق میں ہیں وہ فقہ اکیڈمی سے بھی وابستہ ہیں جو نئے نئے مسائل پیدا ہونے کے باعث فقہ میں تبدیلیاں تجویز کرتی ہے۔ فقیہہ اکیڈمی نے اشطرات فی النکاح (شادی کی شرائط) کے عنوان سے ایک کتاب چھاپی ہے۔ اس کتاب میں شادی کے وقت عورت اور مرد کی طرف سے پیش کی جانے والی شرائط کا بھی تفصیل سے تجویز کیا ہے اور ہندوستان میں مختلف مکتب فکر کے بہت سے علماء نے اس کی منظوری بھی دے دی ہے۔

یوں یہ خبر اچھی ہے کہ بورڈ نے معیاری نکاح نامہ کو حتمی منظوری دینے کا فیصلہ بنگلور کے اجلاس میں تقریباً کر ہی لیا ہے۔ اگر یہ حتمی طور پر منظور ہو جاتا ہے تو پھر ہندوستان میں مسلمانوں کے شرعی قوانین میں تبدیلی کی طرف یہ پہلا قدم ہوگا بعض کو چھوڑ کر اکثر مسلم ممالک

نے خواتین کے حق میں کچھ اصلاحات کی ہیں۔حق تو یہ تھا کہ سیکولر ہندوستان سب سے پہلے ادھر پیش قدمی کرتا۔ بہرطور اگرچہ تاخیر سے ہی سہی مگر اب معاملات آگے بڑھ رہے ہیں اور مسلم خواتین کی حالت کے بارے میں جن کو تشویش لگی رہتی تھی انہیں ان تبدیلیوں کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔

(31-اکتوبر2000ء)

مسلم خواتین اور بنگلہ دیش میں دُوررس تبدیلیاں

بنگال کی مسلم خواتین بھی مردانہ غلبے والے معاشرے میں دوسروں کی طرح مصائب کا شکار تھیں اور زندگی میں انہیں کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش ایک زمانے میں ہندوستان کا حصہ تھے اور وہاں بھی عورتوں کا معاملہ کوئی مختلف نہ تھا۔وہاں کی عورتیں بھی ہندوستان کی عورتوں کی طرح حقوق سے محروم تھیں مگر وہاں 1961ء میں خواتین تنظیموں کے شدید دباؤ کے تحت ایوب خان کے زمانے میں مسلم شرعی قوانین میں کچھ تبدیلیاں کر دی گئیں۔ تین بار طلاق کہنے کا اصول منسوخ کر دیا گیا اور قرآن کے تصور کے مطابق مصالحت کے ذریعے معاملہ طے کرنے کا طریقہ رائج کر دیا گیا۔ یہ طریقہ قرآن کی آیت 4:35 میں بیان کیا گیا ہے اور عورتوں کے لیے منصفانہ ہے کہ اس طرح عورت کو طلاق کے معاملات طے کرانے کے لیے اپنا نمائندہ مقرر کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ تعدد ازدواج کے سلسلے میں ایوب خاں نے 1961ء میں مسلم فیملی آرڈیننس نافذ کر دیا جس کے تحت مرد کو پابند کر دیا گیا کہ وہ دوسری شادی کرنے سے پہلے پہلی بیوی سے اجازت لے اور عدالت کو بھی مطمئن کرے کہ وہ کیوں دوسری شادی کر رہا ہے۔ پاکستان کی مسلم خواتین کے لیے یہ بڑے اطمینان کی بات تھی اس زمانے میں بنگلہ دیش پاکستان کا حصہ تھا اس سے الگ نہیں ہوا تھا۔

علیحدگی کے بعد بنگلہ دیش میں ترمیم شدہ قانون نافذ رہا اور تو اور جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں نظام کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی شدید لہر میں قدامت پسندوں کے شدید دباؤ کے باوجود شرعی قوانین میں یہ ترامیم واپس نہ کی جا سکیں اور اب دونوں ملکوں (پاکستان اور بنگلہ دیش) میں مؤثر ہیں۔

بنگلہ دیش کا معاملہ بڑا دلچسپ ہے مگر بعض وجوہ کی بناء پر یہاں اس کی تفصیل بیان نہیں

کی جا سکتی۔ بنگلہ دیش میں تضادات ہی تضادات ہیں، وہاں بیک وقت مضبوط سیکولر اور ترقی پسندانہ رجحانات کے ساتھ ساتھ کٹر قدامت پسندانہ افکار بھی ہیں، دونوں اپنی اپنی جگہ مضبوط ہیں۔ بنگلہ دیش کا کلچر قدامت پسندی کے لیے حوصلہ افزا نہیں لیکن ایک طرف نیم خواندہ امام صاحبان دوسری طرف نظریاتی جماعت اسلامی قدامت پسندی کے ترجمان ہیں۔ سیکولر اور لبرل عناصر قدامت پسندی کے مقابلہ میں موجود نہیں، کچھ ماہ پہلے ڈھاکہ ہائیکورٹ نے تین مرتبہ طلاق کہنے کے خلاف فیصلہ دیا ہے اور یہ بھی کہا کہ جو کوئی امام تین بار طلاق کہنے کے بعد طلاق کے حق میں فتویٰ دے گا، سزا کا مستحق ہوگا یعنی اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا جائے گا۔

عدالت کے اس فیصلے کے باعث قدامت پسند حلقوں میں بڑا شور ہوا اور جماعت اسلامی اور دوسرے قدامت پسند عناصر نے عام ہڑتال کے کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر سیکولر اور ترقی پسندوں اور قدامت پسندوں کے مابین تصادم میں کئی جانیں ضائع ہوئیں۔ 1999ء میں ڈھاکہ ہائیکورٹ نے فیصلہ دیا تھا کہ مطلقہ تاحیات یا دوسری شادی کرنے تک نان نفقہ کی مستحق ہے اور یہ فیصلہ بھی قرآن کی آیت 2:241 کی تعبیر اور تفسیر پر مبنی تھا۔ ججوں کا دلچسپ نکتہ یہ تھا کہ نان نفقہ مخصوص ہے، ایک مطلقہ کے ساتھ اس لیے جب تک وہ مطلقہ ہے اس وقت تک وہ نان نفقہ کی حق دار ہے مگر یہ ترقی پسندانہ فیصلہ بدقسمتی سے بنگلہ دیش کی سپریم کورٹ نے مسترد کر دیا۔

گویا بنگلہ دیش میں ترقی پسند اور قدامت پسند طاقتیں بڑے زور و شور سے آمنے سامنے ڈٹی ہوئی ہیں، وہاں سیکولر عناصر مسلم پرسنل لا میں مزید تبدیلیوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جس طرح ہندوستان میں مسلم اقلیت اپنے مذہبی قوانین میں تبدیلی کی مخالف ہے اسی طرح بنگلہ دیش میں ہندو اقلیت بھی قوانین میں ترمیم کی مخالفت کر رہی ہے۔ بنگلہ دیش میں ہندو عورتوں پر اب بھی صدیوں پرانی روایات اور قانون کی حکمرانی ہے۔

اب بنگلہ دیش کی حکومت نے مزید ایک قانون کا مسودہ تیار کیا ہے جو خواتین کے لیے مسلم فیملی آرڈیننس 61 سے بھی زیادہ سودمند ہے اس مسودے کو حزب مخالف کی خالدہ ضیا جیسے لیڈروں نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ خالدہ ضیا کا اتحاد قدامت پسند جماعت اسلامی سے ہے تاہم حسینہ واجد کو لبرل اور ترقی پسند عناصر کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ مجوزہ قوانین اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصے متوازن ہیں اور ان کا سب پر اطلاق ہوگا۔ یہ خاندانی ضابطے خواتین کو بڑی

حد تک اپنی زندگی پر زیادہ مختار بنائیں گے، کچھ ذرائع کے مطابق بنگلہ دیش میں عورتوں کے لیے طلاق ایک المناک تجربہ نہیں رہے گی۔

ایک ہی فیملی کوڈ وضع کرنے کا مدعا یہ ہے کہ موجودہ خاندانی قوانین کو زیادہ انسانیت پسندانہ اور عورتوں کے لیے مفید بنایا جائے۔ یہ قوانین مذہب سے بالاتر ہو کر عورتوں کے خلاف امتیاز کو ختم کریں گے اور عورتوں کو معاشرہ میں برابر حیثیت دیں گے۔ یہ ضابطہ یا کوڈ بنگلہ دیش کی خواتین کی تنظیم مہلا پریشد نے وضع کیا ہے۔ یہ تنظیم گزشتہ 30 برسوں سے عورتوں کے حقوق کے لیے کام کر رہی ہے۔

بنگلہ دیش مہیلا پریشد کی سیکرٹری عائشہ خان کے مطابق ''ہمیں احساس ہوا کہ عورتوں کو ذاتی حقوق کے ضمن میں جبر اور تفریق کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اگرچہ آئین میں عورتوں اور مردوں کو برابری کا حق دیا گیا ہے اس کے باوجود عورتوں کو ترقی کے مواقع سے محروم رکھا جا رہا ہے۔'' عائشہ خان نے یہ بھی کہا کہ ''خواتین کے تحفظ کے لیے خواتین سے بے رحمی آرڈیننس، جہیز کی مخالفت کے قانون اور فیملی کورٹ آرڈیننس جیسے قوانین ہمارے قانونی ڈھانچے میں موجود ہیں۔'' عائشہ نے یہ بھی کہا کہ ''ہماری 85 فیصد آبادی مسلمان ہے تاہم یو ایف او (یونیفارم فیملی کوڈ) کے ذریعے مذہبی تفریق بھی ختم کر دی گئی ہے۔''

اس کوڈ کا پہلا حصہ شادی اور طلاق کے امور سے متعلق ہے اس ضابطے کے تحت شادی اور طلاق دونوں کا اندراج ضروری ہے اس قانون کے ذریعے یہ بھی لازم کر دیا گیا ہے کہ شادی کے وقت لڑکے کی کم از کم عمر 22 سال اور لڑکی کی 18 سال ہوگی۔ بنگلہ دیش میں خصوصاً دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی بلوغت کی عمر تک پہنچتے ہی شادی کر دی جاتی ہے۔ بعض اوقات اس سے بھی کم عمری میں اور ان شادیوں کا کبھی کوئی اندراج نہیں ہوتا۔

ان لڑکیوں کے مصائب اس وقت شروع ہو جاتے ہیں جب انہیں ان کے خاوند چھوڑ جاتے ہیں یا انہیں تین بار طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر طلاق دے دی جاتی ہے اگر شادی اور طلاق کا اندراج ہو تو پھر ان عورتوں کے لیے اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کا قانونی جواز بن جائے گا۔ یہ رائے ایک معروف وکیل خاتون تانیا امیر کی ہے۔ ہندوستان میں بھی نیشنل ویمن کمشن نے شادی کے لازمی اندراج کی سفارش کی ہے مگر قدامت پسند مذہبی عناصر نے اس کی شدید مخالفت کی اس نے حکومت کی اس سفارش پر غور ہی نہیں کیا اگر ہندوستان میں بھی شادیوں کا

MashalBooks.org

اندراج لازمی قرار دے دیا جائے تو یہ خواتین کی بہت بڑی خدمت ہوگی مگر اس اقدام کی تمام مذہبی برادریوں کے قدامت پسند طبقوں کی طرف سے شدید مخالفت ہوگی۔

مجوزہ یو ایف سی میں عورتوں اور مردوں کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایسی وجوہ بیان کریں جن کی بناء پر وہ طلاق چاہتے ہیں۔ مرد آٹھ وجوہ کی بناء پر جبکہ عورتیں دس وجوہ کے باعث طلاق دے سکتی ہیں۔ عمومی وجوہات تنقید بداخلاقی، بدکرداری، نامردی یا جسمانی اور ذہنی تشدد کی بناء پر عورتیں طلاق لے سکتی ہیں۔ یو ایف سی نے طلاق لینے کی یہ وجہ بھی شامل کر لی ہے کہ مرد جہیز کے بارے میں مطالبات کرتے ہیں۔ جہیز کا اسلام میں کوئی جواز نہیں مگر اسے طلاق لینے کا ایک سبب قرار دینا ایک بالکل نیا تصور ہو گیا۔ جہیز کی رسم دوسرے مسلم ممالک میں نہیں ہے مگر بدقسمتی سے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں بہت عام ہے۔ حال ہی میں 7 اپریل 2001ء کو دہلی میں ایک مذاکرہ ہوا جس میں خود علماء نے کہا کہ جہیز ایک غیر اسلامی رسم ہے اور اس کے خلاف مہم چلائی جانی چاہیے۔

اسلامی شریعت میں خاوند کی طرف سے بیوی کو چھوڑ جانے یا نامردی کو طلاق کی وجہ تسلیم کیا گیا ہے۔ ڈیز ولیوشن آف مسلم میرج ایکٹ مجریہ 1939ء میں مسلمان عورت کو حق دیا گیا ہے کہ اگر اس کا خاوند لاپتہ ہو گیا ہے یا اسے چھوڑ گیا ہے اور چار سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے تو پھر اسے طلاق دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے تاہم یو ایف سی میں کہا گیا ہے کہ اگر خاوند دو برس تک نان ونفقہ نہ دے یا لاپتہ ہو جائے تو عورت طلاق کا مطالبہ کرنے کی حق دار ہو جائے گی۔ اگر خاوند کسی قسم کی منشیات کا عادی ہے تو ایسی صورت میں بھی عورت کو طلاق لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اگر بیوی منشیات کی عادی ہے تو خاوند بھی طلاق دے سکتا ہے۔

ایک بات دلچسپ یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے یو ایف سی میں ہے کہ اگر بیوی چٹھی بازی کی عادی ہے تو مرد اسے طلاق دینے کا حق رکھتا ہے مگر مرد لونڈے باز ہے تو بیوی طلاق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ طلاق لینے دینے کی یہ وجوہ نئی ہیں اور روایتی اسلامی شریعت میں یہ شامل نہیں اس ضمن میں یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ اگر عورت مرد کی جنسی نااہلی کے باعث اس بناء پر طلاق لے سکتی ہے کہ شوہر وظیفۂ زوجیت (یا جنسی حق) ادا نہیں کر سکتا تو پھر اسی بناء پر عورت لونڈے باز خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہو سکتی ہے کہ اس کا شوہر وظیفۂ زوجیت ادا نہیں کرتا (بشرطیکہ وہ واقعی بیوی کو جنسی اعتبار سے نظر انداز کرتا ہو) اس ضمن میں شرعی اصطلاح

MashalBooks.org

قیاس سے مدد لی جاسکتی ہے۔

یو ایف سی کے دوسرے باب میں مذہبی رسوم اور روایتی قوانین سے قطع نظر نان نفقہ کو لازمی اور یکساں بنادیا جائے گا۔ نان نفقہ کی وجوہات کی تفصیل کے ساتھ ایسا لائحہ عمل بھی مرتب کر دیا گیا ہے جو نان نفقہ کی عدم ادائیگی کی شکل میں اختیار کیا جانا مقصود ہے۔ بنگلہ دیش کی خاتون کارکن فریدہ عارف کا کہنا ہے کہ جن عورتوں کو خاوند چھوڑ جاتے ہیں' ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ کچھ این جی اوز اور ٹرسٹ ان مظلوموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اس لیے نان نفقہ کی وصولی کے سلسلے میں واضح لائحہ عمل بہت ضروری ہے۔

یو ایف سی کے دوسرے حصوں میں نوعمر بچوں کے سرپرست مقرر کرنے یا انہیں گود لینے کے امور شامل ہیں۔ گود لینے کا قانون یکساں' یا یک رنگ ہے۔ شادی شدہ جوڑے کی طرف سے گود لینے کا قانون سادہ بنایا گیا ہے مگر واحد مرد یا واحد عورت کی طرف سے گود لینے کا قانون شامل نہیں۔ یو ایف سی کا ایک پہلو یہ ہے کہ قانون وراثت یکساں کر دیا گیا ہے۔ حقوق ملکیت پر بہت تنازعے ہوتے ہیں۔ یو ایف سی کے مطابق شادی شدہ یا غیر شادی شدہ عورتوں کے وراثت کے حقوق مرد برابر کے ہوں گے۔ جو بچے بغیر نکاح کے پیدا ہوں گے انہیں ماں کی جائیداد میں ایک مخصوص حصہ ملے گا۔ یو ایف سی کا یہ حصہ بہت ہی متنازعہ ہے کیونکہ شریعت میں عورتوں اور مردوں کا برابر کا حصہ نہیں ہوتا۔

یہ ٹھیک ہے کہ قدامت پسند یو ایف سی کی مخالفت کریں گے لیکن خواتین کی تنظیمیں اسے قانون بنانے کے لیے پورا دباؤ ڈالیں گی اگر اپریل میں دہلی میں ہونے والے مذاکرے کی تفصیلات دیکھی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مسلم خواتین بھی اب قانون میں تبدیلی کے لیے دباؤ ڈال رہی ہیں۔ مذاکرے میں متعدد خواتین نے تین بار طلاق کے لیے تعدد ازدواج کے قانونی جواز کو چیلنج کر دیا اور مسلم بورڈ سے مطالبہ کیا کہ وہ تین طلاق کو غیر قانونی قرار دے اور تعدد ازدواج کے بارے میں کوئی ضابطہ بنائے۔ مغربی بنگال کی ایک خاتون نے بتایا کہ کلکتہ کی مسلم طوائفوں میں 75 فیصد وہ ہیں جنہیں ان کے شوہروں نے اپنی مرضی سے یک طرفہ طور پر طلاق دے دی تھی۔ اب وقت ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ مسلمان خواتین کی طرف سے تیار کردہ نکاح نامہ منظور کرے اس سے ہندوستان کی ہزاروں مسلمان عورتوں کو آسانی میسر آئے گی۔ بورڈ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے کچھ جائز تبدیلیوں کی زیادہ دیر مخالفت

نہیں کر سکتا۔

(15- جون2001ء)

کیا جبراً پردہ کرایا جاسکتا ہے؟

کشمیر کی ایک متشدد تنظیم لشکر جبار نے اعلان کیا ہے کہ جس مسلمان عورت نے پردہ نہ کیا' نقاب نہ اوڑھا اس پر تیزاب پھینک دیا جائے گا۔ کیا اس کا کوئی جواز ہے؟ پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ پردے کے بارے میں قرآن کے احکامات کیا ہیں اور پھر لشکر جبار کی بات ہوگی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ قرآن میں تمام مسلم خواتین کے لیے حجاب (نقاب یا پردہ) کا حکم نہیں ہے جو قرآن میں کہا گیا اس کا جائزہ جاہلیہ (ماقبل اسلام) میں خواتین کی عادات واطوار کے پس منظر میں لیا جائے گا۔

ماقبل اسلام عرب مختلف قبائل میں منقسم تھے اور ان کی خواتین سینے نہیں ڈھانپا کرتی تھیں' ان میں سے متعدد عورتیں اپنی جنسی کشش (زینت) کی سرعام نمائش کیا کرتی تھیں' پاؤں میں گھنگھرو یا پائل پہنتیں اور بازاروں میں پاؤں زمین پر زور سے مار کر گھنگھرو کھنکھناتیں تاکہ مرد متوجہ ہوں۔ اسلام بنیادی طور پر لوگوں کو مہذب بنانے کے لیے آیا تھا اس نے عورت کو جنس بازار یا جنسی شے کے درجے سے بلند کر کے ایک باوقار انسانی مقام دیا جو مرد کے مقام کے برابر تھا اس لیے اس نے خاص اطوار' رویے اور لباس کا تعین کیا۔ چنانچہ ان قرآنی احکامات کو اس روشنی میں دیکھ کر اس کی قدر و قیمت متعین کرنی چاہیے۔

قرآن کی سورۃ چوبیسویں (6 پارہ 24) میں بعض ایسے امور کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ خیال ہے کہ اسلام سے پہلے جنسی اخلاقیات بڑی ڈھیلی ڈھالی تھیں اور بعض اوقات عورتیں اور مرد آزادانہ جنسی اختلاط کرتے تھے' اسے اور زنا کاری کو سماجی بُرائی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جب عورتیں اسلام قبول کرتیں' رسولِ کریم ان سے حلف لیا کرتے کہ وہ زنا نہیں کریں گی۔ چنانچہ اس کھلے جنسی رویے کو ختم کرنے کے لیے سورۃ 24:2 میں زنا کی سزا رکھی گئی۔ زنا کاری کے لیے اسلام سے قبل عربوں میں ایسی کوئی سزا نہیں تھی۔

اور سرعام جنسی کشش (زینت) کے اظہار کے بارے میں قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ زینت کی سرعام نمائش نہ کی جائے یہاں بھی قرآن نے ایک اہم استثنا رکھا ہے۔ یونہی عورتوں سے یہ

نہیں کہا گیا کہ وہ ہر شے لوگوں سے پوشیدہ رکھیں۔ بہت سے علماء اور اسلامی قانون دانوں نے اس سے مراد یہ لی ہے کہ عورت اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھ سکتی ہیں، وہ آنکھوں میں سرمہ لگا سکتی ہیں، انگلیوں میں انگوٹھیاں اور بانہوں میں چوڑیاں پہن سکتی ہیں۔ قرآن کے مشہور مفسر طبری نے بھی اپنی تفسیر میں یہی مؤقف رکھا ہے۔

دوسرے علماء بھی اس بات پر ان سے متفق ہیں اور یہ بھی یاد رکھا جائے کہ یہ تفسیر اس زمانے کے سماجی اور ثقافتی حالات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اگر یہ مفسر ہمارے عہد میں ہوتے جبکہ بہت سی ثقافتی اور سماجی تبدیلیاں آ چکی ہیں تو وہ ان آیات کی تعبیر اور بھی آزادانہ اور عورتوں کے حق میں کرتے۔ یوں قرون وسطیٰ کے مفسروں نے عورت کو چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے کی اجازت دی ہے۔ آج عورتوں کو اس سے زیادہ آزادی ہونی چاہیے۔ تاہم قرآن کریم کے قرونِ وسطیٰ کے مفسرین اور قانون سازوں نے جو تعبیریں اور قاعدے دیئے ان کی بناء پر آج کی عورت کو سرعام بے پردہ آنے جانے کی اجازت ہونی چاہیے۔

ایران میں عورتیں حجاب پہنتی ہیں مگر قرآن کی متذکرہ سورہ کے مطابق انہیں چہرہ اور ہاتھ پوشیدہ رکھنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ وہ اوورآل پہنتی اور سر کو ڈھک کر رکھتی ہیں۔ ایران میں عورتوں کو کافی آزادی حاصل ہے، انہیں گھر کی قید میں نہیں رکھا جاتا، وہ عوامی سطح پر خاصی سرگرم ہیں۔ پارلیمنٹ کی رُکن بھی ہیں اور ایک خاتون تو ایران کی اسلامی جمہوریہ کی نائب صدر بھی ہے۔

قرآن کی ایک اور آیت ہے کہ خواتین اپنے سینے چادر سے ڈھانپ کر رکھیں۔ (24:31) تو ثابت ہوا کہ جب قرآن عورتوں کو چادر سے صرف سر اور سینہ ڈھانپ کر رکھنے کا کہہ رہا ہے تو پھر چہرہ چھپانے کا کیسے کہہ سکتا ہے؟ قرآن کے مطابق سینے کو ڈھانپ کر رکھنا عورت کے لیے زیادہ باوقار ہے۔ مولانا محمد علی لاہوری اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

''اسلام سے قبل عورتیں کھلے سینوں کے ساتھ عوام میں آتی تھیں اس طرح عورتوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے مشرقی انداز میں سر کے دوپٹے یا چادر سے سینوں کو ڈھانپیں، بازوؤں، گردن اور سینے یا کانوں، گردن یا سینے پر پہنے زیور بھی پوشیدہ رکھیں۔''

واضح رہے کہ قرآن عورت کو اپنے خاوند، والدین اور ایسے رشتہ داروں کے سامنے آرائش کی اجازت دیتا ہے جن سے وہ شادی نہیں کر سکتی۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس

ضابطے کی خلاف ورزی پر قرآن نے کوئی حد (سزا) نہیں لگائی۔ بعض کا یہ کہنا ہے کہ قرآن کا یہ حکم لازم نہیں، صرف تجویز یا سفارش کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایسی صورت میں کون زبردستی عورت پر پردہ ٹھونس سکتا ہے؟ اس کی یہ دھمکی ہی خلافِ اسلام اور خلافِ قانون ہے اور اگر اسے ہر قیمت پر نافذ ہی کرنا ہے تو پھر کوئی تنظیم اسے سرعام لاگو نہیں کرسکتی صرف اسلامی مملکت ہی یہ حد لگا سکتی ہے۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے یہاں ریاست کسی کی ذاتی آزادی میں دخل نہیں دے سکتی، شریعت میں قرآن کے تجویز کردہ لباس یا ضابطہ کی خلاف ورزی کی کوئی سزا (حد) نہیں رکھی گئی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ لشکر جبار ایسی تنظیمیں ان مردوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتیں جو جنس کے بارے میں قرآنی اخلاقیات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ قرآن نے مردوں کے لیے کوئی جنسی ضابطہ نہیں بنایا، یہ ضابطہ موجود ہے۔ وہ عورت مرد دونوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور جنسی جذبات پر قابو رکھیں۔

قرآن عورتوں سے پہلے مردوں سے جنسی اخلاقیات کے احترام کا تقاضا کرتا ہے لیکن یہ مردوں کے غلبے والی اور پدرسری تنظیمیں عورتوں کے لیے جنسی اخلاقیات پر اصرار کرتی ہیں اور مردوں کے بارے میں خاموش رہتی ہیں اگر مرد عورتوں کو سرعام چھیڑیں، ان سے دست درازی کریں یا ان کی آبروریزی کریں تو یہ پھر بھی مردوں کے خلاف تحریک شروع نہیں کرتے۔ یہ ہے ان کی ''اسلامی اخلاقیات''

دراصل اس قسم کی دھمکیاں پیداوار ہیں کشمیر میں جاری متشددانہ کارروائیوں اور تشدد کی ثقافت کی۔ جب مسائل کو حل کرنے کے لیے تشدد کی راہ اختیار کرلی جائے پھر نتائج بہت ہی المناک ہوتے ہیں اس طرح مسئلہ تو حل نہیں ہوتا البتہ بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں اس طرح جہاد کا تصور بھی سراسر غلط سمجھا گیا ہے اور ہر قسم کے بددیانت عناصر نے اس کو بُری طرح استعمال کیا ہے۔ جہادی گروپوں نے جس طور کشمیر میں تشدد شروع کررکھا ہے اس کا سب سے زیادہ نقصان کشمیر کی عورتوں کو ہوا ہے اور یہ کشمیری عورتیں ہی ہیں جنھوں نے بہت بھاری قیمت ادا کی ہے۔

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ جہادی گروپوں کی کارروائیوں کے جواب میں مسلح افواج نے کشمیری عورتوں کی آبروریزی کی، اخباروں میں ایسے بے شمار واقعات کی خبریں آئیں جب

متشدد افراد کو پکڑنے کے لیے کشمیریوں کے گھروں کی تلاشی لی جاتی ہے تب بھی عورتوں سے دست درازی بلکہ ان کی آبروریزی بھی کی جاتی ہے۔ متشدد عناصر بھی مثالی جنسی اخلاقیات کا مظاہرہ نہیں کرتے' وہ بھی عورتوں کو اغوا کرنے' ان سے زبردستی شادی کرنے یا ان کی آبروریزی کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ اور یہ کشمیری مائیں ہیں جن کے بیٹے اور بیویاں جن کے شوہر مارے گئے' یوں تشدد پسندوں کے نام نہاد جہاد میں سب سے زیادہ نقصان کشمیری عورتوں کو پہنچایا گیا۔

اب یہ ضروری ہے کہ کشمیر میں جبراً پردہ کرانے پر لشکر جبار کی پُرزور مذمت کی جائے۔ ہندوستان کی سیکولر حکومت تو درکنار اسلام بھی ان کو اس قسم کا پردہ کرانے کا حق نہیں دیتا۔ کشمیر کے مختلف سماجی حلقوں کی طرف سے اس قسم کی دھمکیوں کی بجا طور پر مذمت کی گئی ہے اور تو اور حریت کانفرنس کے رہنماؤں نے بھی اس کی مذمت کی ہے۔ صرف گیلانی صاحب نے ایسا نہیں کیا وہ تو ویسے بھی انتہا پسند مشہور ہیں۔

ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں تو حکومت کسی کو خاص لباس کے پہننے کا نہیں کہہ سکتی' عورتوں سمیت تمام شہری جیسا چاہیں لباس پہننے کے لیے آزاد ہیں۔ کشمیر کے لشکر جبار کی دھمکیوں سے ممبئی اور حیدرآباد میں بھی غیر معروف تنظیموں نے حوصلہ پا کر مسلمان عورتوں کو پردہ نہ کرنے پر خوفناک نتائج کی دھمکیاں دینا شروع کر دی ہیں۔ ہندوتوا والے بھی پیچھے نہیں رہے اور انہوں نے جینز اور منی سکرٹ پہننے والی ہندو عورتوں کو بھی اسی قسم کی دھمکی دے دی ہے اگر اسی قسم کی دھمکیاں دی جاتی رہیں اور عورتوں کو مجبور کیا جاتا رہا کہ وہ یہ لباس نہیں وہ لباس پہنیں تو پھر جمہوریت کہاں رہے گی۔

کسی کی مرضی ہے کہ وہ جینز پہنے یا پردہ کرے مگر عورتوں کو کسی بیرونی دباؤ کے بغیر یہ حق استعمال کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ حکومت دیکھے کہ کوئی کتنا بھی عسکریت پسند اور متشدد ہو' اسے قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے وگرنہ حکومت کی حکمرانی کا جواز ختم ہو جائے گا اور لوگوں کا اپنی من مرضی سے زندگی بسر کرنا مشکل ہو جائے گا' آزادی اور وقار کے بغیر جمہوریت ہو ہی نہیں سکتی۔

عام لوگوں کو بھی دیکھنا چاہیے کہ عورتوں کے ساتھ سرعام جبر نہ ہو اگر لوگ اپنی آزادی کو بچانا چاہتے ہیں تو انہیں ایسے عناصر کی حرکات کی مزاحمت کرنا ہوگی اگر ہم ایسی طاقتوں کے

سامنے ہتھیار ڈال دیں گے تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا' یہ سوچ کر آدمی کانپ اُٹھتا ہے۔ ہر قسم کے جنونی اور مذہبی بنیاد پرست قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور اپنے غیر قانونی ہتھکنڈے اور ضابطے آزمائیں گے جن کا مذہب سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ یہ معروف تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں چہرے کے پردے کا کوئی رواج نہ تھا' یہ پردہ عہد اُمیہ میں رومنوں اور ایرانیوں کی طرف سے آیا اور بہت سے مسلم عالموں نے یہ بات واضح بھی کر دی ہے۔ یہ فریضہ مسلم خواتین کا بھی ہے کہ وہ اس ضمن میں قدامت پسندانہ نقطۂ نظر پر بے چارگی کے عالم میں یقین کرنے کے بجائے براہِ راست قرآن کی ہدایات سے باخبر ہوں۔

(30- ستمبر 2001ء)

MashalBooks.org

کشمیر

کشمیر میں تشدد اور جمہوری حقوق

حال ہی میں کشمیر میں سکھوں کے قتلِ عام کے بعد مسئلہ کشمیر ایک بار پھر اُبھر کر سامنے آ گیا ہے اس بہیمانہ کارروائی کی ذمہ داری کسی نے قبول نہیں کی۔ شبہ یہ کیا جا رہا ہے کہ کارروائی لشکر طیبہ کی ہے لیکن کشمیری عسکریت پسند 35 سکھوں کے قتل سے بریت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ضلع اننت ناگ کے قصبہ سنگھ پورا میں جو لوگ سکھوں کو قتل کرنے آئے' انہوں نے غالبًا اصلیت چھپانے کے لیے فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ عسکریت پسندوں کا کہنا ہے کہ قتل میں ہندوستانی فوج یا پیراملٹری فورسز کا ہاتھ ہے مگر بات تسلی بخش نہیں۔ یہ الزام اور جوابی الزام تراشی اب ان کے لیے بے معنی ہے جنہوں نے اپنی جانوں کی قیمت ادا کر دی۔

یہ قتلِ عام اس قدر المناک تھا کہ معاشرے کے سبھی حلقوں نے اس کی پُر زور مذمت کی ہے' دوسروں کے علاوہ تمام قابلِ ذکر مسلم رہنماؤں نے بھی اس بہیمانہ کارروائی کی مذمت کی ہے۔ نائب امام عبداللہ بخاری نے اس کی پُر زور مذمت کرتے ہوئے اسے انسانیت دشمن فعل قرار دیا اور کہا کہ اس کا مدعا فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو زک پہنچانا ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ دنیا کا کوئی مذہب بے گناہ لوگوں کے قتل کی اجازت نہیں دیتا۔ جماعت اسلامی کے امیر مولانا جلال الدین عمری نے بھی واشگاف الفاظ میں اس کی مذمت کی ہے' انہوں نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ فوری طور پر اس المیہ کی تحقیقات کرائے اور ذمہ دار کو سخت ترین سزا دے۔

امریکہ کے صدر کلنٹن نے اے بی سی نیٹ ورک کو انٹرویو دیتے ہوئے اس قتل کے بارے میں کہا ''میرا خیال ہے حکومتِ پاکستان میں بعض عناصر ایسے ہیں جو کشمیر میں تشدد کرنے والوں کی حمایت کرتے ہیں۔'' ہوسکتا ہے کہ کشمیر میں مصروف عسکریت پسندوں نے کلنٹن کے دورۂ ہند کے دوران مسئلہ کشمیر کو نمایاں کرنے کے لیے یہ کارروائی کی ہو۔ مقصد خواہ کوئی بھی ہو اور کتنا منصفانہ ہو تب بھی کسی صورت میں اس کارروائی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک ہم انسانی زندگی کو مقدس نہیں سمجھتے' کسی بھی نصب العین کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ سوال یہ ہے کہ ہم کوئی بھی جدوجہد کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ انسانیت کی فلاح ہو' زندگی میں مشکلات نہ ہوں۔

ہم یہاں پھر اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ تشدد سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ ہاں سنگین ضرور ہوسکتا ہے۔ بعض لوگ بعض حالات میں تشدد کو جائز سمجھتے ہیں مگر وہ لوگ جو دُوراندیش ہیں' جو نتائج کو جانتے ہیں' وہ کبھی بھی تشدد کی حمایت نہیں کرتے اور اس قسم کے اندھادُھند تشدد کی حمایت تو بالکل ہی نہیں کرتے' تشدد کی تو کسی بھی معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں اور جمہوری معاشرے میں تو بالکل نہیں۔ عدم تشدد کا تصور گاندھی جی نے جہاں سے بھی لیا نہ صرف موجودہ صورت میں ہمارے حالات کے مطابق ہے بلکہ اخلاقی لحاظ سے اس کی بڑی ضرورت ہے۔ جمہوری معاشرے میں تو تشدد جمہوریت کا براہِ راست تضاد ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ بزعم خود کشمیری عوام کے حقوق کی لڑائی لڑ رہے ہیں' ان کے دل میں دوسروں کے حقوق کا کسی قسم کا کوئی احترام نہیں وگرنہ وہ ان معصوم سکھوں کا قتل کیسے کر سکتے تھے۔

واضح رہے کہ تشدد کی ایسی وارداتیں صرف کشمیر میں ہی نہیں ہورہیں' دنیا بھر میں ہورہی ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پوری دنیا میں ''جمہوری حقوق'' حاصل کرنے کے لیے تشدد کا اندھادُھند استعمال ہورہا ہے۔ ہم متعدد مثالیں دے سکتے ہیں۔ نمائندہ مثال بوسنیا میں ہونے والے تشدد کی ہے' وہاں ہزاروں کو قتل کردیا گیا اور اب امریکی فوجیوں نے ان کی اجتماعی قبریں بھی ڈھونڈ نکالی ہیں' سینکڑوں عورتوں کو قتل کرنے سے پہلے عصمت دری کی گئی۔ یہ المناک قتلِ عام بوسنیا میں کیوں ہوا ہے؟ سرب لوگ اپنے حقوق لینا چاہتے تھے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ مذہب کے نام پر بدترین قسم کا تشدد مذہبی حق کی خاطر کیا گیا۔

یہ کہنا اور زیادہ تر دائیں بازو کے مذہبی عناصر کا کہنا ہے کہ اپنے مذہبی حقوق حاصل کرنے کے لیے تشدد جائز ہے، مذہب کی توہین ہے۔ امریکہ میں مذہبی دائیں بازو والے لوگ عقیدے کی خاطر دوسروں پر جبر کرنے کو "حیات بخش اصول" قرار دیتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ زندگی کی شمع بجھا کر فروغِ زندگی چاہتے ہیں۔ اس قسم کے "حیات بخش" فلسفہ میں یقین رکھنے والوں نے دوسرے عقیدے کے کئی لوگوں کو قتل کیا ہے۔ امریکہ میں کئی ڈاکٹر اور نرسیں جو اسقاطِ حمل کا آپریشن کرتی ہیں، قتل کر دی گئیں، بہت سی ایسی لیبارٹریوں کو آگ لگا دی گئی جہاں اسقاطِ حمل کے آپریشن ہوئے۔ پنجاب میں خالصتان والوں نے کئی برس تک تشدد کا راستہ اختیار کیے رکھا اور اس لیے تاکہ سکھ مذہب کی بنیاد پر ایک مغربی ریاست وجود میں لائی جائے اور ہمیں سب کو خبر ہے کہ عقیدے کے بزعم خود محافظین فرقہ وارانہ فسادات میں معصوم لوگوں کی جان لیتے ہیں۔

مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ مذہبی یا سیاسی حقوق کے کٹڑ حامی یا مخالف عقیدے کے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ تر اپنے ہی ہم عقیدہ لوگوں کو مار دیتے ہیں۔ پنجاب میں خالصتانیوں کے ہاتھوں ہندوؤں سے زیادہ خود سکھ مارے گئے تھے۔ کشمیر میں بھی ہندو پنڈتوں کی جگہ زیادہ تعداد میں مسلمان ہی مارے گئے ہیں۔ تشدد کے ماننے والوں میں نہ صرف انتہا درجے کا شک وشبہ جنم لیتا ہے اس سے انتہائی عدم رواداری بھی پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ ہر شخص کو دشمن کا ایجنٹ سمجھتے ہیں دوسری طرف وہ اپنے اندر ہی اختلافِ رائے رکھنے والوں کو سزائے موت کا مستوجب گردانتے ہیں۔ یوں آزاد منش سکھ خالصتانیوں کا زیادہ نشانہ بنے اور کشمیر میں جہادیوں کے ہاتھوں زیادہ مسلمان مارے گئے۔

بعض اوقات تو معاشرے کے غالب حصے کے ہاتھوں ظلم وستم کا مسلسل شکار ہونے والے تنگ آ کر تشدد شروع کر دیتے ہیں اور جدوجہد کے ایک مرحلہ میں یہ جائز بھی لگتا ہے مگر تجربے میں آیا ہے کہ جلد ہی اس تشدد آمیز جدوجہد کے اپنے محرکات بن جاتے ہیں اور ان کے سبب ایک اور نوعیت کا تشدد جاری رہتا ہے۔ تشدد کا آغاز کرنا آسان ہے مگر اس کا ختم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ تشدد طاقت یا اختیار ہے جو لوگ بندوق اُٹھا لیتے ہیں، وہ بااختیار ہو جاتے ہیں اور پھر شاید ہی اس اختیار سے محروم ہونے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ وہ بہانے بہانے سے تشدد آمیز طریقے اختیار کیے رکھتے ہیں جب تک کوئی بڑی طاقت مداخلت نہیں کرتی۔ سربیا اور

MashalBooks.org

کوسوو میں نیٹو طاقتوں کی مداخلت کے بعد ہی تشدد کو روکا جا سکا تھا۔

تشدد جلد ہی ایک جبر کا روپ دھار لیتا ہے اگر یہ تشدد آزادی کی خاطر شروع کیا گیا تھا تو کم از کم تیسری دنیا میں ایک انتہائی ناپسندیدہ جبر بن گیا۔ مثلاً اس نے نسل کشی شروع کر دی' آسام میں بوڈو انتہا پسند بوڈو لینڈ بنانا چاہتے ہیں اور علاقے کو تمام غیر بوڈو باشندوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اسی بناء پر بے شمار آسامی مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کو قتل کر دیا ہے۔ انتہا پسند سکھوں نے پنجاب کو غیر سکھوں سے پاک کرنے کے لیے بے شمار بے گناہ ہندوؤں کو قتل کر دیا اسی طرح کشمیری مسلح لوگ کشمیر سے تمام ہندوؤں اور سکھوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں تا کہ وہاں صرف اور صرف مسلمان کشمیری رہ جائیں۔ چنانچہ اس قسم کے نسلی یا فرقہ وارانہ تشدد کا نتیجہ نسل کشی کی صورت میں نمایا ہوتا ہے۔

جس طرح جمہوریت میں حزبِ اختلاف لازم ہے' اسی طرح اس میں تنوع اور کثرت الوجودیت بھی ضروری ہے۔ جمہوریت اس قسم کے معاشرے میں بعض تشویش والے مسائل پیدا کرتی ہے۔ علاقائی شناخت کو باہر سے آنے والوں سے خطرہ لاحق ہوتا ہے اس طرح دائیں بازو کی بہت سی طاقتیں فرزند زمین کا نعرہ بلند کرتی ہیں تا کہ باہر سے ہجرت کو روکا جا سکے۔ خاص طور پر ان کا جن کے نسل یا ہم عقیدہ یا ہم رنگ پہلے وہاں آباد نہیں۔ اسی وجہ سے کشمیر میں آئین کی دفعہ 370 جھگڑے کا باعث بن گئی ہے۔ آئین میں یہ دفعہ کشمیر کی خود مختاری اور اس کی شناخت کو محفوظ رکھنے کے لیے شامل کی گئی تھی تاہم اس دفعہ کو انتہائی نرم کر دیا گیا تھا (اس کا وجود' عدم وجود برابر ہو گیا ہے) دوسری طرف کشمیری عسکریت پسند کشمیری پنڈتوں کو نکال کر یا سکھوں کو قتل کر کے اس کی اندرونی کثرت الوجودیت کو ختم کر رہے ہیں۔

یہ جمہوریت کا ایک ایسا تنازع بھی ہے جسے آسانی سے حل نہیں کیا جا سکتا اور اس کی وجہ سے تنوع کے اصول اور علاقائی شناخت کے مابین سماجی کشیدگی لازماً پیدا ہوتی ہے تاہم اس قسم کی کشیدگی کا حل جمہوری ذرائع سے ہی نکالنا ہوگا۔ یہ بات کہنا آسان مگر کرنا مشکل ہے۔ یہ انتہائی نازک کام ہے اس کے لیے ایک طرف دیانت داری اور راست بازی اور دوسری طرف اعلیٰ درجے کے تدبر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے عوامی سیاست کی اپنی مجبوریاں ہیں اور بلا استثنا کوئی بھی سیاست دان نہیں ہے جو اعلیٰ تدبر اور خلوص کی بناء پر آج کی کثرت الوجودی جمہوریت چلانے کا اہل ہو بلکہ وہ اس کے برعکس سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے

MashalBooks.org

سماجی کشیدگی میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ایسی ہی موقع پرستی تشدد کا باعث بنتی ہے۔نمایاں مثالیں پنجاب اور کشمیر کی ہیں۔ پنجاب اور کشمیر دونوں میں اس وقت کی حکمران جماعت نے تشدد کی طرف مائل کشیدگی کو ہوا دی اگر انہوں نے صورتِ حال سے پیدا ہونے والی کشیدگی کو مدبرانہ انداز سے دُور کیا ہوتا تو اتنے کشت وخون سے بچا جا سکتا تھا۔

انتہائی اہم بات یہ ہے کہ اس ملک کی سلامتی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی کثرت الوجودیت ہمیشہ سے ناپسندیدہ رہی ہے' یہ یک رنگی کے علمبردار ہیں جس کا آخری نتیجہ نسل کشی اور آمریت ہوتی ہے۔ یہ مکمل حاکمیت آج کے جمہوری دور میں ہمیشہ کے لیے قائم نہیں رکھی جا سکتی اور ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ ہماری دائیں بازو کی طاقتیں ہمیشہ یہی سمجھتی ہیں کہ یک رنگی ہی ملک میں اتحاد پیدا کر سکتی ہے حالانکہ یہ یک رنگی ملکی اتحاد کی دشمن ہے۔1971ء میں پاکستان اس لیے ٹوٹ گیا کہ مغربی پاکستان نے اندرونی کثرت الوجودیت کو برداشت نہیں کیا۔ کثرت الوجودیت کے فروغ سے نہ صرف جمہوری طرزِ حکمرانی فروغ پاتا ہے' ملک کے اتحاد اور سالمیت کو بھی توانا کرتا ہے۔

جو لوگ کشمیر کی خودمختاری کے علمبردار ہیں انہیں اس کے اندرونی تنوع کو فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔انہیں کشمیر کے اندر مسلم اور غیر مسلم اور کشمیری اور غیر کشمیری کے درمیان فاصلے بڑھانے نہیں چاہئیں نہ مخالف صف بندی کرنی چاہیے اس سے خود ان کے نصب العین کو نقصان پہنچے گا اگر انہیں اپنی خودمختاری اور ریاست کے استحکام کا خیال ہے تو پھر انہیں کھلے دل سے اندرونی علاقائی خودمختاری کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ کشمیر کے اندر خود مسلمانوں کے اندر بھی علاقائی اور مذہبی تنوع یا تفریق ہے یعنی شیعہ اور سنی (کارگل کے شیعہ اور وادی کے سنی) اور جموں اور وادی کے مسلمانوں میں ثقافتی فرق' کشمیر میں واحد مسلم کشمیری شناخت نہیں دراصل کسی بھی صوبے میں اس تنوع سے مفر نہیں۔خود حریت کانفرنس میں تنوع موجود ہے چنانچہ کشمیر کے مسئلے کا مناسب حل تشدد ترک کر کے بات چیت کے ذریعے ممکن ہے۔(15-اپریل2000ء)

کشمیر......کیا خودمختاری مسئلے کا حل ہے؟

آخر کار کشمیر اسمبلی نے خودمختاری کے بارے میں قرارداد منظور کر لی تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ قرارداد میں اجتماعی حقیقت کتنی ہے اور کتنا انفرادی اظہار۔ کہا جا رہا ہے کہ چونکہ مرکزی حکومت حریت والوں سے مذاکرات کرنے والی ہے اس لیے فاروق عبداللہ نے صورتِ حال سے پورا فائدہ اُٹھانے کی خاطر یہ قدم اُٹھایا ہے یعنی میلہ لوٹنے کے لیے یہ کارروائی کی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہے میرے نزدیک یہ صرف انفرادی اظہار نہیں بلکہ ایک صحیح قدم ہے۔ 1998ء میں سری نگر میں میری فاروق عبداللہ سے بات ہوئی تھی' انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت کے وزیراعظم نرسیماراؤ نے کشمیر کی خودمختاری پر غور کرنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ مرکزی حکومت کی طرف سے اس کی منظوری کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ منظوری کبھی نہیں آئے گی جس پر فاروق عبداللہ نے کہا تھا کہ خودمختاری کے بغیر آپ وادی میں عسکریت کا مقابلہ نہیں کر سکتے مگر اب سوال یہ ہے کیا خودمختاری مل جانے کے باوجود عسکریت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ جواب مشکل ہے۔

اصل میں پہلی خطا مرکز میں کانگریس کی حکومت سے اس وقت سرزد ہوئی جب پنڈت جواہر لال نہرو خود حکومت میں تھے۔ نہرو شدت کے ساتھ کشمیر کے معاملے سے وابستہ تھے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا وہ واقعی آئین کے آرٹیکل 370 کے مطابق کشمیر کو خودمختاری دینا چاہتے تھے۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری (یہ بھی قابلِ اعتراض ہے تاہم یہ قصہ مختلف ہے) کے بعد مرکزی حکومت کشمیر کی خودمختاری کو کم کرنے کے لیے لگی ہوئی تھی۔ یہ ریاست پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنا چاہتی تھی اور شیخ عبداللہ کے جانشیں موم کی ناک والے وزرائے اعلیٰ کی وجہ سے یہ کام مشکل نہ تھا۔ کشمیر اسمبلی نے ایسی قراردادیں منظور کیں جن کے ذریعے یہ آہستہ آہستہ اپنی خودمختاری سے دست کش ہوتی گئی۔ پہلے اس نے صدرِ ریاست کا عہدہ ختم کیا پھر وزیراعظم کا اور ان کی جگہ گورنر اور وزیراعلیٰ کے عہدے بنائے پھر ہندوستانی سپریم کورٹ کا احاطۂ کار کشمیر تک بڑھا دیا جب شیخ عبداللہ کو رہا کیا گیا اس وقت تک یہ خودمختاری کے خاتمے کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی اور کشمیر نے یہ دست برداری ''رضاکارانہ'' طور پر کی تھی۔ کشمیر کی حیثیت دوسرے تمام صوبوں جیسی ہو گئی اور آرٹیکل 370 برائے نام رہ گیا۔

یہ برائے نام دفعہ 370 بھی بی جے پی کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی چنانچہ اس نے اس کے خاتمے کو 80ء کی دہائی کے آخر میں انتہائی اہم مسئلہ بنالیا یہاں تک کہ یہ ہندوتوا کے ایجنڈے کا بھی حصہ بن گیا مگر کشمیر کے لوگوں کے دل و دماغ پر اس کا بہت بُرا اثر ہوا نہ صرف یہ بلکہ اس بدقسمت صوبے میں اپنی کٹھ پتلی حکومتیں قائم کرنے کے لیے ہر الیکشن میں دھاندلی کی گئی جب حزبِ مخالف کی جماعتوں نے این ٹی راما راؤ کی سرکردگی میں کشمیر میں ایک اجتماع (کیمپ) کیا تو فاروق عبداللہ نے ان کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ اندرا گاندھی اس قدر ناراض ہوئیں کہ انہوں نے آئین کی دفعہ 356 کو ناجائز استعمال کر کے نیشنل کانفرنس کے چند ارکانِ اسمبلی کی وفاداری خرید لی اور فاروق عبداللہ کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ تو یہ تھی حقیقت خودمختاری کی جو دفعہ 370 کے تحت کشمیریوں کو دی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ سرحدی ریاست کشمیر متنازعہ ہے اس لیے مرکزی حکومت نے اسے آرٹیکل 370 کے تحت چلانا تو درکنار دوسرے عام صوبوں کے مطابق بھی نہیں چلنے دیا۔

یوں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ 1947ء میں جب پاکستانی قبائلیوں نے کشمیر پر دھاوا بولا تھا اس وقت سے جن کشمیریوں نے بے دھڑک ہندوستان کا ساتھ دیا تھا' ان کو مرکز نے کیا پیغام دیا اور کس نیت سے۔ اس حملے سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان میں ان کی کشمیریت محفوظ نہیں رہ سکے گی اور اس کا تحفظ صرف جمہوری اور سیکولر ہندوستان سے ہی ہو گا لیکن ہم نے ان کی توقعات سے غداری کی اور بلا شک وشبہ غداری کی اگر ہندوستان نے ان کو 1947ء سے ہی حقیقی خودمختاری دی ہوتی' ان کے بارے میں غیر ضروری شکوک وشبہات نہ پالے ہوتے تو پاکستان جو بھی چاہے کر لیتا یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہوتا' ہم سارا الزام پاکستان کو دے کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے' کشمیر بخوشی ایک سیکولر اور کثرت الوجودی ہندوستان کے ساتھ رہنے کو ترجیح دے گا (مگر سیکولر اور کثرت الوجودی اقدار کو آج سب سے بڑا خطرہ لاحق ہے) کشمیری اسلام غیر فرقہ وارانہ صوفیانہ اسلام ہے جو تنگ نظر فرقہ وارانہ رویے کو پسند ہی نہیں کرتا۔

اب یہ ہم ہندوستانیوں کی گہری سوچ بچار کا مسئلہ ہے کہ کشمیر ہم سے اس قدر الگ تھلگ کیوں ہو گیا ہے؟ کیا کشمیر نے ہم سے غداری کی یا ہم نے کشمیر سے غداری کی؟ آج ہم جس انداز سے اس مسئلہ سے نمٹ رہے ہیں اس سے تو دُوریاں اور بڑھ رہی ہیں۔ ہمارے سیاسی رہنما خصوصاً آج کی مرکزی حکومت ایک طرف سیاست بازی کر رہی ہے اور دوسری طرف

MashalBooks.org

اسے صرف امن وامان کا مسئلہ قرار دیتی ہے۔ وادی میں مسلح تصادم کے باعث فوجی آپریشن یک قلم ختم نہیں کیے جاسکتے مگر جس قسم کا رویہ ہماری فورسز کا ہے اور جس طرح سے ایک عام کشمیری کے حقوق پامال ہورہے ہیں اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ وہاں پر انسانی حقوق پامال نہیں ہورہے۔

جہاں تک انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا سوال ہے تو ایک مثال یہ ہے کہ بہت ہی اہم شخصیت جگت گرو شنکر اچاریہ سوامی ادھوکش نند سرسوتی تیرتھ جی مہاراج گوردھن پوری خود کشمیر گئے' خود انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا مشاہدہ کیا اور سری نگر میں ایک پریس کانفرنس میں کہا ''یہ تشدد فوراً بند کیا جائے' آج جو کچھ کشمیر میں ہورہا ہے' وہ ساری انسانیت کے منہ پر کالک ہے۔''

جگت گرو نے جموں اور کشمیر کا مطالعاتی دورہ کیا تھا' انہوں نے کہا کہ انہیں یہ دیکھ کر انتہائی دُکھ ہوا ہے کہ اس جگہ پر انسانیت کی موت انتہائی بے بسی کے عالم میں ہورہی ہے جو جگہ کبھی فرقہ وارانہ ہم آہنگی' رواداری اور امن و آشتی کا گہوارہ تھی۔ مہاتما گاندھی نے کشمیر میں امید کی کرن دیکھی تھی مگر آج وہاں پر نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں اور شجرو حجر پر بھی جبر کیا جارہا ہے۔ سوامی نے کہا کہ مکھن پور سے اِدھر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ جموں و کشمیر کا ہر باشندہ تشدد پسند ہے مگر یہ سر بسر غلط تاثر سیاست دانوں نے محض اپنے گھناؤنے عزائم کو پورا کرنے کے لیے پیدا کر رکھا ہے۔''

سوامی نے قسم اُٹھائی کہ سیاست اور مذہب کے نام پر جو کچھ کشمیر میں ہورہا ہے' وہ اس کے خاموش تماشائی نہیں رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کو جس نے اہنسا کا پیغام ساری دنیا میں پہنچایا تھا' اسے اپنے ایک علاقے میں اس قسم کے تشدد اور جبر کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سیاست دان امن وامان بحال کرنے میں ناکام ہوگئے ہیں اب یہ تمام مذاہب کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ متحد ہوکر کشمیر کے لاچار اور مجبور لوگوں کو ظلم سے بچائیں۔ سوامی جی کے دُکھ اور تشویش سے بھرے بیان سے بڑی آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کشمیر پر کیا گزر رہی ہے۔ کیا ہم اہلِ کشمیر سے اس قسم کا سلوک کر کے کبھی بھی مسئلہ کشمیر حل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے؟

یہ سچ ہے کہ کشمیریوں کا ایک طبقہ آزادی سے کم کسی بات پر تیار نہیں ہوگا' ان کو پاکستان یا

MashalBooks.org

ہندوستان کسی سے بھی الحاق منظور نہیں۔ وہ اقوامِ متحدہ کے استصوابِ رائے پر عملدرآمد پر مصر ہیں اور تو اور جماعت اسلامی ایسے لیڈر جو پاکستان سے الحاق کے حق میں ہیں' وہ بھی استصوابِ رائے پر زور دیتے ہیں مگر پورے جموں اور کشمیر میں (پاکستان والے کشمیر میں بھی) استصوابِ رائے سے یہ مسئلہ مشکل سے ہی طے ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ جموں اور کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی 65 فیصد ہے مگر یہ فرض کر لینا نادانی ہوگی کہ تمام کے تمام لوگ پاکستان یا آزادی کے حق میں رائے دیں گے۔ کشمیر کی صورتِ حال مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پورے جموں اور کشمیر کو تو چھوڑیں' سارے کے سارے مسلمان بھی متحد اور یک رائے نہیں ہیں۔ جموں میں بھاری اکثریت ہندوؤں کی ہے اور لداخ میں بدھوں کی۔ پاکستان سے الحاق تو درکنار وہ تو آزادی کے لیے بھی تیار نہیں پھر کارگل کے مسلمان شیعہ ہیں جنہیں پاکستان سے الحاق کی کوئی تک نظر نہیں آتی اگر وہ اقلیت میں بھی ہیں تب بھی وادی کے مسلمانوں کی باہمی تقسیم کے باعث وہ بھی ایک فریق کا پلڑا بھاری کریں گے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہاں کے مسلمان یک رنگ' یک زبان ہیں مگر وہاں مسلمان یک رنگ نہیں' وہ فرقہ اور ثقافت کے اعتبار سے بٹے ہوئے ہیں۔ وادی میں اگرچہ شیعہ کم ہیں مگر سنی اور شیعہ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پاکستان سے الحاق کا معاملہ ہو یا آزادی کا سوال شیعہ مسلمان سنی مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیں گے' آزادی کی صورت میں بھی اکثریت سنیوں کی ہوگی پھر وادی میں گجر بکروال ہیں تو سنی مگر ان کی اپنی الگ زبان' اپنی الگ ثقافت ہے۔ ان کی اُمنگیں اور مطالبات اکثریتی کشمیری مسلمانوں سے الگ ہیں۔ پھر شمال میں پاکستان کے مقبوضہ علاقوں میں شیعہ مسلمانوں میں (اسمٰعیلی' نزاری) ہیں جو سنیوں کے غلبہ سے عموماً خوف زدہ رہتے ہیں۔ تو جب استصواب رائے کے حوالے سے ان کے مستقبل کا سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر یہ سارے کوائف شمار کیے جانے چاہئیں۔ یہ بھی ہے کہ جب پاکستان سے الحاق یا آزادی کا سوال آئے تو سارے کے سارے سنی بمشکل ہی ایک طرف ووٹ ڈالیں' مختلف مذہبی اور ثقافتی گروہ بندیوں سے ہٹ کر وہاں پر الگ الگ سیاسی اور نظریاتی گروہ بھی ہیں اگرچہ اس وقت استصوابِ رائے کوئی صحیح راستہ نہیں اور اگر یہ بھی طے ہو جائے تو پھر بھی ہندوستان کو نتائج سے اس طرح خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے کہ جس طرح وہ ڈر محسوس کر رہا ہے۔ جموں اور وادی دونوں میں بہت سے مسلمان ہندوستان کے حق میں رائے

دیں گے۔

ان حقائق کے پیش نظر کشمیریوں اور ہندوستان کی مرکزی حکومت کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ کشمیر کو آئین کی دفعہ 370 کے تحت خودمختاری دے دی جائے۔ دوسری بات کہ امریکہ میں بنے تھنک ٹینک کی طرف سے پیش کی جانے والی شرانگیز تجاویز پر غور نہیں کرنا چاہیے' انہیں امریکی حکومت کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ یہ حل کشمیر کو مذہبی بنیادوں پر تین حصوں میں تقسیم کرنے کا ہے یعنی وادئ جموں اور لداخ۔ مگر یہ تو ہماری کثرت الوجودی اور سیکولر مفاد کے خلاف ہے۔ چنانچہ ان تمام معاملات کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر کشمیر کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ اسے آرٹیکل 370 کے تحت خودمختاری دے دی جائے۔ اس ضمن میں بعض ضروری شرائط کو پورا کرنا ہوگا۔

سب سے پہلے سنگھ پریوار کو یہ ضد چھوڑ دینی ہوگی کہ آئین کی دفعہ 370 کو ختم کر دیا جائے بلکہ کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ رکھنے کی خاطر اس دفعہ کو مستقلاً رکھا جائے۔ دوسرے مرکز کشمیر کو وہ تمام اختیارات واپس کر دے جو کٹھ پتلی حکومتیں بنا کر مرکز نے لے لیے تھے۔ اور جموں و کشمیر کے عوام کے سارے حقوق بحال کر دیئے جائیں۔ جہاں تک جموں اور لداخ کی اندرونی خودمختاری کا معاملہ ہے' یہ ریاست کے عوام پر چھوڑ دیا جائے۔ ممتاز شخصیات جیسے بلراج پوری اسی حل کی حمایت کر رہی ہیں اور یہ لوگ اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

دوسرے حکومت فوری طور پر فوجی اور نیم فوجی اداروں کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو روکے۔ وادی کے لوگوں کے دل جیتنے کے لیے سب سے پہلے یہ اقدامات کیے جائیں اس طرح حریت کانفرنس سمیت کشمیر کے لوگوں سے مکالمہ کرنے کی فضا سازگار ہوگی اور ریاست کے لیے خاص ترقیاتی فنڈ بھی دینے کی فوری ضرورت ہے۔ وادی میں پڑھے لکھے بے روزگاروں کے لیے زیادہ سے زیادہ روزگار فراہم کیے جائیں اس طرح عسکریت پسندوں کی طرف ان کی رغبت کم ہو جائے گی مگر اب تک حکومت نے اس سلسلے میں کوئی زیادہ کارکردگی نہیں دکھائی۔ لوگوں کے معاشی مسائل حل کرنے کے لیے ترقیاتی کام کرنے ضروری ہیں' ریاست کو صرف سیاحت کی آمدنی کا محتاج نہ رکھا جائے وہ تو مسلح چپقلش کے شروع ہونے کے بعد کب کی

تباہ ہو چکی ہے اور لوگوں کے لیے نئے مصائب پیدا ہو گئے ہیں۔ کوشش کر کے کشمیری پنڈتوں کو جہاں کہیں بھی وہ چلے گئے انہیں واپس کشمیر میں لایا جائے' عام کشمیریوں کے لیے ان کی کشمیریت ان پنڈتوں کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی۔ یہ وادئ کشمیر میں میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اس طرح کشمیر کا کثرت الوجودی مزاج بحال ہو جائے گا۔

اگر ہم یہ سب کچھ کر لیں تو پھر اس کے بعد پاکستان سے بغیر کسی خوف کے بات چیت ہو سکتی ہے۔ ایک طرف پاکستان اور دوسری طرف حریت والوں سے بار آور مکالمہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد معاہدہ شملہ کے مطابق مسئلہ کشمیر حل کرنا مشکل نہیں رہے گا۔

(15- جولائی 2000ء)

کشمیر کا انتخاب......امن

کشمیر کئی دہائیوں سے ہماری توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے جب مہاراجہ ہری سنگھ نے الحاق کی دستاویز پر دستخط کیے تو ہم نے جانا کہ یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا ہے اس کے علاوہ اور بھی ایسی بہت سی ایسی وجوہ تھیں جن کی بناء پر ہم نے ایسا سوچا تھا۔ کشمیر کے عوام نے شیخ عبداللہ کی قیادت میں کشمیر پر پاکستانی قبائلی یلغار کی مخالفت کی تھی اور ہندوستان سے الحاق کو قبول کر لیا تھا مگر مسئلہ اپنے حل سے کوسوں دُور تھا اور اس کی وجوہ کچھ ہندوستانی اور کچھ پاکستانی تھیں۔

پاکستان نے ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کو کبھی تسلیم نہیں کیا' وہ اسے دوقومی نظریے کی بناء پر اپنا کہتا ہے اور یہاں تک کہتا ہے کہ جب تک مسلم اکثریتی کشمیر پاکستان میں شامل نہیں ہوتا' دوقومی نظریہ مکمل نہیں ہوگا۔ دوقومی نظریے کی ریت میں سر چھپانے والے پاکستان کو یہ معلوم نہیں کہ مشرقی پاکستان نے خود کو الگ کر کے دوقومی نظریے کو دفن کر دیا ہے۔ بنگلہ دیش بننے سے ثابت ہوا کہ ان کے لیے مذہب سے زیادہ زبان' ثقافت اور علاقائی خودمختاری زیادہ اہم ہیں۔ سیاسی اتحاد کے لیے صرف مذہب ہی کافی نہیں بعض معاملات میں زبان اور ثقافت مذہب کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اتحادی عنصر بن جاتے ہیں۔

کشمیر کا معاملہ بھی کچھ اس سے مختلف نہیں۔ بنگال مسلمانوں کی طرح کشمیری مسلمانوں کو بھی مضبوط ثقافتی اور لسانی رشتوں کا احساس ہے اور یہ عنصر مذہبی اشتراک پر غالب آ جاتے

ہیں۔ کشمیری اسلام کی جڑیں صد فیصد کلچر میں پیوست ہیں۔ پاکستان جس دوقومی نظریے کا دعویٰ کرتا ہے، کشمیر والوں نے اس کی کبھی توثیق نہیں کی نہ اس کا کوئی ثبوت ہے۔ حتیٰ کہ 1989ء میں جب کشمیریوں نے علم بغاوت بلند کیا' ان کا نعرہ پاکستان سے ادغام کے بجائے آزادی تھا۔ گویا دوقومی نظریے کی بناء پر کشمیر کے پاکستان پر دعوے کی حقیقت صرف اتنی ہے۔

لیکن مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے۔ مسئلہ کشمیر کو پاکستان کے سارے عوام کے بجائے صرف پنجاب کے حکمران طبقے ہوا دیتے ہیں۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد کے چھوٹے صوبوں کے لوگ یا تو مسئلہ کشمیر سے لاتعلق ہیں یا اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان صوبوں کے لوگ اب دوقومی نظریے پر ہی زور نہیں دیتے اور اب اس کی صرف تاریخی اہمیت باقی رہ گئی ہے۔ یہ صوبے اپنی خودمختاری کے لیے جہدآزما ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پنجاب کا ان پر غلبہ رہا ہے اور وہ ان کی خواہشات اور مطالبات سے انکاری ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تین صوبوں میں مذہب اب کوئی مضبوط مشترکہ بندھن نہیں رہا۔ ان کے لیے مذہب کے مقابلے میں زیادہ اہمیت ثقافتی اور لسانی شناخت کی ہے۔

لشکر طیبہ اور جیش محمد جیسی انتہا پسند طاقتوں نے جہاد کا جو نعرہ بلند کیا ہے اس کا مذہبی جواز کوئی نہیں ہے۔ اوّل یہ کہ قرآن میں جنگ کے لیے جہاد کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ لفظ جہاد کا لغوی معنی ہے بُرائی کے مقابلے کے لیے جدوجہد کرنا' ہوس اور لالچ پر کنٹرول کرنا اور عدل پھیلانا۔ قرآن نے جنگ کے لیے لفظ قتال استعمال کیا ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جارہا ہے کشمیری مسلمان صوفیوں کے اسلام پر یقین رکھتے ہیں اور صوفیاء نے خودغرضی' ہوس اور یہ بھی اقتدار پر قابو پانے کو جہاد قرار دیا ہے اور صوفی اس کو جہادِ اکبر کہتے ہیں۔

جہادی گروپ نہ صرف امن کے نصب العین بلکہ سلامتی اور امن کے مذہب اسلام کے ساتھ بھی بڑی بے انصافی کررہے ہیں۔ جنہوں نے یہ جنگجو گروپ بنا رکھے ہیں' انہیں اسلام کا صحیح مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان نام نہاد جہادیوں کی اکثریت مدرسوں کے طلباء کی ہے جنہیں بے انصافیوں کے خلاف شدید غصہ ہے' اسی غصے کو مفاد پرست عناصر اپنے مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وادی کے لوگ جنگ نہیں' امن چاہتے ہیں اور شدت سے امن

چاہتے ہیں۔1989ء میں جو کچھ ہوا وہ دراصل وادی کے اندر سیاسی صورتِ حال کے خلاف ردِعمل تھا۔ اصل بات وہ ہے جو بار بار کہی گئی ہے کہ ہندوستانی حکومت نے کشمیری عوام کی جمہوری خواہشات کو ہرگز پورا نہیں کیا' کشمیریوں نے شیخ عبداللہ کی قیادت میں اس لیے ہندوستان سے الحاق کیا تھا کہ سیکولر جمہوریت نہ صرف ان کی خودمختاری کا احترام کرے گی بلکہ ان کو ثقافتی اور علاقائی اُمنگوں کو پورا کرنے کی بھی آزادی دے گی۔ یہ خواب تھا جو کبھی پورا نہیں کیا گیا۔

خودمختاری بھی آہستہ آہستہ کم کردی گئی اور تو اور آزادانہ الیکشن بھی ناممکن بنا دیئے گئے۔ کشمیر میں مرکزی حکومت نے ایک کے بعد دوسرا کٹھ پتلی وزیراعظم بنایا اور جس نے کوئی بات ماننے سے ذرا سا بھی انکار کیا تو پھر کشمیری عوام پر کوئی اور مصیبت کھڑی کردی گئی۔ گورنر جگ موہن کے رویے اور 1988ء میں مرکزی حکومت کے سامنے فاروق عبداللہ کے ہتھیار ڈالنے کے باعث کشمیری عوام ناراض ہوگئے' وہ متحد ہوگئے اور انہوں نے یک آواز آزادی کا نعرہ لگا دیا۔ مرکز کی حاکمیت کے خلاف لڑنے والے لوگوں کو عوام کی طرف سے بے پناہ حمایت حاصل ہوئی جسے دیکھ کر مرکزی حاکموں کو یقین کر لینا چاہیے تھا کہ فوری طور پر کشمیریوں کی شکایات کو دُور کرنا اور ان کے جائز تقاضے ماننے کا وقت آ گیا ہے۔

بدقسمتی تو یہ ہے کہ وی پی سنگھ کی حکومت نے تمام صورتِ حال کا غلط اندازہ لگایا اور کشمیریوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے جائز طریقے آزمانے کے بجائے انہیں دبانا شروع کردیا۔ یہ سچ ہے کہ 1989ء میں جذبات بہت بھڑکے ہوئے تھے اور وادی کی صورتِ حال سے نمٹنا آسان نہ تھا مگر سیاسی دانش مندی کا تقاضا تھا کہ سختی کرنے کے بجائے معاملات کو بڑے احتیاط سے سلجھایا جائے۔ کشمیری یک زبان ہوئے تو طلباء اور جوانوں کو وادی کے اندر بندوق اُٹھانے کا حوصلہ مل گیا۔1989ء کی جنگ جوئی کی صورتِ حال سے بیشتر کے احوال کو ایک پاکستانی مبصر نے یوں خوبصورتی سے بیان کیا:

''نہ امن نہ جنگ'' مگر ہندوستانی حکام نے بھی حالات کو سمجھنے کے بجائے اتنی ہی غلطی کی جتنی غلطی کشمیری عوام نے کی۔ کشمیریوں نے سوچا کہ آزادی اگلے موڑ پر آن پہنچی ہے اور ہندوستان حکومت نے کہا کشمیریوں کو کچلنے اور سبق سکھانے کے لیے چند ہزار نیم فوجی دستے بھیجنے

کافی ہوں گے۔

اب ساٹھ ہزار کے قریب جانوں کے اتلاف کے بعد کشمیریوں کو احساس ہوگیا ہے کہ عسکریت انہیں آزادی نہیں دلاسکتی اور دوسری طرف حکومت ہند کو احساس ہوا کہ جتنی چاہے طاقت استعمال کی جائے، کشمیریوں کی حقوق کی جنگ کی روح کو نہیں کچلا جاسکتا اب دونوں کی خواہش ہے کہ امن قائم ہو اور مسئلہ کا باعزت حل نکل آئے۔ حال ہی میں انگریزی ہفت روزہ کشمیرامیجز نے جو سروے کرایا ہے اس کے مطابق کشمیر کے عوام مار دھاڑ سے تنگ آ چکے ہیں اور امن چاہتے ہیں۔ یہ سروے واجپائی کی طرف سے رمضان کے دوران امن قائم رکھنے کی مدت میں توسیع کے بعد کیا گیا اس سروے کے مطابق 92 فیصد کشمیری امن چاہتے ہیں، انہوں نے رمضان میں امن قائم کرنے کی سرکاری کوشش میں توسیع کو بھی پسند کیا۔ وادی میں جن لوگوں سے انٹرویو کیا گیا ان کی 54 فیصد نے امید ظاہر کی کہ ''رمضان امن'' کے باعث گفت و شنید کے دروازے کھلیں گے۔

56 فیصد لوگ چاہتے ہیں کہ ہندوستان پاکستان سے بات چیت کرے، 24 فیصد کا کہنا ہے کہ تینوں فریق یعنی سہ طرفہ بات چیت ہونی چاہیے۔ یہ سروے رمضان میں اس وقت کیا گیا جب واجپائی نے یک طرفہ طور پر فوجی اور پولیس کارروائی روک دی تھی۔ سروے کے مرتبین کا کہنا ہے ''ناامیدی کے باوجود کشمیر کے عوام نے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی طرف سے فائر بندی کے بعد امیدیں وابستہ کر لی ہیں۔ اکثر مسلمان روزے سے ہوتے ہیں اور ہمہ وقت دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ اس بدقسمت سرزمین پر امن کا سورج طلوع ہو۔'' سروے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ جس بھی کشمیری عورت سے سوال کیا گیا اس نے امن کے حق میں بات کی ایک سکول ٹیچر ظریفہ نے کہا کہ ''فائر بندی کا خیال بھی بڑی بات ہے۔''

مسئلہ کے کسی بھی حل کے لیے لازم ہے کہ امن قائم ہو۔ پاکستان کے جنگجو لشکر طیبہ خصوصاً اس کے لیڈروں کا بڑا حصہ حالت جنگ جاری رکھنے سے وابستہ ہے اس لیے وہ بے گناہ لوگوں کو نشانہ بنا کر فائر بندی کو سبوتاژ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر ہمیں اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور ہمیں فائر بندی میں مزید توسیع کی کوشش کرنی چاہیے۔ عسکریت پسند جتنے بے گناہ لوگوں کو نشانہ بنائیں گے، وہ کشمیری عوام سے اور دُور اور الگ تھلگ ہوتے جائیں گے اور سروے

کے مطابق وہ پہلے ہی بہت سی حمایت سے محروم ہو چکے ہیں۔

اگر ہم عسکری عناصر کے ان حملوں کی بناء پر فائر بندی ختم کر دیتے ہیں تو اس طرح ہم نہ صرف اہلِ کشمیر کو بلکہ ساری دنیا کو مایوس کریں گے۔ فائر بندی کے اعلان اور اس میں توسیع کے باعث ہندوستان کو خاصی خیر سگالی حاصل ہوئی ہے اور اگر اس میں توسیع کی جاتی ہے تو اور بھی نیک نامی ہو گی اور ہمارے رویے کے باعث پاکستان بھی بہتر رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا ورنہ بین الاقوامی سطح پر اسے جو حمایت حاصل ہوئی ہے، وہ اس سے محروم ہو جائے گا۔

بعض ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر فائر بندی کے بعد کشمیری عوام کے لیے مناسب سیاسی اور معاشی پیکیج بھی دے دیا جائے تو اس سے کشمیریوں کے دل جیتنے میں بڑی مدد ملے گی۔ پاکستان نے (ہمارے) زلزلہ زدگان کے لیے مالی امداد بھیج کر اچھا قدم اُٹھایا ہے اور جنرل پرویز مشرف نے واجپائی سے بات کر کے برف کو کچھ پگھلایا ہے۔ یہ حوصلہ بخش نشانیاں ہیں اور انہی کی بناء پر پیش قدمی کا سامان کیا جانا چاہیے۔

کوئی یہ نہیں کہتا کہ کشمیر کا مسئلہ فوراً حل ہو جائے گا۔ صرف آغاز کے لیے صحیح راستہ اختیار کرنے میں ہی بڑے صبر اور وقت کی ضرورت ہے۔ تاہم ہمیں اپنی طرف سے صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ پہلے جہاں تک ہو سکے، کشمیریوں کی سیاسی اُمنگوں کو پورا کیا جائے اور پیرا ملٹری فورسز کو واپس بلانے یا کم کرنے کے لیے فضا بنائی جائے۔ کشمیریوں کی تسکین کے لیے ہماری طرف سے یہ ایک بڑا قدم ہو گا اور اسی صورت میں ہم پورے اعتماد کے ساتھ پاکستان سے گفت و شنید کر سکتے ہیں۔ 1947ء میں جب پاکستانی قبائل نے کشمیر پر یلغار کی تھی تو اہلِ کشمیر نے پوری طرح ہندوستان کا ساتھ دیا تھا اگر ہندوستانی حکومت سختی اور جبر ترک کر کے کشمیریوں کی سیاسی اُمنگوں کو پورا کرے تو 47ء کی طرح کشمیری پھر ہندوستان کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ کشمیر کا صوفیانہ اسلام زیادہ دیر عسکریت برداشت نہیں کر سکتا، کشمیریوں کو جارحانہ بنیاد پرستی کے بجائے سیکولر جمہوریت زیادہ راس آتی ہے۔

(15-مارچ 2001ء)

پاک و ہند تعلقات

پاکستان کی نصابی کتابوں میں ہندوستان کی خلاف نفرت

ہندوستان کی نصابی کتابوں میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے خلاف انتہا درجے کا متعصبانہ رویہ روا رکھا گیا ہے اسی طرح پاکستان کی نصابی کتابیں بھی ان سے کچھ مختلف نہیں۔ انہیں لکھا ہی اس طرح گیا ہے کہ ہندوؤں اور ہندوستان کے خلاف نفرت بڑھے۔ دراصل دونوں ملکوں میں مقتدر طاقتوں نے اپنے اپنے سیاسی مفادات کے لیے دونوں میں نفرت پھیلانا ضروری گردانا ہے۔ کتابیں صرف متعصب ذہنیت والے ہی نہیں لکھتے بلکہ انہیں اسی زاویے سے خاص مقصد کے لیے لکھوایا جاتا ہے۔ تعصب سیاسی حوالے کے بجائے جہالت کی پیداوار ہوتا ہے مگر ہندوستان اور پاکستان میں کتابیں مخصوص مقاصد کو سامنے رکھ کر لکھوائی جاتی ہیں اس لیے تعصب سے بھی زیادہ شرانگیز ہوتی ہیں۔ انہی نصابی کتابوں کے ذریعے معصوم ذہنوں میں نفرت کے بیج بوئے جاتے ہیں۔

پاکستان کی ایک ماہر تعلیم اور معروف محقق روبینہ سہگل نے بڑی تفصیل سے پاکستانی نصابی کتابوں کا مطالعہ کیا اور مضمون لکھا جس کا عنوان ''نفرت کا سبق...... بنیاد پرستی جدیدیت اور تعلیم'' یہ مضمون گزشتہ سال برلن میں ساؤتھ ایشیا سیمینار میں پیش کیا گیا اس مضمون میں دلچسپ مواد اکٹھا کیا گیا ہے اور پاکستانی کتابوں سے بڑے تفصیلی اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ اپنے مضمون کے ابتدائیہ میں کہتی ہیں ''تعلیم کو عموماً ایک ایسا طاقتور وسیلہ سمجھا جاتا ہے جس کے ذریعے جدیدیت اور ترقی کے دور میں داخل ہونے کی سبیل نکالی جاتی ہے اس سے امید رکھی جاتی ہے کہ یہ معاشرے کو سائنٹفک علم اور روشن خیالی سے مسلح کر کے مستقبل کی طرف لے جائے گی۔ سرکاری، سیاسی، عوامی، قومی اور بین الاقوامی مکالمے میں اسے ہمیشہ ایک ایسی ترقی پسند طاقت گردانا گیا ہے جو ذہن کو روشن اور کشادہ بناتی ہے اور معاشرے میں رواداری اور ہم

آہنگی پیدا کرتی ہے۔''

لازم ہے کہ تعلیم ایک ترقی پسندانہ، روادار، غیر متشددانہ اور ہمدردانہ زاویہ نظر بخشے اور رنگ، نسل، ذات برادری اور عقیدے کی تنگ حد بندیوں کو توڑے۔ تعلیم کا مقصد آدمی کی ایسی پیداواری اور اخلاقی شخصیت بنانا ہے جو اپنے معاشرے کو دوسروں کے لیے قابلِ رشک بنا دے۔ تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے کہ طالب علم کو دوسروں کا جیسے کہ وہ ہیں، احترام کرنا سکھائے نہ کہ دوسروں کو اپنے سانچے میں ڈھالنے یا اپنے جیسا بنانے کا سوچے۔ دوسروں کو ہو بہو اپنا عکس نہ گردانا جائے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری نصابی کتابیں اسی قسم کی تعلیم دیتی ہیں، ہم دوسروں کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر سے فیصلے دیتے ہیں اور اسی حساب سے انہیں قبول یا رد کرتے ہیں جو ہمارے سانچے میں نہیں ڈھلتے ہم ان سے نفرت کرتے ہیں یوں ہماری نصابی کتابیں عدم رواداری اور دوسروں کو رد کرنے کی تعلیم دیتی ہیں، انہیں قبول کرنے پر مائل نہیں کرتیں۔''

روبینہ یہ بھی کہتی ہیں کہ پاکستان کا نظام تعلیم ٹیکنیک یا طریق پر منحصر ہے نہ کہ مواد اور موضوع پر۔ نواز شریف کی حکومت نے 1988ء میں پاکستان کی تعلیمی پالیسی بنائی جس میں زور اس بات پر دیا گیا کہ کس طرح پڑھایا اور سکھایا جائے (ٹیکنیک) نہ کہ کیا پڑھایا اور سکھایا جائے، کیسے پڑھایا جائے پر زور تعلیم اور تدریس کو ایک ٹیکنیکل یا مکینیکل شہ بناتا ہے اور اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیتا ہے کہ تعلیم ایک اخلاقی اور سیاسی عمل ہے اور اصل مسئلہ بھی یہ ہے کہ کیا پڑھایا جائے، والا باب ہی غائب ہے۔

ہندوستان کی طرح پاکستان کی نصابی کتابوں میں بھی عورتوں کے بارے میں رویہ ناپسندیدہ ہے۔ پاکستان کے ایک صحافی نصرت جاوید اخبار دی نیوز میں لکھتے ہیں:

''نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ پدرسری نظام کی قدامت پسند اقدار کی نمائندہ ہے۔ جن اقدار کا مدعا یہ ہے کہ عورت کو کس طرح کنٹرول اور تابع کیا جائے، خاندانی وقار کو بچانے کے لیے غیض جھلک پڑتا ہے، ہماری عزت اور ہماری اقدار کے نام پر قتل دراصل عورت سے اس نفرت کا اظہار ہے جیسی نفرت طالبان کو عورت سے ہے وہی پی ایم ایل این کے اعصاب پر سوار ہوئے۔ خاندانی عزت کے نام پر سامیہ عمران کے قتل کے سلسلے میں سینٹ میں جو شور و غوغا ہوا اس پر پی ایم ایل این کے لیڈر سرانجام خان نے بلند آواز میں کہا ''ہاں! ہم پٹھانوں کو اس

کا قیمہ قیمہ کر دینا چاہیے جو ہماری عزت کو داغ دار کرے۔'' یہ شخص پاکستان مسلم لیگ این کے سیکرٹری جنرل ایسے بڑے عہدے سے نوازا گیا ہے۔''

پاکستانی نصابی کتابوں میں پورے زور شور سے علیحدگی پسندی اور قیامِ پاکستان کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی طرف سے سوشل سٹڈیز کی چھٹی جماعت کی کتاب میں لکھا ہے'' آج ہم سارے پاکستانی ایک منفرد انداز اور سٹائل سے زندگی گزارتے ہیں، ہمارا لباس، ہماری موسیقی، ہماری زبان، ہمارے سوچنے کے ڈھنگ سب ہمارے اپنے ہیں اور دوسرے تمام علاقوں اور تقاضوں سے مختلف ہیں۔ ہمارے یہ نادر انداز صدیوں کے سفر کی دین ہیں۔''

آٹھویں جماعت کی سوشل سٹڈیز کی نصابی کتاب میں قیام پاکستان کے ناقدانہ سیاسی جواز میں مسلم لیگ کو تمام ذمہ داریوں سے بری کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

'' جناح کے چودہ نکات کے ذریعے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو تحفظ مل گیا تھا اگر انہیں قبول کر لیا جاتا تو مسلمانوں کے اندر سے یہ خوف نکل جاتا کہ انہیں غلام بنا لیا جائے گا مگر جب کانگریس نے محض ضد کی بناء پر ان نکات کو ماننے سے انکار کر دیا تب مسلمانوں نے ایک الگ وطن بنانے کا فیصلہ کر لیا، وقت کے ساتھ ساتھ کانگریس کی مسلمانوں سے دشمنی بے نقاب ہوتی گئی۔''

اس پیرے میں کانگریس کو ضدی یا خودسر دکھایا گیا ہے اور یہ کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان ہندو اکثریت کے غلام بنالیے جاتے۔

اسی مضمون کی نہم اور دہم جماعتوں کی کتابوں میں '' نظریہ پاکستان'' کے عنوان کے تحت ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا ہے۔'' نظریہ پاکستان کی بنیاد اسلامی نظام کے افکار پر ہے اور یہ نظریہ بھی دراصل برصغیر میں ہندوؤں اور انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے استحصال کے ردعمل کے باعث وجود میں آیا۔ یہ ہندوستان میں رائج اس نظام کے خلاف بغاوت تھا جہاں مسلمانوں اور ان کی ثقافت پر ہندو قوم پرستی کو ٹھونسا گیا تھا۔'' نصابی کتاب میں یہ بھی کہا گیا صدیوں ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود ہندو اور مسلمان اپنے اپنے منفرد کلچر اور تہذیب کو ترک نہ کر سکے اور ایک دوسرے سے دُور دُور رہے۔ ایک قوم بننے کے لیے ایک دوسرے کے

طرزِ حیات میں مدغم نہ ہو سکے۔ ثقافت، تہذیب اور نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ اسلام تھا جو کسی دوسرے نظام میں اس لیے ضم نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اللہ کی وحدانیت پر قائم ہے جبکہ دوسری طرف ہندو مذہب میں کئی خدا ہیں پھر بے شمار خداؤں میں یقین رکھنے والی ایک قوم اللہ کی وحدانیت پر کیسے یقین لے آتی اور ہندو اور مسلم طرزِ فکر میں یہی اصل اختلاف ہے۔''

یہاں سب کچھ سمیٹ کر معاملہ صرف خدا کی وحدانیت تک لایا گیا ہے گویا قوم کی تشکیل صرف ایسے مذہبی عقیدوں کی بناء پر ہوئی ہے۔ دوسری طرف مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے علماء متحدہ یا مشترکہ قوم پرستی کی مکمل حمایت اور دوقومی نظریے کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ نصابی کتاب میں مزید لکھا گیا ہے ''اسلام امن اور بھائی چارے کا پیغام دیتا ہے۔ مگر ہندومت میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں۔'' مزید یہ کہ اسلام بھائی چارے، مساوات اور انصاف کا درس دیتا ہے، یہ رنگ و نسل اور مرتبے کی بناء پر امتیاز روا نہیں رکھتا بلکہ ہندو معاشرہ کی بنیاد ذات پات پر ہے جو ہماری انسانیت کی تذلیل ہے۔ نقطۂ نظر اور طرزِ حیات میں اتنے بڑے فرق کے بعد مسلمان اور ہندو ایک قوم کیسے بن سکتے تھے۔ افکار میں اس قدر بُعد تھا کہ اسے دُور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک ساتھ رہے مگر اجنبیوں کی طرح اس لیے مسلمانوں کے لیے تقسیم ہند کے مطالبے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو کچھ (ان کتابوں میں) کہا گیا ہے، وہ سچ کی تضحیک ہے۔ پاکستان ان وجوہ یا بنیادوں پر قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ وجوہ تو کتاب میں ایجاد کی گئی ہیں اصل جدوجہد سیاسی اور اصلی سوال اقتدار میں حصہ داری کا تھا جو سوال کانگریس اور مسلم لیگ میں تسلی بخش طور پر طے نہ ہو سکا۔ جناح صاحب کو اس سوال سے کوئی خاص تعلق نہ تھا پھر ہر کوئی جانتا ہے کہ پاکستان کے معاشرے میں معاشرتی مراتب کو کتنی اہمیت حاصل ہے اس کے لیے پاکستان میں کسی ثبوت کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ نسلی اور فرقہ وارانہ چپقلش ثابت ہو چکی ہے اور یہ بھی کہ قوم سازی کے لیے صرف مذہب کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتا، کسی خاص نسلی گروپ کے غلبے پر مبنی مذہبی قوم پرستی کے جیسے کہ پاکستان میں ہے، مقابلے میں مساوات اور انصاف پر مبنی سیکولر قوم پرستی زیادہ کارگر اور پائیدار ہوتی ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ سوشل سٹڈیز کی پانچویں جماعت کی کتاب میں بنگلہ دیش کی تحریک

کی تمام تر ذمہ داری مشرقی پاکستان کے ہندوؤں پر ڈال دی گئی ہے اور لکھا ہے "1965ء کی جنگ کے بعد ہندوستان نے مشرقی پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں نے لوگوں کو مغربی پاکستان کے خلاف اُکسایا اور پھر دسمبر 1971ء میں خود ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اس سازش کے باعث مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوگیا۔ چنانچہ ہم سب کو فوجی تربیت حاصل کرنی چاہیے تاکہ ہم مستقبل میں دشمن کے منصوبوں کو ناکام بنا سکیں۔"

یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اس سے مساوات' انصاف اور مظلوم نسلی گروہوں کے مطالبات کے لیے احترام کے بجائے اس سے عسکریت کو فروغ ملتا ہے جو انتہائی خطرناک ہے۔ پھر بنگلہ دیش کے قیام میں مجیب الرحمٰن اور ان کی عوامی لیگ کے کردار کا بھی کوئی ذکر نہیں' تمام کا تمام الزام مشرقی پاکستان کے ہندوؤں یا ہندوستان کے ہندوؤں پر تھوپ دیا گیا ہے۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے تیسری جماعت کے لیے اسی مضمون کی جو کتاب چھاپی ہے اس میں پاکستان کو امن اور خوشحالی کی ایسی سرزمین کہا گیا ہے جہاں ہر کوئی پُرمسرت زندگی گزار رہا ہے اور لکھا ہے "شاہجہاں کے بیٹے اورنگ زیب بڑے نیک حکمران تھے' انہوں نے لاہور میں بادشاہی مسجد تعمیر کرائی جو دنیا کی بڑی بڑی مسجدوں میں شمار ہوتی ہے...... آخرکار پاکستان نام کا مسلمانوں کا الگ ملک قائم کیا گیا جس میں ہم سب خوشی خوشی اور مزے مزے سے رہتے ہیں۔"

درست یہ کتاب تیسری جماعت کے طلباء کے لیے ہے پھر بھی اس قسم کی سہل پسندی اور سادگی ذہنوں کو اطاعت گزار بناتی ہے جس میں نقد و نظر کی گنجائش نہیں ہوتی' شاید یہی کچھ پاکستان کے حکمران طبقے چاہتے ہیں۔

پاکستان کی نصابی کتابوں میں ہندوؤں کو ازلی دشمن کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ 1857ء میں جب انگریزوں کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اس میں یہ بیخ لگا دی گئی کہ ہندو فریب اور مکاری کے تحت مسلمانوں سے ملے تھے اور کہا گیا "اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا مگر ہندوؤں نے انتہائی مکاری سے انگریزوں کو قائل کر لیا کہ اس جنگ میں صرف مسلمانوں نے حصہ لیا تھا۔"

ان کتابوں سے نوجوان طالب علموں میں کس قسم کا ذہن پرورش پائے گا؟ اس کا اندازہ لگانا

قطعی مشکل نہیں۔ دراصل یہ سب کچھ پاکستان اور ہندوستان میں مستقل دشمنی قائم رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ پاکستانی کتابوں میں ہندوستان کو عفریت نما دشمن اور ہندوستانی کتابوں میں پاکستان کو دشمن بنا کر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ دونوں ملکوں کے عوام کا فائدہ صرف اور صرف امن میں ہے چنانچہ جس قدر جلدی ہو ایسی کتابیں ترک کر کے ان کی جگہ ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جو دونوں ممالک میں مشترکہ معاملات اور متحدہ ثقافت کو مضبوط بنائیں۔

(31- جنوری 2000ء)

جنوبی ایشیا میں مسئلہ قوم سازی

وطن اور حب الوطنی کے تصورات کے مقابلے میں قوم اور قومیت کا تصور نیا ہے۔ جنوبی ایشیا میں ملک اور قوم کے تصورات اکثر خلط ملط ہو جاتے ہیں اور ایک ہی معنوں میں یا متبادل معنوں میں استعمال ہو جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کی زبانوں میں ملک...... وطن اور ملک...... کا تصور زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ وطن یا ملک ایک ایسے جغرافیائی یونٹ سے وابستہ تھا جس کا ایک حکمران ہو اور جس میں مختلف ذات پات، مذہبی عقائد اور مختلف زبانیں رکھنے والے لوگ رہا کرتے تھے اور اس وطن سے محبت کو سب سے افضل خوبی سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ یا شہزادے کی اس مملکت میں باقی بہت کچھ مختلف ہوتا تھا، صرف جغرافیائی خطہ مشترک ہوتا۔ اہلِ مغرب کے قومی نقطۂ نظر سے یہ لوگ کسی بھی صورت ایک قوم نہیں کہلا سکتے۔ ہندوستان مغلوں کے ماتحت تھا یا انگریزوں کے ماتحت دونوں صورتوں میں یہ ایک انتظامی وحدت یا اکائی تھا۔ سو مغربی اصطلاح کے مطابق ہندوستانی کبھی بھی ایک قوم نہیں تھے۔

تو پھر قوم کی ترکیب ہے کیا؟ مختلف محققوں اور عالموں نے اس کی مختلف تعریف پیش کی ہے۔ عموماً اس سے مراد ایک ایسا علاقہ ہوتا ہے جو ایک تاریخ، مشترک ثقافت، واحد زبان اور سانجھی معیشت رکھتا ہو۔ مغرب والوں کی تعریف کے مطابق وہ قوم ہو ہی نہیں سکتی جس میں بہت سی ثقافتیں اور زبانیں ہوں، یہ مکمل یکساں وجود کا نام ہے اور اسی اصول کی بناء پر سولھویں اور سترھویں صدی میں یورپ میں قومیں وجود میں آئیں جو دوسروں کے لیے مثال بنیں۔ شمالی امریکہ جو برطانیہ کی کالونی تھی، واحد استثناء کی صورت تھا۔ یورپ کے مختلف ممالک کے لوگ بہتر امکانات کی تلاش میں وہاں پہنچے اور پھر 1789ء کے اعلانِ آزادی کے بعد وہاں ایک

MashalBooks.org

متحدہ یا مشترکہ قومیت پیدا ہوئی تو تب امریکی قومیت پر زور دیا گیا اکثر امریکہ کی مثال اس ضمن میں دی جاتی ہے کہ وہاں مختلف قومیتیں پگھل کر ایک روپ یا شناخت بن گئی ہیں۔ یوں امریکی قومیت کا تصور یورپی قومیت کے تصور سے ہٹ کر بنا کیونکہ امریکہ ایک نوآبادیاتی ملک سے تبدیل ہو کر یک قومی ملک بنا۔

ایشیا اور افریقہ کے بہت سے نوآبادیاتی ممالک میں بالکل یہی کچھ ہوا۔ برطانیہ' فرانس' اٹلی وغیرہ نے سامراجی ممالک کی حیثیت سے جس قدر علاقے ممکن ہو سکتے تھے' فتح کیے اور ان کو اپنے زیرانتظام لے آئے جب یہ علاقے سامراجی شکنجے سے آزاد ہوئے تو ان میں کئی مذاہب' کئی عقیدوں' کئی ثقافتوں اور کئی زبانوں کے لوگ پائے جاتے تھے لیکن وہ جدید قومیں یا ریاستیں بن گئے۔ نہ صرف یہ کہ ان سامراجی طاقتوں نے یہ علاقے آپس میں کچھ اس طرح تقسیم کیے کہ ایک ہی زبان اور ایک ہی نسل کے لوگ کئی حصوں یا ملکوں میں بٹ گئے بلکہ اسی وجہ سے آزادی کے بعد ان علاقوں میں قوم سازی کا مسئلہ بھی اُلجھ گیا۔

اس ضمن میں جنوبی ایشیا میں کوئی استثنا نہ تھا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انگریزوں نے تقریباً سارے ہی جنوبی ایشیا کو فتح کر لیا اس میں برما اور سری لنکا بھی شامل تھے مگر ہندوستان کے آزاد ہونے سے پہلے لنکا اور برما کو اس سے الگ کر دیا گیا۔ برما (اب اس کا نام میانمار) اور لنکا (اب سری لنکا) کی علیحدگی کے بعد بھی ایک ایسا ملک ہے جس میں متعدد مختلف نسلی' مذہبی' ثقافتی اور لسانی گروہ آباد ہیں۔ اس کے باوجود اس بات پر زور دیا گیا اور بجا طور پر کہ یہ سب گروہ اتحاد کے ایک دھاگے میں سب پروئے ہوئے ہیں اور ہمارے قومی رہنماؤں نے اسے تنوع میں اتحاد یا ست رنگی میں یک رنگی کا نعرہ دیا پھر سامراجی طاقت کے خلاف اجتماعی لڑائی میں یہ اتحاد قائم رکھنا نسبتاً آسان تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت آزادی کی مشترکہ جدوجہد کے دوران بھی عقیدے اور ذات پات کی بنیاد پر کچھ اختلافات اُبھرنے لگے تھے۔ اچھوتوں اور دوسرے قبائل نے سرکاری ملازمتوں میں اپنا الگ حصہ مانگنا شروع کر دیا تھا۔ تاہم ان کا کچھ نہ کچھ حصہ ریزرو کر کے مسئلہ حل کیا جا سکتا تھا' نچلی ذاتوں کے بابا صاحب امبید کر جیسے لیڈروں نے اچھوتوں وغیرہ کے لیے ملازمتیں مخصوص کرنے کی جدوجہد کی تھی۔

MashalBooks.org

لیکن بڑا اختلاف مذہبی بنیادوں پر اُبھرا' ہندو اور مسلمان قرونِ وسطیٰ کے زمانے سے ایک ساتھ رہتے چلے آئے تھے خصوصاً مغلوں کے عہد میں۔ ان کی بقائے باہمی کے باعث ایک مشترکہ اور متحدہ ثقافت بن گئی تھی لیکن جیسے ہی آزادی کی جدوجہد تیز ہوئی (جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے حصہ لیا) اور آزادی کے آثار قریب نظر آنے لگے تو دونوں برادریوں کے بالائی طبقوں میں آزادی کے بعد اقتدار کی تقسیم کے سوال پر اختلافات اُبھرنے لگے۔ ایم اے جناح کی سربراہی میں مسلم لیگ نے اقتدار میں زیادہ حصہ طلب کیا اور اس ضمن میں آئینی تحفظات اور دوسرے انتظامات کا بھی مطالبہ کیا۔ کیبنٹ مشن کے منصوبہ کے مطابق یہ مسئلہ بھی تقریباً طے ہو چکا تھا اور کانگریس اور مسلم لیگ ایک یونین حکومت میں شامل بھی ہو گئی تھیں مگر (ایک دوسرے کی نیت کے بارے میں) شبہات موجود تھے اور قوم پرست لیڈروں کی طرف سے غیر ذمہ دارانہ بیانات کے باعث یہ انتظام بھی ختم ہو گیا اور آخر کار تقسیم ہو گئی۔

یوں ایک ہی ملک میں سے دو قومیں پیدا کی گئیں لیکن متذکرہ بالا تعریف کے مطابق یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایک قوم نہ تھیں اور ان پر جدید یورپی مثال بالکل لاگو نہیں ہوتی تھی۔ بظاہر ملک کی تقسیم مذہبی بنیاد پر ہوئی تھی جس سے قوم کے ایک نئے تصور یعنی مذہب کی بنیاد پر ایک قوم نے جنم لیا۔ یورپی قومیت کا ماڈل ہرگز ایسا نہ تھا' وہاں خیال یہ تھا کہ مذہب کے بجائے لسانی اور ثقافتی ہم آہنگی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ جناح صاحب نے اس طرح قوم کا ایک نیا نظریہ دیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی زندگی میں مذہب کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی انہوں نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے نئے ملک کے شہریوں کے بارے میں کہا کہ وہ سب پاکستانی ہیں اور مذہب ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ یوں جناح صاحب نے پاکستان ایسے نظریے پر بنایا جس پر انہیں خود یقین نہیں تھا۔

دوسری طرف جمعیۃ العلمائے ہند کے علمائے دین نے مذہبی قوم پرستی کے تصور کو رد کر کے متحدہ قومیت کا جواز پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ متحدہ قومیت کا تصور اسلام کی تعلیمات کے منافی ہرگز نہیں۔ دیوبند کے دارالعلوم کے سربراہ مولانا حسین احمد مدنی نے اسلام اور متحدہ قومیت کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اور قرآن و حدیث سے ثابت کیا کہ متحدہ قوم پرستی اسلام کی

تعلیمات سے ہم آہنگ ہے۔ علماء نے تقسیم ہند کی حمایت نہیں کی، مسلمانوں کا بالائی طبقہ اس کا پُرجوش حامی تھا۔ یہ بہت اہم تضاد ہے جس کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مسلمانوں کے سیکولر بالائی طبقے نے تقسیم ہند کا مطالبہ مذہبی بنیادوں پر کیا لیکن مسلمانوں ہی کے قدامت پسند علماء نے اس کی پُرزور مخالفت کی۔ سیکولر بالائی طبقہ مذہب پر یقین کم رکھتا تھا مگر اسے سیاسی سودے بازی کے لیے استعمال کرتا تھا اور جب سودے بازی نہ ہوسکی وہ اقتدار میں مطلوبہ حصہ نہ لے سکا تو اس نے علیحدگی اختیار کی۔ سچ تو یہ ہے کہ تقسیم مذہب کی بناء پر نہیں ہوئی تھی، بالائی طبقے کے سیاسی مفادات کے باعث ہوئی تھی۔

قوم سازی کے مسئلے

جب دونوں ملکوں ہندوستان اور پاکستان کو آزادی مل گئی تو پھر دونوں کو قوم سازی کے مسائل پیش آئے۔ پاکستان میں زندگی کے نئے نئے حقائق کے باعث مذہبی ایکتا میں رخنے پڑنے لگے اور نسلی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر شدید اختلافات اُبھرنے لگے۔ اُردو بولنے والے مہاجرین پاکستان کے بنانے میں سب سے آگے آگے تھے، انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ نئے ملک میں ان کی نسلی اور ثقافتی جڑیں ہی نہیں۔ شروع میں وہ انتظامیہ اور معیشت پر حاوی رہے مگر وہ عرصہ بڑا مختصر تھا۔ فوراً بعد ہی پاکستان کی غالب قومیت والے پنجابیوں نے اپنا زور دِکھانا شروع کیا اور مہاجروں سے اہم مناصب لے لیے۔ مہاجروں کو احساس ہوا کہ انہیں قومیت سازی کے معاملے سے ہی الگ کر دیا گیا ہے۔ انہیں اقتدار سے دُور رکھنے کا عمل اس وقت تیز تر ہو گیا جب ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے۔ بھٹو صاحب کی پاکستان پیپلز پارٹی کی سندھ میں بڑی مضبوط بنیاد تھی اور یہ سندھی قوم پرستی کی دلداری کرتی تھی۔ کراچی اور حیدرآباد (سندھ) میں سندھیوں اور اردو بولنے والوں میں تصادم بھی ہوئے جن میں سینکڑوں لوگ مارے گئے۔

اس سے پہلے بنگالی بولنے والے مسلمان پاکستان سے علیحدہ ہو گئے۔ بنگالی پاکستان میں اکثریت میں تھے اور 1970ء کے انتخابات میں نیشنل عوامی پارٹی (عوامی لیگ۔ مترجم) نے مجیب الرحمٰن کی قیادت میں اکثریت حاصل کر لی تھی مگر مغربی پاکستان کے لیڈروں نے

انہیں پاکستان کا وزیراعظم بننے ہی نہیں دیا۔ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو شکایت تھی کہ ان کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں ہو رہا اور مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی نوآبادی بنا دیا گیا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کو اپنی زبان اور ثقافت پر بھی بڑا ناز تھا' انہوں نے اُردو کو واحد قومی زبان بنانے پر بھی شدید ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اپنی لسانی اور ثقافتی خودمختاری برقرار رکھنا چاہتے تھے جبکہ مغربی پاکستان کے سیاسی رہنما بنگالی زبان اور ثقافت کے بارے میں بے حس تھے۔ پھر پاکستان میں فوجیوں کا راج بھی بہت عرصہ قائم رہا اس لیے وہاں شہری سوسائٹی کی قائم بالذات حیثیت کا بھی شعور نہ تھا۔ ان حالات میں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ اپنے مسائل حل ہی نہیں کر سکتے۔ پھر مسلح بغاوت ہوئی اور ایک سال کی جنگِ آزادی کے بعد بنگلہ دیش وجود میں آ گیا۔

پاکستان سے الگ ہو کر بنگلہ دیش کے قیام نے ایک بار ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیا کہ مختلف نسلی اور ثقافتی گروپوں میں مذہب سیاسی اور قومی اتحاد کی مضبوط بنیاد نہیں بن سکا۔ بنگلہ دیش کی علیحدگی کے بعد بھی پاکستان کو شدید نسلی کشیدگی کا سامنا ہے۔ ہندوستان نے آزادی کے فوراً بعد لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل نو کر کے مختلف لسانی گروپوں کی نفی کر دی۔ پاکستان میں وحدانیت پر زیادہ زور رہا اور متعدد لسانی صوبوں' سندھ' بلوچستان اور صوبہ سرحد کو لسانی خودمختاری دینے سے انکار کیا گیا۔ بادشاہ خان (سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان) کی سرکردگی میں پختونستان کی تحریک کو کچلا گیا۔ پاکستان میں علاقائی اور لسانی شخصیات کا بڑا مقام ہے اور خودمختار لسانی صوبوں کی تشکیل کا مطالبہ موجود ہے لیکن پنجاب اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لیے صوبائی خودمختاری کے تصور کو قبول نہیں کرتا۔ اب خود پنجاب کے اندر ہی سرائیکی قوم پرستی کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ سرائیکی والوں کا دعویٰ ہے کہ پنجاب میں پنجابی بولنے والوں کی نہیں ان کی اکثریت ہے' وہ سرائیکستان کے نام سے الگ صوبہ چاہتے ہیں۔

گزشتہ کئی سالوں میں کراچی کو کئی بار غسلِ خون دیا گیا' پہلے مہاجروں اور سندھیوں میں تصادم ہوا پھر مہاجروں اور پٹھانوں کے فسادات میں سینکڑوں لوگ مارے گئے جب ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے تو انہوں نے سندھیوں کی شکایات دُور کرنے کے لیے انہیں سرکاری ملازمتوں میں زیادہ حصہ دینے کی کوشش کی جس سے وہ اب تک محروم تھے اور یہ کہنے کی

MashalBooks.org

ضرورت تو نہیں کہ پہلے یہ مراعات مہاجروں کو حاصل تھیں اب انہی میں سندھیوں کو حصہ دار بنایا گیا' مہاجروں کا پارہ چڑھ گیا کہ انہیں پاکستان میں تمام مراعات سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ان کی مایوسی نے مختلف صورتوں میں ظاہر ہونا شروع کیا۔ یونیورسٹی کے طالب علموں کی قیادت میں مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) وجود میں آئی اور یہ قائم ضیاء کے عہد میں ہوئی اب مہاجر قومی موومنٹ والے سندھی قوم پرستوں کے بجائے پولیس اور پیراملٹری فورسز سے دست و گریبان ہیں۔ مہاجر قومی تحریک انتہائی متشدد ہوگئی ہے پھر ضیا کی حکومت نے اپنی خفیہ فورس کو اس میں داخل کیا اور اسے بھی تقسیم کرا دیا۔ ایک ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین ہیں' دوسری حقیقی مہاجر قومی موومنٹ کہلاتی ہے جو حقیقی کے نام سے معروف ہے۔

کراچی دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح اسی قسم کے مسائل سے دوچار ہے۔ یہ صنعتی اور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز ہے' ملک کی واحد بندرگاہ ہے اس لیے پاکستان کے ہر علاقے سے لوگ اس میں آ کر بس رہے ہیں۔ تقسیم کے وقت بھی شہر کو بہت سے مہاجروں کی میزبانی کرنا پڑی۔ مشرقی پنجاب آنے والے پنجابی مہاجروں نے مغربی پنجاب کو ترجیح دی جبکہ اُردو بولنے والے مہاجروں کے لیے کراچی ایک فطری قیام گاہ تھا۔ تقسیم کے وقت کراچی چند لاکھ نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ تقسیم کے بعد آبادی میں کئی گنا اضافہ ہوا پھر معاشی ترقیاتی دور کا آغاز ہوا تو ملک کے کونے کونے سے لوگوں کے یہاں آنے کا تانتا بندھ گیا۔ آج کراچی کی آبادی ایک کروڑ سے بھی بڑھ گئی ہے اور اگرچہ یہ صوبہ سندھ کا دارالحکومت ہے مگر یہاں سندھیوں کی تعداد 20 فیصد سے بھی کم ہے۔ ایسے حالات میں یہ شہر لازماً شدید نسلی کشاکش کا شکار ہوگا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس وقت پاکستان میں نسلی کشیدگی کا مرکز کراچی ہی ہے۔

پاکستان میں 1979ء میں ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد خاص طور پر شدید فرقہ وارانہ تشدد کا سامنا ہے' پاکستان میں شیعوں کی کل تعداد متنازعہ مسئلہ ہے۔ سنی کہتے ہیں کہ شیعہ 10 فیصد سے زیادہ نہیں' شیعہ حضرات کا دعویٰ ہے کہ وہ 40 فیصد سے کم نہیں۔ غالباً اصل تعداد ان دو اعداد کے درمیان یعنی 20 فیصد ہے۔ چنانچہ شیعہ فرقہ کو اقلیت ہونے کا احساس ہے۔ شیعہ حضرات کو ایران کے انقلاب پر نہ صرف فخر ہے بلکہ ان کا اپنے آپ پر اعتماد بھی بڑھ گیا

ہے سب سے پہلا تنازع اسلامی ٹیکس یعنی زکوٰۃ کی ادائیگی پر ہوا۔ ضیا کی حکومت نے اسلام رائج کرنے کی کوشش میں تمام مسلمانوں پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی قرار دے دی اور اس کی کٹوتی لوگوں کے بینک میں رکھی رقموں سے کی جانے لگی۔ شیعہ صاحبان نے کہا کہ وہ سنی ریاست کو زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتے' یہ صرف شیعہ مذہبی رہنماؤں کو دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اسلام آباد میں بڑا مورچہ لگا دیا۔ شیعہ فرقہ بہت منظم تھا اس نے ضیا حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ شیعہ آبادی کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دے اس احتجاجی تحریک کی سربراہ تحریک جعفریہ تھی اس اور اس جیسے دوسرے معاملات کے باعث سنیوں میں منفی ردعمل ہوا۔

سنی مسلمانوں کے ایک گروپ نے تحریکِ جعفریہ کی سرگرمیوں کا جواب دینے کے لیے سپاہ صحابہ نام کی تنظیم بنالی۔ یہ دونوں تنظیمیں بار ہا ٹکرائیں اور ایک دوسرے کو قتل کرتی رہیں۔ بہت سے ایسے واقعات ہوئے کہ اے کے 47 سے مسلح سکوٹر سوار آتے' مسجدوں میں نمازیوں پر گولی چلا دیتے یا جنازے پر اندھا دُھند گولیاں چلا دیتے۔ تشدد کی ان فرقہ وارانہ وارداتوں میں سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ دیکھنے والا یہ پہلو بھی ہے کہ کراچی میں تو فسادات نسلی بنیادوں پر ہوتے ہیں مگر پنجاب کے بعض شہروں میں فسادات شیعہ اور سنی بنیادوں پر ہو رہے ہیں۔ کراچی میں نسلی فسادات اس لیے ہوتے ہیں کہ یہاں پاکستان کے مختلف نسلی اور لسانی گروپوں کے لوگ مسلسل آ رہے ہیں اس لیے یہاں نسلی الاؤ جل گئے مگر پنجاب میں محرکات بالکل مختلف ہیں۔ پنجاب دوسرے صوبوں پر غلبہ قائم رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے جبکہ دوسرے صوبے سندھ' بلوچستان' سرحد اس کی شدید مخالفت کر رہے ہیں اور پنجاب سے متنفر ہیں۔ ان تمام صوبوں میں علیحدگی کی یا خودمختاری کی تحریکیں چل رہی ہیں' پنجاب اپنا سیاسی غلبہ صرف ایک ہی صورت میں قائم رکھ سکتا ہے کہ نسلی شناختوں کے مقابلے میں اسلامی شناخت پر اصرار کرتا رہے۔

اسی بناء پر پنجاب میں فرقہ واریت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ضیا نے اپنی حکومت کا اخلاقی اور قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے اسلام کے نفاذ کا سہارا لیا تاہم ایک وجہ اور بھی تھی۔ انہیں غیر پنجابی نسلی گروہوں' سندھیوں' بلوچیوں اور مہاجروں کی طرف سے چیلنج درپیش تھا۔ انہوں نے مہاجر قومی موومنٹ میں ہر طرح سے نفاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات بھی

MashalBooks.org

قابلِ ذکر ہے کہ مہاجر قومی موومنٹ نے کراچی میں شیعہ سنی کشاکش کو روکے رکھا۔ اُردو بولنے والے شیعہ اور سنی پنجاب کی بالادستی کے خلاف متحد ہیں اور اگرچہ ضیاء الحق نے ایم کیو ایم کو تقسیم تو کر لیا مگر اسے ختم نہ کر سکے۔ آج بھی سندھ کے اُردو بولنے والے حلقوں میں اس کا وسیع اور گہرا اثر ہے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے چھوٹے گروپوں میں مذہبی یا اسلامی شناخت کے بجائے نسلی بنیادوں پر اتحاد زیادہ مضبوط ہے۔ پنجاب غالب گروپ ہے اس لیے وہاں اسلامی شناخت زیادہ اہم ہے' پنجاب نسلی شناختوں کے بجائے عالمی شناخت کا پتا زیادہ استعمال کرتا ہے۔

اسی بناء پر پنجاب اسلامی تحریکوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور اسی لیے فرقہ وارانہ تنظیمیں بھی مضبوط وجود رکھتی ہیں۔ 60ء کی دہائی تک جماعت اسلامی کا اُردو بولنے والے مہاجروں پر بڑا اثر تھا۔ مہاجروں نے بھی پاکستان میں (جہاں ان کی نسلی' لسانی یا ثقافتی جڑیں نہیں تھیں) اسی عالمی شناخت یا مذہبی شناخت کو زیادہ اہمیت دی تھی مگر جب وہ ملک کی سول سوسائٹی میں کوئی مستقل مقام حاصل نہ کر سکے تو انہیں اپنے غیر اہم اور بے اثر ہونے کا احساس ہونے لگا پھر انہوں نے مذہبی حوالے کے بجائے نسلی حوالہ اختیار کر لیا۔ جماعت اسلامی کی جگہ مکمل نسلی حوالے والی ایم کیو ایم نے لے لی۔ جماعت سندھ خصوصاً کراچی میں کمزور ہو گئی' پنجاب میں (جہاں عالمی شناخت یا اسلامی شناخت کی ضرورت تھی) وہ مضبوط ہو گئی۔ ضیا کا اسلامی پروگرام پنجاب میں زیادہ کامیاب ہوا مگر دوسرے صوبوں میں ٹھنڈا ٹھنڈا ہی رہا۔

اسلامی انتہا پسندوں کی تحریکیں آج کے پاکستان میں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پنجاب میں فروغ پا رہی ہیں۔ پھر یہ پنجاب ہی ہے جو کشمیر کے مسئلے پر اٹک گیا ہے۔ کشمیر ایک اور وجہ سے بھی پنجاب کے لیے زیادہ اہم ہے۔ کشمیر کا مطالبہ دو قومی نظریے کی بناء پر کیا جا رہا ہے جبکہ دوسرے صوبوں میں اب دو قومی نظریے کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ دو قومی نظریے کی منطق یا اصل یہ ہے کہ مذہبی شناخت یا اتحاد نسلی شناخت یا اتحاد سے بالاتر ہوتا ہے۔ کشمیری بھی اپنی مذہبی شناخت کے بجائے اپنی نسلی شناخت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس لیے کشمیریوں کا تضاد ہندوستانی قوم پرستی سے بھی بنتا ہے۔ کشمیر میں اسلامی روایات میں مضبوط مقامی عناصر شامل ہیں جو دوسرے علاقوں کی اسلامی روایات سے مختلف ہیں۔ اس لیے اس کی ایک نادر اور

منفرد اسلامی شخصیت بنتی ہے۔ غالب ہندوستانی قوم پرستی کے مقابلے میں ہوسکتا ہے بعض کشمیری حلقے دو قومی نظریے کے تحت اپنی مذہبی شناخت پر اصرار کرتے ہوں مگر اسے قبول عام حاصل نہیں مگر پنجاب دو قومی نظریے کے جواز کے لیے کشمیر میں بھی دو قومی نظریے کو مضبوط کرنے کے لیے عالمی اسلامی شناخت پر پورا زور لگا رہا ہے۔ اس طرح وہ پاکستان کے اندر کم حیثیت کیے گئے نسلی گروپوں پر اپنا غلبہ قائم رکھنا چاہتا ہے۔

عبدالغفار خان جیسے لیڈروں نے بہت پہلے اس حقیقت کو جان لیا تھا' انہیں اپنے ذاتی تجربات سے پتہ چل گیا تھا کہ وسیع عالمی شناخت (جیسے اسلامی شناخت) کا تصادم مقامی یا نسلی (مثلاً پٹھان) شناخت سے ہوگا اور پٹھانوں کو پاکستان میں کبھی خودمختارانہ ترقی کے مواقع نہیں ملیں گے۔ چنانچہ انہوں نے زوروشور سے پاکستان کی مخالفت کی۔ جمہوری طریق میں قوم سازی میں تمام نسلی' مذہبی' ثقافتی اور لسانی شناختوں کو فروغ کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں اس طرح قوم سازی میں زیادہ پیچیدہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا مگر ایک غالب مذہبی یا لسانی گروپ اس عمل میں اس لیے رخنہ ڈالتا ہے کہ کہیں اس کی اپنی غالب حیثیت کو خطرہ نہ لاحق ہو جائے اس لیے اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لیے وہ مذہبی یا قومی شناخت پر زور دیتا ہے۔ ہندوستان میں مذہبی عناصر ہندوتوا یا انتہا پسند ہندوستانی شناخت پر زور دیتے ہیں اور جمہوری علاقائی' نسلی اور اقلیتی شناختوں کو اس پر قربان کر دینا چاہتے ہیں۔

ہندوستان جمہوری ملک ہے اس لیے یہ مذہبی بنیاد پر ایک خاص حد سے آگے زیادہ دُور نہیں جا سکتا۔ لیکن پاکستان میں سول سوسائٹی کمزور ہے اس لیے اکثریتی مذہب زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ ریاست پر نہ صرف اکثریتی مذہبی شناخت کا کنٹرول ہوتا ہے بلکہ غالب نسل کی شناخت (پنجاب کی) بھی بڑی مضبوط ہے۔ 1970ء میں اگرچہ پاکستان میں اکثریت بنگالیوں کی تھی مگر پنجابی شناخت زیادہ غالب اور مؤثر تھی۔ اس لیے بنگالیوں کے لیے پاکستان سے علیحدگی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ متحدہ پاکستان میں اسلامی سلیت کے مقابلے میں پنجابی شناخت کہیں زیادہ مضبوط ثابت ہوئی۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ ایک نسلی شناخت کا کردار غالب ہو تو وہ مذہبی شناخت سے کہیں زیادہ فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے تاہم آج کل پاکستان میں مذہبی اور نسلی شناخت کا امتزاج ہے۔ پنجاب کے حکمران طبقے

اپنی شرائط پر پاکستان کی سلیت کو برقرار رکھنے کے لیے مذہبی انتہا پسندی کو ہوا دے رہے ہیں۔

مابعد زمانہ جدیدیت میں اگر طریق کار جمہوری نہ ہو اور اس کی بنیاد تنوع کثرت الوجودیت اور انسانی وقار پر نہ ہو تو قوم سازی میں افسوس ناک کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ صحیح جمہوری طریق کا تقاضا ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے تمام نسلی گروہوں کو ترقی کے برابر موقع میسر ہوں‘ چھوٹے بڑے یا اکثریتی اقلیتی تمام مذہبی‘ لسانی اور ثقافتی گروپوں کو احساس ہو کہ وہ قوم سازی کے عمل میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے مذہبی یا نسلی گروہ کو بھی یہ احساس ہو جائے کہ اس عمل میں اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے تو قوم سازی کے عمل کو سخت مشکل درپیش ہوگی۔ سارے جنوبی ایشیا کی قوموں کو یہی مسائل درپیش ہیں کیونکہ کم اہمیت نسلی‘ ثقافتی یا مذہبی گروہوں کو قوم سازی میں برابری کا مقام حاصل نہیں‘ وہ صرف یہی نہیں سمجھتے کہ انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے بلکہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ نفرت کا نشانہ بنائے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جنوبی ایشیا کے ہندوستان‘ پاکستان اور سری لنکا ایسے ملکوں جو شدید قسم کی نسلی اور مذہبی کشاکش موجود ہے‘ وہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ سری لنکا میں تامل مسئلہ 1961ء میں اس وقت پیدا ہوا جب پارلیمنٹ نے آئین بناتے وقت تامل زبان کو اس کا حق نہیں دیا۔ تامل گروہ کو سخت افسوس ہوا اور جب جمہوری طریق سے یہ مسئلہ حل نہ کیا گیا تو پھر تشدد شروع ہو گیا۔ ہندوستان میں کشمیر کا مسئلہ بھی بالکل اسی نوعیت کا ہے۔ دہلی کی مرکزی حکومتوں نے کشمیر میں کبھی مخالف جمہوری حق کو پنپنے نہیں دیا‘ اسے ہمیشہ کشمیر میں ایک ایسی کٹھ پتلی حکومت کی ضرورت تھی جو کشمیری شناخت کو پس پشت ڈالے۔ اب ہندوستان کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے اگر ہندوستانی حکومت نے کشمیر میں جمہوری عمل کو فروغ پانے دیا ہوتا تو کشمیری جوان اس حد تک متشدد نہ ہو گئے ہوتے۔ کشمیر کے معاملہ میں مذہب اور نسل یہ بھی دو عوامل کارفرما ہیں۔

جنوبی ایشیا میں ایک طرف تو نوآبادیاتی ورثہ تھا دوسری طرف آزادی کے بعد برسر اقتدار طبقوں نے قوم سازی کے عمل کو بلاوجہ زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ جنوبی ایشیائی قوموں میں امن اور ہم آہنگی کے فروغ کے لیے لازم ہے کہ سول سوسائٹی کو زیادہ بااختیار بنایا جائے‘ نسلی اختلاف کے اظہار کے لیے زیادہ گنجائش پیدا کی جائے‘ تنوع اور رنگا رنگی کو سراہا جائے اور عدل

وانصاف کو عام کیا جائے۔

(31-مارچ 2000ء)

پاکستان......جمہوری حکومت' سیاست اور پائیداری

''انسانیت کی تاریخ میں قیامِ پاکستان بہت بڑی غلطی ہے۔'' یہ بات پاکستان کی متحدہ قومی تحریک کے رہنما الطاف حسین نے کہی جو ان دنوں لندن میں جلاوطنی کے دن گزار رہے ہیں۔ اپنے قیام کے پچاس برس بعد پاکستان کو سخت مشکلات درپیش ہیں۔ 1971ء میں یہ دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ بنگالی مسلمانوں نے کشت وخون کے بعد علیحدگی اختیار کر لی باقی ماندہ پاکستان اندرونی خلفشار کا شکار ہے۔ سندھی' بلوچی اور پٹھان بے زار ہیں' ہندوستان سے جانے والے مہاجرین بھی محسوس کرتے ہیں کہ ان کا بھی کوئی والی وارث نہیں اور پنجابی مقتدر طبقے ان سے زیادتی کر رہے ہیں۔

جناح صاحب نے دو قومی نظریے کی بناء پر پاکستان بنایا تھا۔ جناح صاحب نے نظریے پر یقین کے بجائے صرف سیاسی مصلحت کے پیش نظر کہا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دونوں قوموں کا مذہب' زبان' ثقافت اور تاریخی ہستیاں مختلف ہیں۔ اس قسم کے نظریے تنقیدی جائزے کی مار نہیں سہہ سکتے اس دو قومی نظریے کے پس منظر میں یہ مفروضہ کام کر رہا تھا کہ ایک برادری صرف مذہب کی بنیاد پر یکتا اور یک رنگ ہو سکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی بناء پر کوئی بھی یک رنگ انسانی گروپ نہیں بن سکتا۔ مذہب زیادہ سے زیادہ اتحاد کا ایک اہم عنصر بن سکتا ہے مگر سب کچھ نہیں بن سکتا۔ پاکستانیوں پر اب یہ بات الم نشرح ہو رہی ہے جبکہ بنگالیوں پر ماضی میں اس کا انکشاف ہو گیا تھا۔

میں کسی مبالغے کے بغیر کہتا ہوں کہ دو قومی نظریے کے بیج انگریزوں نے انیسویں صدی میں اس وقت بوئے تھے جب انہوں نے شرارتاً نہیں جہالت کی بناء پر اور بعد میں سیاسی وجوہ پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنی اپنی جگہ ہم جنس یا یک رنگ برادریاں سمجھنا شروع کیا۔ پھر بیسویں صدی کے شروع میں انہوں نے مذہب کی بناء پر (1909ء میں) جداگانہ انتخابات شروع کیے۔ کسی بھی قومی ریاست میں مذہب کی بناء پر جداگانہ انتخابات کا تصور چل ہی نہیں

سکتا مگر انگریزوں نے بالارادہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ کرنے کے لیے جداگانہ طریق انتخاب رائج کر دیا۔

اصل حقیقت تو یہ ہے کہ جب انگریزوں نے مردم شماری میں مذہب کا خانہ شامل کیا اور مذہبی برادریوں کا قصہ گھڑا تو اس سے پہلے ہندوستانی معاشرے میں ایسا کوئی تصور تھا ہی نہیں' ذات پات یا علاقائی شناخت زیادہ تر پیشوں کے حوالے سے تھی یا علاقائی حوالے سے۔ مثلاً بنگالی قوم یا مالی قوم یا انصاری قوم یا راجپوت قوم وغیرہ وغیرہ۔ ہر مذہبی برادری ذات پات' پیشوں' زبانوں اور علاقوں کے حوالے سے ضمنی طور پر تقسیم تھی۔ ہندوستان کسی ایسی قوم کا تصور نہیں تھا جس کی ایک زبان' ایک ثقافت' ایک مذہب یا ایک سے سیاسی مفادات ہوں جبکہ جناح صاحب کے دوقومی نظریے میں فرض کر لیا گیا کہ ثقافت' زبان' تاریخ اور سیاسی مفادات کے لحاظ سے ہندو اور مسلمان بالکل الگ الگ قومیں ہیں۔ اگر جناح صاحب واقعی اس نظریے پر یقین رکھتے تھے تو یہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی شاید وہ اس پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

ان کے دوقومی نظریے کو سب سے زیادہ حمایت یوپی اور بہار کے مسلم اشراف سے حاصل ہوئی۔ برطانوی ہندوستان کے ان صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے اور اس سے پہلے یہیں پر مسلمان حکمران رہے تھے' انہی دو صوبوں خصوصاً یوپی میں زمینداروں' جاگیرداروں اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ان کے چشم و چراغ تھے جو بڑی حد تک اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ اور جیسے جیسے آزادی کا دن قریب آ رہا تھا' ان طبقوں کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ جاگیرداروں کو خدشہ تھا کہ سوشلسٹ کانگریس آزاد ہندوستان میں جاگیرداری کو ختم کر دے گی' ان کے ان عزیز و اقارب کا سرکاری ملازمتوں کے حوالے سے مستقبل تاریک ہو جائے گا جو اس وقت بااثر عہدوں پر فائز تھے یعنی انہیں حکومت میں زیادہ حصہ نہیں ملے گا۔ ہندو ان کا راستہ روک لیں گے تو یہ طبقے تھے جنہوں نے پوری توانائی اور زور و شور سے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ نہ تو ان دو صوبوں (یوپی اور بہار) کے غریب مسلمانوں نے اور نہ ہی بنگال' پنجاب' سندھ' بلوچستان اور سرحد کے برسرِ اقتدار طبقوں نے مسلم لیگ کی پرواہ کی۔ مسلم اکثریت والے صوبوں کو کسی اکثریت سے خوف نہیں تھا کیونکہ وہاں تو مسلمان خود اکثریت میں تھے۔

تاریخ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یوپی اور بہار کے اقلیتی صوبوں کے بالائی طبقے کے

MashalBooks.org

مسلمانوں نے اس خیال سے قیامِ پاکستان کی پُرجوش حمایت کی کہ انہیں پاکستان میں بڑے مفادات حاصل ہوں گے مگر آج وہی طبقے پاکستان میں بدسلوکی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ یہی یوپی اور بہار کے مسلمان پاکستان میں پچاس برس گزر جانے کے باوجود مہاجر کے نام سے جانے جاتے ہیں' آج ان کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔ چنانچہ ان تارکینِ وطن کی ناراض تحریک کا نام بھی قومی مہاجر موومنٹ رکھا گیا ہے۔

جب 1947ء میں یہ مہاجر پاکستان گئے تو ان کا فوج' افسر شاہی' معیشت اور سیاسی قیادت سبھی پر قبضہ تھا مگر یہ سب کچھ عارضی ثابت ہوا۔ جلد ہی پنجابی مقتدر طبقوں نے اپنے وجود کا احساس دلانا شروع کیا اور مہاجروں کو کہنی مار کر ایک طرف کر دیا۔ یہ عمل ضیاء الحق کے زمانے میں اور بھی مؤثر ہو گیا۔ انہوں نے ہر کلیدی عہدے پر پنجابی بٹھا دیئے اور اقتدار پر پنجابیوں کا قبضہ پکا کر دیا۔ اب پنجاب میں نسلی اور لسانی شناخت سب سے اہم شناخت بن گئی ہے اور اب وہاں پر اکثریتی نسلی برادری کو جابرانہ قبضہ حاصل ہو گیا ہے۔ پنجابیوں سے صرف مہاجروں کو ہی سنگین شکایات نہیں اس صف میں بلوچی' سندھی اور پٹھان بھی شامل ہیں۔

نواز شریف کی حکومت میں ایم کیو ایم کے خالد مقبول صدیقی صنعتوں کے وزیر تھے جب پاکستانی فوج اور پولیس نے ایم کیو ایم کو ہراساں کرنا شروع کیا تو انہوں نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے دہلی میں ایک انٹرویو میں کہا ''ہم نے بلوچوں' سندھیوں اور پٹھانوں کے معروف رہنماؤں کو اکٹھا کر لیا ہے۔ یہ واقعی اقلیتیں اس وقت متحد ہونا چاہتی ہیں اب پاکستان میں ایک اور تاریخ تشکیل پا رہی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کام بڑی سنجیدگی کے ساتھ ہوا ہے اب ہم سب کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بن گیا ہے۔'' اب ایم کیو ایم کے قائد بھی ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں سے بھی اپیل کر رہے ہیں کہ وہ مہاجروں کی حمایت کریں۔

ایک اور اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ جہاں تک کشمیر کا معاملہ ہے' صرف پنجاب کے برسر اقتدار طبقے ہی بوقتِ ضرورت اس کو اُٹھاتے ہیں۔ مہاجر' سندھی اور بلوچی نسلی اقلیتیں کشمیر سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں۔ دراصل وہ خود زیادہ خودمختاری کے لیے پنجاب کے شکنجے سے پنجہ آزما ہیں۔ بھلا انہیں اس بات سے کیسے دلچسپی ہو سکتی ہے کہ کشمیر کو ہندوستان سے آزادی دلا کر پاکستان میں مدغم کر دیا جائے اور اس طرح یہ پنجاب کا ایک سیاسی کارنامہ بن

جائے؟

بہت سے سندھیوں اور بلوچوں نے مجھے بتایا کہ کشمیر پاکستان کا نہیں پنجاب کا مسئلہ ہے' ہمیں اپنے لیے زیادہ خودمختاری چاہیے' مہاجر لوگ بھی کشمیر کے بارے میں سردمہر نہیں اور خالد مقبول صدیقی نے کہا ''ایم کیوایم کا کشمیر کے مسئلے پر مؤقف بالکل واضح ہے۔ کشمیریوں کی اپنی مرضی مانی جائے اور پاکستان اور ہندوستان دونوں کو اس میں دستگیری کرنی چاہیے اس سے ہٹ کر ہم کسی کی طرف داری نہیں کرتے۔''

ایک وقت تھا جب شمالی ہندوستان کے مسلمان پاکستان کو ایک جذباتی پناہ گاہ سمجھتے تھے مگر حیرت ہے کہ اب معاملہ اُلٹا ہو گیا ہے۔ پاکستان کے اُردو بولنے والے مہاجر اب ہندوستان کو اپنی جذباتی پناہ گاہ سمجھنے لگے ہیں' وہ ہندوستان میں اپنی جڑوں کی تلاش میں ہیں۔ ساتویں دہائی میں جب ابھی ایم کیوایم وجود میں نہیں آئی تھی' لندن میں مجھ سے ایک مہاجر نے کہا ''پاکستان میں آ کر ہم نے بڑی غلطی کی۔'' ہندوستان میں ہندو مسلمانوں سے ایسا امتیازی سلوک نہیں کرتے جیسا پاکستان میں مہاجروں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا رویہ بدلنے لگا اور مہاجروں نے پاکستان میں اپنی حیثیت کے بارے میں شک وشبہ کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت تک سندھ میں آباد مہاجروں کی بڑی وابستگی جماعت اسلامی سے تھی مگر انہوں نے اپنی وفاداری اور سیاسی نظریہ بدلنا شروع کیا۔ مہاجروں نے اپنی تنظیم کھڑی کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ ایم کیوایم شروع میں طلباء کی تنظیم تھی اور اسے لونڈوں لباڑوں کی جماعت کہا جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ یہ نچلے اور درمیانے طبقے کے ایک حصے کے مہاجروں کی خواہشات کا آئینہ دار بننے لگی۔

پاکستانی مہاجر محسوس کرتے ہیں کہ وہ کہیں گم ہو گئے ہیں اور اب مشترکہ مذہبی شناخت بھی کارگر نہیں رہی۔ اب وہ خود کو ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ قریب سمجھتے ہیں کیونکہ انہی سے ان کی لسانی' ثقافتی اقدار کا اشتراک اور اتحاد بنتا ہے اور اب وہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہ بہت اہم موڑ ہے اور یہ مقام اس لیے آیا کہ ہندوستان جمہوری ملک ہے جس میں کثرت الوجودیت کو اہمیت دی جاتی ہے جبکہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جس میں کثرت الوجودیت کو دبایا جاتا ہے۔ کثرت الوجودیت کو ایک نظریاتی مملکت میں ہمیشہ

خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں کوئی جمہوریت نہیں ہے' وہاں صرف جاگیردارانہ ڈھانچہ ہے جو اب بھی مضبوط ہے۔ بعض مہاجر پاکستان کی جمہوریت کو نام نہاد جمہوریت قرار دیتے ہیں جبکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ اسے "جاگیردارانہ جمہوریت" کہتے ہیں۔

اس میں ان سب کے لیے ایک سبق ہے جو اکثریت پر گمان کرتے ہوئے مذہبی یا نسلی اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق اور اقتدار میں واجب حصہ دینے سے انکاری ہیں۔ آج کی دنیا کی جمہوریت میں اقلیتوں کے حقوق دراصل انسانی حقوق ہیں اور اگر ان کے حقوق کا احترام نہیں کیا جاتا' انہیں پامال کیا جاتا ہے تو ایسی صورت کوئی بھی اقلیت ہرگز برداشت نہیں کرسکتی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مذہبی اشتراک سیاسی' سماجی اور ثقافتی یک رنگی حاصل کرنے کی کوئی ضمانت نہیں ہوتا اور اگر اس کا کوئی مثبت ثبوت درکار ہے تو وہ پاکستان نے فراہم کردیا ہے۔ پاکستان میں جو کچھ ہورہا ہے اس سے ہمارے ہندوتوا وادیوں کو بھی سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ہندوراشٹر کا قیام مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے مزید تشویش ناک بنادے گا۔ ہندوستان کی اصل طاقت اس کی جمہوری کثرت الوجودیت میں ہے۔"

(15-نومبر2000ء)

پاک و ہند تعلقات میں بڑھتی تلخی

آگرہ میں واجپائی مشرف کی چوٹی کی ملاقات نے فضائیں بدل ڈالی ہیں۔ لگتا ہے جیسے ان دوملکوں میں کبھی کوئی تلخی رہی ہی نہیں اور ہمارے اخبار' ریڈیو' ٹیلی ویژن دونوں ملکوں کے تعلقات کے بارے میں خبروں' فیچروں اور مضامین سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر صفِ اوّل کی قیادت تھوڑی سی کشادہ دلی اور سیاسی پہل قدمی دِکھائے تو حالات میں کس قدر فرق پڑجاتا ہے۔ کل تک یوں لگتا تھا کہ دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری ناممکن ہے مگر اب لگتا ہے کہ یہ تو آسان سی بات ہے۔ ہر کوئی واجپائی اور مشرف کی بات چیت کا دَم سادھے انتظار کررہا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوا اور اٹل بہاری واجپائی نے صدر مشرف کو کیسے ہندوستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی اس کے بارے میں ہر قسم کی قیاس آرائی کی جارہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ امریکہ نے دباوَ ڈالا ہے' دوسری طرف (پاکستان والے سمجھتے ہیں) ہندوستان کشمیر میں عسکریت سے تنگ آ گیا ہے' اس کی افواج مسئلہ کا حل چاہتی ہیں اس لیے واجپائی نے جنرل مشرف کو بات چیت کے

MashalBooks.org

لیے بُلا لیا ہے۔

یہ مسئلہ دراصل ہم سے متعلق نہیں ہے۔ وجہ جو بھی ہو چوٹی کی اس ملاقات کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے اور بغیر کسی ذہنی تحفظات کے۔ دباؤ نہ سہی امریکی پیش قدمی سمیت بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں اور اب اس وقت دونوں ملکوں میں پُرسکون فضا ہو گئی ہے۔ واجپائی کی حکومت نے بعض اقدامات کا اعلان کیا ہے جو دونوں ملکوں میں دوستی بڑھانے میں بڑے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ گزشتہ رات انہوں نے اعلان کیا کہ ایسے پاکستانی ویزا داروں کو جو سڑک کے ذریعے سفر کرنا چاہیں' انہیں سرحد پر ہی ہندوستانی ویزا دے دیا جائے گا۔ کشمیر میں بھی ویزا لائن آف کنٹرول پر دیا جائے گا' یہ بہت اچھا فیصلہ ہے۔

ویزوں کے معاملہ میں زیادہ آسانی پیدا کی جانی چاہیے اور آخر کار اسے بالکل ہی ختم کر دینا چاہیے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سفر کرنے والوں کو دونوں اطراف میں ویزا کی وجہ سے بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس قسم کی پابندیوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس طرح لوگ پریشان ہوتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہندوستان کے اس خیر سگالی کے اظہار کا جواب پاکستان کی طرف سے اسی خیر سگالی سے دیا جائے گا اور ویزا کی پابندیاں نرم کی جائیں گی۔ ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کرنے والوں کو ان کی آمد پر (ہوائی اڈے) پر ویزا جاری کیا جائے تو پھر یہ سہولت صرف سڑک کے ذریعے سفر کرنے والوں کے لیے ہی کیوں؟ ہم امید کرتے ہیں کہ دونوں حکومتیں ہوائی مسافروں کو بھی یہ سہولت دیں گی۔ تاجر اور عالم فاضل لوگ تو عموماً ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کرتے ہیں۔

انڈین کونسل آف سوشل سائنس میں ریسرچ (آئی سی ایس ایس آر) کے چیئرمین نے پاکستانی اور ہندوستانی عالموں کے لیے واجپائی' مشرف کے نام پر 27 فیلوشپ کا اعلان کیا ہے۔ یہ بڑا ہی فراخ دلانہ فیصلہ ہے اس قسم کی اعلیٰ ظرفی کے مظاہرے دونوں ملکوں میں نمایاں تبدیلی لانے کا باعث بنیں گے۔ ہم پاکستان سے بھی امید کرتے ہیں کہ وہ بھی اسی قسم کی فیلوشپ یا کوئی اور صورت نکالے گا۔

ہمیں خبر نہیں کہ دونوں ملکوں میں مصالحت کرانے کے لیے امریکی یا بین الاقوامی دباؤ کس حد تک ہے مگر دونوں ملکوں کے لوگوں کے باہمی رابطوں کا بھی اس میں بڑا حصہ ہے۔

MashalBooks.org

بدقسمتی یہ ہے کہ دو مخالف ممالک میں تعلقات کو بہتر بنانے میں سول سوسائٹی نے جو کردار ادا کیا ہے' ذرائع ابلاغ اس پر توجہ نہیں دے رہا صرف سیاسی حلقوں کو سارا اعزاز دیا جا رہا ہے حالانکہ سول سوسائٹی نے جو حصہ ڈالا ہے' وہ کسی سے کم نہیں۔

ایک عشرہ گزرا' انڈو پاک فرینڈ شپ سوسائٹی نے دونوں ملکوں کے باشندوں کے آپس میں رابطے کی تحریک کی اور دانش وروں' عالموں اور انسانی حقوق کے کارکنوں کی کئی کانفرنسیں ہوئیں۔ ایک جلسہ ہندوستان میں ہوتا تھا تو دوسرا پاکستان میں۔ ان اجلاس کی وجہ سے نہ صرف دونوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آئے بلکہ باہمی افہام وتفہیم کے دروازے بھی کھلے۔ مزید یہ کہ یہ اجلاس دونوں ملکوں کے مختلف علاقوں میں ہوئے اور ان جلسوں میں دونوں ملکوں کے ذہین ترین افراد اکٹھے ہوئے۔

سول سوسائٹی کی طرف سے صرف یہی واحد پیش قدمی نہ تھی۔ دراصل یونیورسٹی اور دوسرے عالمانہ پلیٹ فارموں پر بھی کئی مذاکرے اور اجلاس ہوئے۔ یہ مذاکرے بھی ٹریک ٹو ڈپلومیسی کا حصہ ہیں۔ پھر شاعروں اور ادیبوں کے بھی اجتماع ہوئے جن میں شعر سنائے گئے اور دوسری ادبی تخلیقات پیش کی گئیں۔ گزشتہ دنوں لاہور میں پنجابی ادیبوں کا بہت بڑا اجتماع ہوا' دونوں ملکوں کے ادیب بہت بڑی تعداد میں اکٹھے ہوئے اور انہیں لگا کہ ہم میں کوئی بھی فرق نہیں ہے' ہماری زبان' ہماری ثقافت' ہماری روایات' ہمارا کھانا پینا سبھی کچھ تو ایک جیسا ہے تو پھر یہ تقسیم کیوں؟ جب دونوں ملکوں کے اُردو شاعر ادیب ملتے ہیں تو تب بھی یہی سماں ہوتا ہے۔

میں کراچی میں ترقی پسند ادیبوں کے اجتماع میں شریک تھا' دونوں ملکوں کے ادیب ایک دوسرے کو گلے مل رہے تھے' رو رہے تھے اور یہ بھی دل گداز کرنے والے مناظر تھے۔ سبھی کا خیال تھا کہ تقسیم تو صرف سیاسی ہے' ہم سب تو ایک ہیں' وہاں ہم ہندوستانیوں سے کئی ادیبوں نے کہا کہ ہم دونوں ملکوں کی کنفیڈریشن بنانے کی کوشش کریں تاکہ ہم ایک دوسرے سے آزادانہ مل جل سکیں۔ دونوں ملکوں میں بہت سے لوگوں کی خواہش ہے کہ انہیں قریب لانے کے لیے کنفیڈریشن بنائی جانی چاہیے اور یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ہندوستان اور پاکستان کی کنفیڈریشن بنانے کے بڑے حامی تھے (مگر یہ 1971ء میں پاکستان

کے ٹوٹنے سے پہلے کی بات ہے)

ڈاکٹر لوہیا کے پیروکاروں میں سے ملایم سنگھ یادو مشہور ہوئے' وہ بھی بڑے جوش وخروش سے کنفیڈریشن بنانے کی باتیں کرتے ہیں' بہت سے ہندوستانی اس تصور کے حامی ہیں جب یہ تصور پیش کیا گیا تھا تو یہ ایک یوٹوپیا (افسانوی) قسم کی شے لگتا تھا اور اگرچہ حالات اب بھی کوئی زیادہ سازگار نہیں مگر اب یہ کچھ کچھ حقیقی بھی لگتا ہے اس لیے دونوں ملکوں میں باہمی اعتماد پیدا کرنے کے لیے قدم بقدم آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

دراصل ہندوستان کے ٹکڑے تو سیاسی لوگوں نے کیے وگرنہ عام لوگوں کی تو ایسی کوئی خواہش یا ارادہ نہیں تھا۔ سیاست دانوں نے ملک تقسیم کیا' قیمت عام لوگوں کو ادا کرنا پڑی۔ اس عمل میں دس لاکھ سے زیادہ انسانوں کو کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ آج اس قتلِ عام کا خیال آتے ہی آدمی کانپ جاتا ہے' بہت سے لوگوں کے تو ابھی زخم تازہ ہیں۔ فیڈریشن ان کے لیے مرہم ثابت ہوسکتی ہے۔ بلاشبہ ابھی یہ ایک خواب ہے مگر ایسا خواب جس کے حقیقت میں ڈھل جانے کے بڑے امکانات بھی ہیں۔ کل تک ہم تو یہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے کہ دونوں ملک اتنے خوشگوار ماحول میں اکٹھے ہوں گے مگر اب یہ ایک حقیقت ہے۔

بہرطور میں یہ نہیں کہہ رہا کہ واجپائی اور مشرف کے درمیان ملاقات کے بعد معجزے نمودار ہوں گے' کوئی بھی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا۔ تاہم ایک بات یقینی ہے کہ ایک طرف بی جے پی کی سربراہی میں حکومت نے دوسری طرف پاکستان کی طرف سے فوجی جنرل نے پیش قدمی کی ہے اس لیے ان دونوں کی مخالفت کا خطرہ کم ہے۔ اگر بی جے پی کی جگہ کوئی اور حکومت اس قسم کا قدم اُٹھاتی تو بی جے پی اس کی پُرزور مخالفت کرتی اور اگر پاکستان کی کسی سول حکومت نے اس قسم کا اقدام کیا ہوتا تو فوج ہی اس کو سبوتاژ کر دیتی۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب نوازشریف کے زمانے میں واجپائی نے بس یاترا کی صورت میں پیش قدمی کی تھی اور نوازشریف نے اس کا پُرجوش سواگت کیا تھا تو کارگل کی جنگ شروع ہوگئی اور دونوں ملکوں میں پھر فضا ہی بدل گئی۔

اس مرتبہ دونوں ملکوں میں حالات ویسے نہیں' دونوں ملکوں کے تقریباً سبھی سیاسی حلقوں نے اس بات چیت کا گرم جوشی سے خیرمقدم کیا ہے' دونوں ملکوں کی سول سوسائٹی باہمی کشیدگی

اور مخاصمت سے تنگ آ چکی ہے۔ تاجر طبقہ سول سوسائٹی ہی کا حصہ ہے، وہ بھی اپنے مفاد کے پیش نظر بہتر تعلقات کا حامی ہے۔

دونوں ملکوں کو اپنے اپنے معاشی تقاضوں کے باعث ایک دوسرے کی شدید ضرورت ہے۔ بتایا گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان پہلے ہی غیر سرکاری طور پر دُبئی اور سنگاپور کے ذریعے کم و بیش سو ملین روپے کی تجارت ہو رہی ہے اگر تجارتی تعلقات بہتر ہوتے ہیں تو تجارت اور صنعت کے کئی دوسرے شعبوں میں بہتر تعلقات کے اور بھی بہت امکانات ہیں۔ پاکستان کے راستے ایران کی طرف سے ہندوستان کو گیس پہنچانے اور پائپ بچھانے کی بات بھی چل رہی ہے اس سے پاکستان کی ڈوبتی معیشت کو سالانہ 600 ملین ڈالر کی کمائی ہو سکتی ہے۔

تو نظر یہ آتا ہے کہ سول سوسائٹی کی طرف سے دونوں ملکوں پر تعلقات بہتر بنانے کے لیے دباؤ پڑ رہا ہے، دونوں ملکوں کے سیاسی لوگ اس دباؤ سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ ایک وقت تھا جب دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے بارے میں بے خبری عام تھی اب زی اور سٹار ٹی وی اور بہت سے دوسرے ذریعوں سے پروگرام چل رہے ہیں جو یہ غلط فہمیاں دُور کرنے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ اب کسی بھی قسم کی سنسر شپ کارآمد نہیں رہی۔ یہ بھی بڑی حوصلہ افزا بات ہے حالانکہ ایک وقت تھا جب اخباروں کا تبادلہ بھی بہت مشکل تھا اب اخبار ویب سائٹ پر آ جاتے ہیں۔ ہندوستانی اخبارات پاکستانی اخبارات سے اور پاکستانی ہندوستانی اخبارات سے مضمون لے کر شائع کر رہے ہیں اب کوئی بھی معلومات کے اس تبادلے کو نہیں روک سکتا۔

ہندوستان اور پاکستان میں تعلقات بہتر ہوں گے تو ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ فضا بھی بہتر ہوگی، دونوں ملکوں میں فرقہ وارانہ اور بنیاد پرست طاقتیں اسی مخاصمت کی بناء پر پھل پھول رہی ہیں۔ پاکستان کے جہادی ہوں یا بجرنگ دل والے دونوں کے مفاد تعلقات کی خرابی میں ہی ہوتے ہیں۔ وہ نفرت پر پلتے ہیں، دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کی بہتری کے باعث ان بنیاد پرستوں کی اوقات کیا رہ جائے گی۔

آخر میں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ کئی صدیوں تک پھیلی ہماری ایک ہی تاریخ رہی ہے، ثقافت پاکستان کی ہو یا ہندوستان کی بہرحال متحدہ اور مشترکہ ہے۔ ہم اس حقیقت سے گریز نہیں کر سکتے کہ اسلام کا ہماری ثقافت پر گہرا اثر ہے اور ہندومت کا اسلامی طرزِ حیات پر بڑا اثر

پڑا ہے۔ ہندوستان کے ہندو اور پاکستان کے مسلمان ایک ہزار سال کی امیر کبیر روایت کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے۔1947ء میں جو شگاف پڑا' وہ شدید ضرور تھا مگر عارضی تھا اور اب کسی کا یہ مسئلہ نہیں کہ وہ دونوں ملکوں کی سیاسی مختاری کو ختم کرے مگر دونوں ملکوں کی سول سوسائٹی معاشرتی دراڑوں کو تو ختم کر سکتی ہے۔

(31-جولائی2001ء)

کیا جنوبی ایشیا میں کنفیڈریشن ممکن ہے؟

بہت سے لوگ جنوبی ایشیا کے ممالک کی کنفیڈریشن بنانے کی بات کرتے ہیں۔ معروف ہندوستانی سیاست دان رام منوہر لوہیا نے یہ خیال دیا تھا اور وہ مسلسل اسی کے لیے کوشاں رہے اس کا پروپیگنڈہ کرتے رہے' ان کی رائے تھی کہ کنفیڈریشن بننے سے فرقہ وارانہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ تاہم اس وقت تک اس تجویز کی زیادہ تر حمایت ہندوستانیوں نے ہی کی' دوسرے ممالک پاکستان' بنگلہ دیش' نیپال' سری لنکا وغیرہ سے اس قسم کی تجویز کسی نے پیش نہیں کی۔ ممکن ہے کہ یہ ممالک ہندوستان کے بڑے بھائی والے کردار کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوں۔

ورلڈ اسمبلی کا ایک اجتماع الائنس فار اے ریسپانسیبل ورلڈ نے کثرت الوجودی متحدہ دنیا کے حوالے سے کروایا تھا جس میں جنوبی ایشیا کے ممالک سے متعلق اجلاس میں یہ بات بھی زیر بحث آئی تھی۔ اس میں ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش' سری لنکا اور نیپال کے مندوبین موجود تھے۔ نیپال کے ایک مندوب نے ہندوستان کے بڑے بھائی والے کردار کی بات کی تھی' باقی سب نے اس کی توثیق کر دی تھی۔

تاہم سبھی شرکاء کا کہنا تھا کہ ابھی اس تجویز کے بارے میں کام کرنے کا وقت نہیں آیا' یہ لوگ نہ تو ملکوں کے نمائندے تھے' نہ ہی اس موضوع پر بات کرنے کے مجاز۔ وہ تو صرف امکانات کا جائزہ لے رہے تھے پھر یہ خیال فوری طور پر تو ممکن ہی نہیں تاہم مستقبل کے حوالے سے اسے دیکھا گیا تھا۔ اس خواب کو عملی شکل دینے کے لیے طویل عرصے تک بہت کام اور ان ممالک میں بڑا اعتماد پیدا کرنے کے لیے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس مقصد کے حصول کے لیے اعتماد سازی کی خاطر کیے جانے والے اقدامات کی بہت

MashalBooks.org

اہمیت ہے۔ چنانچہ کچھ شرکاء پر مشتمل اس مقصد کے لیے ایک ٹاسک فورس بھی بنائی گئی تھی۔

یہ بات واضح ہے کہ موجودہ حالات میں یہ تصور ایک طرح سے دیوانے کا خواب (یوٹوپیا) ہے۔ ان ممالک میں اس وقت شدید تضادات' کشمکشیں اور بے اعتمادی کی فضا ہے مگر بعض اوقات اسی قسم کے خواب حقیقت بھی بن سکتے ہیں۔ مثلاً بہت سے شرکاء نے بار بار یورپ کی مثال دی' زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ان یورپی ممالک میں شدید اختلافات اور تنازعے تھے اور بعض تو ایک دوسرے سے دست و گریبان بھی تھے۔ دو عالمی جنگوں میں لاکھوں افراد مارے گئے' دوسری جنگِ عظیم کے بعد کون سوچ سکتا تھا کہ صرف پانچ دہائیوں کے اندر یورپی یونین بن جائے گی۔

یہ سچ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان تین جنگیں کر چکے ہیں' دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں' ان حالات میں ان کا کنفیڈریشن بنانا ناممکن نظر آتا ہے۔ دونوں ملکوں نے تو تباہ کن ایٹمی ہتھیار بھی بنا لیے ہیں اور آج دنیا بھر کی نظریں جنوبی ایشیا پر لگی ہوئی ہیں۔ ہندوستان نے پاکستان کو نیچا دِکھانے کے لیے 1999ء میں ایٹمی دھماکہ کیا مگر پاکستان بھی پیچھے نہیں رہا اور اس نے بھی کوئی وقت ضائع کیے بغیر ایٹمی دھماکہ کر دیا۔ اس وقت تک دونوں ملکوں میں لاہور اور آگرہ کی چوٹی کی کانفرنسوں سمیت کیے گئے اقدامات بار آور ثابت نہیں ہوئے۔ لاہور کی سربراہ ملاقات کے بعد کارگل کی جنگ شروع ہو گئی' آگرہ میں کوئی معاہدہ ہی نہ طے پا سکا اس بناء پر کون سر پھرا شخص ہی دعویٰ کر سکتا ہے کہ کنفیڈریشن کبھی قائم ہو سکتی ہے۔

بہرحال یورپی ممالک بھی پہلی کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے تھے' ان کی یونین بنانے سے پہلے متعدد اقدامات کیے گئے ان میں یورپی مارکیٹ کا قیام بھی تھا۔ اگرچہ سارک ابھی تک کوئی قابلِ فخر کردار ادا نہیں کر سکا مگر راستہ تو کنفیڈریشن کو ہی جاتا ہے۔ بے شک ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کارگل میں سارک تقریباً مر گیا تھا مگر اب پھر اس کو زندہ کیا جا رہا ہے اور جنوری 2002ء میں کھٹمنڈو میں اس کا ایک اجلاس ہو رہا ہے اگر آدمی پُر امید ہو اور اچھی فضا قائم کرنے کی کوشش بھی جاری رکھے تو سارک جنوبی ایشیا کو کنفیڈریشن کے راستے پر ڈال سکتا ہے۔

چنانچہ مندوبین میں یہ طے پایا کہ وہ اپنے اپنے ملک میں اچھی فضا اور مثبت رائے بنانے کے لیے کمیٹیاں قائم کریں گے اور وسیع پیمانے پر گفت و شنید بھی کریں گے۔ مگر یہ بھی

پیچیدہ جمہوری عمل ہے جسے تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔ اعتماد سازی کے لیے جو اقدامات کیے جائیں' ان میں سب سے ضروری تو ویزوں کی آسانی پیدا کرنا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں ہزاروں خاندان بٹے ہوئے ہیں' وہ ایک دوسرے ملک کا سفر سیاحت یا سیاست کے لیے نہیں اپنے بچھڑے رشتے داروں سے ملنے ملانے کے لیے کرنا چاہتے ہیں۔

یہ فرض کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ لوگ جاسوسی کریں گے۔ یہ سراسر لایعنی مفروضہ ہے' جاسوس تو ویزے کی سختیوں کے باوجود اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی لچر بات ہے کہ لوگوں کو صرف خاص شہروں یا مقامات کا ویزا دیا جائے اور وہ وہاں پہنچتے ہی پولیس تھانوں میں رپورٹ کریں۔ دوسرے کسی ملک میں ایسی پابندی نہیں ہے اس لیے اعتماد سازی کی خاطر پہلا قدم یہ ہے کہ مخصوص شہروں میں جانے کی پابندی بالکل ختم کر دی جائے اور اگر ممکن ہو تو ویزا سرحد پر دینے کے بجائے نہ صرف ہندوستان کے اعلان کے مطابق سرحد پر دیا جائے بلکہ ایئر پورٹ پر بھی دیا جائے اور آمد پر دیا جائے۔ پھر آہستہ آہستہ نیپال اور ہندوستان کی طرح یہ ویزوں والا دھندہ ہی ختم کر دیا جائے۔ جنوبی ایشیا کے تقریباً سارے ممالک ہی ایک دوسرے کے بارے میں شک وشبہ رکھتے ہیں مگر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان زیادہ مسائل ہیں۔ یہ تعلقات سنگین ہیں جبکہ باقی ملکوں میں مسئلے زیادہ گمبھیر نہیں۔ یہ مسائل بھی ایک تو تقسیم اور دو قومی نظریے کی وجہ سے پیدا ہوئے دوسرا کشمیر کا مسئلہ ہے۔ ان میں بھی دو قومی نظریے کے بجائے بڑی رکاوٹ مسئلہ کشمیر ہے۔

لیکن کشمیر کا مسئلہ بھی قریبی تعلقات اور اعتماد سازی کے ذریعے ہی حل ہوگا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا' دوسرا کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہوگا بلکہ معاملہ اُلٹ ہے اگر ہم تجارت اور دوسرے شعبوں میں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو اس طرح کشمیر کے مسئلے کے حل کے امکانات بڑھتے ہیں۔ ضرورت صرف اخلاص' مسائل کو حل کرنے کی قوتِ ارادی' اور بے باک پیش قدمی کی ہے۔ یہ مسائل ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے پیدا کردہ نہیں بلکہ مضبوط مخصوص مفادات خصوصاً سیاسی مفادات والوں کے باعث پیدا ہوئے ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ ہندوستان کی تقسیم اصلاً مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں' انا پرستی اور باہمی شک وشبے کے باعث

ہوئی تھی' ان کو ایک دوسرے پر بڑی بے اعتمادی تھی اگر دونوں جانب کے رہنماؤں نے دانش مندی کا مظاہرہ کیا ہوتا تو تقسیم کو ٹالا جا سکتا تھا۔ بہرحال اب تو یہ معاملہ تاریخ کا حصہ ہے اس تاریخ سے ہمارا مستقبل داغ دار نہیں ہونا چاہیے اس میں کوئی شک نہیں کہ کنفیڈریشن بنے نہ بنے' ہمارے مستقبل کا انحصار باہمی تعاون پر ہے۔

جہاں تک ہندوستان اور پاکستان کا تعلق ہے' ان کے مسائل ناقابلِ حل یا ناقابلِ تسخیر نہیں مگر مسائل کا کچھ انسانی پس منظر بھی ہے' دونوں طرف کے خاندان بٹے ہوئے ہیں' ان خاندانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے رحم دلی کا مظاہرہ کیا جانا چاہیے۔ مہاجر ہی قیامِ پاکستان میں سب سے بڑا وسیلہ بنے تھے مگر آج انہیں بدترین حالات درپیش ہیں' دونوں ملکوں میں انہی کے حالات خراب تر ہیں۔ وہ ہندوستان میں اپنے عزیزوں سے ملنا چاہتے ہیں مگر درمیان ویزے کی دیوار حائل ہے' وہ پاکستان میں خود کو سماجی اور ثقافتی اعتبار سے شجر بے بنیاد محسوس کرتے ہیں' آج پاکستان میں مہاجروں کو اپنی بقاء کے لیے خود جدوجہد کرنا ہوگی۔

وہ صرف بار بار ہندوستان کا دورہ ہی نہیں کرنا چاہتے بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ دونوں ملکوں میں جو کشیدگی ہے' وہ کم ہو۔ میں پاکستان گیا تو مجھے کئی دوستوں نے بڑے جوش سے گلے لگایا اور مجھ سے کہا کہ دونوں ملکوں میں کنفیڈریشن بنانے کی تحریک چلائی جائے۔ یوں معاشی اور سیاسی حوالے کے علاوہ انسانی پہلو بھی اتنا ہی اہم ہے۔

جنوبی ایشیا کے سارے ملک غریب ہیں' غربت' ناخواندگی' صحت اور بے روزگاری کے مسائل میں پھنسے ہوئے ہیں مگر بڑے بڑے لشکر رکھنے کے لیے بھاری رقم صرف کرتے ہیں' اسلحہ کی خریداری پر اربوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں اگر گزشتہ پچاس برس میں یہ رقوم افلاس اور ناخواندگی کے خاتمے پر خرچ کی گئی ہوتیں تو دونوں ملکوں کو بڑا فائدہ ہوتا اور یہ ممکن ہے کہ جنوبی ایشیا کے ان دو ممالک میں افلاس اور ناخواندگی کا معیار اس قدر نہ گرا ہوتا۔

پھر مسئلہ صرف ہندوستان اور پاکستان کا ہی نہیں' سری لنکا میں تامل سنہالی تنازع کے باعث 65 ہزار افراد مارے گئے اور فوج پر بھاری رقم خرچ کی گئی۔ سری لنکا جیسا ملک اس ناقابلِ برداشت مالی بوجھ کو ٹال سکتا تھا۔ دوسری طرف تامل سویلین بھی نہ صرف اسلحہ بلکہ انسانی جانوں کی شکل میں بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں جس طرح مسلمان ہندوستان اور پاکستان میں

MashalBooks.org

بٹے ہوئے ہیں اسی طرح تامل بھی سری لنکا اور ہندوستان میں تقسیم ہیں۔ ہم یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہیں گے اگر دُور یا نزدیک کبھی برصغیر کی کنفیڈریشن بن بھی گئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں شامل قومیں اپنی خودمختاری سے دست کش ہو جائیں گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ ہندوتوا کا اکھنڈ بھارت کا نظریہ قبول کرلیا جائے گا یا کسی ایک مذہب یا ثقافت کی اجارہ داری قائم ہوگی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اصل مسائل اس نظریہ نے ہی پیدا کیے اور یہ مسائل بھی برصغیر کی تقسیم کا سبب بنے۔ راستہ صرف ایک ہے کہ جنوبی ایشیا کی ثقافتی، مذہبی اور لسانی رنگارنگی اور کثیرالوجودیت کا احترام کیا جائے اور کسی ایک مذہب، ثقافت اور زبان کی اجارہ داری دوسروں پر نہ ٹھونسی جائے۔ جنوبی ایشیا کی کنفیڈریشن یا جنوبی ایشیا کی اقوامِ متحدہ قائم کرنے کے لیے لازم ہے کہ مذہبی ہم آہنگی، قریبی تجارتی تعلقات اور اندرونی طور پر جمہوریت کے فروغ کے لیے کام کیا جائے۔ موزوں نصابی کتابیں لکھی اور پڑھائی جائیں اس وقت دونوں ملکوں میں جو نصابی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کے ذریعے طلباء کو صحیح تاریخ پڑھانے کے بجائے سیاسی مفادات کو ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ کتابیں سب سے زیادہ تفریق پیدا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ویزے کے نظام کو اس قدر نرم کردیا جائے کہ ایک مرحلے پر اسے بالکل ہی ترک کردیا جائے۔ فی الحال یہ ایک خواب ہے تاہم انسانیت کے مستقبل کا انحصار انہی خوابوں پر ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی میں ملکوں کو اپنی سرحدیں پکی کرنے کے بجائے مشترکہ ثقافت اور تاریخ کے حوالے سے ایک دوسرے کی قربت درکار ہے۔ خوشحال زندگی کے لیے دوسرے ملکوں کی طرف نقل مکانی کی لہر کے باعث قوم کا پرانا تصور پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ رہا ہے، ثقافتی اور لسانی اعتبار سے اب قومیں مخصوص تنگ جغرافیائی حدود میں رہنے کے بجائے دوسرے متعدد ممالک میں جارہی ہیں۔ جنوبی ایشیا کو چاہیے کہ وہ اس میدان میں دنیا کی رہنمائی کرے۔

(31-دسمبر2001ء)

عالم اسلام

ایران......جدید اور قدیم کے درمیان

آج ایران تقریباً اسی خلفشار سے گزر رہا ہے جس سے اسلامی انقلاب کے دوران گزر رہا تھا بلکہ آج یہ خلفشار اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے نہ صرف عالم اسلام کو بلکہ پوری مغربی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اس کے جھٹکے سارے مغربی ممالک میں محسوس کیے گئے اس انقلاب کی قیادت آیت اللہ خمینی نے کی تھی۔ اگرچہ تعلیم و تربیت کے اعتبار سے وہ قدامت پسند تھے مگر بلاشبہ ان میں ایمان اور حوصلے کی غیر معمولی صفات تھیں۔ انہوں نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت امریکہ اور ان کے الفاظ میں سب سے بڑے شیطان کو چیلنج کیا اور اس کے سر پر غرور کو جھکا دیا۔ ایرانی انقلاب نے مغربی دنیا کے سیاسی تجزیہ نگاروں کو حیرت زدہ کر دیا۔ مغربی طاقتیں شاہ ایران کی حمایت میں پورا زور لگا رہی تھیں اور انہیں یقین تھا کہ شاہ کا پایۂ تخت بڑا مضبوط اور مستحکم ہے۔ آج ایران میں جاری اصلاحی تحریک کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایرانی اسلامی انقلاب کے پس منظر کو سمجھا جائے۔

ایران کا اسلامی انقلاب محض تاریخی حادثہ نہ تھا' یہ اس وقت برپا ہوا جب عالمِ اسلام خود ایک خلفشار سے گزر رہا تھا۔ 1968ء میں اسرائیل کے ہاتھوں شکست نے عالم عرب کے حاکم طبقے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس شکست نے جمال عبدالناصر کے عرب قوم پرستی کے نظریے کو بڑی حد تک بے اثر کر دیا تھا۔ پانچویں دہائی کے شروع میں عرب عوام کے لیے ناصر ایک افسانوی شخصیت بن گئے تھے جب انہوں نے مغربی سامراج کو چیلنج کیا تو وہ عربوں کی تمناؤں کی

علامت بن گئے مگر 1968ء میں اسرائیل سے جنگ ہارنے کے بعد جوفوائد حاصل ہوئے تھے ضائع ہوگئے۔ وہ ایک شکستہ دل آدمی کی حیثیت سے اس جہاں سے گزر گئے۔ گویا وہ مغربی سامراج کو نیچا دِکھانے میں ناکام ہوگئے مگر آیت اللہ خمینی کو یہ مقصد حاصل کرنے میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔

عرب نیشنلزم کی جگہ احیائے اسلام نے لے لی اور اس کو حوصلہ 1972ء میں مصر کی اسرائیل پر جزوی کامیابی سے حاصل ہوا اسی باعث عربوں نے پہلی بار تیل کے حربے کو مغربی دنیا کے غلبہ کو چیلنج کرنے کے لیے استعمال کیا تو دنیا میں تیل کا بحران پیدا ہوگیا۔ اس زمانے میں مسلمان ملکوں کے مغرب کے حامی حاکموں کو بھی برا سمجھا جانے لگا اسی بناء پر مصر کے صدر انور سادات کو احیائے اسلام کے علمبردار نوجوانوں نے قتل کر دیا کہ وہ مغرب سے تعلقات بڑھا رہے تھے۔

شاہِ ایران صرف مغرب ہی کے نہیں اسرائیل کے بھی حامی تھے۔ امریکہ تیل کی دولت سے مالا مال مشرقِ وسطیٰ میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے شاہِ ایران کو کیل کانٹے سے لیس کر رہا تھا' شاہ نے مغرب نواز پالیسی اس زور وشور سے اختیار کی کہ انہوں نے نہ صرف ایرانی عوام کے طرزِ احساس کو نظر انداز کیا بلکہ شیعہ علماء کی مضبوط جمعیت کو بھی ناراض کر لیا۔ واضح رہے کہ بیسویں صدی کے شروع میں ایران کے علماء کا طبقہ سیاسی بن چکا تھا اس زمانے میں انہوں نے تمباکو کی تحریک میں زبردست کردار ادا کیا تھا۔ شاہِ ایران نے تو اپنے ملک کی تاریخ سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔ یہاں جان ایسپوسیٹو اور جان وول (John Esposito, John Voll) کی کتاب ''اسلام اینڈ ڈیموکریسی'' سے اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ''ایران کی تاریخ میں اثنا عشری ہمیشہ غیر سیاسی رہے اور ریاست یا حکومت سے نباہ کرتے رہے مگر پوری تاریخ میں اہم اور نازک مرحلوں پر شیعہ اعتقاد' قیادت اور اداروں نے ایرانی سیاست اور معاشرے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ قومی شناخت اور آزادی کے تحفظ اور عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے شیعہ عقیدے کی نئی تعبیر بھی کی گئی اور اسے استعمال بھی کیا گیا۔''

شاہ نے یہی پہلو نظر انداز کیا اور اس کی قیمت چکانا پڑی۔ شاہ نے مصنوعی اور فروعی اصلاحات کیں جس کے لیے آزاد خیال لوگوں نے ان کی بڑی تعریف بھی کی۔ اصلاحات

MashalBooks.org

مغربی انداز اختیار کرنے کے لیے تھیں اور شاہ کے اردگرد مغربی رنگ میں رنگے اشرافیہ کے محدود طبقے نے انہیں قبول کیا۔ ان اصلاحات کے ساتھ ساتھ شاہ کی مغرب نواز پالیسی سے ایران کے لوگوں میں غصہ پیدا ہونے لگا اور وہ خمینی کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ خمینی کے خلاف جب ظلم و ستم کے باب کھول دیئے گئے تو وہ ابتلا کے اس دور میں بھی ثابت قدم رہے۔ یوں لوگوں کی نظر میں ان کی توقیر بڑھ گئی اس جدوجہد کے زمانے میں ان کا ایک بیٹا بھی مارا گیا۔ خمینی نے ایرانی عوام کو اس حد تک تیار کر لیا کہ عالم اسلام میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو اپنی شناخت پر فخر محسوس کرنے کے قابل بنا دیا اس طرح نہ صرف شیعہ بلکہ سنی بھی ان کے فریفتہ ہو گئے۔

ایران میں اصلاحی تحریک کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ایرانی انقلاب کے ایک اور پہلو کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ سعودی عرب سمیت پورے عالم اسلام میں اقتدار سیاسی طبقے کے پاس تھا۔ سعودی عرب میں علماء خاصے بااثر ہیں مگر سعودی حکمرانوں کے محتاج ہیں۔ صرف ایران میں علماء کو براہِ راست اقتدار حاصل ہوا۔ عالم اسلام میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آج ایران میں علماء کے اسی اقتدار کو چیلنج درپیش ہے اور مقابلے میں اعتدال پسند علماء اور آزاد خیال متوسط طبقہ ہے۔ اصلاحات کا مطالبہ کرنے والوں کی پہلی صفوں میں نوجوان اور طلباء شامل ہیں۔ خاتمی جس بھاری اکثریت سے ایران کے صدر منتخب ہوئے ہیں اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ حال ہی میں پارلیمانی انتخابات میں اصلاح پسند جیت گئے اور قدامت پسندوں کو نقصان ہوا۔ انہوں نے غصے میں آ کر غلط کام کرنے کی کوشش کی۔ تہران کا میئر اصلاحات کا حامی اور خاتمی کا قریبی تھا اس پر بدعنوانی کا الزام لگایا اور اسے قید کی سزا دی۔ خاتمی کے دوسرے حامیوں پر بھی اسی قسم کے الزامات لگائے گئے۔

یہ کہنا ضروری ہے کہ خاتمی خود بھی اعتدال پسند عالم ہیں اور ایران کے لیے ایک عظیم سرمایہ۔ انقلاب کے بعد ہر جگہ جو زیادتیاں اور خرد ماغی ہوتی ہے' ایران میں بھی ہوئی۔ کوئی بھی انقلاب ان زیادتیوں سے پاک نہیں ہوتا اور اگر کوئی ایسا انقلاب ہوا ہو تو یہ حیرت کی بات ہے۔ ایران میں خون کم بہا مگر زیادتیوں سے پاک نہ تھا تاہم اس کی قیادت مذہبی لوگوں نے کی اس اعتبار سے یہ نادر انقلاب تھا۔ اٹھارہویں صدی کے بعد دنیا میں جس قدر انقلاب آئے' وہ

چرچ اور جاگیرداروں کی سیاست کے خلاف ترقی پسند طاقتوں نے برپا کیے۔ ایران میں پہلی بار انقلاب مذہبی طبقہ لے کر آیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خمینی کی سرکردگی میں علماء کا یہ طبقہ سیاسی طور پر ترقی پسند (سامراج اور امریکہ کے مخالف) تھا مگر معاشرتی اور مذہبی اعتبار سے قدامت پسند تھا۔ ہمارے ہندوستان میں اس کی ایک مثال ہے دیوبند کے علماء آزادی کی حمایت کرنے میں بڑے ترقی پسند (متحدہ قوم پرستی کے حامی اور ملک کی تقسیم کے خلاف) تھے مگر معاشرتی اعتبار سے خاصے قدامت پسند۔

شاہِ ایران کی جابرانہ پالیسیوں کے طفیل اسلامی انقلاب کو عوام کی بے پناہ حمایت حاصل ہوئی۔ نوجوان (جو آج پھر قدامت پسند مذہبی فرقے کے ظلم وستم کے خلاف لڑ رہے ہیں) گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ اس پر بے روزگاری کی یلغار اور سکے کی قدر و قیمت تیزی سے گرنے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ان اسباب پر ایک دھماکہ خیز سیاسی صورت پیدا ہوگئی اب اسلامی انقلاب کی راہ ہموار تھی۔ آج پھر نوجوان مذہبی طبقے کی روک ٹوک کی پالیسی کے باعث گھٹن محسوس کرتے ہیں اس لیے اصلاحات زیادہ آزدی اور مغرب سے بہتر تعلقات کے لیے بے تاب ہیں۔ جولائی 1999ء میں بے چینی نے نوجوانوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ پولیس والوں نے ایران کے سخت گیر پولیس سربراہ کی ہدایت پر سختی سے طلباء کے احتجاج کو روکنا چاہا' خون خرابہ ہوا تو طلباء نقاب (شاہِ ایران کے خلاف تحریک میں بھی نقاب پہن کر احتجاج کیا کرتے تھے) پہن کر پولیس کے سربراہ کی برطرفی کا مطالبہ لے کر سڑکوں پر آ گئے۔ 11 جولائی کو 20 ہزار سے زائد طلباء احتجاج کرنے آ گئے۔ یہ اجتماع یونیورسٹی طلباء کا آج تک ہونے والے اجتماعات میں سب سے بڑا تھا اور یہ 1979ء کے اسلامی انقلاب کے بعد عوامی غم و غصے کا سب سے بڑا ہجوم تھا جس کے ساتھ لوگوں کی ہمدردریاں بھی تھیں۔ بے چینی کے اس عدیم المثال مظاہرے نے قدامت پسند مذہبی طبقہ کو ہاتھ روکنے پر مجبور کر دیا۔

ایران کے اسلامی انقلاب کی ایک اور بے مثال صفت یہ بھی تھی کہ اس سے ایک جمہوری حکومت نے جنم لیا۔ دوسرے انقلابات کے بعد اکثر کلیت پسند حکومتیں قائم ہوتی رہی تھیں اور انقلاب کا یہی پہلو تھا جس سے عالم اسلام کے بہت سے بادشاہ' جاگیردار شیخ اور ملٹری ڈکٹیٹر

MashalBooks.org

خوفزدہ ہوگئے کہ کہیں ایرانی انقلاب کی پیروی میں ان کے ہاں بغاوت نہ ہو جائے۔ ایران میں دوسرے کئی اسلامی ممالک کے خلاف عورتوں کو ووٹ کا حق دیا گیا' کویت میں عورتوں کو یہ حق حاصل نہیں' ایران میں عورتیں عہدوں کے لیے انتخاب بھی لڑسکتی تھیں اور اس وقت ایران کی نائب صدر ایک عورت ہے لیکن ایرانی پارلیمنٹ کی طرف سے منظور شدہ قانون کی توثیق ولایت فقیہہ سے مشروط ہے اور یہ ایران کے آئین کا حصہ ہے۔ جب تک خمینی زندہ تھے' ان کی قانون سازی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جاسکا' ان کے انتقال کے بعد اس پر لے دے شروع ہوگئی کیونکہ ان کے پائے کا کوئی صاحب قانون نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے قانون سازوں کی ایک کونسل منتخب کی گئی۔

ایران میں اصلاحات کی تحریک سے مراد کیا ہے؟ سب سے بڑا مسئلہ تو آزادیٔ اظہار کا ہے۔ اخباروں' رسالوں پر سخت سنسرشپ لگا دی گئی' طالب علموں میں بے چینی پھیلنے کا ایک سبب ایک اخبار کی بندش ہے۔ یہ اخبار آزاد خیال تھا اور اصلاحات کا حامی۔ طلباء نے اخبار کی بحالی کا مطالبہ کیا اور ان کی پولیس سے جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ دوسرا مسئلہ ہے یورپی ممالک خصوصاً امریکہ سے تعلقات میں نرمی پیدا کرنے کا۔ تیسرا مسئلہ عورتوں کے حقوق کا ہے۔ خواتین نے اسلامی انقلاب لانے میں زوردار کردار ادا کیا تھا۔ عورتوں نے کچھ حقوق شاہِ ایران کے زمانے میں حاصل کر لیے تھے مگر اصلی کے بجائے زیادہ تر دکھاوا تھے۔ اس زمانے میں عورتوں نے کچھ مراعات حاصل بھی کر لیں مثلاً نقاب اوڑھنے اور مغربی لباس پہننے کی اجازت لے لی لیکن سیاسی آزادی کھو دی۔ نقاب نہ اوڑھنا اور مغربی لباس پہننا آزادی کے زمرے میں نہیں آتا چنانچہ انہوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے سکرٹ کی جگہ چادر اوڑھ لی۔

مگر انقلاب کے فوراً بعد ان پر وہ پابندیاں لگنا شروع ہوگئیں جو ان کی مرضی کے خلاف تھیں۔ قدامت پسند مذہبی طبقے نے سوچے سمجھے بغیر شرع نافذ کر دی اور تو اور خمینی بھی اپنے قدامت پسند ساتھیوں کے دباؤ کے تحت عورتوں سے کیے وعدوں سے پھر گئے۔ اس طرح عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ انہیں چادر پر بھی اعتراض نہ تھا بشرطیکہ ان کے بارے میں شرعی قوانین کی قرونِ وسطیٰ کی تعبیر میں وقت کے ساتھ ساتھ

MashalBooks.org

تبدیلیاں کی جائیں۔ان کے لیے چادر ایک وقار کی علامت تھی پھر عورتوں کے حقوق کے حامی رسائل کی اشاعت کی اجازت دے دی گئی' ان میں ایک پیام حاجر بھی تھا یہ رسائل اسلامی حدود کے اندر خواتین کے حقوق کے لیے آواز اُٹھاتے تھے۔اصلاحات کی تحریک میں ایک مرکزی مسئلہ عورتوں کے حقوق کا ہے۔مثلاً متذکرہ رسالہ میں شائع ایک مضمون ''کیا مرد عورتوں سے برتر ہیں''؟ چھاپا گیا جس میں کہا گیا ''مسلمان کی حیثیت سے ہم مانتے ہیں کہ ہماری دنیوی اور اخروی زندگی کے بارے میں قرآن کے احکامات حرفِ آخر ہیں مگر بعض اوقات قرآن کی آیات کی غلط تشریح اور تفسیر سے بعض مسائل کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عدالتوں میں عورتوں کے خلاف غیر منصفانہ فیصلے دیئے جا رہے ہیں۔

ایران میں عورتیں انقلاب کی صفِ اوّل میں تھیں' ان میں زبردست بیداری پیدا ہوئی تھی اور اب بھی وہ تحریک اصلاحات کے لیے صفِ اوّل میں ہیں۔یوں اصلاحات کی تحریک کا اتنا دباؤ بڑھ گیا ہے کہ مذہبی قیادت سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرنے پر مجبور ہے۔ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ اصلاح پسندوں نے کامیابی حاصل کر لی ہے لیکن حالات ان کے موافق ہیں اور شاید قدامت پسند مذہبی قیادت کے لیے تبدیلی کو روکنا مشکل ہو رہا ہے۔

(30-اپریل2000ء)

انڈونیشیا میں سیاست اور مذہب

تیسری دنیا کے بے شمار ممالک کو قبائلی' ذات پات' فرقہ وارانہ اور نسلی خلفشار کا سامنا ہے اور انڈونیشیا کا بھی یہی حال ہے۔آج کل یہاں نسلی اور فرقہ وارانہ مشکلات درپیش ہیں میں ان معاملات میں کچھ زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔خوش قسمتی سے مجھے یوگیا کارتا میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کی دعوت مل گئی۔کانفرنس کا موضوع تھا ''ابراہیمی مذاہب اور آج کے چیلنج'' میں نے دعوت قبول کر لی اور 5 سے 10 اگست 2000ء تک اس کانفرنس میں شرکت کی۔اس طرح مجھے انڈونیشیا میں نازک فرقہ وارانہ اور نسلی صورتِ حال کے بارے میں متعلقہ عالموں سے تبادلہ خیال کا موقع مل گیا۔ان عالموں میں سے کچھ اس کانفرنس میں بھی شریک تھے۔

یہ انڈونیشیا کی خوش قسمتی ہے کہ عبدالرحمٰن واحد جیسا کشادہ نظر اور سیکولر سکالر اسے بطورِ صدر مل گیا۔ عبدالرحمٰن ایک بڑی اسلامی تنظیم نہضۃ العلماء کے سربراہ ہیں اس لیے مذہبی زندگی پر بھی ان کا بڑا اثر ہے۔ انہوں نے الازہر یونیورسٹی سے اسلامیات میں گریجوایشن کی' اپنی دیسی زبان بھاسا کے علاوہ انگریزی اور عربی میں بھی رواں ہیں۔ میں نے جکارتہ میں ان سے ملاقات کر کے نازک فرقہ وارانہ صورتِ حال کے بارے میں بات چیت کی۔ بے شک یہ واحد صاحب ایسے ہی لوگ ہیں جو اس سخت بحران میں ملک کو متحد رکھ سکتے ہیں۔ یہی ان کے لیے خراجِ تحسین کی بات ہے کہ اقلیتیں اپنے تحفظ اور بہبود کے لیے ان کی طرف دیکھتی ہیں۔

سوہارتو کے زمانے میں صورتِ حال بہت ہی خراب تھی مگر سوہارتو کے آمرانہ اقتدار کے باعث کشیدگی سامنے کم اور لاوہ اندر زیادہ پک رہا تھا۔ سبھی آمروں کے عہد حکومت میں یہی ہوتا ہے کہ سماجی کشیدگی پس پردہ رہتی ہے اور جب آمر ہٹایا جاتا ہے تو پھر اچانک اُبل پڑتی ہے۔ یہی کچھ انڈونیشیا میں بھی ہوا اب جب جمہوری حکومت قائم ہوئی تو یہ کشاکش جو پہلے دبا کر رکھی گئی تھی' اچانک اُچھل کر باہر آ گئی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ صورت پریشان کن ہوتی۔ میں سوہارتو کی حکومت اور اس سے پہلے تین بار انڈونیشیا گیا اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لوگوں سے گفت وشنید کے دوران مجھے اس کشیدگی کا احساس ہو گیا تھا۔

انڈونیشیا میں فرقہ وارانہ صورتِ حال سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اگرچہ یہاں مسلمان بھاری اکثریت میں یعنی 65 فیصد ہیں مگر رسمی طور پر اسے کبھی اسلامی مملکت نہیں کہا گیا۔ ہمارے آر ایس ایس والے مسلسل یہ پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں' وہاں وہ سیکولرازم میں پناہ ڈھونڈتے ہیں مگر جب اکثریت میں ہوتے ہیں تو ملک کے اسلامی ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ انڈونیشیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا اور اگرچہ بنیاد پرستوں کی طرف سے دباؤ بھی ہے مگر ایسا غالباً ہو گا نہیں حالانکہ بنیاد پرست مظاہرے کرتے رہتے ہیں کہ شرع کو ریاست کا قانون بناؤ اور شریعت کی حکمرانی قائم کرو۔

انڈونیشیا میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت بنیاد پرستوں کے خلاف ہے اور وہ پنچ شیلا کے اصولوں کی حمایت کرتے ہیں جو اپنی نوعیت میں سیکولر ہیں۔ میں نے بہت سے ایسے طلباء اور طالبات سے ملاقات کی جو سیکولر سیاست کے حامی ہیں اور انہیں بعض حلقوں میں بنیاد

MashalBooks.org

پرستوں کے بڑھتے اثر ورسوخ پر تشویش بھی ہے۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا اسلام سیکولر سیاست کے حق میں ہے؟ میں نے انہیں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا آزاد ایسے علماء کی مثال دی کہ انہوں نے سیکولر ریاست کے حق میں فتوے دے رکھے ہیں۔

انڈونیشیا میں بھی ہماری طرح کے بے شمار مدرسے ہیں جنہیں پیسنتران کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ سنسکرت اور مقامی بھاشا کا امتزاج ہے مگر یہاں پر مذہبی اور سیکولر دونوں قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہزاروں طلباء ان مدرسوں سے ہر سال گریجوایشن کرتے ہیں اور پھر ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں چلے جاتے ہیں۔ یہ طلباء مذہبی معاملات کا گہرا علم رکھتے ہیں اور انگریزی اور عربی بھی روانی سے بول سکتے ہیں۔ حال ہی میں میں یوگیا کارتا کے قریب ایسے مدرسے میں گیا' طلباء اور اساتذہ سے ملاقات کی اکثر مدارس میں مخلوط تعلیم رائج ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ طلباء نے ہمارا استقبال موسیقی اور رقص سے کیا' لباس روایتی جاوا والا تھا اور سر پر بھی اسی قسم کے کپڑے کی ٹوپیاں وغیرہ۔ طلباء اور اساتذہ دونوں نے مجھ سے عربی اور انگریزی میں بات چیت کی۔

انڈونیشیا میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں خصوصاً شہروں میں بڑی بیداری پائی جاتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اکثر طالبات انہی مدارس میں مذہبی اور دوسری تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ میں نے خواتین اساتذہ اور طالبات سے بھی ملاقات کی۔ ان میں مرد عورت میں منصفانہ سلوک کے مسئلے کا بھی شعور ہے' ان میں سے بعض نے اسلام میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات کے سوال پر پی ایچ ڈی بھی کر رکھی ہے اور کم از کم دو طالبات میرے اس کام پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں جو میں نے اسلام میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں کر رکھا ہے پھر مجھے خوشگوار حیرت اس بات پر ہوئی کہ انڈونیشیا میں بہت سے طلباء اور طالبات مزاجاً لبرل اور سیکولر ہیں اور وہ بنیاد پرستوں سے مقابلہ کرنے پر بھی تیار ہیں۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ انڈونیشیا میں کوئی گمبھیر قسم کے مسائل ہیں ہی نہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے بعض علاقوں مثلاً ایمبون Ambon میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں شدید کشیدگی اور جھگڑا ہے۔ تبدیلی مذہب وہاں پر بھی بڑا تلخ مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں مبالغے کی حد تک خوف یہ ہے کہ لوگ مسیحیت قبول کر رہے ہیں اور مسیحیوں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا

ہے۔ایمبون میں بھی یہی صورت ہے بعض بنیاد پرستوں کا کہنا ہے کہ عیسائیوں کا مقصد یہ ہے کہ اپنی آبادی پچاس فی صد تک بڑھالیں جس پر جہادی مسلمان شور ڈال رہے ہیں اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ان علاقوں میں دونوں برادریاں ایک دوسرے پر حملے کر رہی ہیں۔ایمبون میں عیسائیوں کی بڑی آبادی ہے' وہاں تصادم ہو رہا ہے۔ جولائی کے دوسرے ہفتے میں 28 آدمی مارے گئے تھے۔ جزیرہ ایمبون مسالوں کے سب بڑا زرخیز علاقہ ہے۔

اس جزیرہ کے لوگوں نے بتایا کہ 13 جولائی کو چودہ افراد مارے گئے تھے اس کے بعد پوری مسلح پولیس اور فوج کو متعین کیا گیا اس کے باوجود اس واقعہ کے بعد مزید بلوہ ہوا اور سات افراد مارے گئے۔ایمبون ملوکس کا سب سے بڑا خوش نما مناظر والا ساحلی شہر ہے جو گولیوں کی تڑتڑ اور بارود کے دھماکوں سے لرزتا رہتا ہے۔ایک اتوار کو ہجوم نے اس قدر تباہی مچائی اور عمارتوں کو آگ لگائی کہ فضا دھوئیں سے بھر گئی۔ایمبون میں صرف مسلمان عیسائی کو نہیں مار رہے' عیسائی بھی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ایک مسلمان لیڈر نے بتایا کہ 14 جولائی کو پانچ مسلمان مارے گئے جبکہ ایک مسلمان اس سے اگلے روز مارا گیا۔

اسی طرح ملوکس میں ٹیمائے بندرگاہ کی گلیوں بازاروں میں لشکر جہاد کے بینر لگے ہوئے تھے جن میں مسلمان نوجوانوں سے کہا گیا تھا کہ وہ ہمسایہ جزیرے ہالمہر Halmahera کے عیسائیوں پر حملہ کر دیں' وہاں جون کے تیسرے ہفتے میں درجنوں لوگ مارے گئے۔مسلم ملیشیا کے ایک کمانڈر فیصل انصار نے کہا ہمیں جہاد کر کے انہیں (عیسائیوں کو) تباہ کرنا ہے۔ عیسائیوں نے چھ ماہ پہلے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا اور اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنا علاقہ ان سے واپس لیں۔ملوکس ڈچ نوآبادیاتی عہد میں مسالوں کے باعث مشہور ہوا اس دور افتادہ علاقے کے کا نام بھی مصالحوں کے جزیرے کے باعث مسالوں کا جزیرے پڑ گیا۔اس علاقے میں بڑے خوفناک بلوے ہوئے اور اٹھارہ ماہ کے عرصہ میں فریقین کے ڈھائی ہزار افراد ہلاک ہوئے۔ یہ فسادات زیادہ تر ساحلی علاقوں میں ہو رہے ہیں کیونکہ نوآبادیاتی عہد حکمرانی میں تبدیلی مذہب انہی علاقوں میں شروع ہوئی تھی۔مخالف دھڑوں کے مذہبی گروپوں میں بڑے ہلاکت خیز تصادم ہوتے ہیں۔سینکڑوں لوگ نیزوں' تلواروں' تیر کمان اور مقامی

طور پر بنائی بندوقوں سے مسلح ہو کر حملہ کرتے ہیں۔ اب وہاں پر جدید ہتھیار بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ یہ فسادات جون کے تیسرے ہفتے میں اس وقت انتہائی خوفناک صورت اختیار کر گئے جب چار ہزار مسلمان لڑاکوں نے ہالمہرا کے اکثریتی عیسائی آبادی والے گاؤں ڈوما Duma پر حملہ کر دیا۔ چرچ کے کارکنوں کا کہنا ہے کہ 180 افراد مارے گئے۔ حکومت نے کہا 108 مارے گئے' دونوں اعداد و شمار میں سے یہی بات جھلکتی ہے کہ یہ انتہائی ہولناک واقعات میں سے ایک واقعہ تھا۔

واضح رہے کہ عبدالرحمٰن واحد انڈونیشیا میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ گزشتہ برس وہ خود ایک امن مشن لے کر ایمبون گئے تھے مگر بدقسمتی کہ ان کے رخصت ہونے کے اگلے روز لڑائی پھر شروع ہو گئی۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جب انڈونیشیا اپنے بدترین سائنسی بحران میں پھنسا ہے اور تین عشروں کی آمرانہ حکومت کے بعد جمہوریت کی طرف گامزن ہے اس وقت وہاں پر اس قدر قتل و غارت ہو رہی ہے۔

ایک اور فساد کا مقام آچے ہے یہاں مسئلہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں بلکہ بنیاد پرست مسلمانوں اور آزاد خیال مسلمانوں کے درمیان ہے۔ بنیاد پرست ریاست کو اسلامی قرار دینے اور شرعی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں اور تو اور وہ انڈونیشیا سے علیحدگی کی بھی مانگ کر رہے ہیں۔

انڈونیشی معاشرہ دراصل بڑا پیچ دار ہے' جاوا میں ثقافت متحدہ یا مشترکہ ہے اس لیے وہاں کے لوگ آزاد خیال ہیں۔ جاوا پر ہندو آٹھویں صدی سے حکمران ہوئے تھے اور ہندو حکمرانی کا جاوا کے کلچر پر گہرا اثر پڑا ہے۔ اس ثقافت میں ہندومت' بدھ مت عیسائیت اور اسلام سبھی کے عناصر شامل ہیں مگر غالب اثر ہندومت اور اسلام کا ہے۔ سیتا' لکشمن اور رام ایسے ہندوانہ نام مسلمانوں کے بھی رکھے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا کی زبان بھی سنسکرت' لاطینی اور مقامی زبانوں کا ملغوبہ یا امتزاج ہے۔ ہر جملے میں مقامی الفاظ کے ساتھ آپ کو سنسکرت اور لاطینی کے الفاظ بھی ملیں گے۔ جاوا کے مشترکہ کلچر سے صرف زبان ہی نہیں' طرزِ حیات بھی متاثر ہے۔ اس لیے یہاں کی رواداری' کشادہ نظری اور کشاکش سے آزاد سماج کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہاں ہندوؤں اور عیسائیوں کی تعداد کم ہے' ہندو کم ہیں اس لیے رامائین اور مہا

MashalBooks.org

بھارت کے رقص مسلمان کرتے ہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ متحدہ ثقافت کے باعث اس علاقے میں بڑی رواداری ہے۔

تاہم انڈونیشیا کے دوسرے علاقوں میں معاملہ مختلف ہے اور یہی علاقے ہیں جو فسادات اور تشدد کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ ہندوؤں کی اکثریت بالی جزیرہ میں ہے مگر ان کی آبادی بھی پھیل نہیں رہی اس لیے یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں میں کشاکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بالی میں گاندھی کی پیروکار لیڈر مس کوکا نے جواب پارلیمنٹ کی رکن بھی ہیں' مجھے بتایا کہ بالی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تھوڑی سی شکر رنجی ہے مگر اس نے کبھی تشدد کی شکل اختیار نہیں کی۔ مس کوکا آزاد خیال اور سیکولر ہیں' صدر عبدالرحمٰن واحد کے قریب بھی ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے ان کی کوششوں کی حامی بھی۔ بدھ لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے' ان کی کسی دوسری برادری سے کشیدگی ہو ہی نہیں سکتی۔ چینی باشندے ڈھائی فیصد ہیں' معاشی اعتبار سے بڑے بااثر اور طاقت ور چنانچہ جب انڈونیشی معیشت میں شدید اُتار آیا تو اس کا ذمہ دار انہی چینیوں کو قرار دیا گیا۔ ان کے خلاف کچھ متشددانہ کارروائیاں بھی ہوئیں مگر اب سب ٹھیک ہو گیا ہے اور چینیوں کو کسی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔

انڈونیشیا میں اس مرحلے پر نومولود جمہوریت کو کچھ گمبھیر مسائل درپیش ہیں۔ معاشی بحران کے باعث بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور معیشت ابھی پوری طرح بحال نہیں ہوئی جب تک بے روزگاری بڑھتی رہے گی' نوجوان نہ صرف غصیلے ہوتے جائیں گے بلکہ خطرہ ہے کہ ان کا رُخ فرقہ واریت کی طرف مڑتا جائے گا۔ عبدالرحمٰن واحد کو بھی کڑے سیاسی مسائل کا سامنا ہے مگر وہ انڈونیشیا کی واحد امید ہیں اور اس مرحلے پر جبکہ فرقہ وارانہ' مذہبی اور علیحدگی کی طاقتیں سر اُٹھا رہی ہیں' صرف وہی اس ملک کو اکٹھا رکھ سکتے ہیں۔

(31-اگست 2000ء)

انڈونیشیا......مصیبت میں ہے

ہوا یہ کہ مجھے ایک برس میں لیکچر دینے اور مذاکروں میں شرکت کے لیے تین بار انڈونیشیا جانا پڑا جہاں میری ملاقات دیرینہ دوست اور سابق صدر عبدالرحمٰن واحد سمیت متعدد لوگوں سے ہوئی۔ میں نے وہاں بہت سے واقعات کا خود مشاہدہ بھی کیا۔ ہندوستان اور انڈونیشیا میں

دلچسپ مشابہتیں بھی ہیں' ان میں سے بعض کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دونوں کی ثقافت متحدہ ہے' دونوں پر ہندومت اور اسلام کا اثر ہے۔ انڈونیشیا میں مسلمانوں کی اکثریت ہے' ہندو چھوٹی سی اقلیت ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی بھاری اکثریت ہے جبکہ مسلمان ایک نمایاں اقلیت ہیں اگرچہ دونوں ملکوں میں مذہبی بنیاد پرستی کا مسئلہ موجود ہے مگر دونوں کا سیاسی اور انتظامی ڈھانچہ سیکولر ہے اور معاشرت عموماً آزاد خیال۔ 50ء کی دہائی میں عالمی سرد جنگ کے زمانے میں دونوں نے غیر جانبداری کی حمایت کی' ان دنوں دنیا دو مخالف برسرِ پیکار دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جواہر لال نہرو' صدر سوئیکارنو' جمال عبدالناصر اور مارشل ٹیٹو نے غیر جانبدار ملکوں کی تنظیم بنائی' دونوں ملکوں میں ایک اور مزیدار اشتراک بھی ہے۔ جواہر لال نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی وزیر اعظم بنیں اور اسی طرح سوئیکارنو کی بیٹی میگھاوتی سوئیکارنو بھی سربراہِ مملکت بنیں اگرچہ مؤخر الذکر والد کی وفات کے بہت بعد یہ مرتبہ حاصل کرسکیں۔ وہ اندرا گاندھی جیسی مضبوط شخصیت کی مالک نہیں۔

انڈونیشیا اور ہندوستان دونوں پر اسلام اور ہندومت کا گہرا اثر ہے۔ انڈونیشیا جانے والے فرد کو پتہ مل جاتا ہے کہ وہاں (جاوا اور سماٹرا) میں بارہویں صدی میں ہندوؤں کے عہد حکومت میں اسلام داخل ہوا تھا۔ انڈونیشی لوگوں کی اسلام سے گہری وابستگی ہے مگر انہیں اپنے ماضی کے ہندو کلچر پر بھی ناز ہے۔ جب میں 1993ء میں یوگیا کارتا گیا تھا تو گجامایونیورسٹی (یہ نام یوگیا کارتا کے ہندو وزیر اعظم کے نام پر رکھا گیا تھا) کی دو لڑکیاں ایئرپورٹ پر میرا استقبال کرنے آئی تھیں' ان میں سے ایک نے سر پر اسلامی دوپٹہ لے رکھا تھا۔ مجھے خواتین کی ایک تنظیم نے اسلام میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں اظہارِ خیال کے لیے بلایا تھا اس تنظیم نے اس موضوع پر میری کتاب کا انڈونیشی زبان (بھاسا) میں ترجمہ کرایا تھا۔

جب میں نے ان لڑکیوں سے ان کے نام پوچھے تو ایک نے سیتا بتایا اور دوسری نے لکشمی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا وہ ہندو ہیں؟ انہوں نے کہا کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور دین پر عمل بھی کرتی ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ نے ہمیں ہندو کیسے سمجھ لیا؟ میں نے کہا کہ ان ناموں سے۔ کہنے لگیں انڈونیشیا میں یہ نام عام ہیں۔ مذاکرے میں عبدالرحمٰن واحد بھی موجود تھے' میں نے ان سے پوچھا کیا یہ سچ ہے کہ مسلمان عورتوں کے نام سیتا اور لکشمی بھی

ہوتے ہیں؟ انہوں نے نہ صرف اس کی توثیق کی بلکہ یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ ہمارے سب سے بڑے مسلم مبلغ کا نام مولانا وشنو ہے۔ بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خود عبدالرحمٰن واحد کی بیوی کا نام سیتا ہے۔

ہندوستان میں اسلام کا اثر جتنا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ ہے۔ نہ صرف ہندو ناموں (اقبال نرائن، مالک رام، روشن لال وغیرہ) پر اسلام کا اثر ہے، ہماری موسیقی، طرزِ تعمیر، لباس اور کھانوں پر بھی خاصا اسلامی اثر ہے۔ انڈونیشیا کی بھاسا کی طرح ہندوستان کی زبانوں ہندی، گجراتی، مراٹھی، تامل، کنڑا وغیرہ میں بھی بے شمار لفظ عربی اور فارسی کے ہیں اور روزمرہ استعمال ہوتے ہیں۔

انڈونیشیا میں رامائن رقص بڑا مقبول ہے خصوصاً سیاحوں میں یہ رقص ایک مندر کی عمارت میں ہو رہا تھا اور اس میں حصہ لینے والے سارے کے سارے مسلمان تھے۔ یوگیا کارتا اور اس کے ارد گرد کوئی ہندو رہے ہی نہیں جو اس رقص میں شریک ہوتا۔ یہ مندر بیسویں صدی میں بنایا گیا تھا، بڑے بڑے پتھروں سے کئی حصے بنائے گئے ہیں اور ان کی بڑی دیکھ بھال کی جاتی ہے اور روزانہ بڑی تعداد میں سیاح انہیں دیکھنے آتے ہیں۔ رامائن ڈانس ان مندروں کے صحن میں کیا جاتا ہے۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ قبائلی رقص سمیت قبائلی رسوم پر اب بھی عمل کیا جاتا ہے۔ یوگیا کارتا کے قریب محمدیہ فرقہ کا مدرسہ (پیسنتر ان) دیکھنے گیا تو میں نے دیکھا کہ بعض طلباء نے قبائلی لباس پہنا ہوا ہے اور قبائلی رقص کرتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت گا رہے ہیں اور ان کا اسلام کی تبلیغ کا یہی طریقہ ہے۔ یہ اسی انداز میں آس پاس کے دیہات میں جا کر اسلام کی تعلیمات کی تبلیغ کرتے ہیں۔

آج کل انڈونیشیا پر ایک بڑی مصیبت آن پڑی ہے اور پھر فرقہ وارانہ اور مذہبی مناقشات کی گرفت میں بھی ہے۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ انڈونیشیا میں بہت عرصہ فوجی آمریت قائم رہی تب اختلافی آرا کو جبراً دبا دیا جاتا تھا، لوگ اپنے اختلافات کا اظہار نہیں کر پاتے تھے جب سے فوجی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا ہے تو لوگ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، مظاہرے کرتے ہیں اور ہر قسم کی تحریکیں سر اُٹھا رہی ہیں۔ آچے میں گیس سمیت بہت سے

MashalBooks.org

قدرتی وسائل ہیں، وہاں کے لوگ اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں اگر چہ یہ تحریک دب گئی ہے مگر چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔

مسلمانوں اور عیسائیوں میں بھی کشیدگی ہے، کبھی کبھی بھڑک اُٹھتی ہے۔ خاص طور پر ملوکا میں جہاں عیسائیوں کی خاصی تعداد ہے، چرچوں اور مسجدوں پر بھی حملے ہوتے ہیں۔ عیسائیوں کی آبادی کی شرح کیا ہے اس پر جھگڑا ہے۔ عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ 12 فیصد ہیں مگر سرکاری ذرائع 7 فیصد بتاتے ہیں۔ خیر اعداد و شمار الگ دونوں میں جھگڑا ہوتا رہتا ہے خصوصاً ملوکا کی ریاست میں بلوے ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوؤں کی تعداد بہت کم (دو فیصد) ہے اور زیادہ تر جزیرہ بالی میں رہتے ہیں۔ بالی میں ایک ہندو خاتون گاندھی آشرم بھی چلا رہی ہے، اس خاتون کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ بالی کے ہندوؤں میں اب بھی چار ورن (چار ذاتیں) موجود ہیں اور وہاں اب بھی یہ کلاسیکل نظام موجود ہے۔

ہندو تعداد میں اتنے کم ہیں کہ وہ کوئی سیاسی طاقت نہیں بن سکے۔ مسلمان اکثریت میں ہیں مگر ہندوؤں کا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔ جمہوریت میں تنازع ایسی دو برادریوں کے درمیان ہوتا ہے جو تعداد میں خاصی ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہے جہاں جھگڑا ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہے۔ مسلمان اقلیت میں ہیں مگر یہ اقلیت خاصی بڑی ہے بالکل اسی طرح انڈونیشیا میں جھگڑا مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہے۔ ہندوستان ہی کی طرح وہاں پر جھگڑا زیادہ تر سیاسی نوعیت کا ہوتا ہے مگر اسے اخلاقی جواز دینے کے لیے مذہبی علامتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ انڈونیشیا میں اسلامی ریاست قائم کرنے کا مطالبہ تو ہوتا رہتا ہے مگر ریاست کا فلسفہ پنچ شیلا کا اصول ہے۔ ہندوستان میں ابھی بھی ریاست کو ہندو ریاست بنانے کا دباؤ ہے مگر یہ بی جے پی کی مخلوط حکومت کے باوجود اب تک ایک سیکولر ریاست ہے۔

جب انڈونیشیا میں فوجی آمریت کا تختہ اُلٹا گیا تھا اور انتخابات کا اعلان کیا گیا تھا تو ملک کو اسلامی ریاست بنانے کا مطالبہ اُبھرا تھا۔ پارلیمان کے بننے کے بعد تک کچھ عرصہ یہ مطالبہ ہوتا رہا مگر اب مطالبہ کم ہو گیا ہے۔ عبدالرحمٰن واحد انڈونیشیا کے پہلے منتخب صدر بنے، وہ معروف اسلامی عالم ہیں مگر ان کا نقطۂ نظر بڑا کشادہ ہے۔ انڈونیشیا کی خوش قسمتی کہ ایسا آزاد خیال شخص اس کا صدر بن گیا اور اس دوران بے شمار سیاسی دباؤ پڑے اور فرقہ وارانہ مطالبات کا طوفان آیا

مگر واحد وانڈونیشیا کو اس بحران سے نکال لے گئے۔ وہ پارلیمان میں اقلیت میں تھے (500 کی پارلیمان میں ان کے 50 ارکان تھے اور میگھاوتی کے 200) اس لیے انہیں ہٹا دیا گیا مگر انہوں نے جو پالیسی اختیار کی اس کا انڈونیشی سیاست پر اثر پڑے گا۔

فوجی آمریت کے خاتمے کے بعد انڈونیشیا میں اسلام کے احیا کا زور ہوا۔ جمہوریت میں اس قسم کا اُبھار قدرتی امر ہے۔ انڈونیشیا دنیا میں سب سے بڑا مسلم ملک ہے اور وہاں کئی عشروں کے بعد مسلمانوں کو پہلی بار سیاسی حقوق حاصل ہوئے۔ یہ اُبھار سراسر منفی نوعیت کا نہیں۔ آج انڈونیشی معاشرہ میں تین فریق آمنے سامنے ہیں' بنیاد پرست' آزاد خیال اور اعتدال پسند۔ اس کے بارے میں صحیح اندازہ تو مشکل ہے مگر میرا خیال ہے کہ اکثریت بنیاد پرستوں کے بجائے اعتدال پسندوں کی۔

ایک اور اہم اقلیت بھی ہے جو اسلام کی کھلی اور کشادہ صفات کی طرف مائل ہے وہ اسلام کی ایسی تعبیر کرنا چاہتی ہے کہ جس کے ذریعے معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لائی جاسکیں۔ ان کا خاص زور معاشی استحصالی ڈھانچہ تبدیل کرنے پر ہے۔ اسلام کی دینی کشادگی نام کی میری کتاب کا بھاسا میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اس کی مانگ بھی بہت ہے۔ مسلمان خواتین کو اپنے حقوق کا شدت سے احساس ہو رہا ہے اور قوانین میں تبدیلیوں کا مطالبہ کر رہی ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ اسلام کے مطالعہ کے بارے میں خواتین کی تعداد بڑھ رہی ہے' وہ اسلام پر پی ایچ ڈی کی سطح کی تحقیق کر رہی ہیں' عربی سیکھتی ہیں اور اصل عربی ذرائع سے تعبیریں کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ انہیں بااختیار بنانے کے لیے ضروری ہے اس طرح وہ شرعی قوانین کے ارتقاء کا مطالعہ اصل ذرائع کے حوالے سے کر سکتی ہیں۔ بہت سی یونیورسٹیاں بن گئی ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ صرف یوگیا کارتا میں 70 یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں۔ یوگیا کارتا اصلاً جاوا کا تعلیمی مرکز ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اسلام کی روایتی شکل سکہ بند صورت بھی جڑ پکڑ رہی ہے مگر اسے لبرل اسلام سے مسلسل سامنا کرنا پڑے گا۔

جون 2001ء میں جنوبی سلیویسی کے کے مقام یوجنگ پانڈا میں قرآن اور امن عالم پر کانفرنس ہوئی جس کے لیے مجھے بھی بلایا گیا۔ انڈونیشیا کی مختلف یونیورسٹیوں سے بہت سے اسلامی عالموں کے ساتھ ساتھ عرب ممالک سمیت کئی ممالک کے عالم اس میں شریک ہوئے۔

کانفرنس کے دوران مجھے بہت سے انڈونیشی عالموں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ان کی بہت بڑی تعداد اعتدال اور امن کے حق میں تھی اگر یہی رجحان غالب ہو گیا تو انڈونیشیا عالم اسلام کے لیے ایک مثالی ملک بن سکتا ہے۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ ایک عورت دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کی سربراہ بن گئی ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ وہ کب تک سربراہ رہیں گی کیونکہ عبدالرحمٰن واحد کی طرح وہ بھی سمجھوتے کی پیداوار ہیں' ان کی اپنی سیاسی بنیاد بھی کوئی زیادہ مضبوط نہیں اور وہ زیادہ سیاسی داؤ پیچ بھی نہیں جانتیں۔

(15- ستمبر 2001ء)

ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ اور مسائل

11 ستمبر 2001 کو نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر ٹاورز پر جو حملہ ہوا وہ انتہائی ہولناک اور الم ناک ہے۔ حملے کا اصل نشانہ جب غیر سیاسی امور یا معاملات یا ریاستی پالیسی سے الگ تھلگ بے گناہ شہری ہوں تو اس کی مذمت کے لیے لفظ کم پڑ جائیں گے۔ غالباً دہشت گردوں نے ان میناروں کو اس لیے منتخب کیا کہ وہ امریکہ کے معاشی غلبے اور سامراجی عزائم کی علامتیں تھے۔ دہشت پسند یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ امریکہ جیسی عظیم طاقت بھی ناقابلِ تسخیر نہیں ہے جدید ٹیکنالوجی کسی ایک علاقہ یا ملک تک محدود رہ ہی نہیں سکتی تاہم یہ بات ناقابلِ یقین ہے کہ چند عرب اور افغان اتنی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے اتنے ماہر ہو سکتے ہیں کہ وہ اس قسم کی مربوط اور باریک کارروائی کر سکیں۔ اس کے لیے بڑی مہارت اور ٹیکنالوجی کے جدید ترین علم سے آگاہ ہونا لازمی ہے۔ میری خواہش تھی کہ جن نوجوانوں نے اپنے علاوہ چھ ہزار معصوم زندگیاں تباہ کر دیں وہ پہلے اپنی مہارت اور صلاحیتوں کو اپنے اپنے ملک میں ٹیکنالوجی کی ترقی پر صرف کرتے اور پھر امریکہ کی فوجی طاقت سے دست پنجہ کرتے۔

یہ بات واضح رہے کہ یہ نوجوان بے روزگار نہیں تھے کہ انہوں نے بے روزگاری سے تنگ آ کر یہ کارروائی کر دی ہو بلکہ انتہائی تربیت یافتہ ماہر پائلٹ اور ٹیکنالوجسٹ تھے جو ایسی نپی تلی منصوبہ بندی کرنے کے اہل تھے۔ انہوں نے ایک ''مقصد'' کی خاطر اپنی زندگیاں قربان کر دیں' وہ انتہائی سرمست اور اپنے مقصد پر پکا ایمان رکھتے تھے۔ جدید ٹیکنالوجی اگر نظریاتی طور پر مضبوط افراد کے ہاتھ میں اس قدر تباہ کن ہو سکتی ہے تو ایک ملک کے ہاتھ میں

MashalBooks.org

بھی اتنی ہی تباہ کن ہو سکتی ہے۔ امریکہ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی پالیسیوں کا شکار بہت سے ملک اپنے حکمرانوں کے امریکہ سے ملتے جلتے مفادات کے باعث فی الحال خاموش رہ سکتے ہیں مگران اقوام کے بپھرے شہری جواب میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کر کے اور تباہی لا سکتے ہیں۔ جانوں اور جائیدادوں کے علاوہ وہ جراثیمی ہتھیار بھی استعمال کر کے اس سے بھی زیادہ تباہی لا سکتے ہیں۔

ان تباہ کن حملوں پر امریکی حاکموں کا ردعمل دانش مندانہ اور مدبرانہ ہونے کے بجائے ایسے لوگوں کا تھا جو جواب میں صرف انتقام کا راستہ جانتے ہیں۔ اگر دہشت گردوں نے برا کیا تھا تو امریکہ اس سے بھی برا کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ کے غصے کے باعث جنوبی اور مغربی ایشیا کے کئی ممالک غیر ضروری جنگ میں جھونکے جا سکتے ہیں جس میں ہزار ہا بے گناہ افراد مارے جائیں گے اور جائیداد تباہ ہوگی پھر بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں۔

افغانستان کے خلاف جنگ کرنے اور بقول امریکی صدر بش کے اس پر اندھادُھند بمباری سے بھی افغانوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ ایک طرف سپر طاقتوں نے افغانستان کو حجری دور تک پہنچا دیا' دوسری طرف طالبان نے باقی کسر نکال دی ہے۔ اب افغان لوگ اور کیا کھوئیں گے جبکہ وہ پہلے ہی سب کچھ کھو چکے ہیں پھر یہ بھی کہ افغانستان کے عوام اپنی آزادی کے لیے ایک سو سال تک گوریلا جنگ لڑ سکتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ افغانوں نے باہر سے آنے والے اپنے ہم مذہبوں سے ہی ہار نہیں مانی۔ ہندوستان کے انگریز حکمران بھی انہیں اپنے تخت و تاج کے زیرنگیں نہ رکھ سکے۔ اپنی پوری تاریخ میں انہوں نے یہی ثابت کیا ہے کہ وہ اپنی آزادی کے زبردست مجاہد رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ملحوظ رکھی جانی چاہیے کہ دہشت گردوں کی کارروائی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اسلام کو استعمال کیا جاتا ہے مگر ان کا بھی اصل مسئلہ اسلام نہیں ہے' ہمیں مذہب بطور عقیدہ اور مذہب بطورِ شناخت میں امتیاز کرنا چاہیے۔ دہشت پسند اسلام کو اس طرح بطورِ شناخت استعمال کر رہے ہیں جس طرح نسل پرستی شناخت کی سب سے مؤثر علامت بن جاتی ہے۔ نسلی دہشت گردی بھی اتنی ہی خطرناک ہے جتنی مذہبی دہشت گردی۔ مغربی اور ہندوستانی ذرائع ابلاغ بعض بڑی ہوشیاری سے اور بعض علی الاعلان اسلام کو جنون اور تشدد کا مذہب کہہ کر نشانہ

بناتے ہیں اور یہ اتفاق ہے کہ اس واقعہ میں جو دہشت گرد ملوث ہیں' وہ مسلمان ہیں (ہر چند ابھی اس مفروضے کو ثابت نہیں کیا گیا' ہم اسے مفروضہ سمجھ کر بات کرتے ہیں) تاہم اوکلاہاما کے واقعہ کے ذمہ دار عیسائی تھے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دہشت گرد مذہب کی پیداوار نہیں' وہ بعض ریاستی پالیسیوں کی پیداوار ہیں۔ امریکہ نے یہ کہہ کر بڑی سنگین غلطی کی تھی کہ یہ دہشت گرد مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکی پالیسیوں کی نہیں بلکہ اسلام کی پیداوار ہیں۔ اُسامہ بن لادن اگر نیویارک کے ٹاورز پر دہشت پسندانہ حملہ کرنے میں ملوث بھی ہیں تب بھی انہوں نے یہ حملے اسلامی مذہبی مفتی کی حیثیت سے نہیں کیے۔ سعودی عرب کے صفِ اوّل کے مذہبی مفتی بن باز نے نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کرنے کے لیے کوئی فتویٰ جاری نہیں کیا تھا اور اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اُسامہ کو سعودی عرب سے نکال دیا گیا تھا۔ سارے افغان بھی اس کے ہم خیال نہیں ہیں۔ افغانستان میں اس وقت بھی خانہ جنگی ہو رہی ہے' شمالی اتحاد والے طالبان کے جانی دشمن ہیں' ہزاروں افغان طالبان سے نفرت کرتے ہیں مگر وہ بے بس ہیں۔ طالبان کا اسلام ایک چھوٹی سی انتہا پسند اقلیت کا اسلام ہے اور اس قسم کے کسی بھی تشدد پسند گروپ کی ہمیشہ یہ ضرورت رہی ہے کہ اپنے پیروکاروں کو متحد رکھنے کے لیے مذہب کی اس قسم کی انتہا پسندانہ تعبیر کرے۔

بہت سے مسلمان علماء نے اس دہشت گردی کی مذمت کی ہے۔ اسلامی تنظیموں کے بہت سے رہنماؤں نے بھی ایسے ہی بیان جاری کیے ہیں جن میں کہا گیا ہے ''ہم نیویارک اور واشنگٹن پر ہولناک حملوں کی مکمل طور پر مذمت کرتے ہیں کہ ان حملوں کا نشانہ چالیس ممالک اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بنے۔ اسلام انسانی جان کے تقدس اور حفاظت کا علمبردار ہے۔ اور قرآن میں کہا گیا ہے کہ ایک بے گناہ کا قتل دراصل ساری انسانیت کا قتل ہے۔ 11 ستمبر کا المیہ انسانیت کے خلاف جرم ہے اور پوری دنیا میں اہلِ اسلام اس جارحیت کا شکار ہونے والوں اور امریکہ اور دنیا بھر کے اس نقصان پر ماتم کناں ہیں۔'' اس بیان سے واضح ہو جانا چاہیے کہ 11 ستمبر کو جو کچھ ہوا' اسے اسلام کی منظوری یا حمایت حاصل نہ تھی اس حادثے کو دراصل مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں امریکی پالیسیوں کے حوالے سے دیکھا جانا چاہیے اس کے علاوہ اسے پرکھنے کا اور کوئی زاویہ ہے ہی نہیں۔

MashalBooks.org

اس طرح امریکہ کا فرض بنتا ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنانے کے بجائے ٹھنڈے دل سے ایسی پالیسیاں اختیار کرے جن سے اس بہیمانہ دہشت گردی کا خاتمہ ہو سکے۔ اسے طاقت پر ناز تھا مگر ویت نامیوں کو نہ ہرا سکا اور افغانوں کو بھی شکست نہیں دے سکے گا۔ بغداد پر اس کی بمباری سے صدام کا تختہ نہیں اُلٹا گیا بلکہ اس طرح اگر کچھ ہوا بھی ہے تو یہ کہ صدام کی پوزیشن اور مضبوط ہو گئی ہے۔

امریکہ کو افغانستان پر بمباری کر کے اسے پتھر کے زمانے میں پہنچانے یا دہشت گردی کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے اور ایک طویل لڑائی لڑنے کا نہیں سوچنا چاہیے۔ بے شک امریکہ بہت ہی بڑی طاقت ہے مگر صدیوں پرانی کہاوت کے مطابق طاقت کے استعمال سے ناخوب خوب نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تشدد سے مزید بدترین تشدد ہی جنم لے گا اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے امریکہ کی اس سے پہلے بھی کئی بار شکست اور کرکری ہو چکی ہے اور اگر انہی پالیسیوں پر کار بند رہا تو پہلے سے بھی زیادہ ہزیمت اُٹھانی پڑے گی۔

امریکہ کو مشرقِ وسطیٰ میں اپنی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے' اس کی اسرائیل دوستی اس کی اندرونی مجبوریوں کے باعث ہو گی مگر اس طرح یہ مسلمان ممالک کو دوست نہیں بنا سکتا۔ مسلم ممالک کے حکمران طبقوں میں نہ سہی مگر وہاں کے عوام سے امریکہ کی دُوری بڑھتی جائے گی۔ فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل کی مسلسل جارحیت کے باعث امریکہ اور مسلم ممالک کے عوام میں خلیج گہری ہوتی جائے گی اور ذرائع ابلاغ جتنا چاہے زور لگا لیں' وہ امریکہ کو اس انجام سے نہ بچا سکیں گے۔ سی این این' نیویارک ٹائمز یا دوسرے بڑے بڑے امریکی ذرائع ابلاغ ناخوب کو خوب نہیں بنا سکیں گے۔

نیویارک کے واقعات کے باعث مسلم ممالک کے حکمران طبقوں کی آنکھیں بھی کھل جانی چاہئیں۔ وہ ایک آتش فشاں پر بیٹھے ہوئے ہیں نہ امریکہ سے اتحاد نہ امریکی ہتھیار ہی انہیں بچا سکتے ہیں۔ ان کے لیے شاہِ ایران کا انجام سبق آموز ہونا چاہیے۔ یہ کوئی استثنا کی مثال نہیں۔ یہ کارروائی سعودی عرب جیسے ممالک میں دہرائی بھی جا سکتی ہے۔ یہ سمجھ لینا سراسر غلط ہے کہ جمہوری حقوق دبا کر اور جبر و ستم سے وہ بچ سکتے ہیں۔ شاہِ ایران کی ساوک کتنی جابر اور وحشی تھی مگر شاہ کے تاج و تخت کو نہ بچا سکی۔

ہندوستان کو بھی اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ کشمیر میں تشدد کا مقابلہ کرنے میں امریکہ اس کی مدد کرے گا اگر کشمیر کو ایک اٹوٹ انگ کے طور پر رکھنا ہے تو پھر ہندوستان کو کشمیری عوام کے بارے میں بنیادی تبدیلیاں لانا پڑیں گی اس کے لیے بھی انسانی حقوق کی پامالی اور جبر کے بجائے عقل وفکر کی ضرورت ہے۔ آر ایس ایس کے جنگ باز گرو مورتی نے زی ٹیلی ویژن پر اعلان کیا کہ ہندوستان نے ایک ہزار برس تک ''مسلم دہشت گردی'' کا مقابلہ کیا اور اب موقع پیدا ہو گیا ہے کہ وہ پاکستان کے اندر فوجیں بھیج کر تربیتی کیمپوں کا صفایا کر دے۔ اس قسم کے جارحانہ اور جنگجویانہ رویے کے باعث کشمیر کے مسئلے کو حل کرنا ہزار گنا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ کشمیر کو ہندوستان کا حصہ اس وقت تک رکھا جا سکتا ہے جب تک ہندوستان سیکولر اور جمہوری ہے۔ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ہندوستان میں قائم آر ایس ایس کے تربیتی کیمپ بھی بند کرنے کی ضرورت ہے۔

(15-اکتوبر 2001ء)

دہشت گردی کا ٹکراؤ

کہا جاتا ہے کہ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گان پر حملے کا منصوبہ اور عملدرآمد اُسامہ بن لادن نے کرایا۔ چنانچہ صدر بش افغانستان کو فتح کرنے کے لیے نہ سہی اپنی اور اپنی قوم کی عزت کی بحالی کے لیے بموں کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ پروفیسر ہنٹنگٹن کا یہ مفروضہ کہ یہ ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' ہے' غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن یہاں اصل اور سچ بات یہ ہے کہ یہ دہشت گردی کا دہشت گردی سے ٹکراؤ ہے۔ اُسامہ اور اس کی تنظیم القاعدہ نے مبینہ طور پر جو کچھ امریکہ سے کیا' صدر بش اس کے جواب میں نہ صرف القاعدہ سے بہت برا کر رہے ہیں بلکہ اس ملک سے بھی جس نے بن لادن کو نہ صرف پناہ دی بلکہ اس کا دفاع بھی کر رہا ہے اور صدر بش کی نظر میں یہی افغانستان کا ناقابلِ معافی جرم ہے۔

صدر بش کے غصے کی کوئی حد نہیں' قرونِ وسطیٰ کے اس نظریہ یا اصول سے ہم پوری طرح واقف ہیں کہ ''آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک'' امن اور عدم تشدد کے پیامبر مہاتما گاندھی نے کہا تھا اگر ہر کوئی آنکھ کے بدلے آنکھ چاہتا ہے تو پوری دنیا نابینا لوگوں سے بھر

جائے گی ۔مگر بش صرف آنکھ کے بدلے آنکھ ہی نہیں لینا چاہتا ہے' بے شمار انسانی لاشیں بھی چاہتے ہیں اور یہ اکیسویں صدی کے عین شروع میں ہورہا ہے۔سوال یہ ہے کیا مشرق یا مغرب میں ہمارے مہذب ہونے کا کوئی جواز ہے؟ کیا یہ تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے یا دہشت گردی کا دہشت گردی سے؟ اطالوی وزیراعظم برلسکونی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے نے ثابت کردیا ہے کہ مغربی تہذیب برتر ہے اور یہ کہ اسلام جدیدیت سے سمجھوتہ کرنے میں ناکام ہوگیا ہے۔

ادھر مسئلہ یہ ہے کہ مغربی حکمراں عالم اسلام کے خلاف انتہائی شدید تعصبات میں مبتلا ہیں۔مسئلہ صرف ایک عالم ہننگٹن یا اطالوی وزیراعظم ایسے ایک سیاستدان تک ہی محدود نہیں' مغربی دنیا میں ہننگٹن کے ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' والے مشکوک مفروضے کو جس قدر پذیرائی حاصل ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صلیبی جنگوں سے اب تک مغربی دنیا میں اسلام کے خلاف کس قدر تعصب پایا جاتا ہے۔اورتو اور جب بش بن لادن کی دہشت گردی کا انتقام لینے کی بات کررہے تھے تو انہوں نے کروسیڈ کا لفظ استعمال کیا (یعنی مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگیں) برطانوی ہفت روزہ اکانومسٹ بڑا ثقہ جریدہ ہے مگر اس نے بھی اپنے 22:28 ستمبر کے شمارہ میں ہننگٹن کے وضع کردہ کلیہ کو اس طرح پیش کیا کہ گویا یہ جریدہ بھی اسے صحیح سمجھتا ہے۔

جہاد' تشدد اور مذہبی جنونیت کے تصور کو صرف مسلمانوں پر بلکہ اسلام پر ہی تھوپ دیا گیا ہے۔دنیا کے مؤثر ذرائع ابلاغ پر جزوی طور پر یہودیوں کا قبضہ ہے' وہ بھی مسلمانوں اور اسلام پر یہی تصور یا مثال تھوپ رہے ہیں۔نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ ٹاورز پر حملے کے باعث یہ مباحثہ اور شدت پکڑ گیا ہے۔آر ایس ایس کے ایک رُکن نے مجھے لکھا کہ مسلم مُلا مسلمانوں کو جہاد پر اُکساتے رہتے ہیں۔کیا ہندو مذہبی رہنما بھی کسی کو جنگ کرنے کی دعوت دیتے ہیں؟ میں اس مرحلے پر اپنے اس دوست سے بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا مگر ان کی اور دوسروں کی توجہ ایک اہم فتوے کی طرف دِلانا چاہوں گا جو علامہ یوسف قرضاوی کی سربراہی میں معروف مذہبی عالموں نے جاری کیا اور اس فتوے کے ذریعے دہشت گردی کے خلاف جنگ کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یوسف قرضاوی بہت پائے کے عرب عالم ہیں' جنہیں

MashaiBooks.org

پوری دنیا خصوصاً مشرقِ وسطیٰ میں بڑی عزت اور احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ بہت بڑے فقیہہ ہیں جن کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ فتویٰ انہوں نے امریکی فوج کے ایک مسلمان مولوی عبدالرشید محمد کے سوال کے جواب میں جاری کیا تھا۔ آج امریکی فوج میں سینکڑوں مسلمان ہیں اس لیے امریکی حکومت کو ان مسلمان سپاہیوں کی مذہبی اور روحانی ضرورتوں کی خاطر مولوی مقرر کرنا پڑا۔

ممکن ہے کہ ان مسلمان سپاہیوں کو افغانستان میں اپنے ہم مذہبوں کے خلاف لڑنے میں ذہنی طور پر مشکل پیش آئی ہو۔ چنانچہ یہیں سے یہ سوال پیدا ہوا۔ فتویٰ عربی میں جاری کیا گیا تھا جس کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا گیا۔ اس فتوے کو اس لیے بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یوسف قرضاوی اپنے فکر و خیال کے لحاظ سے امریکہ کے حامی نہیں سمجھے جاتے۔ وہ خاصی حد تک آزاد خیالات کے مالک ہیں اور کوئی عرب حکومت ان کی سر پرستی بھی نہیں کرتی۔ فتویٰ میں کہا گیا ہے ''ہم پر لازم ہے کہ ان جرائم کے ذمہ داروں اور ان کی جو مالی یا دوسری امداد دے کر یہ جرائم کرنے پر اُکساتے ہیں' پکڑ کریں۔''

فتوے میں مزید کہا گیا ''انہیں قانون کی غیر جانبدار عدالت کے سامنے لانا چاہئے اور مناسب سزا دینی چاہیے جو ان کے لیے اور ان ایسے لوگوں کے لیے عبرت آموز ہو جو لوگوں کو قتل کرنے' جائیدادیں برباد کرنے اور لوگوں کو دہشت زدہ کرنے میں ذرا سی جھجک بھی محسوس نہیں کرتے۔ اس لیے تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر ممکن طریق سے اس کارِ خیر کی حمایت کریں۔'' فتویٰ میں یہ بھی کہا گیا ہے ''تمام مسلمانوں کو ان کے خلاف متحد ہو جانا چاہیے جو بے گناہ لوگوں کو دہشت زدہ کرتے ہیں۔'' اس میں یہ بات بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ امریکی فوجی کارروائی میں بے گناہ لوگ بھی مارے جائیں مگر اس فتوے کے مطابق امریکی سپاہیوں سے کہا گیا کہ وہ اس صورتِ حال کے ناپسندیدہ ہونے کے باوجود اپنا فرض سرانجام دیں۔

اس انتہائی متنازعہ مسئلہ کے بارے میں مسلمان عوام تو ایک طرف بڑے بڑے فقیہہ بھی ہم رائے نہیں' نہ متحد ہیں مگر ہمارے عالم لوگ اور سیاست دان پوری برادری کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے اور اس پر جہادی ذہنیت اور جنون پرستی کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ یہاں میں ایک نکتہ پر زور دینا چاہتا ہوں کہ اس پر پیچ دنیا میں انسانی رویہ متعین کرنے میں مذہب بہت سے عوامل

میں سے صرف ایک عنصر ہے۔

مذہبی عقائد اور سیاسی نظریات کے مقابلے میں بہت سے دوسرے عوامل خصوصاً انسانی مفادات رویہ بنانے میں زیادہ مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ کسی بھی اسلامی ملک نے (صدام کے عراق کو چھوڑ کر جس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے) افغانستان اور امریکہ کے تصادم میں افغانستان کی حمایت نہیں کی۔ او آئی سی (آرگنائزیشن آف اسلامک کنٹریز) مسلمان ممالک سے متعلق مسائل زیرِ غور لاتی ہے اس نے بھی افغانستان پر امریکی حملے کی مذمت نہیں کی اور اتنا کہا کہ وہ مشرقِ وسطیٰ خصوصاً فلسطین کے بارے میں اپنی پالیسیوں پر نظرِ ثانی کرے۔ پاکستان تو طالبان کی حکومت کا خالق تھا مگر اس نے بھی اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کو دیکھتے ہوئے امریکہ کی حمایت کر دی۔

اگر ہمیں اکیسویں صدی میں زندہ رہنا ہے تو پھر جمہوریت' آزادی اور انسانی حقوق کا مکمل احترام کرتے ہوئے امن کے کلچر کو فروغ دینا ہوگا۔ امریکہ ہمیشہ یہی کہتا رہتا ہے کہ مسلمان ہماری آزادی اور جمہوریت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس رویے کی صداقت کے بارے میں سوال ہے کیا امریکہ اپنے ملک سے باہر آزادی اور جمہوریت کو فروغ دے رہا ہے؟ کون ہے جو آزادی اور جمہوریت سے محبت نہیں کرتا؟ مسلمان عوام یا ان کے وہ حکمران جنہیں امریکہ کی حمایت حاصل ہے؟ پاکستان میں جب جنرل مشرف نے حکومت پر قبضہ کیا تو امریکہ نے پاکستان پر سب پابندیاں وغیرہ ختم کر دیں اس لیے کہ اسے دہشت گردی کے خلاف لڑائی میں پاکستان کی امداد درکار تھی۔ تو کیا دنیا میں جمہوریت اور آزادی کے فروغ کے یہی لچھن ہیں؟

امریکہ نے جس طرح افغانستان پر حملہ کیا اس سے تو جمہوریت' قانون کی حکمرانی اور بین الاقوامی طریق کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ ایک دوسرے طریقے سے بہتر طور پر جیتی جا سکتی تھی کہ مسلم ممالک کی حمایت حاصل کی جاتی' انہیں اُسامہ اور اس قبیل کے لوگوں کا بائیکاٹ کرنے اور ان کے دہشت گردی کے قابلِ مذمت اقدامات کے خلاف زبردست عوامی رائے پیدا کی جاتی' انہی خطوط پر زوردار پروپیگنڈہ مہم شروع کی جا سکتی تھی۔ سارے کے سارے مسلمان اس قسم کے جہاد پر نہ ایمان' نہ اتفاق رکھتے ہیں۔ اعتدال پسند مسلمان تو آج کی دنیا میں جہاد کی ضرورت سے ہی انکاری ہیں (یعنی جہاد لڑائی کے مفہوم

میں)۔قرآن میں بھی جہاد کا لفظ جنگ کے لیے نہیں استعمال کیا گیا) وہ بھلا دہشت گردی کے انفرادی فعل کی جہاد سمجھ کر حمایت کیسے کر سکتے ہیں؟

امریکہ اگر امن' جمہوریت اور بین الاقوامی قانون کا راستہ اختیار کرتا تو اس کا یہ رویہ زیادہ پسند کیا جاتا اس کو نہ صرف دنیا بھر کے مسلمانوں کی حمایت اور ہمدردی حاصل ہو جاتی بلکہ اس طرح امن اور ثقافت کو بھی تقویت ملتی۔ایک تباہ شدہ غریب ملک افغانستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے اس نے نہ صرف اپنا وقار گھٹا لیا ہے' وہ اعتدال پسند مسلمانوں سے بھی دُور ہو گیا ہے اگر کوئی شخص ایک مکھی کو مارنے کے لیے ہتھوڑا استعمال کرے گا تو کوئی بھی اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھے گا۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کے اعلان اور بموں کی بارش سے کامیابی حاصل نہیں کی جا سکے گی۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح اصل مقصد ہی ضائع ہو جائے اور اس سے مزید دہشت گردی خصوصاً امریکہ کے خلاف دہشت گردی بڑھ جائے۔ بموں کے ساتھ روٹی کا پیکٹ پھینک کر نہ تو لوگوں کی حمایت حاصل کی جا سکتی ہے' نہ ہمدردی۔امریکہ اکیسویں صدی میں امن کی ثقافت کے فروغ میں بڑا مددگار ثابت ہوسکتا ہے بشرطیکہ اپنی طاقت پر گھمنڈ نہ کرے اور اپنی پالیسیوں پر مکمل طور پر نظر ثانی کرے۔

امریکہ کو فخریہ دعویٰ ہے کہ اسے آزادی' جمہوریت اور انسانی حقوق بڑے عزیز ہیں مگر افسوس اس نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے مختلف علاقوں میں سب سے زیادہ بے گناہ لوگوں کو قتل کیا ہے۔اس رویے کے باعث آبادی کے خاص حلقوں میں دہشت گردی پیدا ہوتی ہے۔ دہشت گردی کو کبھی بھی جوابی دہشت گردی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔تشدد کی ماری اس غریب دنیا کو آج پہلے سے بھی زیادہ امن کی ضرورت ہے۔امریکہ آزادی اور جمہوریت کی بات کرتا ہے لیکن آزادی اور جمہوریت کو فروغ اسی وقت مل سکتا ہے جب پوری دنیا میں امن اور انصاف ہو۔

(31-اکتوبر2001ء)

عالم اسلام کو نئے راستے کی ضرورت ہے

آج عالم اسلام میں بڑا خلفشار ہے' نیویارک میں 11 ستمبر کے واقعات کے سبب اسلامی دنیا کو ایک اور دھچکا لگا ہے۔ مسلمان دنیا تو اس واقعہ سے پہلے بھی سیاسی طور پر کوئی زیادہ مستحکم نہیں تھی۔ یہاں بہت بحران' کشمکشیں اور انقلاب گزرے' پورے افریقہ اور ایشیا میں نو آبادیاتی غلبہ کے بعد کہیں بھی نہ سکھ کا سانس آیا نہ استحکام۔ حکومتیں دن رات بدلتی رہیں اور انقلاب آتے رہے۔ یہ اتھل پتھل اس لیے رہی کہ معاشی ترقی نہیں ہوئی' لوگوں میں بے دلی پھیلی اور یہ مسائل نو آبادیاتی عہد کے بعد زیادہ شدید ہوئے۔ پورے عالم اسلام خاص طور پر مغربی ایشیائی علاقے میں تیل کی پیداوار کے باعث زیادہ کشمکش رہی اور ہے۔

تیل کی اس سیاست کے باعث ہی اس علاقے میں زیادہ خلفشار پیدا ہوا اور یہی علاقہ اسلام کا بنیادی علاقہ یا مرکز ہے۔ چنانچہ اس خطے میں واقع ممالک میں مغربی طاقتوں نے یا تو ان کٹھ پتلی حکمرانوں یا آمروں' بادشاہوں اور شیوخ کی حمایت کی جنھیں عوام میں پذیرائی حاصل نہ تھی۔ ایران' عراق اور دوسرے ممالک میں کئی انقلابات یا سیاسی بحران آئے چونکہ یہ اہم اسلامی علاقہ ہے اس لیے یہاں صحیح سیاسی ترقی بھی انہوں نے نہیں ہونے دی۔ ان پر نظریہ ٹھونسا گیا اور اس طرح اسلام کو آمریت کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور دلیل دی جانے لگی کہ اسلام جمہوریت کی اجازت نہیں دیتا۔

آمرانہ حکومتوں نے اپنی بقاء کے لیے قرونِ وسطیٰ کے مذہبی شرعی ٹوٹکے استعمال کیے جو قرآن کی اصل تعلیمات پر مشتمل نہیں بلکہ قرونِ وسطیٰ کی اپنی تشریح ہے اور اسے ہی اسلامائزیشن (یعنی اسلامانے) کا نام دے دیا گیا۔ غیر مقبول حکمرانوں نے اپنی حکومت کو جائز ثابت کرنے کے لیے ان پرانی شرعی تعبیرات یا تصورات کا استعمال کیا جن کا سماجی اور سیاسی اثر اور نتیجہ بھی ان حکمرانوں کے خلاف رہا پھر ان حکمرانوں نے جدیدیت' سیکولرازم اور خواتین کے حقوق کے خلاف اقدامات کیے' ان اقدامات کی وجہ سے اسلام پر کڑی تنقید ہونے لگی۔

ذرائع ابلاغ کے اسلام کے خلاف اپنے تعصّبات ہیں چنانچہ معاملات کو سماجی اور سیاسی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کے بجائے ہر غلط بات کا ذمہ دار اسلام کو قرار دے کر اس پر اور بھی سخت تنقید کی جا رہی ہے۔ اگرچہ ہمارے مدرسوں کا نظام سماجی تعصب کا ذمہ دار نہیں مگر اس نظامِ تعلیم کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جبکہ ان مدرسوں کے رویے میں غیر جمہوری حکمرانوں کے

طور طریقوں اور سیاسی حیلہ بازی کی عکاسی ہوتی ہے۔

جو لوگ مدرسوں پر اثر و رسوخ رکھتے تھے' ان کی اپنی سیاسی آرزوئیں تھیں' انہی مدرسوں نے طالبان پیدا کیے۔ یہ مدرسے ایسے طالب علم پیدا کرنے کے لیے بنائے گئے جن کے ذریعے افغانستان پر روسی قبضہ کے خلاف جہاد کرانا مقصود تھا۔ جہاد کی تلقین کرنے والے ان مدرسوں کو مالی امداد سی آئی اے اور سعودی عرب نے اپنے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے دی ورنہ ان مدرسوں میں متعصب طلباء پیدا ہی نہیں کیے جاتے۔ ان کا اصل مقصد نہ ہی تعلیم عام کرنا ہے۔ پاکستانی سیاست خصوصاً ضیاء الحق نے اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے کی خاطر اسلامی عقائد پرستی کو وسیلہ بنایا۔ ضیاء الحق کا اسلام نافذ کرنے کا سارا منصوبہ دراصل ان کی سیاسی ضرورتوں کی پیداوار تھا۔ انہوں نے ایسی قدامت پسندی اور جہادی ذہنیت کو پاکستانی فوج میں بھی پھیلایا۔ آئی ایس آئی فوجی حکمرانوں کے سیاسی آلہ کار کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ان تمام اقدامات کو پاکستان کے عوام کی حمایت یا توثیق بھی حاصل نہ تھی۔ پاکستان میں کبھی بھی ایک صحیح جمہوری حکومت نہیں رہی۔ فوجی حکومتوں کے درمیان جو جمہوری دور آئے بھی وہ بھی فوج کے زیر اثر تھے اور مزاجاً آمرانہ۔

افغانستان میں طالبان کی انتہائی رجعت پسند حکومت کو پاکستان کی پشت پناہی حاصل تھی۔ پاکستان کو کسی مذہبی تقاضے کے لیے اس کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعے پاکستان خطے میں اپنا غلبہ قائم رکھنا چاہتا تھا اور جہاد کا نام بھی دراصل علاقے میں سیاسی تشدد کو جائز ثابت کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ علاقے میں یعنی افغانستان اور پاکستان میں دوسرے سیاسی اثرات خصوصاً سوویت عہد حکومت میں سوویت اثرات اور شاہِ ایران کے بعد کے زمانے کے ایرانی اثرات کو روکنے کے لیے سعودی عرب نے جنوب مشرقی ایشیا میں انتہا پسند وہابی گروہوں کو مالی امداد دی۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے سعودی حکمرانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ انتہا پسند سنیوں کو مالی امداد دیتے تھے۔ سپاہ صحابہ اور اسی قسم کے گروہوں کا مالی معاملات میں انحصار' مقامی وسائل (مثلاً آئی ایس آئی یا عوامی عطیات) کے علاوہ سعودی عرب پر تھا۔

پاکستانی سیاست دانوں نے بھی کشمیر کو واقعی ''آزاد'' کرانے کے لیے نہیں بلکہ زبردست فوائد حاصل کرنے کے لیے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر کشمیر میں جذبات کو بھڑکایا۔ یہ کارروائی بھی لفظ جہاد کا استعمال کر کے جائز ثابت کی جاتی ہے اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کشمیریوں میں کوئی بے چینی نہیں پائی جاتی اور ان کی شکایات کو دُور کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہرطور یہ ایک مسئلہ ہے۔ کشمیریوں کا اسلام صوفیانہ اسلام ہے جس میں جہادی ذہنیت کی کوئی گنجائش نہیں' ان کا ملک صلح کل کا ہے لیکن جہادی گروپ کھڑے کیے گئے اور پاکستانی حکمرانوں کی سیاسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انہیں پیسے دیئے گئے۔ جہاد کی اصطلاح اَن پڑھ' بے روزگار نوجوانوں کے لیے بڑی پُرکشش ثابت ہوئی کہ اس طرح وہ مسلح لڑائیوں کے ذریعے اپنی مایوسیوں کو کم کر سکتے تھے' غصہ نکال سکتے تھے۔

یہ امر بھی اہم اور قابلِ ذکر ہے کہ انتہائی ترقی یافتہ صنعتی معاشروں سمیت سبھی معاشروں میں تشدد کے محرکات اور خدشات موجود ہیں۔ وقتاً فوقتاً امریکی معاشرے میں ملکی یا اندرونی تشدد کے مناظر سامنے آتے ہیں جیسا عرب نیوز کے ایڈیٹر انچیف خالد المینا نے لکھا ہے کہ امریکی معاشرے میں بھی انسانیت سوز تشدد کے واقعات ہوئے ہیں۔ انہوں نے لکھا ''سعودی عرب کو اپنے اسلامی اداروں کی کارروائی پر نظر رکھنے کا مشورہ دینے سے پہلے امریکہ کو اپنے سکولوں پر نظر ڈالنی چاہیے جو سکینڈلوں کی پیداوار اور افزائش کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے یونیورسٹی سٹوڈنٹ چارلس وٹمین کی مثال دی' وہ 1966ء میں ٹیکساس میں یونیورسٹی کے مینار پر اسلحہ لے کر چڑھ گیا پھر اس نے اپنے 17 ہم جماعتوں اور اساتذہ کو ہلاک کر دیا پھر چارلس مینسن کے پیروکاروں کا قصہ ہے جو چارلس کو خدا مانتے تھے اور آنکھیں بند کر کے اس کے احکام بجالاتے تھے اور اسی کے حکم کے تحت انہوں نے لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے' وہ کسی اسلامی مدرسہ میں تو نہیں پڑھے تھے؟

فلسطین میں جو تشدد ہو رہا ہے خصوصاً حماس والوں کا' وہ کسی اسلامی مدرسہ کے نظام کی پیداوار نہیں ہیں۔ یہ فلسطین میں اسرائیلی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ ہر بم دھماکے کے بعد ذرائع ابلاغ اسلامی عسکریت کی مذمت کرنے کو دوڑ پڑتے ہیں مگر اسرائیلی ظلم و ستم اور سکیورٹی کے نام پر فلسطینیوں کے خلاف روز افزوں تشدد کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ بعض اخبار تو یہاں تک

لکھ دیتے ہیں کہ اسرائیل جنگجو عرب ملکوں میں گھرا ہوا ہے جو اسے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اس لیے اسرائیل کو اپنی حفاظت کے لیے یہ اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ اسرائیل خود اتنا طاقت ور ہے کہ وہ سارے کے سارے عرب ممالک کو تباہ کر سکتا ہے اور اسے امریکہ کی زبردست حمایت اور اسلحہ بھی حاصل ہے۔

یہ سب کچھ عرض کرنے کے بعد مسلمانوں سے یہ گزارش کرنا ضروری ہے کہ وہ آج عالم اسلام کے مسائل کے بارے میں غور و فکر کریں۔ ہو سکتا ہے کہ عالمی ذرائع ابلاغ اپنے تعصّبات کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس خطے میں تیل کی سیاست اور مغربی مفادات کے باعث یہاں عدم استحکام ہے مگر مسلمان بھی اس ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے کہ انہوں نے عالم اسلام میں امن اور ترقیاتی سیاست کو فروغ دینے میں کوتاہی کی ہے۔

حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں اس لیے اپنے مسائل پر غور و فکر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ حکمرانوں کے اپنے مفادات ہیں مگر مسلمانوں کو ایک طرف جدید تعلیم کے ذریعے اپنی سیاسی اور سماجی آزادی کے لیے سرگرم ہونا ہے، دوسری طرف جمہوری کلچر قائم کرنا ہے۔ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ اسلام امن کا علمبردار ہے، مسلم معاشروں میں امن کے فروغ کے لیے بھی مؤثر طریق سے کام کرنا لازم ہے۔ جہادیوں کے مسلک کا مقابلہ امن اور جمہوریت کا مسلک سے کرتا ہے، اسلام اپنے عہد میں عرب معاشرے میں ناانصافیوں اور جہالت کے خلاف بذاتِ خود انقلاب تھا اس اسلامی انقلاب نے انصاف، امن، انسانی وقار اور ہوش و خرد کی اقدار دیں۔

چنانچہ سب مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسلام کی بنیادی اقدار کی روشنی میں تنظیمیں قائم کر کے ان اقدار کے نفاذ کے لیے جمہوری طریق کے مطابق جدوجہد کریں۔ جہادی مسلک کی جگہ جمہوری مسلک قائم ہونا چاہیے۔ جدید معاشرے کا کوئی بھی مسئلہ تشدد کے ذریعے حل نہیں ہو سکتا۔ صنعتی اور ٹیکنالوجی کی ترقی بھی صرف تعلیم اور صحیح ترقیاتی تناظر میں ہو سکتی ہے۔

مشکل زمانوں میں ہی انسانی معاشروں میں سے ایسی قیادت اُبھری ہے جسے مستقبل کا ادراک حاصل تھا۔ عسکریت اور انتہا پسندی کو یکسر ترک کرنا ہوگا، مسلم نوجوانوں میں اسلام کی بنیادی اقدار کے حوالے سے ایسی روح پھونکنا ہوگی کہ وہ منصفانہ اور بہتر معاشروں کے قیام

کے لیے جدو جہد کریں۔

اُسامہ بن لادن جیسے لوگ اسلامی ممالک کو آزاد نہیں کرا سکتے' وہ صرف تباہی اور جنگ لائیں گے۔ عدم اطمینان پیدا کر کے یہ سمجھنا کہ اس طرح تبدیلی آئے گی' ایسا نہیں ہوتا۔ اُسامہ اور ان کے پیروکار صرف غصے اور مایوسی کے نمائندے ہیں' غصے اور مایوسی کے عالم میں تشدد پر اُتر آنا جہاد نہیں ہوتا اس قسم کا تشدد نہ صرف دشمنی کی بلکہ اپنی تباہی کا باعث بھی بنتا ہے۔

اصل جہاد تو یہ ہے کہ اپنے اپنے معاشرے میں جس قدر بھی جمہوری گنجائش موجود ہے اس میں رہ کر جہالت اور مخصوص مفادات کے خلاف جدو جہد کی جائے۔ قرونِ وسطیٰ کی مذہبی تعبیروں' اصطلاحات وغیرہ کو حرفِ آخر جاننا اور کٹھ ملائیت کسی بھی کام کی نہیں اس طرح کے مذہبی نظریاتی مسلک سے صرف جمود ہی پیدا ہوگا۔

جمال الدین افغانی' محمد عبدہ سرسید اور محمد اقبال جیسے عظیم اسلامی مفکروں کی نظر میں روحِ قرآن تو تحرک میں ہے' انہوں نے اسلام کے نام پر قائم جمود' کٹھ ملائیت' جہالت اور ادہام پرستی کے خلاف جہاد کیا۔ بہت ضروری ہے کہ ان سرگرم مسلم مفکروں کے افکار کی تجدید کی جائے' انہی کا جہاد اصلی جہاد تھا اور اس جہاد میں علم' دین کی صحیح تفہیم اور تبدیلی لانے کی مستقل کوشش ہی ان کے بڑے ہتھیار تھے۔ اس جذبہ کی ترجمانی اقبال ہی کا ایک مشہور شعر کرتا ہے ۔

یقیں محکم' عمل پیہم' محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ہم سب مسلمانوں کے لیے یہی چیلنج ہے' ہمیں بہت بڑا موقع ملا ہے جس سے فائدہ اُٹھا کر ہم جدید دنیا میں اسلام کا تصور تبدیل کر سکتے ہیں۔

(31- جنوری 2002ء)

MashalBooks.org